طارنوش
قت پر حیران و پریشان رہنے والا "طارنوش"
ایک حفاظتی خوشبو حصار میں لئے رہتی تھی۔
1
عیم نوید
aazzamm@yahoo.com
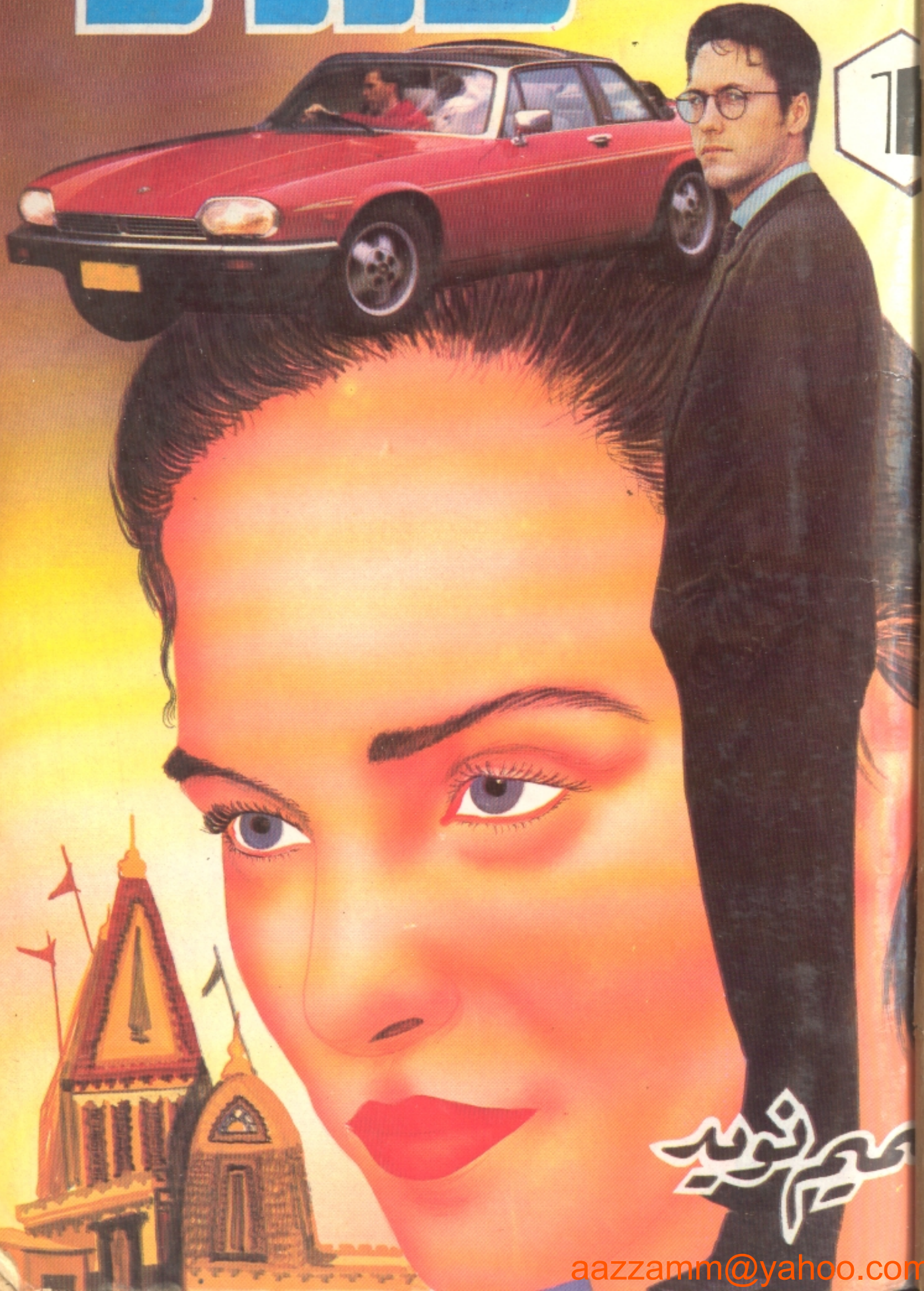
ایک پراسرار وجود کی تہلکہ خیز سرگزشت
ایک بے مثال خودنوشت

طارنوش

حصہ دوم

شمیم نوید

گل قریش پبلی کیشنز اینڈ لائبریری
11- عمر روڈ، اسلام پورہ، لاہور
فون:7229762-7248599

پُراسرار' ہیبت ناک' جناتی ناول

ایم۔اے راحت

مجاہد اوّل ذرا توقف کے بعد میری طرف رخ کرکے پھر بولا "یہ سانپ تمہیں کوئی جلدی نہیں تھی۔ تم ایک مہم سے لوٹ رہے تھے۔ اگر تم گرفتار بھی ہو جاتے تو بخت خاں سے یہ معلومات تنظیم کو مل جاتیں' کیوں؟"

"جی ہاں" میں نے اقرار کیا اور جوگیندر کی طرف دیکھا' پھر بخت خاں اور بیتا کی طرف۔ ان سب کی آنکھوں میں سہمے پن اور اضطراب تھا۔

"تم سب ایک بات یاد رکھو۔ تم اپنے حافظے پر اعتماد کرنا چھوڑ دو اس بات سے نہ ڈرو کہ تم کوئی اہم بات بھول جاؤ گے۔ انتہائی مجبوری کے عالم میں رپورٹ میں تحریر کرو' زخمی ... رپورٹ میں لکھو اور رپورٹ لکھنے کے بعد فوراً ہی اسے ... کی طرف روانہ کر دو۔ متحرک آدمی کم خطرے میں ہوتا ہے۔ تم نے بہت بڑی غلطی کی ہے شاہین!" مجاہد اوّل خاموش ہو گیا۔ پھر اس نے بیتا سے کہا "جاؤ بیٹا' ایک بالٹی لے آؤ۔"

بالٹی آئی تو مجاہد اوّل نے رپورٹ میری طرف پھینکتے ہوئے کہا کہ اسے جلا دو! میں نے رپورٹ کے کاغذات بالٹی میں ڈالے اور ماچس سے آگ لگا دی۔

"اب تمہیں جو کچھ مزید بتانا ہے' زبانی بتاؤ!" مجاہد اوّل مجھ سے مخاطب تھا۔ میں نے تمام باتیں دہرانا شروع کیں' رپورٹ بالٹی میں جلتی رہی۔

رپورٹ سننے کے بعد مجاہد اوّل نے کہا "تمہیں اس غلطی کی سزا بھگتنا ہوگی" اس کا لہجہ بہت سرد تھا "آج سے اگلے احکام تک تم کسی بھی دستے کے سربراہ نہیں ہو گے۔ اب جوگیندر اس دستے کی قیادت کرے گا۔ بخت خاں نے خود اقرار کر لیا ہے کہ وہ ملتان کی مہم پر دراصل تمہارے ہی مشوروں پر عمل کرتا رہا ہے۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ وہ عملاً تمہارے حق میں دستبردار ہو گیا تھا۔ بولو تم جوگیندر کے تحت کام کرو گے؟ بولو منظور ہے تمہیں؟"

"اے مجاہد اوّل! میں نے اس وطن کے لیے جان دینے کا عہد کیا ہے' تنظیم سے وفاداری کا عہد کیا ہے' مجھے کسی دستے کا سربراہ بننے سے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں ایک عام رکن کی حیثیت سے بھی کام کر لوں گا۔"

"مگر جناب..." جوگیندر نے کچھ کہنا چاہا۔

"اگر مگر کچھ نہیں جوگیندر! تم شاہین کے دوست ہو تو تنظیم کو اس سے کوئی غرض نہیں۔ بولو تمہیں کوئی اعتراض ہے؟"

"جی نہیں" جوگیندر نے کمزور سے لہجے میں کہا۔

"سنو! اب انگریز حکومت کا سارا زور سندھ پر ہے۔ وہ یہاں وہی کھیل کھیلنا چاہتی ہے جو ملتان میں کھیل چکی ہے۔ اب تمہیں سندھ میں کام کرنا ہے۔ جلد ہی تمہیں اس سلسلے میں ضروری ہدایات مل جائیں گی۔ ملتان سے تمہیں اس لیے یہاں بلوایا گیا ہے" مجاہد اوّل اب ایک نئی مہم کے بارے میں ہمیں سمجھا رہا تھا "یہ مہم صرف کسی ایک شہر تک محدود نہیں ہوگی۔ اس میں افراد کم سے کم ہوں گے اور سنو! اگر کبھی تم پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ اور وہ تم سے تنظیم کے متعلق سوالات کرے، تو تمہیں ہر سوال کا جواب نفی میں دینا ہے۔ تم ہر بات سے انکار کرتے چلے جانا۔ انکار میں تمہاری بچت ہے۔ انکار ہی میں تنظیم کا بھلا ہے۔ انکار ہی میں تمہاری فتح ہے۔ تمہارا انکار ہی اس ملک کے لیے سب سے زیادہ مفید ہے۔ انکار ہی کرتے رہنا، خواہ تمہیں کتنے ہی تشدد سے گزرنا پڑے۔ خواہ تم خود کو موت کے کنارے ہی کیوں نہ محسوس کرو۔ یاد رکھو جب تک تم انکار کرتے رہو گے تمہاری جان بچی رہے گی۔ جس لمحے تم نے اقرار کیا، اسی وقت سے تمہاری زندگی کے آخری لمحوں کی گنتی شروع ہو جائے گی" مجاہد اوّل نے ایک نظر ہم چاروں پر ڈالی۔ کمرے میں سناٹا پھیل گیا تھا "بولو میری بات سمجھ میں آگئی؟"

"جی ہاں" ہم چاروں نے سحر زدہ انداز میں بہ یک وقت کہا۔

"شاہین!" مجاہد اوّل کی آواز گونجی "اب تم یہاں نہیں رہو گے" یہ کہہ کر اس نے اپنے لباس سے ایک کارڈ نکال کر میری طرف بڑھایا "اب تم اس پتے پر منتقل ہو جاؤ گے۔ وہاں تمہیں تین دن رہنا ہے۔ اس عرصے میں تم نہ کسی سے ملو گے، نہ کہیں باہر جاؤ گے۔" میں نے کارڈ کو ایک نظر دیکھ کر اپنی جیب میں ڈال لیا۔ کارڈ پر رتن تالاب کے علاقے میں کسی عمارت کا نام اور فلیٹ نمبر لکھا ہوا تھا۔ "میں خود تمہیں وہاں اتاروں گا" مجاہد اوّل نے کہا۔ اس کے بعد وہ بخت خاں سے مخاطب ہوا "تمہیں، جوگیندر اور کنیز فاطمہ کو فی الحال یہیں رہنا ہے۔ اب ضرورت نہیں رہی کہ اسے سیتا کہا جائے۔ یہ اب فاطمہ ہے، صرف فاطمہ — اس تنظیم کی پہلی مجاہدہ!" مجاہد اوّل کی آواز میں سیتا یا فاطمہ کے لیے پدرانہ شفقت تھی۔ اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ صرف لفظ "فاطمہ" اس پر بھلا لگ رہا تھا "کنیز" نے اس لفظ کے حسن اور معصومیت کو مجروح کر دیا تھا۔ سو میں نے سیتا کو فاطمہ کی حیثیت سے قبول کیا اور وہ — وہ تو مجھے بہت پہلے قبول کر چکی تھی۔ "اچھا فاطمہ، شاہین اور بخت خاں! تم دوسرے کمرے میں جاؤ، مجھے جوگیندر کو کچھ ہدایات دینا ہیں۔"

ہم لوگ اٹھ کر برابر والے کمرے میں آگئے۔ فاطمہ نے مجھے اور میں نے فاطمہ کو دیکھا۔ بچھڑنے کی گھڑی پھر آگئی تھی۔ مجاہد اوّل مجھے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔ مجاہد اوّل کوئی نصف گھنٹے تک جوگیندر سے گفتگو کرتا رہا اور اس عرصے میں فاطمہ کی اور میری آنکھیں بھی ایک دوسرے سے گفتگو کرتی رہیں۔

○☆○

رتن تالاب کے اس فلیٹ میں تین دن بند رہنا ایک طرح سے میری سزا تھی۔ سولجر بازار میں ایلی کے گھر سے نکلتے وقت مجاہد اوّل نے ایک بار پھر سختی سے کہا تھا کہ مجھے تین دن تک اس فلیٹ سے قطعی نہیں نکلنا ہے۔ "خواہ پولیس آ جائے یا زلزلہ، آگ لگ جائے یا کوئی اور آفت آ جائے، تین دن قید تنہائی تمہاری سزا ہے۔"

مجاہد اوّل ایک موٹر میں سولجر بازار آیا تھا۔ جسے وہ خود ہی ڈرائیو کر رہا تھا۔ واپسی میں اس کے ساتھ میں بھی تھا۔ اس نے مجھے کار کی پچھلی نشست پر بٹھایا تھا اور پھر رتن تالاب کے علاقے میں ایک عمارت کے سامنے اس نے موٹر روک دی تھی۔ یہ وہی عمارت تھی جس کا نام کارڈ پر لکھا تھا۔

میں نے فلیٹ میں آکر اس کا جائزہ لیا۔ وہاں ضرورت کی ہر چیز تھی۔ باورچی خانے میں اتنا سامان تھا کہ اگر مجھے وہاں ایک مہینے بھی رہنا پڑتا تو کھانے کے لیے باہر نہ جانا پڑتا۔ یہ فلیٹ دو کمروں پر مشتمل تھا۔ ایک کمرے میں مسہری پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ دوسرے کمرے میں فرش پر قالین بچھا تھا۔ وہاں دو الماریاں موجود تھیں، جن میں کتابیں بھری ہوئی تھیں اور چند کرسیاں دیوار کے سہارے رکھی تھیں۔

ایک کمرے کے آگے بالکونی بنی ہوئی تھی۔ دوسرے کمرے میں اسی سمت سڑک کی جانب کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ فلیٹ کا جائزہ لے کر میں نے اطمینان سے کپڑے بدلے اور مسہری پر لیٹ گیا۔ میرا ذہن اس وقت دہلی میں تھا جہاں میری ممی تھیں اور جہاں ایک پاگل سی لڑکی زیبا رہتی تھی جس نے مجھ سے عشق کرنے کے جرم میں خودکشی کر لی تھی، جہاں میری پہلی محبت قتل کر دی گئی تھی بلونت کور! پھر ڈیڈی کی طرف میرے ذہن کی رو منتقل ہو گئی اور میں سوچنے لگا، میرے اور ڈیڈی کے درمیان اس قدر اختلاف بھی قدرت کا تماشا ہے۔ وہ انگریز کے نوکر تھے اور انگریز کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ مجھے اس بات پر شرمندگی محسوس ہوتی تھی کہ میری پرورش ان ہاتھوں میں ہوئی تھی جو انگریز کو سیلوٹ کرتے تھے۔ ایک سوال میرے ذہن میں اکثر پیدا ہوتا تھا اور کبھی میں اس کا جواب نہ دے پاتا تھا کہ اگر کبھی اس تنظیم کی خاطر اس ملک کے کاز کی خاطر میں نے خود کو ڈیڈی کے مقابل پایا تو میرا کیا رویہ ہوگا؟ مگر آج میں اس بارے میں اپنا فیصلہ دے سکتا تھا۔ یقیناً اگر کبھی ایسا موقع آیا تو میں اپنی تنظیم اور اپنے وطن کو ترجیح دوں گا۔ رام مورتی، حمید اللہ اور میرے ڈیڈی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہ سب میری مخالفت میں صف آرا تھے۔ یہ سب ان لوگوں میں شامل تھے جن سے مجھے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔

یہی سب کچھ سوچتے ہوئے میں سو گیا۔ میں نے رات بھر بہت پریشان خواب دیکھے۔ کبھی دیکھا کہ میری لاش کفنائی ہوئی رکھی ہے اور ممی بین کر رہی ہیں مگر کسی کمرے سے ڈیڈی کے قہقہے ابھر رہے ہیں، کبھی میں نے دیکھا کہ میں اپنے کمرے میں موجود ہوں، میز کے ساتھ ایک کرسی پر صدرِ عدالت کے مانند بیٹھا ہوں۔ جوگیندر، ڈیڈی کے خلاف فردِ جرم پڑھ رہا ہے اور میں ان کی موت کا حکم صادر کر رہا ہوں۔

دروازے پر زوردار دستک سن کر میں بیدار ہو گیا۔ کون ہو سکتا ہے؟ کون آ سکتا ہے؟ میرے لیے کوئی راہِ فرار نہ تھی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ دودھ والے کو دیکھ کر مجھے اطمینان ہوا اور میں نے دیگچی میں دودھ لے لیا۔

جبری تنہائی میں وقت کس قدر سست روی سے گزرتا ہے، یہ وہی لوگ جان سکتے ہیں جو اس آزار سے گزرے ہوں۔ میں نے الماریوں میں رکھی ہوئی کتابوں سے دل بہلانا چاہا مگر وہ سب کتابیں میرے کسی کام کی نہیں تھیں۔ تمام کتابیں سائنس کے مختلف موضوعات سے متعلق تھیں جن سے مجھے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ہو سکتا ہے یہ تمام کتابیں وہاں جان بوجھ کر رکھی گئی ہوں تاکہ میں اپنی دلچسپی کا کوئی سامان پیدا نہ کر سکوں۔

تمام دن اسی کوفت میں اور جھلاتے ہوئے گزر گیا۔ اگلا دن بھی اسی طرح گزرا۔ اس فلیٹ میں میری دوسری رات تھی۔ ابھی مجھے وہاں ایک اور دن گزارنا تھا، ایک اور شب بسر کرنا تھی۔ بیکار ہونے کی وجہ سے مجھ پر تھکن کا احساس غالب تھا۔ ایک کاہلی تھی کہ میرے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی۔ ذہن ہر وقت سویا سویا رہتا تھا۔ اس رات مجھے بڑی دیر میں نیند آئی۔

○☆○

دروازہ بہت زور زور سے دھڑدھڑایا جا رہا تھا۔

میری آنکھ کھل گئی۔ کون ہو سکتا ہے؟ "کون ہے؟" میں نے آواز دی۔

"دروازہ کھولو!" ایک سخت آواز سنائی دی۔ "پولیس۔"

مجھے دروازہ کھولنا ہی تھا۔ وہ فلیٹ میرے لیے پنجرا ثابت ہوا تھا۔

دروازے پر دو مسلح پولیس والے اور ایک سادہ لباس والا موجود تھا۔ "مسٹر طارنوش!"

میں اپنا اصل نام سادہ لباس والے کی زبان سے سن کر اچھل پڑا، پھر اپنے حواس پر قابو پا کر بولا۔ "کیا بات ہے؟ آپ کس لیے آئے ہیں؟" پولیس کی اچانک آمد پر میں حیران رہ گیا تھا۔ میرا اصل نام تو اب تک میرے تنظیمی ساتھیوں تک کو معلوم نہیں تھا۔

"آپ کو ہیڈ کوارٹر چلنا ہے ہمارے ساتھ!" سادہ لباس والے نے کہا۔

مجھے ان کے ساتھ جانا ہی پڑا۔ میں نے فلیٹ میں تالا ڈالا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ زینے اتر کر ہم نیچے آئے تو وہاں ایک کار کھڑی تھی۔ میں دونوں مسلح پولیس والوں کے درمیان بیٹھا اور کار چل پڑی۔ پھر مجھے بے بس کر دیا گیا میری آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔

میں کس چکر میں پھنس گیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اگر اطمینان تھا تو صرف یہ کہ مجھے قید تنہائی کی سزا دی گئی تھی تو یقیناً میری نگرانی بھی کی گئی ہوگی کہ میں مجاہد اوّل کی ہدایات سے روگردانی تو نہیں کر رہا ہوں!

لاہور میں جس طرح مجھے سی آئی اے سینٹر لے جایا گیا تھا، کراچی میں تقریباً میرے ساتھ وہی ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اس مرتبہ جب میری آنکھوں سے پٹی کھولی گئی تو میں کسی عمارت کے تہ خانے میں تھا۔ کوئی دس فٹ کے فاصلے پر ایک میز کے پیچھے تین افراد بیٹھے تھے۔ مجھے ان سے دور ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ سادہ لباس والا ایک طرف ہاتھ باندھے ایک ستون سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ ہر طرف ستون ہی ستون تھے جس کا مطلب یہی تھا کہ وہ کسی بلند و بالا عمارت کا تہ خانہ تھا۔ میرے منہ پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ یہ روشنی سامنے میز کے ساتھ ہی رکھی تھی اور اس کا رخ میرے چہرے کی جانب تھا۔ میز کے دونوں طرف دو مسلح سپاہی موجود تھے۔ ان کی رائفلیں میری ہی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

چند لمحے بعد تہ خانے میں قدموں کی آواز ابھری۔ میں

نے دائیں جانب دیکھا ادھر سے ایک اور باوردی سپاہی مستعد انداز میں میز کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک فائل بھی تھی۔ اس نے یہ فائل سادہ لباس والے کو دی اور واپس چلا گیا۔ سادہ لباس والے نے چند قدم بڑھا کر یہ فائل درمیان میں بیٹھے ہوئے شخص کو دے دی۔ فائل پر سرخ حروف میں "خفیہ" کا لفظ چمکتا نظر آیا تھا۔

خمیدہ ناک اور گھنی بھنوؤں والے نے فائل کا معائنہ کیا۔ اس کا انداز ایسے گدھ کا تھا جو کسی مردہ لاش کو نوچنے سے پہلے اس کا معائنہ کرتا ہے۔ خمیدہ ناک والے نے سر اٹھا کر مجھے مخاطب کیا۔ "طارنوش! اب اپنے سارے پتے کھول دو۔"

"کون سے پتے؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ اب تک تمہاری کیا مصروفیات رہی ہیں۔"

"پھر تو تمہیں مایوس ہونا چاہیے کہ میں تمہارے مطلب کا آدمی نہیں ہوں۔" میں نے جی کڑا کر کے کہا۔

اس کی تیز آنکھیں جیسے میرے دماغ میں گھسی جا رہی تھیں۔ ان آنکھوں میں سنگدلانہ کیفیت تھی۔ میرے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ مجھے وہ شخص یاد آ گیا جس نے لاہور کے پی آئی اے سینٹر میں میرے کان کی لو استرے سے اڑا دی تھی۔ خمیدہ ناک والا اس سے زیادہ خطرناک معلوم ہو رہا تھا۔

"طارنوش!" اس کی باریک آواز چیخ میں تبدیل ہو گئی۔ "میں جھوٹ بولنے والے کو سخت ناپسند کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہی وہ ایک دم اپنی کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا اور سادہ لباس والے سے بولا۔ "اس کے ہاتھ باندھ دو!"

سادہ لباس والے نے میرے ہاتھ کرسی کی پشت کے ساتھ موڑ کر رسی سے باندھ دیے۔ اس وقت خمیدہ ناک والا میرے نزدیک آ چکا تھا۔

"لالہ مرلی دھر' راوجا' ساوتری' سید حیدر عباس' مسعود' پنڈت گردھاری لل' شمبھو' قاسم' رام مورتی' خان بہادر حمید اللہ' رائے بہادر وشنو کمار' گنگا پرشاد' احمد حسین۔" خمیدہ ناک والا ایک ایک نام کو واضح الفاظ میں دہراتا رہا۔ "ان میں سے کسی نام کا کوئی شخص تمہارے ذہن میں ابھرتا ہے؟"

میں نے آنکھیں جھپکا کر رہ گیا۔

"دہلی سے علی گڑھ' علی گڑھ سے اتروئی' علی گڑھ ہی سے جلالی' پھر علی گڑھ۔ اس کے بعد دوبارہ دہلی۔ وہاں سے لاہور' لاہور سے براستہ لائل پور' ملتان اور پھر ملتان سے کراچی!" اس نے کہا۔ "کچھ یاد آیا؟"

میرا سانس رک گیا اور دل جیسے دھڑکنا بھول گیا۔ ان لوگوں کو سب کچھ معلوم تھا۔ انکار بے سود ہے۔ مجھے ممی یاد آئیں' ڈیڈی یاد آئے۔ اس کے ساتھ ہی انگریز سے ڈیڈی کی وفاداری یاد آئی۔ ایک نفرت سی میری رگ و پے میں دوڑ گئی۔ یہ سب کچھ چند ہی لمحوں میں ہوا۔

"کچھ یاد آیا؟ بولو!"

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ تم کیا کہہ رہے ہو!"

"اگر تم نہیں بتاؤ گے تو میرے پانچ تک گنتی گننے کے ساتھ ہی یہ دونوں سپاہی گولی چلا دیں گے۔" اس نے کہا۔

میں نے میز کی دونوں جانب کھڑے ہوئے سپاہیوں کو دیکھا جنہوں نے نشانے ٹھیک کر لیے تھے۔

"احمق! پاگل میں کچھ نہیں جانتا۔ تم مجھے مارنا ہی چاہ رہے ہو تو بہانے کیوں تراش رہے ہو۔" میں چیخ کر بولا۔ میں اس گومگو کی صورت حال کو مزید برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

"ایک۔۔۔ دو۔۔۔ تین۔۔۔" اس نے گنتی شروع کی۔

کیا میں پانچ تک کی گنتی تک ثابت قدم رہ سکوں گا؟ شاید نہیں۔ میں نے سوچا۔ خان بہادر حمید اللہ بھی جی چھوڑ بیٹھا تھا۔ اس وقت میرے تمام حواس جیسے سُن ہو گئے تھے۔ مگر اس نے تین کے بعد کچھ نہیں کہا۔ ایک طویل وقفے کے بعد خمیدہ ناک میرے چہرے پر جھک آئی۔ اس کی سکڑی ہوئی گھنی بھنوؤں کے نیچے الو جیسی زرد زرد آنکھیں میری آنکھوں پر جم گئیں۔ "سنو طارنوش! مجھے تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری موت کو آسان بنا دوں۔ ہمیں تمہاری تمام سرگرمیوں کا علم ہے۔ وہ فائل دیکھ رہے ہو اس میں دہلی' علی گڑھ اور جلالی سے لے کر لاہور اور ملتان تک کی تمام رپورٹیں ہیں۔ میں خاص طور پر شملے سے آیا ہوں۔ تمہیں علم نہیں شاید کہ ہم تم تک تمہارے ڈیڈی کی بدولت پہنچے ہیں۔ تم سچ سچ سب قبول دو۔ تمہارے ڈیڈی نے حکومت سے تمہاری بخشش کرا لی ہے۔ تمہیں معاف کر دیا جائے گا۔ تم سرکاری گواہ بنا لیے جاؤ گے۔ ورنہ۔۔۔؟"

"ورنہ کیا ہو گا؟" میں بول اٹھا۔

"ورنہ ہمیں حقیقت اگلوانے کے سیکڑوں طریقے آتے ہیں۔" وہ پیچھے ہٹ گیا۔ "تمہارے ڈیڈی نے وائسرائے سے مل کر تمہاری زندگی کی بھیک مانگ لی ہے' مگر یہ بھیک صرف اسی صورت میں ملے گی کہ تم رضاکارانہ طور پر سب کچھ مان لو' اپنے تمام جرائم کا اعتراف کر لو۔"

"میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"حکومت کا ایک اسلحہ ڈپو اڑا دینا' حکومت کے وفاداروں کو قتل کرنا' لاہور کے پی آئی اے سینٹر پر حملہ کرانا' حکومت کے ایک غدار کو چھڑا لے جانا اور ملتان میں حکومت کے خلاف ہنگامے کرانا' سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا' کیا تم انہیں جرائم نہیں سمجھتے؟"

زندگی' زندگی! خوبصورت دنیا' خوبصورت و معصوم فاطمہ! فاطمہ کی بڑی بڑی آنکھیں میرے تصور پر محیط ہو گئیں۔ مجھے اس کے ہونٹوں کا لمس یاد آیا۔ مجھے اپنی ممی کا چہرہ یاد آیا۔ یہ سب کچھ خوبصورت ہے۔ یہی زندگی ہے۔

"اپنے ڈیڈی کی شفقت یاد کرو' اپنی ممی کو یاد کرو!" اس کی آواز ابھری۔

"ممی۔ ماں۔ نہیں! یہ دھرتی میری ماں ہے۔ میں مادرِ وطن کا سپاہی ہوں۔ مجھے اپنے بے شمار عہد یاد آئے جو میں نے ارضِ وطن سے کیے تھے۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔ کچھ نہیں کیا' میں کچھ نہیں جانتا۔" میں نے بلند آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی مجھے مجاہدِ اول کی ہدایت یاد آئی۔ اگر کبھی پولیس کے ہتھے چڑھ جاؤ تو کسی بات کا اقرار نہ کرنا' ہر بات کو جھٹلانا' ہر بات سے انکار کرنا' اسی میں تمہاری جیت ہے اسی میں تمہارے بچنے کا امکان ہے۔ یہ الفاظ یاد آتے ہی میں نے اپنے اندر ایک اعتماد سا محسوس کیا۔ یہ لوگ معلومات حاصل کیے بغیر مجھے نہیں مار سکتے۔

"تم نے مجھے مجبور کر دیا ہے۔" اس زرد رو نے سرد لہجے میں کہا۔ "ہم تمہاری لاش پولیس کے حوالے کر دیں گے۔ ہماری رپورٹ یہ ہو گی کہ تم قانون سے فرار ہونے کی کوشش میں مارے گئے ہو۔"

"تم مجھ سے جھوٹی باتوں کا اعتراف کیوں کرانا چاہتے ہو؟" میں بولا۔ "میں سچ کہتا ہوں' ان معاملات سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ مجھے نہیں معلوم تم کن باتوں کے بارے میں پوچھ رہے ہو!"

"چلو ہم یہ بات مان لیتے ہیں۔ تم اسی لیے ان سب باتوں کو جھٹلا رہے ہو کہ تمہیں زندگی عزیز ہے۔ یہ زندگی تمہیں ان جرائم کا اعتراف کرنے کی صورت میں بھی مل سکتی ہے۔ سیکرٹری آف اسٹیٹس کا خط پڑھو!" اس نے میز پر بیٹھے ہوئے ایک شخص کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

دائیں جانب بیٹھے ہوئے شخص نے فائل کھول کر کاغذات الٹ پلٹ کیے اور پھر ایک کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر

پڑھنا شروع کی۔ اس خط کا لب لباب یہ تھا۔

ہز میجسٹی کی حکومت مسٹر ڈیسوزا کو یہ یقین دلاتی ہے کہ اگر ان کے بیٹے طارنوش نے اپنے جرائم کا اعتراف کر لیا جن کی نوعیت انتہائی گھناؤنی ہے تو مسٹر ڈیسوزا کی خدمات کے صلے میں حکومت ان کے بیٹے سے رحم کا سلوک کرے گی اور ان کے بیٹے کو حکومت کے باغیوں کے خلاف سرکاری گواہ بنا کر اس کی جان بخش دے گی۔

خط ختم ہو چکا تھا۔ "سنا تم نے۔" شکرے نما شخص نے میرے پاس آ کر کہا۔ "جرائم کا اعتراف کر دیا اپنے بہ قول غلط باتوں کا' دونوں صورتوں میں تم زندہ رہو گے۔ صرف اعتراف کر لو اور زندہ رہو۔" وہ پیچھے ہٹا۔ "ہم نے تمہاری جانب سے اعترافی بیان تیار کر لیا ہے۔" اس نے مڑ کر سادہ لباس والے سے کہا۔ "اقرار نامہ لاؤ۔"

سادہ لباس والا میز کی طرف بڑھا۔ کرخت چہرے والے نے سادہ لباس والے کو ایک اور فائل اٹھا کر دی۔ اس نے فائل میں سے ایک کاغذ نکالا اور اسے فائل پر رکھ کر میرے سامنے کر دیا۔

"پڑھ لو۔" شکرے نما انسان کی آواز ابھری۔

میں نے وہ بیان پڑھا۔ مختصر سے مضمون میں یہ ان تمام واقعات کا اعتراف تھا' میں جن میں شریک تھا۔ یہ مضمون میری زندگی کا پروانہ تھا' میری زندگی کا پیغام تھا' اس زندگی کا پیغام جو میر جعفر اور میر صادق کو ملی تھی۔ تاریخ میرا نام بھی انہی لوگوں کی فہرست میں رقم کرے گی۔ انکار کرتے رہو' اعتراف ہرگز نہ کرو' خواہ تم خود کو موت کی دہلیز پر کیوں نہ محسوس کرو! مجاہدِ اول کی آواز میرے کانوں میں گونجی۔ یہ بھی زندگی کا پیغام تھا' آبرومندانہ زندگی کا پیغام!

"اے خدا! مجھے حوصلہ عطا فرما!" میں نے دل ہی دل میں اپنے رب سے دعا کی' پھر بولا۔ "یہ سب جھوٹ ہے۔ میں اس پر دستخط نہیں کروں گا۔"

"کیا حماقت کر رہے ہو!" سادہ لباس والے نے سرگوشی کی۔

"بکواس مت کرو!" میں زور سے چیخا۔ "میں دستخط نہیں کروں گا۔"

شکرے جیسا شخص میز پر اپنی کرسی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ "آخری موقع دے رہا ہوں۔ میرے گنتی گننے سے قبل اقرار کر لو۔" خاموشی چھا گئی۔ میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔

میں خوف زدہ نہیں تھا مگر ٹھنڈا ٹھنڈا پسینا میرے جسم

سے چھوٹ رہا تھا۔ میں اس کیفیت کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ "گنتی گنو' الو کے پٹھو! گنتی گنو! میں اقرار نہیں کروں گا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم' نہیں میرا اس سے کوئی تعلق نہیں جو کچھ تم نے اس بیان میں لکھا ہے۔ گنتی گنو!" میں پوری قوت سے دہاڑا۔ اور گنتی شروع ہو گئی۔

"ایک!" اس نے کہا۔ ساتھ ہی دونوں سپاہیوں نے رائفلوں کے بٹ کاندھوں سے جما کر نال کے ساتھ اپنی آنکھیں لگا دیں۔ "اوہو' تمہارا تو چہرہ پسینے میں بھیگ گیا!"

"گنتی گنو! جلدی سے یہ سب ختم کرو اور گولی چلا دو۔" میں دیوانوں کی طرح چیخا۔

"دو!" اس کی سرد آواز ابھری۔ "حماقت نہ کرو اگر یہ سب کچھ جھوٹ ہے تو بھی تم کیوں اپنی جان گنواتے ہو؟"

"گنتی گنو!" میں پھر بولا۔ اب میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور کلمۂ طیبہ کا ورد کرنے لگا۔ میں اپنے وطن پر قربان ہو کر سرخرو ہونا چاہتا تھا۔

"تین!" وہی سرد آواز ابھری۔ "کوئی ذہین آدمی یوں خودکشی نہیں کرتا۔"

"تم ذلیل' کتے! میں نہیں جانتا کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ ختم کرو۔ گولی چلاؤ!" میں نے آنکھیں کھول کر کہا۔

"چار!" ہر قسم کے جذبات سے عاری اس کی سرد آواز ابھری۔ "اس کے بعد میں جو ہندسہ کہوں گا اس کے ساتھ ہی گولیاں چلیں گی پھر میں تمہیں کوئی مشورہ بھی نہیں دے سکوں گا۔"

"تیرے مشورے کی ایسی تیسی!" میں پاگلوں کی طرح چیخا اور آنکھیں بند کر لیں۔ "چلاؤ گولی!" دونوں سپاہیوں نے زور سے ایڑیاں بجائیں۔

میں سوچ رہا تھا کہ گولیاں چلنے کی آواز پہلے سنوں گا یا پہلے میرے گولی لگے گی؟ میں ان گولیوں کا منتظر تھا جو مجھے چھید کر اس دنیا سے میرا رابطہ ہمیشہ کے لیے ختم کرنے والی تھیں۔ اس وقت کسی کا خیال بھی میرے ذہن میں نہیں تھا' نہ ممی کا' نہ ڈیڈی کا نہ اسنی کا نہ فاطمہ کا خیال! میرا ذہن اس وقت قطعی خالی تھا۔

↓ ↓ ↓ ↓

"آخری بار اس دنیا کو دیکھ لو طارنوش کہ یہ دنیا بہت حسین اور خوب صورت ہے۔" شگرے نما شخص کی آواز ایک بار پھر سنائی دی "اب میں آخری ہندسہ کہنے والا ہوں۔ میں سمجھ چکا ہوں کہ تم خودکشی کرنا چاہتے ہو اور میں تمہیں یہ موقع۔۔۔" اس کی بات پوری نہ ہو سکی اور میز پر جو بلب جل رہا تھا' بجھ گیا۔

اسی لمحے میں نے ایک دھماکا سنا اور پھر ہر طرف سناٹا پھیل گیا' تاریکی اور سناٹا! اس کے بعد بھاگتے ہوئے قدموں کی آوازیں۔ معلوم نہیں وہاں کیا ہو رہا تھا۔ اسی تاریکی میں کوئی میری طرف دوڑتا ہوا آیا اور اس نے کرسی کی پشت سے میرے ہاتھ کھول دیے۔ میں کرسی سے اٹھنے ہی والا تھا کہ جیسے میرے سر پر قیامت ٹوٹ پڑی۔ میرا ذہن اردگرد پھیلے ہوئے اندھیرے کا حصہ بن گیا۔

آنکھ کھلی تو میں نے خود کو اسی فلیٹ میں پایا جہاں سے مجھے لے جایا گیا تھا۔ میں مسہری پر دراز تھا اور مسہری کے قریب بچھی ہوئی کرسی پر جوگیندر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے اپنے قریب بیٹھے دیکھ کر چند لمحوں کو حیرت ہوئی اور پھر میرا ذہن کڑیاں جوڑنے لگا۔

سی آئی اے والے مجھے اس فلیٹ سے اٹھا کر لے گئے تھے اور پھر مجھے مار ڈالنا چاہتے تھے۔ عین اس وقت میرے تنظیمی ساتھیوں نے مجھے بچا لیا۔ فوری طور پر میں اس کے سوا کچھ نہ سمجھ سکا لیکن میری دانست میں دوبارہ مجھے اسی فلیٹ میں لے آنا غلطی تھی۔ وہ فلیٹ سی آئی اے والوں کی نظر میں آ چکا تھا۔

ہوش میں آنے کے بعد سب سے پہلے یہی بات میری زبان پر آئی۔ میں نے آخر میں کہا "یہاں سے جلد از جلد کہیں چلو جوگیندر! ورنہ میرے ساتھ تم بھی خطرے میں پڑ جاؤ گے!" یہ کہتے ہی میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔

خلاف توقع جوگیندر کے چہرے پر مجھے اطمینان و سکون نظر آیا۔ وہ بولا "لیٹے رہو یار!۔۔۔ اور یہ بتاؤ کہ سر پر زیادہ چوٹ تو نہیں آئی۔ اندھیرے میں بخت خاں سے غلطی ہو گئی۔ وہ اس پر پشیمان ہے۔"

"کیا؟" میں نے حیرت سے کہا "تو کیا میرے سر پر کوئی بھاری چیز مارنے والا بخت خاں تھا؟"

"ہاں" جوگیندر نے اطمینان سے جواب دیا۔

"مگر کیوں؟"

"اس لیے کہ مجاہد اول کا حکم یہی تھا۔" اس نے بتایا' پھر کہنے لگا "میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتا ہوں' پھر آرام سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"

"لیکن تم پہلے میری بات تو سن لو کہ یہاں خطرہ۔۔۔"

"معلوم ہے مجھے۔" اس نے میری بات کاٹ دی پھر معنی خیز انداز میں مسکرا کر بولا "اب کوئی خطرہ وطرہ نہیں ہے۔" وہ کرسی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

جوگیندر کے اطمینان اور مسکرانے پر مجھے حیرت تھی۔ یا تو اسے حقائق کا علم نہیں تھا یا پھر وہ حد سے بڑھی ہوئی خود اعتمادی کا شکار تھا لیکن حقیقت کچھ اور ہی نکلی جس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب وہ چائے بنا کر لے آیا۔

مجھے چائے کی پیالی دیتے ہوئے اس نے مبارکباد دی "مبارک ہو شاہین کہ تم ایک ایسے امتحان میں کامیاب ہو گئے جس میں بڑے بڑوں کا پتا پانی ہو جاتا ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟ کیسا امتحان؟"

"چائے تو پیو ابھی بتاتا ہوں۔" اس نے چائے کی چسکی لی۔

پھر مجھے جوگیندر سے جو کچھ معلوم ہوا وہ میرے لیے انتہائی حیران کن تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ مجاہد اول کے ایما پر میرا ایسا کڑا امتحان لیا جائے گا۔ ہر امتحان میں کامیابی کسی ترقی کی دلیل ہوتی ہے اور اب وطن پرست تنظیم میں مجھے بھی ترقی مل چکی تھی۔ تنظیم کے جن افراد نے میرا یہ امتحان لیا تھا' انہوں نے گویا مجھے سو میں سے سو نمبر دیے تھے۔ مجاہد اول کے بعد تنظیم میں انہی تینوں کا درجہ تھا جنہوں نے سی آئی اے کے اعلیٰ افسران کا کردار ادا کیا تھا۔ انہیں اسی امتحان کی غرض سے مجاہد اول نے کراچی طلب کیا تھا۔ ان کا تعلق ملک کے مختلف گوشوں سے تھا۔ ان تینوں نے اتنی بھرپور اور مکمل اداکاری کی تھی کہ مجھے اس پر حقیقت کا گمان ہوا تھا۔ انہوں نے بالکل ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ جیسے واقعی مجھے گولی مارنے والے ہوں۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ اب انہی تینوں میں سے چوتھا میں تھا' یعنی مجاہد اول کے بعد تنظیم میں چوتھا درجہ مجھے حاصل ہو گیا تھا۔ اب میں وقت اور حالات کے مطابق خود ہر فیصلہ کرنے کا مجاز تھا۔ اس کے لیے مجھے مجاہد اول سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں تھی۔

میرے ہی امتحان کے ساتھ ساتھ جوگیندر' بخت خاں' فاطمہ اور ایولی کا بھی امتحان لیا گیا تھا۔ ابتدا میں انہیں صرف اتنا بتایا گیا تھا کہ میں سی آئی اے کی قید میں ہوں اور میری زندگی خطرے میں ہے۔ اس مقام کے سوا مجاہد اول نے انہیں کچھ نہیں بتایا تھا جہاں مجھ سے "پوچھ گچھ" کی جا رہی تھی۔ ہاں اس نے مجھے بے ہوش کرنے کی ہدایت ضرور دی تھی۔ ذرا غور کرنے پر اس ہدایت کی وجہ بھی میری سمجھ میں آ گئی۔ اس وقت میری ذہنی حالت حقیقتاً ایسی تھی کہ مجھ سے کوئی بھی غیر ذمے دارانہ حرکت سرزد ہو سکتی تھی۔

مجھے سی آئی اے والوں کی فرضی قید سے چھڑانے کا منصوبہ جوگیندر نے بنایا تھا۔ بخت خاں' فاطمہ اور ایولی نے اس کی معاونت کی تھی۔ میرے فلیٹ کے تالے کی چابی انہیں میری جیب ہی میں مل گئی تھی۔ فلیٹ کا پتا انہیں مجاہد اول ہی سے معلوم ہوا تھا۔ میری بے ہوشی کے دوران ہی میں مجاہد اول وہاں آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک ڈاکٹر بھی تھا جس کا تعلق تنظیم ہی سے تھا۔ ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنے کے بعد رپورٹ دی تھی کہ سر پر معمولی چوٹ آئی ہے۔ پھر وہ مجھے ایک انجکشن دے کر مجاہد اول کے حکم پر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اسی کے بعد مجاہد اول نے یہ انکشاف کیا تھا کہ ہم سب کا امتحان لیا گیا تھا اور ہم سبھی اس میں کامیاب رہے تھے۔ بخت خاں' فاطمہ اور ایولی کو وہ اپنے ساتھ ہی لے گیا تھا کہ انہیں سولجر بازار چھوڑ دے گا۔ جوگیندر کو وہ میری تیمارداری اور حقیقت حال سے آگاہ کرنے کی غرض سے وہیں چھوڑ گیا تھا۔ ان تمام باتوں کے باوجود مجاہد اول نے مجھے جو تین دن قید تنہائی کی سزا دی تھی' وہ اپنی جگہ برقرار تھی۔ ابھی مجھے کل کا دن بھی اسی فلیٹ میں گزارنا تھا۔ ویسے موجودہ حالات کے پیش نظر عملاً اب یہ قید تنہائی نہیں رہی تھی کیوں کہ جوگیندر بھی وہاں میری تیمارداری کے لیے موجود تھا۔ محبت میں آدمی خودغرض بھی ہو جاتا ہے۔ شاید اسی لیے مجھے فاطمہ کا خیال آ رہا تھا جو کبھی سیتا ہوا کرتی تھی اور جو جوگیندر کی بہن تھی۔ مجاہد اول کے ایما پر اب ہم سب اسے صرف فاطمہ کہنے لگے تھے۔ اس علاقے میں کوئی ایسی مصلحت ہمارے سامنے نہیں تھی کہ اسے سیتا کہا جاتا' ملتان کی بات اور تھی۔ وہاں اسے ہندو ہی ظاہر کرنا ضروری تھا تاکہ ہندوؤں کو اعتماد میں لیا جا سکے۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر جوگیندر کے بجائے اس کی بہن فاطمہ میری تیماردار ہوتی تو کتنا اچھا تھا! اس وقت مجھے یہ علم نہیں تھا کہ آیندہ روز میری یہی خواہش حقیقت بن جائے گی' فاطمہ عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر صبح ہی صبح وہاں پہنچ جائے گی۔ وہ رات اس نے آنکھوں میں کاٹی تھی۔ اس کی حسین آنکھوں میں گلابی ڈورے تیر رہے تھے۔ بخت خاں بھی اس

کے ساتھ آیا تھا جس نے مجھے مجاہد اوّل کا ایک پیغام دیا۔ بند سبز لفافہ بخت خاں نے میرے حوالے کردیا تھا۔ یہ لفافہ گزشتہ شب بہ وقت رخصت اسے مجاہد اوّل نے دیا تھا کہ آیندہ روز صبح مجھے پہنچا دیا جائے۔ بخت خاں مجھے وہی لفافہ دینے آرہا تھا کہ فاطمہ نے بھی اس کے ساتھ چلنے کو کہہ دیا۔

اس روز صبح ہم چاروں نے ایک ساتھ ناشتا کیا' ناشتا فاطمہ نے بنایا تھا۔ اسی دوران میں بخت خاں نے گزشتہ رات میرے سر پر ضرب لگانے کے سلسلے میں معذرت کی۔ اس نے کہا کہ دراصل اندھیرے کی وجہ سے مجبوراً مجھے ایسا کرنا پڑا۔

"کشتن سوزن کشتن" میں ہنس کر بولا "اگر ایسا نہ ہوتا تو میرے ہوش بہ ہوتے اور بستر پر بیٹھے ہوئے تکریر نہ چڑاتا۔"

"دیکھو اب تم اچھے بھلے ہوگئے ہو' یہ ڈرامے نہیں چلے گا۔" جوگیندر مسکرا کر بولا "دوپہر کا کھانا تم پکاؤ گے۔"

"بھیا! یہ زیادتی نہیں چلے گی۔" فاطمہ بول اٹھی "ابھی شاہین کو آرام کی ضرورت ہے۔"

"دیکھو مسکی' اگر تیرے کلیجے میں شاہین کے لیے زیادہ درد اٹھ رہا ہے تو پھر تو رک جا یہاں!" اس نے اپنی بہن سے کہا۔

"ہاں ہاں رک جاتی ہوں' تم بخت خاں کے ساتھ سولجر بازار سے" سیتا فوراً بولی۔

"یہ ٹھیک رہے گا۔" بخت خاں نے بھی ہنس کر تائید کی "آج فاطمہ کی پریڈ لگوائیے۔" یوں وہ دونوں ناشتا کرکے چلے گئے اور فاطمہ میرے پاس رہ گئی۔

میری زندگی کا وہ حسین ترین دن تھا۔ آج بھی اس دن کی یاد آتے ہی میرے ذہن میں چراغاں سا ہوجاتا ہے' لگتا ہے کہ جیسے سیاہ آسمان پر ستاروں کی محفل سج گئی ہو۔ جنات انتشر کردوں آسمان کی وسعتوں میں آوارہ و عریاں ہوگئی ہوں۔ جسے اکبر کے ستاروں نے چھپر کھٹ کے گرد لڑیاں پرودی ہوں' زمین سے آسمان تک کہکشاں نے نور پھیلا دیا ہو' سد سکندری سمٹ کر بحیثیت نور میں تبدیل ہوگئی ہو۔ اس روز میں نے اور فاطمہ نے کراچی کے خنک ماحول کی گرم گرم اور مشکی تنہائی میں بڑا خوش وقت گزارا۔ فاطمہ اس دن جیسے پاگل ہوگئی تھی۔ بخت خاں اور جوگیندر وہاں سے گئے تو وہ انہیں جاتے دیکھتی رہی پھر دروازہ بند کرکے واپس آئی تو اس کی سانس بے ترتیب تھی' فرش پر اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ وہ مدہوشی کی سی کیفیت میں ڈولتی ہوئی آئی اور میری آغوش میں سمٹ گئی۔ میں اسے اپنے وجود کا حصہ بنالینا چاہتا تھا تاکہ دوئی ختم ہوجائے۔ اس کی آنکھوں میں جگنو ستارے اتر آئے تھے' اس کے ہونٹوں پر وہ نمی پھوٹ آئی تھی جو گلاب کی پنکھڑی پر اوس کے لمس سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کا سارا وجود بے ترتیب سانسوں کی وجہ سے متموج تھا۔ میرا چہرہ اس کے چہرے پر جھکا تو اس نے ایک دل فریب مسکراہٹ کے ساتھ اپنی آنکھیں موند لیں اور اس کے لانبے لانبے بازو میری گردن کے گرد آگئے۔

کیسی مٹھاس تھی' کیف و مستی کا کیسا عالم تھا' کیسا نشہ تھا' جسموں سے پھوٹتی ذرہ کیسی مہکار تھی۔ اس حسن اور اس وارداتِ عشق کو لفظوں میں مقید نہیں کیا جاسکتا' جذبے اپنے آپ میں ایک زبان ہوتے ہیں اور یہ احساس کی زبان ہوتی ہے۔ لفظ انہیں بیان کرتے ہوئے مشکل اور بے جان ہوجاتے ہیں۔

فاطمہ کا یہ اضطراب اور بے چینی اس کے خوف کی علامت تھی۔ ہمیں کچھ علم نہیں تھا کہ نگاہ لیا آنے والا دن ہمارے لیے کیا پیغام لانے والا تھا۔ ہم سب محض موت میں زندہ تھے اور اس لیے زندہ تھے کہ آنے والی نسلیں غلامی کے طوق سے آزاد ہوجائیں۔ ہمارے سامنے ایک بڑا اور نیک مقصد تھا۔ ہم سبھی یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ ہر گزرنے والا دن ہمیں قیدوبند' صعوبتوں' اذیتوں' کالے پانی اور پھانسی سے قریب تر لے جارہا ہے۔ ہم کسی خوش فہمی کا شکار نہیں تھے۔ ہم صرف یہ جانتے تھے کہ اپنی ہر کارروائی سے اپنے لیے انگریزوں کے قانون کی گرفت کو زیادہ سخت کرتے چلے جارہے ہیں۔ اپنے لیے مفر اور بچاؤ کی ہر راہ ہم مسدود کرتے جارہے ہیں۔ میں نے فاطمہ کو آہستگی سے علیحدہ کرتے ہوئے پوچھا "ارے! یہ تمہاری آنکھوں میں آنسو کیوں آگئے؟"

پھر وہ بلک ہی تو پڑی۔ "ہاں میرے دیوتا!" اس نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا "میں ڈرتی ہوں' آنے والے وقت سے ڈرتی ہوں! میں۔ میں تمہارے لیے پریشان ہوں۔"

"پگلی!" میں نے کہا "ہمیں اس طرح ہراساں نہیں ہونا چاہیے۔ یہ سوچو فاطمہ کہ ہم اس راہ میں مارے بھی گئے تو کیا ہوا! آنے والے زمانے میں کوئی بھی شاہین سے اس کی فاطمہ کو نہیں چھین سکے گا۔"

مگر آج میں سوچتا ہوں' اس وقت میں نے کتنی احمقانہ بات کہی تھی وہ انسانی رشتے جنہیں مضبوط کرنے کے لیے اس دور میں ہر خطرے سے گزرنے کے لیے تیار رہتے تھے' وہ اقدار جن پر ہمیں یقین تھا' جو ہمارے لیے اس دور کی مشعل راہ تھیں' آزادی کے باوجود ہر گزرنے دن کے ساتھ غلامی کا دور ختم ہوجانے پر بھی کمزور سے کمزور تر ہوتی جائیں گی۔

اس روز دیر تک ہم اپنی جدوجہد کے حال اور مستقبل کے خطرات پر گفتگو کرتے رہے۔ اسی دوران میں کئی مرتبہ مدہوشی اور سرشاری کے جذبات بھی ہم پر غالب آئے اور ایسا اس وقت ہوا جب ہم تجزیہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچے کہ ہماری ناکامی یقینی ہے پھر فاطمہ میرے شانے سے سر ٹکا دیتی اور سسکتے ہوئے سانسوں کے درمیان اس کی سرگوشی ابھرتی "پھر کیا ہوگا شاہین؟ اگر۔ تم اگر نہ رہے تو۔ تو میں کیا کروں گی؟"

"تم اسی راہ پر آگے بڑھتی رہو گی۔"

"تمہارے بغیر تو میں کوئی محفوظ ترین سفر بھی نہیں کرسکتی شاہین!" وہ بولی "تمہارے بغیر میرے لیے اس دنیا میں کچھ بھی تو نہیں رکھا۔" میں نے اس سے وعدہ لینا چاہا کہ وہ میرے بغیر بھی جدوجہد کی راہ ترک نہیں کرے گی تو اس نے خوب صورتی سے بات کو ٹال دیا۔ جذبات و ہیجان کے دوسرے لمحے میں جب میں نے پھر اس سے وعدہ کرنے کا اصرار کیا تو اس نے نقرئی گھنٹیاں بجاتے ہوئے کہا "میرے دیوتا! تم سمجھتے ہوگے کہ میں پاگل ہوں۔ میں بتاؤں' مجھے نجانے کیوں یقین سا ہے کہ میں ایک نہ ایک دن اپنے دیوتا پر اپنی جان نچھاور کردوں گی اور اس اطمینان کے ساتھ مرجاؤں گی کہ میں نے اپنی زندگی کا مقصد پالیا ہے۔"

میں نے فاطمہ کے رخسار کو آہستہ سے تھپتھپایا "پگلی کہیں کی! ایسی باتیں نہیں کرتے۔"

اس نے اپنے رخسار پر میرا ہاتھ دباتے ہوئے کہا "شاہین! میں جو اتنی پاگل ہوجاتی ہوں' جانتے ہو اس کی کیا وجہ ہے؟" اس کی بڑی بڑی آنکھیں پھیل گئیں "اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ مجھے اپنے انجام کی خبر ہے' جانتی ہوں میں کہ ان کی موت میرا مقدر ہے۔ ہم کبھی ان خوب صورت لمحوں کی انتہا کو نہیں چھو سکیں گے۔ یہ لمحے' یہ خوب صورت سلگتے ہوئے یونہی ہمیشہ تشنہ رہیں گے۔ ان لمحوں کی تکمیل کبھی نہیں ہوگی' مگر۔ میں۔ میں چاہتی ہوں۔" وہ میرے اور بھی قریب آگئی "شاہین! میرے دیوتا! میں بکھر رہی ہوں' مجھے سمیٹ لو۔"

میٹھا میٹھا سا سرور آگیں درد میرے رگ و پے میں دوڑ گیا اور میں نے اسے سمیٹ لیا۔ اس لمحے مجھ میں اس قرب کا خیال تھا جو روح سے روح کو ملادیتا ہے۔ میرے اندر ایک دشت آباد تھا جس پر کوئی عمل کرے ستا۔

"میں چاہتی ہوں شاہین کہ بس اس عالم میں مجھے موت آجائے۔"

"تو تم وہ وعدہ نہیں کرو گی؟"

"ایک شرط پر کہ۔ کہ اگر میں تم پر نثار ہوگئی۔ اگر میں۔ میں تم سے پہلے مرگئی شاہین تو۔ تو تم کسی اور کو اپنا لینا۔ بولو شاہین' میری یہ شرط قبول ہے تمہیں؟" وہ میرے بازوؤں کے حلقے سے آزاد ہوگئی۔

"تم جانتی ہو فاطمہ کہ ہم۔ ہم اس وقت اتنے قریب ہوکر بھی ایک دوسرے سے اس قدر دور کیوں ہیں؟ جذبات کے تندو تیز دریا کے باوجود ہم دونوں' دو مخالف کناروں پر کیوں کھڑے ہیں؟ کون ہمیں اس دریا میں چھلانگ لگانے اور باہم ایک دوسرے میں جذب ہوجانے سے روک رہا ہے؟"

"میں جانتی ہوں شاہین!" فاطمہ نے کہا۔

"تمہارے بغیر میں اپنی زندگی کو نامکمل سمجھتا ہوں فاطمہ!" میں بولا "مجھے معلوم ہے کہ فاطمہ کا مکمل وجود میرے اور صرف میرے لیے ہے۔ اس وجود کے ہر انگ اور ہر رنگ کی ہر سرمستی صرف میرے لیے ہے میرا یہی یقین۔"

"اور میرے دیوتا!" فاطمہ نے میرے ہاتھ کی انگلیاں اپنی انگلیوں میں پھنساتے ہوئے کہا "میں بھی یہی سمجھتی ہوں شاہین! ہمارا یہی یقین تو ہے جو ہمیں جذبات کے تندو تیز دریا میں بہا کر نہیں لے جاتا۔ اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا تو شاید اب تک' اب تک ہم۔"

میں نے فاطمہ کو آگے کچھ نہ کہنے دیا اور اس یقین کے ساتھ کہ لذتِ وصل ہمارا مقدر نہیں ہے' اپنی روح کی تشنگی کو اور بڑھانے کے لیے اس کے لب و رخسار کی مدح کرنے لگا' یوں کہ کچھ اور کہنے کو نہ رہے' یہ کہتا وہ کہتا تھا کہ الفاظ کی ضرورت نہیں تھی۔ مایوسی کے اسی یقین کے بے تابانہ شدتوں کا جواب مجھے فاطمہ کی طرف سے بھی ملا۔

جسم و جاں کے تقاضے شدید تھے۔ اب مذاہب کا فرق بھی ہمارے درمیان سد راہ نہ تھا۔ ہم دونوں پوری شدتوں کے ساتھ ایک دوسرے کے طالب و مطلوب تھے مگر ایک مقدس عہد تھا جو ہمیں ان حدود میں داخل ہونے سے روک رہا تھا۔ یہ عہد تھا اس سرزمین سے جس کی آزادی کے لیے ہم سر سے کفن باندھ کر نکلے تھے۔ ہم نے اپنے لیے لذت وصل کو اس وقت تک کے لیے حرام کر رکھا تھا جب تک وطن آزادی سے ہم آغوش نہ ہو اور آزادی کی صبح بہت دور تھی۔

پھر بھی یہ مسرت کیا کم تھی کہ میں تھا' فاطمہ تھی اور

تنہائی تھی۔ بے پناہ مسرتوں کے ہجوم میں' مایوسیوں سے بوجھل آنکھوں میں نمی لیے ہم ایک دوسرے کو دیکھتے رہے اور پھر فاطمہ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک آئے۔ ترنم جیسی کے ساتھ وہ بلک اٹھی' جلترنگ جیسے رو دیا۔ میری آنکھوں میں بھی نمی تھی' میرے ہونٹوں پر بھی ہنسی تھی! غم آگیں مسرت سے چور اور نڈھال لمحے' جلترنگ کی غم زدہ دھن پر آہستہ آہستہ گزرتے رہے۔

○☆○

بخت خاں' مجاہد اول کا جو پیغام مجھے دے گیا تھا اس میں مجاہد اول نے لکھا تھا کہ وہ کراچی سے جا رہا ہے۔ اس کی اگلی منزل پنجاب کا ایک شہر راولپنڈی تھی۔ اس نے لکھا تھا کہ جب مجھے ضرورت محسوس ہوئی تمہیں پنجاب بلواؤں گا۔ سندھ میں اس نے مجھے اپنی نیابت سونپ دی تھی۔ دستے کا سالار بدستور جوگیندر ہی تھا مگر اب اسے میرے احکام کا پابند کر دیا گیا تھا۔ میرے لیے اب یہ ضروری نہیں تھا کہ اس کے ساتھ سندھ کے ان شہروں کا خود بھی رخ کرتا جہاں انگریز فسادات کی آگ بھڑکانا چاہتا تھا۔ یہ میری مرضی پر منحصر تھا کہ جوگیندر' بخت خاں' فاطمہ اور ایوبی کے ساتھ کراچی سے نہیں جاتا یا نہ جاتا۔ مجھ پر کوئی پابندی نہیں رہی تھی۔ ہمارے ہندوستان میں تنظیم کے جو اہم ارکان تھے' انہیں میری نئی حیثیت سے آگاہ کرنے کے لیے احکام جاری کر دیے گئے۔ فہرست کو بھی میں نے بہت غور سے پڑھا۔ یہ فہرست کراچی اور سندھ کے دوسرے شہروں میں سرگرم ارکان پر مشتمل تھی جن سے میں جب چاہتا رابطہ قائم کر سکتا۔ مجھے یہ پوری فہرست ذہن نشین کرنے کے بعد ضائع کرنا تھی۔

ایک روز فاطمہ میرے لیے رات کا کھانا تیار کرنے کے بعد جوگیندر کے ساتھ [illegible] بازار چلی گئی تو میں اس فہرست میں درج نام پتے یاد کرنے لگا۔ جوگیندر شام کو پانچ بجے [illegible] تھا۔ ہم لوگوں نے شام کی چائے ساتھ ہی پی تھی۔ میں نے جوگیندر سے کہہ رکھا تھا کہ [illegible] مجھے [illegible] کی ضرورت نہیں رہی۔

"مجاہد اول کی ہدایات کے مطابق ہمیں کل کس وقت یہاں سے [illegible] کے لیے روانہ ہونا ہے؟" جوگیندر نے [illegible] "کیا تم بھی ہمارے ساتھ چلو گے؟"

"اس کا جواب میں تم لوگوں کو کل صبح ہی دوں گا۔ مجھے سوچنے کے لیے کچھ وقت چاہیے۔ کل میں خود [illegible] بازار [illegible] گا۔ ایوبی سے کہہ دینا کہ وہ [illegible] موجود رہے۔"

اس رات کو میں دیر تک اپنی شخصیت کے الجھے ہوئے دھاگے سلجھاتا رہا تھا۔ مجاہد اول کی نیابت نے میری ذمے داریوں میں خاصا اضافہ کر دیا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کیا یہ بوجھ اٹھانا میرے بس میں ہے؟ دوسرا اہم سوال میرے لیے یہ تھا کہ اب بھی کیا میں فاطمہ سے اپنی اصل شخصیت چھپائے رہوں؟ فاطمہ نے اب تک اس سلسلے میں ایک لفظ بھی نہیں کہا تھا۔ وہ تو میرے عشق میں سراپا سپردگی تھی۔ اس نے تو مجھ سے اب تک میرا اصل نام بھی نہیں پوچھا تھا تو کیا میں یہ پردہ ابھی یونہی پڑا رہنے دوں؟ اسے یہ نہ بتاؤں کہ در اصل میں کون ہوں؟ کیا وہ یہ برداشت کر لے گی کہ جس کے عشق میں مبتلا ہے' اسے خود اپنی منزل کا علم نہیں؟ کیا فاطمہ یہ جاننے کے باوجود کہ میں صرف آدم زاد نہیں' کچھ اور بھی ہوں' دہشت زدہ نہیں ہو جائے گی؟ پھر جب اسے یہ معلوم ہوگا کہ میں اپنے باپ ہامون کا انتقام لینا چاہتا ہوں تو اس پر کیا رد عمل ہوگا؟ یہ اور ایسے ہی بہت سے سوالات اس رات دیر تک میری نیند اڑاتے رہے۔ پھر میں نے اپنے گرد پر اسرار اسنی کی خوشبو محسوس کی تو چونک اٹھا۔ وہ میرے بے قرار دل کو قرار دینے آگئی تھی۔

"ابھی اسے اپنے بارے میں کچھ نہ بتاؤ طارنوش!" میں نے اسنی کی آواز سنی "تم ٹھیک سوچ رہے ہو' وہ یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکے گی۔ پہلے ہی تم نے اسے اتنا اداس کیا ہے۔ میری جان' میرے چاند! میں تمہیں پہلے بھی سمجھا چکی ہوں کہ کامیابی یا ناکامی کی فکر چھوڑ دو! حرکت ہی زندگی ہے' نتیجہ اس ذات پر چھوڑ دو کہ جو ذات ہر ذات سے افضل ہے۔"

"اسنی! تم اگر مجھے یہ نہیں بتانا چاہتیں کہ ہماری جدوجہد کا انجام کیا ہوگا تو کم از کم اتنا تو بتا دو کہ فاطمہ ہمیشہ کے لیے میری ہو سکے گی یا نہیں؟"

"وہ تمہاری ہے اور تمہاری ہی رہے گی اور سنو کہ میں تمہیں ایک بات اور تعلیم کرنا چاہتی ہوں' وہ جو تم جانتے! اس کے بعد تمہیں یہ بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ تمہاری اسنی تمہیں کیا بتا سکتی ہے اور کیا نہیں! سنو کہ غیب کا علم اللہ کی ذات کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کل کیا ہوگا؟ کوئی نہیں جانتا اور جو یہ دعویٰ کرے وہ جھوٹا ہے' خواہ اس کا تعلق آدم زادوں سے ہو یا وہ میری طرح عالم جنات سے رکھتا ہو۔ بات صرف اتنی ہے کہ اللہ ہی کی مرضی اور منشا سے آدم زادوں اور جنات میں سے کچھ ایسے نیک بندے ہیں جن کو خود اللہ تعالیٰ نے کشف کے ذریعے یہ صلاحیت [illegible] رکھی ہے کہ وہ پیش گوئی کر سکیں ورنہ وہ اس کے بھی اہل نہ ہوتے۔ تم نے شاید قرآن حکیم کی سورۂ جن کا بہ غور مطالعہ نہیں کیا اور ان آیات کو بھی سمجھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جن کا ورد کرتے رہتے ہو۔ قرآن کو رک رک کر غور سے پڑھو اور سمجھو' اس کتاب میں تمہیں اپنے تمام سوالوں کے جواب مل جائیں گے۔ ان عربی کی کتابوں کو بھی اپنے حافظے میں تازہ کرو جو تم پڑھ چکے ہو۔" ان الفاظ کے ساتھ ہی اسنی کی خوشبو معدوم ہو گئی۔

اسنی چلی گئی اور میں سورۂ جن پر غور و فکر کرنے لگا۔ اس سورت میں جنوں کے قرآن سن کر جانے اور عالم جنات میں اسلام کی تبلیغ کرنے کا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اصحاب کے ساتھ بازار عکاظ تشریف لے جا رہے تھے راستے میں نخلہ کے مقام پر آپؐ نے صبح کی نماز پڑھائی' اس وقت جنوں کا ایک گروہ ادھر سے گزر رہا تھا تلاوت کی آواز سن کر وہ ٹھہر گیا اور غور سے قرآن سنتا رہا اس واقعے کا ذکر اس سورت میں کیا گیا ہے۔

عربی زبان کی تعلیم حاصل کرکے مجھے ایک بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ میں نے براہ راست عربی کی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اور سب سے بڑی کتاب قرآن کو سمجھنے میں مجھے دقت پیش نہیں آئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے عمدہ حافظہ ودیعت کیا تھا۔ سورۂ حجر' سورۂ صافات اور سورۂ ملک کی مختلف آیات میں بھی جنات کا ذکر یوں کیا گیا ہے کہ جن اگرچہ عالم بالا کی طرف پرواز کر سکتے ہیں مگر ایک حد سے آگے نہیں جا سکتے۔ اس سے اوپر جانے کی کوشش کریں تو اور ملاء اعلیٰ کی باتیں سننا چاہیں تو انہیں روک دیا جاتا ہے۔ چوری چھپے سن گن لیں تو شہاب ثاقب انہیں مار بھگاتے ہیں۔

اسنی نے مجھے سورۂ جن کی جو آیتیں ورد کرتے رہنے کے لیے تعلیم کی تھیں۔ ان آیات کا مفہوم یہ تھا۔

اور یہ کہ "ہم نے آسمان کو ٹٹولا تو دیکھا کہ وہ پہرے داروں سے پٹا پڑا ہے اور شہابوں کی بارش ہو رہی ہے۔" اور یہ کہ "پہلے ہم سن گن لینے کے لیے آسمان میں بیٹھنے کی جگہ پا لیتے تھے۔ مگر اب جو چوری چھپے سننے کی کوشش کرتا ہے وہ اپنے لیے گھات میں شہاب ثاقب لگا ہوا پاتا ہے۔"

مندرجہ بالا آیات کے علاوہ اسنی نے مجھے ورد کرنے کے لیے جو آیتیں بتائیں' ان کا مفہوم مندرجہ ذیل تھا۔

اور یہ کہ "ہم نے جب ہدایت کی تعلیم سنی تو ہم اس پر ایمان لے آئے۔ اب جو کوئی بھی اپنے رب پر ایمان لے آئے گا اسے کسی حق تلفی یا ظلم کا خوف نہ ہوگا۔"

"اور یہ کہ "ہم میں سے کچھ مسلم (اللہ کے اطاعت گزار) ہیں اور کچھ حق سے منحرف۔ تو جنہوں نے اسلام (اطاعت کا راستہ) اختیار کر لیا انہوں نے نجات کی راہ ڈھونڈ لی اور جو حق سے منحرف ہیں وہ جہنم کا ایندھن بننے والے ہیں۔"

اس رات میرے حافظے میں دو واقعات اور تازہ ہو گئے۔ یہ دونوں واقعات میں نے عربی ہی کی کتابوں میں پڑھے تھے اور ان کا تعلق بھی جنات سے تھا۔ ایک جگہ میں نے پڑھا تھا کہ حضور اکرمؐ کی بعثت کے وقت کسی جن نے جبل ابو قیس پر چڑھ کر یہ آواز دی اور اشعار پڑھے۔

برا کرے اللہ تعالیٰ رائے کعب بن فہر کا
یہ لوگ کتنے سبک عقل ہیں
بنی کعب کا دین ان کے آباء کرام کے حمایت کرنے والوں کا دین ہے'
وہ اس دین میں ملامت کیے جاتے ہیں
تمہارا ساتھ جنات دیں گے جس وقت تم پر حکم کیا جائے
اور وہ مرد تمہارا ساتھ دیں گے جو تحمل و اطام کے ہیں
قریب ہے تو سواروں کو دیکھے گا کہ وہ خرام کریں گے
ایسی حالت میں کہ قوم کے بڑے شہروں میں قتل کریں گے
کیا تم لوگوں میں ایسا کوئی کریم ہے کہ اس کا نفس آزاد ہے
اور اس کے ماں باپ اور چچا شریف ہیں
وہ کریم ایسی ضرب لگانے والا ہو کہ وہ عذاب خوشی ہو تختی اور غم سے

یہ اشعار شہر مکہ میں اس قدر مقبول ہوئے کہ ایک ایک مشرک کی زبان پر تھے۔ کفار ان کا مضمون سن کر بہت خوش ہوئے اور مسلمانوں سے کہنے لگے' دیکھو تمہارے قتل اور شہر بدر ہونے کا حکم غیب سے ہوا ہے۔ اس پر مسلمانوں کو بہت رنج ہوا۔ اس سلسلے میں حضورؐ سے کہا گیا۔ آپؐ نے فرمایا' یہ شیطان مسعر تھا۔ اللہ تعالیٰ عنقریب اسے سزا دے گا۔

اس کے تیسرے ہی روز ایک زور آور جن مسلمان ہو گیا۔ اس کا نام سمج تھا۔ حضور اکرمؐ نے اس کا نام تبدیل کرکے عبداللہ رکھا۔ عبداللہ نے مسعر کو قتل کرنے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے اجازت عطا فرما دی۔ پھر حضورؐ نے اپنے صحابہؓ سے فرمایا "مسعر آج قتل ہو جائے گا۔"

مسلمان بہت خوش ہوئے۔ اسی روز شام کے وقت پہاڑ سے ایک سخت آواز بلند ہوئی "ہم نے مسعر شیطان کو قتل کر ڈالا ہے۔ جبکہ اس نے سرکشی اور تکبر کیا۔ مسعر شیطان نے

حق کو سبک سمجھا اور امرِ حق کو سخت ٹھہرایا۔ میں نے اس کا قلع قمع اس تلوار سے بنایا جو بنیادِ ہستی کو کھودنے والی اور قاطع ہے۔ اس شیطان کو میں نے اس لیے قتل کیا کہ اس نے ہمارے نبی مطہرؐ کو برا کہا۔"

دوسرا واقعہ جو مجھے یاد آیا وہ یہ تھا کہ جندلؓ بن نضلہ' حضورِ اکرمؐ کے پاس تشریف لائے۔ یہ واقعہ ان کے ایمان لانے کا ہے۔ انہوں نے حضورؐ سے کہا کہ میرا ایک دوست جنات میں سے تھا' وہ یکایک میرے پاس آیا اور کہا "اٹھ تحقیق کہ دین کا سراج روشن ہوا ایسے پیغمبرؐ کے سبب جو صادق' مہذب اور امانت دار ہے۔ سوالیں اونٹنی پر کوچ کر جو نجات دینے والی ہے اور خلقت میں مضبوط ہے' وہ نرم زمین اور سخت دونوں پر چلتی ہے۔" یہ اشعار سن کر میں نے پوچھا' کیا واقعہ ہے تو اس نے جواب دیا "قسم ہے زمین کو مسطح کرنے والے کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمام روئے زمین پر مبعوث کیے گئے ہیں۔ محمدؐ نے مکہ مکرمہ میں نشوونما پائی ہے اور طیبہ کی طرف ہجرت کی ہے۔" یہ سنتے ہی میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کے لیے روانہ ہو گیا۔ راستے میں یہ بھی آواز میرے کان میں آئی "اے وہ شترسوار جو اپنی اونٹنی کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف لے جانے والا ہے' تحقیق تو نے ہدایت کی توفیق پائی۔"

سورۂ جن اور ان دونوں واقعات پر غور و فکر کرنے سے مجھ پر جو عقدہ کھلا وہ یہ تھا کہ حضورؐ سرورِ کائنات کی بعثت سے قبل جنات آسمانوں کے راز زمین والوں پر ظاہر کر دیتے تھے (آسمانوں سے یہاں مراد فاصلے ہیں) سو انہیں ایسا کرنے سے روک دیا گیا کیوں کہ وہ کچھ باتیں اپنی طرف سے بھی گھڑ کر بتا دیتے تھے۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ جنات نے بھی حضورؐ کے ہاتھ پر بیعت کی اور ایمان لائے۔ اس کے علاوہ میں نے یہ جانا کہ شیاطین' جنات ہی میں سے ہوتے ہیں' ان سے الگ کوئی مخلوق نہیں اور یہ کہ عزازیل جو ابلیس کہلایا ان کافروں کا سربراہ ہے۔ مسعر جن کو حضورِ اکرم نے شیطان کہا اور پھر وہ ایک جن ہی کے ہاتھوں حضورؐ کی پیش گوئی کے مطابق قتل ہوا' اس جن کے ہاتھوں جو ایمان لا چکا تھا۔

جندلؓ بن نضلہ کے ایمان لانے کے واقعے سے مجھ پر یہ کھلا کہ جنات راہِ راست کی طرف انسانوں کی رہنمائی بھی کرتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسا من جانب اللہ ہی ہے۔ خلاصہ کلام یہ کہ اگر اللہ اپنے کسی نیک بندے کو چاہے تو کشف کے ذریعے پیش گوئی کا اہل بنا سکتا ہے اور نہ چاہے تو بندہ درست پیش گوئی کرنے کا اہل نہیں ہو سکتا کیوں کہ عالم الغیب صرف خدائے بزرگ و برتر کی ذات پاک ہے۔

اسیٰ سے میں نے جو سوال کیا تھا' مجھے اس کا جواب مل گیا تھا' بے شک قرآنِ حکیم انسان کے ذہن میں پیدا ہونے والے ہر سوال کا جواب دیتا ہے' شرط صرف اس کتاب کو سمجھنے کی ہے۔

وہ شب میرے لیے بڑی مبارک شب تھی کہ اس شب مجھ پر آگہی کے کچھ نئے در کھلے۔

بچپن سے اب تک کے مطالعے اور غور و فکر سے میں نے عالمِ ارواح اور عالمِ جنات کی بابت جو کچھ جانا اور سمجھا تھا' مختصراً اسے یوں بیان کر سکتا ہوں کہ میری سرگزشت پڑھنے والا ہر شخص بہ آسانی ہر بات سمجھ سکے۔

قصہ یہ تھا کہ کائنات کے اس ٹکڑے پر جسے ہم زمین کہتے ہیں یہاں آدم علیہ السلام سے پہلے جنات آباد تھے۔ اس وقت تک اللہ تعالیٰ نے فرشتوں اور جنات ہی کو خلق کیا تھا جن کہ جس کی جمع جنات ہے' ان میں اصلاحِ حال کی خاطر پیغمبر بھی اتارے جاتے رہے اور ان پر سرکشی کی وجہ سے عذاب بھی کیے جاتے رہے۔ پھر جب قادرِ مطلق نے آدم علیہ السلام کو خلق کیا تو جنات ہی کی نسل میں سے ایک جن عزازیل نے نافرمانی کی اور معتوب ہوا۔ وہ زمین کی خلافت کا دعویدار تھا۔ زمین کیوں کہ جنات ہی کا گھر تھی اس لیے انہیں اس پر آدم علیہ السلام اور ان کی نسل کا بسایا جانا اچھا نہ لگا۔ وہ جنات جو صاحبِ ایمان تھے انہوں نے اللہ کے فیصلے کو قبول کر لیا اور وہ جو عزازیل کے بہکانے میں آ گئے انہوں نے سرکشی اختیار کر لی اور آدم زادوں سے عداوت رکھنے لگے۔

تخلیقِ آدم کے بعد جنات میں پیغمبر اتارے جانے بند کر دیے گئے۔ نسلِ آدم میں جو پیغمبر آتے رہے' ان جنات کو بھی انہی کی پیروی کا حکم دیا گیا۔ سو یوں آدم زادوں ہی کی طرح جنات میں بھی مختلف مذاہب عام ہوئے۔ کفر و الحاد جنات میں بھی اسی طرح در آیا جس طرح آدم زادوں میں پھولا پھلا۔

عیسیٰؑ کی بعثت سے پہلے جنات آسمانوں پر آیا جایا کرتے تھے۔ فرشتوں سے بھی ان کا میل جول تھا۔ عیسیٰؑ کی بعثت پر جنات کو پہلے آسمان سے اوپر جانے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کے باوجود جنات پہلے آسمان پر فرشتوں کے درمیان ہونے والی گفتگو سن لیتے تھے اور کاہنوں کو غیب کی باتیں بتا دیا کرتے تھے۔ ان باتوں میں کچھ اپنی طرف سے بھی اضافہ کر دیتے تھے۔ حضور سرورِ عالم کی بعثت کے بعد جنات کو آسمانوں پر جانے کی قطعی ممانعت ہو گئی۔ ان کے لیے یہ انتظام کر دیا گیا کہ اگر کوئی جن آسمان پر جانے کی کوشش کرے تو اسے ستاروں کی آگ کے شعلوں سے بھگا دیا جائے۔

میں نے سیرتِ طیبہ میں پڑھا تھا کہ جب اللہ تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مبعوث فرمانے کا ارادہ کیا تو آپؐ کی پیدائش سے پہلے کثرت کے ساتھ ستارے ٹوٹنے لگے۔ عرب اس حالت کو دیکھ کر گھبرائے اور ایک بڑے کاہن کے پاس گئے۔ یہ کاہن آنے والے واقعات کی پیش گوئی کیا کرتا تھا۔ کاہن نے کہا "اگر برج ٹوٹ رہے ہیں تو سمجھ لو دنیا کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے ورنہ دنیا میں کوئی عظیم الشان واقعہ پیش آنے والا ہے۔ آنحضرت کی بعثت اس زمانے کا عظیم ترین واقعہ ہے۔

چونکہ عرب میں کہانت کا زور تھا اس لیے وحی الٰہی کو جنات سے بچانے کے لیے آسمانوں پر ان کی آمد بند کر دی گئی اور احتیاط کے طور پر یہ انتظام کر دیا گیا کہ جنات میں سے جو سرکش آسمانوں پر آنے یا آسمانوں کی بات سننے کی کوشش کرے اسے آگ کے شعلے مار مار کر بھگا دیا جائے۔

اللہ تعالیٰ کے اس انتظام سے جہاں وحی الٰہی کی عصمت محفوظ ہو گئی۔ وہیں عرب سے کہانت کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا۔

آنحضرتؐ سے کاہنوں کے متعلق ایک بار سوال کیا گیا تو فرمایا ان لوگوں کا کوئی اعتبار نہیں۔ صحابۂ کرامؓ نے عرض کیا یا رسول اللہؐ! یہ لوگ بعض وقت ایسی باتیں کر جاتے ہیں جو سچی ہوتی ہیں۔ ارشاد ہوا' جنات کوئی کوئی بات فرشتوں سے سن کر کاہنوں کے کانوں میں ڈال دیتے ہیں اور اپنی طرف سے بھی ایسی باتیں غلط سلط کر دیتے ہیں جو بالکل جھوٹی ہوتی ہیں۔

لغتِ عرب میں کاہن کا مطلب جادوگر' شگون لینے والا' جانوروں کی آواز سے غیب کی باتیں بتانے والا اور پیش گوئیاں کرنے والا ہے۔

بچپن سے اب تک اسیٰ بھی مجھ سے پیش گوئیاں کرتی آئی تھی مگر یہ پیش گوئیاں' کہانت کے باب میں نہیں آتی تھیں۔ ان میں مرضیِ الٰہی شامل تھی' ان کا مقصد مجھے نیک راہ پر لانا تھا' مجھ پر میرے اصل وجود کا انکشاف کرنا تھا' مجھے کفر و الحاد کی طرف جانے سے روکنا تھا' مجھے یہ بتانا تھا کہ میرا وجود ایک جن اور ایک آدم زادی کے ملاپ کا نتیجہ ہے۔ اسی کے سبب عالمِ جنات میں سے کچھ میرے دشمن ہیں وہی جو میرے باپ باسوس کے دشمن تھے۔

ابھی میری جنگ عالمِ معلوم تک محدود تھی۔ میں شیطان صفت انگریزوں کے خلاف برسرِپیکار تھا۔ عالمِ جنات ابھی تک میرے لیے راز ہی تھا اور میں اس عالمِ نامعلوم کے متعلق قطعی بے خبر تھا کہ کب اور کیسے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہو سکوں گا! اسیٰ کے خیال میں ابھی میں اس قابل نہیں ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ فی الحال میری تمام تر توجہ زمین پر فتنہ و فساد بونے والے ایک شیطان کی طرف تھی اور یہ شیطانِ مجسم وہ انگریز تھا جو ارضِ ہند پر سازشوں کے جال بن رہا تھا' اپنوں ہی کے ہاتھوں اپنوں کے گلے کٹوا رہا تھا' صرف اس لیے کہ اس کے اقتدار کا سورج یونہی چمکتا رہے' وہ دونوں ہاتھوں سے ہندوستان کو لوٹتا رہے' ہندوستان کی دولت بٹور کر انگلستان لے جاتا رہے!

ہندوستان کے باسیوں کو آپس میں لڑوانے اور ان پر حکومت کرنے کے لیے انگریز نے جو حکمتِ عملی اختیار کی تھی' وہ میرے خیال میں بہت خطرناک تھی۔ یہ حکمتِ عملی اس نے بہت سوچ سمجھ کر ترتیب دی تھی۔ اس نے ہندو ذہنیت کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو آپس میں لڑوانا اس کے لیے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ مجاہدِ اول نے اس کا جو توڑ سوچا میرے نزدیک اسے محض تاریخی جبر کی حیثیت حاصل تھی۔ اس وقت ہندو مسلم اتحاد کے سوا اور کوئی راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ اس اتحاد کے بعد ہی ہماری جنگ کا اصل رخ انگریز کی طرف مڑ سکتا تھا۔

ملتان میں جو واقعات پیش آئے اور تمام تر کوششوں کے باوجود ہمیں جس طرح اپنے مقصد میں ناکامی ہوئی' اس سے میں نے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وادیِ سندھ میں بھی ہماری کامیابی کے امکانات نہ ہونے کے برابر تھے۔ لالچی ہندو یہاں بھی ہمارے آڑے آتا۔ اس کے باوجود ہم برسرِپیکار تھے۔ جنگ کا یہ رخ اپنے دفاع کا تھا۔ ہم اپنا دفاع کر رہے تھے مگر میرا ذاتی خیال یہ تھا کہ ہمیں اپنے دفاع کے ساتھ ساتھ حملہ بھی کرنا چاہیے تھا' براہِ راست حملہ! اس طرح دشمن کی توجہ دو طرف بانٹی جا سکتی تھی۔ یوں دشمن اپنا دفاع کرنے پر مجبور ہو جاتا۔

اس وقت میں سندھ میں تھا اور سندھ کے سیاسی حالات ہی میرے پیشِ نظر تھے۔ سندھ میں بھی شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ انگریز ان تحریکوں کی پشت پناہی کر رہا تھا۔ ان حالات و واقعات کے سبب سندھی مسلمانوں کے دل میں ہندوؤں کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک رہی تھی۔ دونوں کے سوچنے سمجھنے کا انداز الگ ہو گیا تھا۔ انہی دنوں پنجاب میں خاکسار اور احرار تحریکیں شروع ہوئیں۔ سندھ کے مسلمان بھی ان تحریکوں میں بڑے جوش و

خروش سے حصہ لے رہے تھے۔

اس دور میں مسلمانوں کے اخبارات "الوحید" ستارۂ سندھ اور سندھ زمیندار' مسلمانوں کا نقطۂ نظر واضح انداز میں ظاہر کررہے تھے۔ یہ اخبارات سندھ میں مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ کررہے تھے۔ اس زمانے کے ہندو اخبارات ہندو' سنسار سماچار' ہندو گزٹ' سندھی اور بھارت اپنے قلم کا زور مسلم دشمنی پر صرف کررہے تھے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کرچکا ہوں کہ اس زمانے میں سندھ الگ صوبہ نہیں تھا۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کا زیادہ نقصان ہورہا تھا۔ مسلمان ۱۹۰۸ء سے سندھ کو الگ صوبہ بنانے کی جدوجہد کررہے تھے۔ شروع میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا تھا لیکن بعد میں مخالفت شروع کردی تھی۔ اس مخالفت کی وجہ یہ تھی کہ ان کے خیال میں اس طرح اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آجاتا۔

۱۹۲۲ء کے بعد سندھ میں جو کچھ ہوا ضمناً اور اختصار کے ساتھ یہاں میں وہ بھی بیان کردوں تو اس وقت جو صورتِ حال تھی اسے سمجھنے میں آسانی ہوگی۔ سندھ کے باب میں سب سے اہم واقعہ چودہ سال بعد یعنی ۱۹۳۶ء میں ہوا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ صوبہ بنایا گیا۔ اسی سال کے آخر میں الیکشن کی سرگرمیاں شروع ہوگئیں۔ الیکشن کے لیے تین پارٹیاں بنیں۔ سرشاہنواز بھٹو اور ان کے دوستوں نے "یونائیٹڈ پارٹی"' سرغلام حسین نے "سندھ مسلم پولیٹیکل پارٹی" اور شیخ عبدالمجید سندھی نے "سندھ آزاد پارٹی" بنائی۔

۷ فروری ۱۹۳۷ء کو الیکشن ہوا اور یونائیٹڈ پارٹی نے ۲۲' پولیٹیکل پارٹی نے ۵ اور آزاد پارٹی نے ۳ نشستیں حاصل کیں۔ یونائیٹڈ پارٹی کے لیڈر سرشاہنواز بھٹو اور ڈپٹی لیڈر سرعبداللہ ہارون کامیاب نہیں ہوسکے۔ اس پارٹی کے دوسرے ڈپٹی لیڈر خان بہادر اللہ بخش سومرو کامیاب ہوگئے۔ جمہوریت کے اصول کے مطابق گورنر کو لازم تھا کہ وہ خان بہادر اللہ بخش سومرو سے وزارت بنانے کے لیے کہتا۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ جمہوریت کے اصولوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے سرغلام حسین کو وزارت بنانے کے لیے کہا گیا۔ گورنر کے اسی اقدام نے سندھ میں خانہ جنگی کی بنیاد ڈالی۔ اللہ بخش سومرو بڑے ذہین اور ہوشیار سیاست داں تھے۔ انہی کی سیاسی چالوں کے سبب آخر مارچ ۱۹۳۸ء میں سر غلام حسین کی وزارت ختم ہوئی اور اللہ بخش سومرو نے وزارت بنائی۔ اللہ بخش سومرو اتنے شاطر سیاست داں تھے کہ سندھ کے دوسرے تمام سیاست داں مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کرسکتے تھے۔ وہ اللہ بخش سومرو کی سیاسی دانش مندی سے مرعوب تھے۔ آخر انہوں نے سومرو کا مقابلہ کرنے کے لیے سندھ میں مسلم لیگ کی شاخ بنانے کا فیصلہ کیا۔ شیخ عبدالمجید سندھی بمبئی تشریف لے گئے اور قائدِ اعظم سے ملاقات کی۔ قائدِ اعظم سے وہ سندھ میں مسلم لیگ کی شاخ قائم کرنے کی اجازت لے آئے۔ یوں مئی ۱۹۳۸ء میں سندھ پراونشل مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور پھر جلد ہی سندھ کے مختلف شہروں میں مسلم لیگ کی برانچیں قائم کردی گئیں۔ سندھ میں مسلم لیگ کے جلسے ہونے لگے۔ اس کے لیے آغا غلام نبی اور شیخ عبدالمجید سندھی نے بہت کوششیں کیں۔ اکتوبر کی دس تاریخ سے بارہ تاریخ تک کراچی میں مسلم لیگ کی بہت بڑی کانفرنس ہوئی جو کراچی کانفرنس کے نام سے مشہور ہے۔ اس کانفرنس میں شیخ عبدالمجید سندھی نے ایک قرارداد پیش کی جس میں واضح طور پر مطالبہ کیا کہ جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں مسلمانوں کی الگ حکومت بنائی جائے۔ تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں یہ قرارداد لاہور ریزولیشن سے ڈیڑھ سال پہلے پیش ہوئی اور اس میں پاکستان کے لیے واضح مطالبہ موجود تھا۔

۷ نومبر ۱۹۳۸ء کو سندھ مسلم لیگ کا باقاعدہ الیکشن ہوا اور سرعبداللہ ہارون اس کے باقاعدہ صدر ہوئے۔ اس کے بعد مسلم لیگ اور کانگریس میں اختلافات بڑھتے گئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں شدید کشیدگی پیدا ہوگئی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی بدنیتی کا اندازہ لگا کر اپنی تنظیم شروع کردی۔ ہندو مسلم فسادات بھی ہونے لگے۔ ۱۹۳۹ء میں سب سے بڑا واقعہ ہوا۔ اس واقعے کا سبب سکھر کی مسجد منزل گاہ تھی۔ سول نافرمانی شروع ہوئی اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان سندھ کے کونے کونے سے سکھر پہنچ گئے۔ انہوں نے منزل گاہ پر قبضہ کرلیا۔ حکومتِ وقت نے انہیں زبردستی وہاں سے ہٹا کر شہر سے کئی میل دور پھینکنا شروع کیا لیکن سکھر میں مسلمانوں کی آمد بہ دستور جاری تھی اسی لیے حکومت کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ نتیجے کے طور پر لاٹھی چارج ہوا اور آنسو گیس استعمال کی گئی جس سے متعدد مسلمان زخمی ہوئے۔ لیڈروں اور ہزاروں مسلمانوں کو جیلوں میں ڈال دیا گیا۔ جیل جانے کے لیے اتنے لوگ تیار تھے کہ حکومت بوکھلا گئی۔ مسجد منزل گاہ پر ہندو اپنا قبضہ جمانے کی کوشش کررہے تھے' حکومت کو مسلمانوں کے سامنے جھکنا پڑا اور مسجد مسلمانوں کی تحویل میں دے دی گئی۔

مندرجہ بالا سیاسی پس منظر سے قطع نظر ۱۹۲۲ء میں سندھ کی صورتِ حال کچھ اور ہی تھی۔ سندھ میں خلافت تحریک عروج پر تھی اور اس کا اثر شعر و ادب پر بھی پڑ رہا تھا۔ شعراء غازیوں کے حق میں شعر کہہ رہے تھے۔ ان کی شاعری سے انگریز کے لیے نفرت اور حقارت کا اظہار ہورہا تھا۔ اس ضمن میں مولانا تاج محمود امروٹی' حبیب اللہ خادم شکارپوری' محمد آدم' محمد ہاشم مخلص' نور محمد نظامانی اور حکیم فتح محمد سیوہانی قابلِ ذکر ہیں۔ گڑھی یاسین کے محمد آدم نے اپنے شعروں میں یونانیوں کے لیے یوں بددعا کی "اے خدا! ظالموں میں تباہی مچادے' صلیبیوں کو سرنگوں کر' یونانیوں کو سمندر میں غرق کردے اور ان پر قہر نازل فرما۔" (محمد آدم ۱۸۶۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۸ء میں وفات پائی) مولانا تاج محمود امروٹی غازیوں کی کامیابی کے لیے یہ دعا کررہے تھے "میرے پروردگار! مصطفیٰ' احرار کو کامل نصرت عطا فرما' غازیوں کی مدد فرما کہ ان کی فتح و نصرت کی شہرت ہوجائے (مولانا کی وفات ۱۹۲۹ء میں ہوئی' سن پیدائش ۱۸۴۴ء ہے) شکارپور کے حبیب اللہ خادم کہہ رہے تھے۔ "اللہ تبارک تعالیٰ جلد ہی ہمیں کامیاب کرے گا اور ظالم انگریز حکومت کا خاتمہ ہوجائے گا۔ ملک ہمیشہ شاداب ہو اور اس کا پرچم دیکھ کر دشمنوں میں لرزہ پیدا ہوجائے۔ صلیبی ہر جگہ سرنگوں رہیں۔"

میرپور خاص کے محمد ہاشم مخلص نے تو نظم و نثر کے ذریعے سارے سندھ میں آگ سی لگا رکھی تھی۔ حریت کا جذبہ اس سندھی شاعر کی نس نس میں سمایا ہوا تھا۔ برطانوی سامراج کے خلاف کھلم کھلا نفرت کا اظہار مخلص کی شاعری کا نمایاں پہلو تھا۔ نور محمد نظامانی اپنی صحافیانہ صلاحیتیں آریہ سماجی ہندوؤں کی شرارتوں کے خلاف استعمال کررہے تھے۔

زمینداروں اور پیروں وڈیروں کے خلاف بھی کئی صحافی اور شاعر اپنے قلم کا زور صرف کررہے تھے "توحید" میں خاص طور پر پیروں کے خلاف میں نے مضامین دیکھے۔ ان مضامین میں یہ ظاہر کیا جاتا کہ اکثر پیر جاہل اور مکار ہیں' یہ عوام کا خون چوستے ہیں۔ اسی کے ساتھ ان مضامین میں یہ بھی بیان کیا جاتا کہ ان کی حرکتیں اور عوام کے توہمات اسلامی تعلیم کے خلاف ہیں "الوحید" میں زمینداروں کے مظالم اور سرکار پرست ذہنیت کے متعلق مضامین چھپ رہے تھے۔

اخبار "مسلمان" پیروں' زمینداروں اور راشی ملازموں کے خلاف سب سے زیادہ مؤثر انداز میں لکھ رہا تھا۔ ہاری تحریک بھی زوروں پر تھی۔ لکھنے والے ہاری کی بے بسی' ناداری' بے کسی اور زمینداروں کے ظلم کو اپنا موضوع بنا رہے تھے۔ ان میں حیدر بخش جتوئی' کشن چند بیوس اور محمد ہاشم مخلص نمایاں تھے۔

مجاہدِ اوّل نے مصلحتِ وقت کے پیشِ نظر ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنے کے لیے جس جدوجہد کا آغاز کیا' سندھ میں صوفی تحریک اس کے لیے بڑی معاون ثابت ہوسکتی تھی۔ روحل فقیر کی درگاہ واقع کنڈڑی' سچل سرمست کی درگاہ واقع جھوک میران پور' قادر بخش بیدل کی درگاہ واقع روہڑی' ان تمام ہی مقامات پر ان دنوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ میلے ہوتے تھے۔ متعدد ہندو' مسلمان بزرگوں کے مرید ہورہے تھے۔ شاہ' سچل' بیدل' بیکس اور روحل فقیر کی شاعری ہندو مسلم ملاپ کا ذریعہ بنی ہوئی تھی۔ سچل سرمست کی درگاہ کے سجادہ نشین تخی قبول محمد بڑی پُرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ ہندو بھی ان کے بڑے عقیدت مند تھے اور ان کے پاس کھنچ کر آتے تھے۔ غیر متعصب ہندوؤں نے بھی ضلع لاڑکانہ کے ایک گاؤں طیب میں اکبر آشرم قائم کیا تھا۔ اس کا مقصد تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب لایا جائے' نفاق دور کیا جائے اور ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی کی جائے۔

اس رات میں نے سندھ میں وطن پرست تنظیم کے لیے یہی لائحہ عمل طے کیا کہ اس کے ارکان صوفیاء کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کے لیے سرگرمِ عمل ہوجائیں۔ خود میں نے کراچی ہی میں رہنے کا فیصلہ کیا تھا' یہ سوچ کر کہ کیا خبر مجاہدِ اوّل کب مجھے پنجاب بلوالے۔ فاطمہ کی وجہ سے مجھے یہ فیصلہ کرتے ہوئے کچھ دقت تو ہوئی کہ اس طرح وہ مجھ سے جدا ہوجاتی مگر میں ذاتی مفاد پر اجتماعی مفاد کو ترجیح دے رہا تھا۔ صبح جب میں بخت خان' جوگیندر' ایوبی اور فاطمہ سے سولجر بازار میں جاکر ملا تو میں نے انہیں اپنا فیصلہ سنادیا۔ فاطمہ میرے اس فیصلے پر سب سے زیادہ حیران تھی کہ میں کراچی ہی میں رکوں گا جو چار رکنی دستہ اندرونِ سندھ روانہ ہورہا تھا' اس کا سربراہ بہ دستور جوگیندر ہی تھا۔

کراچی سے انہیں پہلے میرپور خاص ہی جانا تھا اور وہاں پہنچ کر محمد ہاشم مخلص سے ملنا تھا۔ مخلص کا [illegible] بھی ہماری وطن پرست خفیہ تنظیم ہی سے تھا۔ اس کا نام میں نے اس فہرست میں دیکھا تھا جو مجھے مجاہدِ اوّل نے فراہم کی تھی۔ وہ فہرست میں نے صبح ہوتے ہی نذرِ آتش کردی تھی۔ میرپور خاص کے علاوہ سکھر اور حیدر آباد میں ہماری تنظیم کے جو اہم ارکان تھے' ان کے نام پتے بھی میں نے جوگیندر کو

بتادیے۔ اس چار رکنی دستے کو پہلے میرپور خاص، پھر سکھر اور حیدر آباد جانا تھا۔ خود مجاہدِ اوّل بھی اس سلسلے میں جوگیندر کو بریف کر چکا تھا کہ اسے اندرونِ سندھ کیا طریقۂ کار اختیار کرنا ہے نئی ہدایات اسے میری طرف سے مل گئی تھیں۔

اس وقت کیوں کہ میری حیثیت مجاہدِ اوّل کے نائب کی تھی اس لیے میرے چاروں ساتھی پوری توجہ اور انہماک سے میری ہدایات سن رہے تھے۔ میں نے آخر میں کہا "ایوبی کے سوا تم سبھی ملتان میں ایسی ہی صورتِ حال سے دوچار ہو چکے ہو۔ اس لیے مجھے توقع ہے کہ وہاں جو غلطیاں ہوئیں یہاں نہیں دہراؤ گے۔ اس کے علاوہ تمہیں فاطمہ کا بہ طور خاص خیال رکھنا ہے۔ ہماری تنظیم کی یہ پہلی مجاہدہ ہرچند کہ خود بھی انتہائی ذہین اور دلیر ہے، پھر بھی میری خواہش ہے کہ اسے معرکہ آرائی کے وقت کسی محفوظ مقام پر ہونا چاہیے۔" یہ کہہ کر میں ایوبی سے مخاطب ہوا "تمہارے لیے اس نوعیت کی کوئی مہم یقیناً نئی ہوگی۔ اپنے طور پر تمہیں کوئی قدم نہیں اٹھانا! دستے کے سربراہ کا ہر حکم ماننا تم پر فرض ہے۔"

"ایسا ہی ہوگا جناب!" ایوبی پُراعتماد آواز میں بولا "میں آپ کی توقعات پر پورا اترنے کی کوشش کروں گا۔"

"میٹنگ ختم ہونے سے پہلے اگر تم میں سے کوئی بھی کچھ پوچھنا چاہے تو پوچھ سکتا ہے۔" میں نے ان چاروں کے چہروں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ کسی نے کچھ نہیں پوچھا البتہ میں نے فاطمہ کے چہرے پر ایسا تاثر دیکھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہو مگر کسی سبب نہ کہہ پا رہی ہو۔ فاطمہ کیا پوچھنا کیا کہنا چاہتی ہوگی، مجھے اس کا اندازہ تھا۔ یقیناً وہ یہ جاننا چاہتی ہوگی کہ میں اندرونِ سندھ سے ان لوگوں کی واپسی تک کراچی ہی میں رکوں گا یا یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں گا؟ مگر یہ سوال ذاتی نوعیت کا تھا۔ تنظیم سے یا موجودہ مہم سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔ وہ اسی لیے خاموش رہی تھی۔ میں نے میٹنگ ختم ہونے کا اعلان کر دیا اور پھر اسی کے ساتھ زور سے ہنسا۔ وہ سبھی مجھے حیرت سے دیکھنے لگے جیسے انہیں میری ذہنی صحت پر شبہ ہو۔ "یار، تم لوگ مجھے اس طرح کیوں دیکھ رہے ہو جیسے میرے سر پر سینگ نکل آئے ہوں۔" میں ہنستے ہوئے بولا "دراصل مجھے خود اپنے آپ پر ہنسی آ رہی ہے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تک میں تم لوگوں کو اچھا خاصا چغد نظر آ رہا ہوں گا کیوں بھائی بخت خاں؟"

"خیر اس میں چغد نظر آنے والی تو کوئی بات نہیں تھی۔ ہاں کچھ عجیب سا ضرور لگ رہا تھا جب تم ہدایات دے رہے تھے، لیکن شاہین! میٹنگ کے دوران میں یہ سب ضروری ہے۔ نظم و ضبط کے بغیر کوئی بھی تنظیم چلتی نہیں ہے۔ حفظِ مراتب کا بہرحال خیال رکھنا پڑتا ہے۔" بخت خاں نے کہا۔

"میں تو خیر اپنے احساس کی بات کر رہا تھا۔ ویسے بھائی بخت خاں نے بڑے نکتے کی بات کہی ہے۔ یہ نکتہ تعلیم کرنے کی خوشی میں ان پر لازم ہے کہ وہ ہم سب کو چائے پلوائیں۔ معتبر ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ بھائی بخت خاں چائے بہت عمدہ بناتے ہیں۔" میں مسکرایا۔

بخت خاں چائے بنانے کے لیے اٹھنے لگا تو حسبِ توقع فاطمہ نے اسے روک دیا "میں لاتی ہوں چائے بنا کر!" پھر چائے پینے کے دوران میں فاطمہ نے مجھ سے وہ سوال کر ہی دیا جو ذاتی نوعیت کا تھا۔

"یہ سب راز کی باتیں ہیں خاتون! انہیں یوں بے سرِ عام آشکار نہیں کیا جا سکتا۔" میں ہنس کر بولا، پھر ذرا توقف کے بعد سنجیدگی سے اسے بتایا "ابھی کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ کیا خبر تم لوگوں کی واپسی تک میں یہیں رکوں اور کیا معلوم مجھے یہاں سے کہیں اور جانا پڑے! پھر ابھی تو یہ بھی طے نہیں کہ تم لوگ کراچی لوٹ کر آؤ گے یا وہیں سے تمہیں کہیں اور جانے کے احکام دینا پڑیں گے۔ ان ساری باتوں کا انحصار پیش آنے والے واقعات پر ہے جن کے متعلق قبل از وقت کچھ نہیں کہا جا سکتا۔"

وہاں سے رخصت ہوتے وقت میرا جی تو بہت چاہ رہا تھا کہ دو چار گھڑی خلوت میں فاطمہ سے بات کرنے کا موقع مل جائے مگر اسے میں نے مناسب نہیں سمجھا۔ ان سب کو میں کھپرل والے اس بڑے گھر کے ایک کمرے میں چھوڑ کر باہر آ گیا۔ سامنے ہی لان کے ایک گوشے میں درخت کے نیچے کھری چارپائی پر وہی بڑے میاں بیٹھے نظر آئے۔ جنہیں میں پُراسرار لکھ چکا ہوں۔ حسبِ معمول وہ چارپائی پر بیٹھے حقہ گڑگڑا رہے تھے۔ چارپائی پر چاروں طرف کتابیں اور اخبار پھیلے ہوئے تھے۔ چارپائی کے قریب ہی خالی کرسی بھی موجود تھی۔

"فضلو! ابے او فضلو!" بڑے میاں نے حقے کا دم کھینچتے ہوئے ہانک لگائی "ابے حقہ ٹھنڈا ہو گیا ــــ کہاں مر گیا بدبخت!"

"آیا سیّد صاحب!" لان ہی کے ایک گوشے سے آواز ابھری۔

میں آگے قدم بڑھاتا ہوا پھاٹک کی طرف چلا۔ ابھی پھاٹک کے قریب پہنچا ہی تھا کہ سیّد صاحب کا ملازم فضلو پیچھے سے لپکتا ہوا آیا اور مجھے ایک سبز لفافہ تھما گیا۔

"کس نے دیا ہے یہ؟" میں نے چونک کر فضلو سے پوچھا۔

"سیّد صاحب نے" فضلو نے جواب دیا اور پلٹ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چلم تھی۔

میں نے دور کھری چارپائی پر بیٹھے ہوئے سیّد صاحب کو دیکھا۔ وہ اب چارپائی پر دراز ہو کر کسی اخبار کا مطالعہ کرنے لگے تھے۔ میلا سا ایک تکیہ انہوں نے سر کے نیچے لگا رکھا تھا۔ مجھ تک وہ لفافہ اپنے ملازم کے ہاتھوں پہنچوا کر وہ اس طرح لاتعلق ہو گئے تھے جیسے مجھے جانتے ہی نہ ہوں، میں نے وہ لفافہ اپنی جیب میں سرکایا اور پھاٹک سے نکل گیا۔ اس سبز لفافے پر "شاہین کے لیے" لکھا ہوا تھا۔ میں وہ تحریر پہچانتا تھا۔ وہ اندازِ تحریر مجاہدِ اوّل کا تھا۔ اس لفافے کی وجہ سے سیّد صاحب کی پُراسرار شخصیت بھی اب میرے لیے زیادہ پُراسرار نہیں رہی تھی، پھر بھی میں الجھا ہوا تھا۔

اپنے فلیٹ میں واپس پہنچنے کے بعد میں نے وہ لفافہ کھولا۔ پیغام مجاہدِ اوّل ہی کا تھا۔ یہ تو میں سمجھ ہی چکا تھا کہ سیّد صاحب کا تعلق بھی ہماری ہی تنظیم سے ہے مگر یہ علم نہیں تھا کہ ان کا نام گزشتہ فہرست میں کیوں نہیں تھا۔

وطن پرست تنظیم سے ایسے کچھ افراد بھی وابستہ ہیں جن کا تعلق براہِ راست میدانِ عمل سے نہیں، یہ انکشاف مجھ پر اسی روز ہوا۔ سیّد صاحب بھی ایسے ہی لوگوں میں سے تھے۔ مجاہدِ اوّل نے ان لوگوں کو "اہلِ فکر" کا نام دیا تھا۔ تنظیم کے لیے سوچنے والے یہ دماغ ہندوستان کے ہر خطے میں موجود تھے مگر ان کی تعداد خاصی کم تھی۔ خود مجاہدِ اوّل مختلف معاملات میں ان سے مشورے طلب کرتا رہتا تھا۔ اور اس کے نائب بھی ان افراد سے رابطہ قائم رکھتے تھے۔ یہ لوگ جنہیں مجاہدِ اوّل نے اہلِ فکر کہا تھا، گویا تنظیم کا دماغ تھے۔ مجھے حکم ملا تھا کہ میں بھی سندھ میں سیّد صاحب سے رابطہ قائم رکھوں۔ اس روز تمام اخبارات و رسائل کا مطالعہ کرنے کے بعد دوپہر کا کھانا کھا کے میں سو گیا اور پھر شام کو سولجر بازار کی طرف چل دیا۔

جب میں سولجر بازار کی اونچی چھتوں والے اس گھر میں داخل ہوا تو ایک پیڑ کے نیچے سیّد صاحب کو لان ہی کے مخصوص گوشے میں چارپائی پر پہلو کے بل دراز دیکھا۔ میں آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا چارپائی کے قریب پہنچا۔ سیّد صاحب محوِ خواب تھے اور ان کے سوا وہاں مجھے کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ مجھے یہ کچھ اچھا نہیں لگا کہ

انہیں جگاؤں۔ بایاں ہاتھ اپنے سر کے نیچے رکھے وہ بڑے آرام سے سو رہے تھے۔

مجھے وہاں بیٹھے ذرا ہی دیر ہوئی تھی کہ اچانک سیّد صاحب اٹھے۔ چارپائی سے کچھ ہی فاصلے پر گھاس میں ایک لوٹا رکھا تھا۔ چارپائی سے اٹھ کر سیّد صاحب نے وہ لوٹا اٹھایا اور میرے سلام کا جواب دے کر بولے "میاں، میں ابھی آیا۔"

سیّد صاحب کی واپسی سے قبل ان کا ملازم چلم اتار کر لے گیا، پھر اس نے حقے کا پانی بدلا۔ سیّد صاحب ہاتھ منہ دھو کر آئے تو حقہ تیار تھا اور فضلو ایک ٹرے میں دو کپ چائے بھی چارپائی پر رکھ کر چلا گیا تھا۔

"لو میاں، چائے پیو!" سیّد صاحب نے چائے کی ایک پیالی ٹرے سے اٹھا کر مجھے تھما دی اور پھر خود بھی چائے کی چسکیاں لینے لگے۔ اس دوران میں وہ حقے کے کش بھی لیتے جا رہے تھے۔ اس وقت ان کے انداز و اطوار سے یوں معلوم ہو رہا تھا جیسے ان کے اور میرے درمیان برسوں کی جان پہچان ہو۔ چائے کی پیالی سے لمبے لمبے گھونٹ بھر کے انہوں نے پیالی ٹرے میں رکھی اور پھر ٹرے اٹھا کر چارپائی کے نیچے ایک طرف رکھ دی۔ میں ابھی تک چائے پی رہا تھا اور وہ حقہ گڑگڑانے میں اتنے منہمک تھے جیسے اس عالمِ آب و گل میں وہ صرف حقہ پینے ہی آئے ہوں۔ پھر جب میں نے بھی چائے پی لی اور خالی پیالی نیچے ٹرے میں رکھ دی تو انہوں نے حقے کا ایک لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا اور نے ایک طرف کر کے اچانک مجھ سے مخاطب ہوئے "میاں! آج کے اخبارات دیکھے تم نے؟"

"جی" میں نے ان کے سرخ و سفید چہرے پر پھیلے ہوئے جھریوں کے جال کا جائزہ لیا۔

انہوں نے اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف چارپائی پر ٹیک ... اور ان کی لمبی گردن شانوں کے درمیان جیسے غائب ہو گئی۔ "وہ چلم پھوڑ چلا گیا نا آخر!" یہ کہہ کر وہ آہستہ سے ہنسے۔

"چلم پھوڑ؟"

"ہاں وہی تمہارا لارڈ چیمسفورڈ اور کون! وائسرائے ہند! میں اسے چلم پھوڑ ہی کہتا ہوں۔ معلوم ہے تمہیں، اسے کیوں واپس بلا لیا گیا ہندوستان سے؟"

"آپ فرمائیں، میں کیا عرض کر سکتا ہوں!"

"میاں، کیا کرو عرض بلکہ فرمایا کرو! اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔" وہ مسکرائے، پھر کہنے لگے "قصہ دراصل یہ

ہوا میاں کہ تمہارا چیم چھوڑ زیادہ ہی بک بک کرنے لگا تھا۔ بھلا بتاؤ وہ برطانیہ عظمیٰ کے وزیراعظم لائیڈ جارج کو یہ مشورہ دینے لگا تھا کہ تحریک خلافت کا مسئلہ ہندوستان کے مسلمانوں کی مرضی کے مطابق حل کیا جائے۔ تمہی بتاؤ اب کہ وہ کہاں لائیڈ جارج مان لیتا چیلمسفورڈ کی بات!"

سید صاحب کسی تمہید کے بغیر شروع ہوگئے تھے۔ اخبارات میں نے بھی پڑھے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وائسرائے ہند لارڈ چیلمسفورڈ کی جگہ نیا وائسرائے لارڈ ریڈنگ ہندوستان پہنچ چکا تھا اور آئندہ روز ہندوستانی عوام سے خطاب کرنے والا تھا۔ وائسرائے کی اس تبدیلی کے اثرات ہندوستانی عوام پر کیا پڑنے والے تھے سید صاحب وہی مجھ پر واضح کر رہے تھے۔ تبدیلی کا سبب تو انہوں نے بتا دیا تھا اب مزید انکشافات کر رہے تھے۔

"میاں لارڈ ریڈنگ یہودی ہے سمجھے کچھ؟"

"میرے علم میں یہ بات نہیں تھی جناب!"

"یہ تو علم میں ہوگا تمہارے کہ وہ کہ یعنی برطانوی وزیراعظم لائیڈ جارج مسلمانوں کا بدترین ... ہے۔"

"جی ہاں معلوم ہے۔"

"اور یہ جو اس نے نیا وائسرائے لارڈ ریڈنگ یہاں بھیجا ہے یہ اس نطفہ نا تحقیق سے بھی دو ہاتھ آگے ہے۔" پھر سید صاحب روانی سے بولنے لگے۔ میں ان کی باتیں پوری توجہ اور انہماک سے سن رہا تھا "لارڈ ریڈنگ کی ہندوستان آمد کا مقصد یہ ہے کہ انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف جو مجموعی سازش تیار کی ہے ہندوستان میں اس پر شدت سے عمل کرایا جائے۔ نئے وائسرائے کا تقرر میڈی ٹرینین پالیسی کو کامیابی سے ہمکنار کرانا ہے تاکہ بحیرہ روم نہر سوئز بحیرۂ احمر اور خلیج فارس پر اس کا مکمل کنٹرول ہوجائے اور اس کے جہاز یعنی انگریزوں کے جہاز برطانیہ سے آسٹریلیا تک کسی روک ٹوک کے بغیر جاسکیں۔ اس مقصد کے لیے انگریزوں نے ان سمندروں کے ساتھ ساتھ واقع مسلمانوں کی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا ہے ترکی کے حصے بخرے کردیے ہیں۔ اب اس علاقے میں اسے آنکھیں دکھانے والی کوئی طاقت موجود نہیں۔ اس کامیابی کے بعد وہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہونے والی قوت کو کس طرح برداشت کرسکتے ہیں۔ لارڈ ریڈنگ کو دراصل یہی قوت توڑنے کے لیے ہندوستان بھیجا گیا ہے۔ اس یہودی بچے کو بنیادی طور پر یہ فرض سونپا گیا ہے کہ وہ یہاں ہندو مسلم اتحاد ختم کرادے ... اور تم دیکھنا میاں کہ وہ ... کرے گا۔ آج

میرے پاس اس ... جوت ... پہنچ چکا ... کمال ہو! ایسے ایسے جنرل کھادیتے ہو کہ ہم بڈھے بھی ... جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے سید صاحب اپنے مخصوص ... میں مسکرائے۔ "معلوم نہیں وہ کس جنرل اور کس ... بات کر رہے تھے! میں بہرحال درمیان میں کچھ نہیں بو... صاحب پھر حقے کے کش لینے لگے۔ "یہ عیار اور مکا... لارڈ ریڈنگ۔" وہ پھر بولنے لگے "کل بہ حیثیت وا... اپنی پالیسی تقریر کرنے والا ہے۔ اس تقریر کی ایک ... تمہارے کچھ ساتھیوں نے مجاہد اول کو فراہم کی اور ... بھی بھیج دی ہے۔ کمال تم لوگوں کا! ظاہر ہے کہ یہ ... دن پہلے خوب سوچ بچار کے بعد ترتیب دی گئی ہوگی ... مجھ تک یا مجاہد اول تک قبل از وقت نہ پہنچتی ... ہوئے سید صاحب نے اپنے سرہانے پڑی ہوئی ایک ... میں سے سبز لفافہ نکالا اور پھر اسے کھول کر دو بڑے ... اسکیپ کاغذ میری طرف بڑھادیے "یہ ہے وہ تقریر ... پڑھو گے تو پتا چلے گا کہ اس یہودی بچے نے کتنی چا... مسلمانوں کے خلاف زہر اگلا ہے" اسی کے ساتھ بعد ... اینگلو انڈینز کو کتنی خوب صورتی سے مسلمانوں کے ... بھڑکایا ہے! اس تقریر میں خاص طور پر ملتان میں ... والے واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔ اس ... لگایا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں اور دوسری قو... افراد کو قتل کیا اور ان کی املاک کو لوٹا ہے۔ کتنی د... پُرلطف بات ہے! تم تو میاں گواہ ہو اس کے! ہے نا؟"

وہ خاموش ہوکر حقہ پینے لگے تو میں اس تقری... کرنے لگا جو آئندہ روز وائسرائے کو کرنا تھی۔ و... صاحب نے جو کچھ کہا تھا بالکل درست تھا ... وائسرائے لارڈ ریڈنگ کی اس تقریر کا مقصد ہندو ... اتحاد کو دھچکا پہنچانا تھا تاکہ وہ آپس میں دست و گر... اور اپنے اصل دشمن یعنی انگریز کی طرف متوجہ نہ ... میں نے وہ تقریر پڑھ کر انہیں واپس کردی۔

"آپ کا فرمانا بالکل برحق ہے جناب! اس تق... نتیجہ نکلتا ہے۔" میں بولا "مگر میں ایک بات عرض ... ہوں یا یوں کہنا بہتر ہے کہ سمجھنا چاہتا ہوں۔"

"فرماؤ!" سید صاحب میری طرف متوجہ ہو...

"ہم آخر کب تک ایک مصنوعی اتحاد کو قا... اپنی توانائیاں صرف کرتے رہیں گے؟ کوئی اور ... ہے کیا؟"

"مثلاً؟ فرماؤ، توقف!" سید صاحب کی لمبی

شانوں کے درمیان غائب ہوگئی تھی اور وہ حقہ پینا چھوڑ چکے تھے۔

"معاف کیجیے گا جناب! آپ کی گفتگو سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ہمیں یعنی وطن پرست تنظیم کے ارکان کو بہرصورت ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشش کرنا چاہیے۔ میرے خیال میں ہماری تحریک کا مقصد اس سے کہیں مختلف ہے۔ ہماری تنظیم کا بنیادی مقصد تو انگریزوں کی سرکاری مشینری پر ضرب

لگا کر اسے معطل کرنا ہے۔"

"ہاں میاں تم نے ٹھیک کہا یہی مقصد ہے ہمارا اور ہم اپنے نصب العین پر قائم ہیں۔ تمہیں شاید علم ہوگا اس کا کہ سیاسی سطح پر اس وقت جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہے وہ محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ اس اتحاد کو آخرکار ایک روز ختم ہونا ہی ہے مگر یہ اتحاد جتنی زیادہ دیر قائم رہے اتنا ہی اچھا ہے کیوں کہ ہمارے پیش نظر جو مقصد ہے اس کے لیے بھی یہ عارضی اتحاد اہم ہے۔ ہماری کوشش یہ ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑانے کے لیے انگریز نے جو منصوبہ بنایا ہے اسے ناکام بنادیں۔ یہ وہ قوت ہے جس سے انگریز ہراساں ہے اور جسے ختم کرنے کے لیے اس نے بڑی عیاری سے ایسا جال پھیلایا ہے جس میں اس خطے کے لوگوں کا پھنس جانا لازمی ہے۔ ہماری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ ہم لوگوں کو اس جال میں نہ پھنسنے دیں۔ ہماری یہ کوشش بھی ہمارے اصل مقصد کو تقویت فراہم کرے گی۔ یوں سمجھو میاں کہ انگریز جس بات کو اپنے لیے خطرناک سمجھ رہا ہے وہی ہمارے حق میں بہتر ہے۔" سید صاحب کی دلیل میرے دل کو لگی تو ضرور مگر اب بھی میرے نزدیک ہندو مسلم اتحاد ناممکن سی بات تھی۔ پھر میں نے ان سے رخصت کی اجازت چاہی۔ "میاں! جب تک یہاں ہو آتے جاتے رہنا۔" سید صاحب بولے "تم اچھے لگے مجھے کہ تمہارے اندر اختلاف کا حوصلہ ہے۔ جی ہاں جی بہتر ہے اور بجا فرمایا کہنے والے نوجوان مجھے پوچ لگتے ہیں۔" میں وہاں سے چلا آیا۔ اختلاف رائے کے باوجود مجھے سید صاحب کی شخصیت دلچسپ معلوم ہوئی تھی۔

اگلے ہفتے مجھے اندرون سندھ سے خبریں ملنا شروع ہوگئیں کہ وہاں ہندو مسلم فسادات شروع ہوچکے ہیں۔ اسی دوران میں لاہور میں شہید گنج کا واقعہ ہوا۔ اس کا اثر بھی سندھ پر ہوا۔ پنجاب اور سرحد بھی فسادات کی لپیٹ میں آنے لگے۔ ہماری تنظیم جو اس طوفان کے آگے بند باندھنے کی کوشش کر رہی تھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکی۔ میرے اندازے صد فی صد درست ثابت ہوئے۔ نیک خواہشات رکھنا ایک الگ مسئلہ ہے اور انہیں روبہ عمل لانا دوسرا مسئلہ! قوموں کی تقدیر خواہشات کی پابند نہیں ہوتی۔ خودکشی کرنے والوں کو بھلا کون روک سکتا ہے! اس وقت ہندوستان کے باسی خصوصاً ہندو اجتماعی خودکشی کر رہے تھے۔ تقریباً پورا سندھ فسادات کی زد میں آچکا تھا۔

میرے خیال میں اب مجاہد اول کو اپنی جدوجہد کا رخ تبدیل کردینا چاہیے تھا۔ اس عرصے میں سید صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ مجھے حیرت اس پر تھی کہ ان ملاقاتوں میں انہوں نے مجھ سے ایک بار بھی اپنے بیٹے ایوبی کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے! حالانکہ انہیں تنظیم میں میری حیثیت کا علم تھا اور یہ بھی معلوم تھا کہ اس وقت پورے سندھ میں تنظیم کے جتنے بھی ارکان سرگرم عمل تھے ان سے میرا رابطہ قائم تھا۔ سید صاحب اپنے ہی کینڈے اور مزاج کے آدمی تھے۔

موجودہ حالات کے پیش نظر میں یہ سوچ رہا تھا کہ شاید مجاہد اول اب مجھے کراچی سے پنجاب بلوا لے گا اور یہاں میری جگہ کوئی اور لے لے گا۔ دو روز کے بعد ہی میری یہ توقع پوری ہوگئی۔ مجھے مجاہد اول کی نئی ہدایات مل گئیں۔

○☆○

اب ہم راولپنڈی میں تھے۔ ایوبی کو ہم نے کراچی ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ مجاہد اول کی ہدایت پر اپنے چاروں سکھی ساتھیوں کو میں نے کراچی واپس بلالیا تھا۔ فاطمہ بھی انہی میں شامل تھی۔ میرے اور میرے ساتھیوں کے لیے سندھ میں خطرہ بڑھ گیا تھا۔ کراچی میں کیتھی کی موجودگی اس بات کا ثبوت تھی۔ یہ اطلاع بھی مجھے مجاہد اول ہی کی طرف سے ملی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جب تک ریلوے اسٹیشن سے ٹرین روانہ نہیں ہوگئی۔ ہم بھی چوکنا اور محتاط رہے۔ ہم چاروں یعنی میں فاطمہ جوگیندر راور بخت خاں تیسرے درجے میں سفر کر رہے تھے۔ فاطمہ زنانہ ڈبے میں تھی۔ ہم تینوں کو ایک ہی ڈبے میں تھے لیکن ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر تھے۔ اس کے باوجود ہمارے خدشات بے بنیاد ثابت ہوئے۔ ہمیں اپنے اردگرد کوئی مشتبہ آدمی نظر نہیں آیا۔ میں یہ سوچتی ہوئی کیتھی کس طرح لاہور سے کراچی پہنچ گئی تھی۔ یہ

بات میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی۔ کراچی میں اس کی آمد میرے نزدیک کسی اور سبب بھی ہو سکتی تھی مگر احتیاط کا تقاضا یہی تھا کہ میں کراچی چھوڑ دیتا میرے علاوہ جوگیندر اور فاطمہ کے لیے بھی سندھ سے نکل جانا فی الحال بہتر تھا۔ رہا بخت خاں تو وہ تن تنہا اس علاقے میں رہ کر کیا کرتا! یہاں کام کرنے کے لیے اور دوسرے لوگ موجود تھے۔

اس زمانے میں راولپنڈی چھوٹا سا ایک پُر سکون اور خوب صورت شہر تھا۔ وہاں ہمیں چنی ہٹیاں کے علاقے میں اپنے ایک تنظیمی ساتھی کے ملنے کے بعد کرائے پر ایک مکان حاصل کرنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔

اب ہمیں وہاں مجاہدِ اوّل کی نئی ہدایات کا انتظار تھا۔ راولپنڈی پہنچ کر ہمیں کیا کرنا تھا' کیا مہم ہمیں درپیش تھی' اس کا علم ہمیں اب تک نہیں ہوا تھا۔

اگلے دن ہی صبح جب دودھ والا دودھ دینے آیا تو اس نے فاطمہ کو ایک بند لفافہ دیا "بی بی جی! شاہین صاحب کے لیے ایک صاحب نے یہ چٹھی دی ہے۔"

"وہ صاحب کہاں ہیں؟" میں نے اپنا نام سنا تو لپک کر دروازے تک آگیا۔

دودھ والے نے پلٹ کر ایک سمت اشارہ کیا۔ گلی کے اختتام پر میں نے ایک شخص کو دیکھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا جارہا تھا۔ دودھ والا دودھ دے کر جاچکا تھا مگر میں اور فاطمہ ابھی تک دروازے ہی پر کھڑے تھے۔ وہ گلی خاصی لمبی تھی۔ ہمارے اور اس شخص کے درمیان خاصا فاصلہ تھا۔ اس شخص کے جسم پر مغربی لباس تھا' سر پر ہیٹ لگا تھا اور آنکھوں پر دھوپ کا چشمہ! دیکھتے ہی دیکھتے وہ گلی سے نکلا اور پھر اس نے ہماری طرف پلٹ کر دیکھا۔ کافی فاصلے کی وجہ سے اب وہ ہیولا ہی رہ گیا تھا۔ رومال سے اس نے اپنے چہرے کے نچلے حصے کو چھپا رکھا تھا یوں جیسے کوئی چلتے چلتے بدبو سے بچنے کے لیے ناک اور منہ پر رومال رکھ لے۔ گلی میں کچھ گندگی بھی تھی اس لیے ایسا کرنا خلافِ معمول نہیں لگ رہا تھا۔ وہ گلی کے نکڑ پر کھڑا ہوا' صرف چند لمحوں کے لیے پھر اس نے ہاتھ اٹھا کر گویا ہمیں الوداعی سلام کیا اور پلٹ کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

میں نے کچھ ایسا محسوس کیا کہ وہ شخص مجاہدِ اوّل ہی تھا۔ یہی وجہ تھی کہ میرے دل میں بڑی شدت سے یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اس کا تعاقب کروں اور اس کی شخصیت سے آگاہ ہو جاؤں مگر میں نے اس خواہش کو دبالیا۔ مجھے اس کی چال میں چند لمحوں کو شناسائی کی جھلک محسوس ہوئی تھی لیکن ان چند لمحوں کے بعد اس کا اندازِ خرام میرے لیے پھر اجنبی ہوگیا تھا۔

سبز رنگ کے اس مخصوص لفافے میں مجاہدِ اوّل ہی کا پیغام تھا۔ رات عشاء کی نماز کے بعد اس نے گھر کے عقبی دروازے کو کھلا رکھنے کا حکم دیا تھا' اس کے ساتھ مختصراً دوسری ہدایات بھی تھیں جن کا تعلق اس کی شخصیت کی پردہ پوشی سے تھا۔

اس رات ہم نے اس کی ہدایات پر عمل کیا۔ برابر والے کمرے میں ہمیں اس وقت مجاہدِ اوّل کی موجودگی کا احساس ہوا جب اس نے "ساتھیو!" کہہ کر متوجہ کیا۔ معلوم نہیں کب وہ دبے پاؤں عقبی دروازے سے داخل ہو کر برابر والے کمرے میں پہنچ گیا تھا! ہم سب کرسیوں پر ایک گول میز کے گرد بیٹھے تھے' میز پر لالٹین رکھی تھی۔ جس کی لو مدھم کردی گئی تھی۔ ہم مجاہدِ اوّل کی صرف آواز سن سکتے تھے۔

"سب سے پہلے تم لوگ ایک خوش خبری سن لو!" مجاہدِ اوّل کی آواز ہم نے سنی "تمہارے ساتھیوں نے گزشتہ دنوں مراد آباد میں اناج کی منڈی لٹوادی ہے۔ اس موقع پر یہ کارروائی کوئی معمولی بات نہیں ہے۔ بنگال' آسام' بہار' یو پی اور اڑیسہ میں بھی انہی دنوں ایسے ہی واقعات ہوئے ہیں۔ انگریزوں کے ایوانِ حکومت میں ان واقعات کے سبب زلزلہ آگیا ہے۔ انگریز حکومت اس نتیجے پر پہنچ چکی ہے کہ یہ تمام واقعات اس کے خلاف کسی منظم سازش کا نتیجہ ہیں اور ان کا ذمے دار کوئی منظم گروہ ہے۔ اکثر جگہوں پر ان واقعات میں ہماری تنظیم کا براہِ راست ہاتھ نہیں لیکن بہت سے شہروں میں ہمارے ہی مجاہدوں نے ایسی کارروائیاں کی ہیں۔ انہی میں سے ایک مراد آباد بھی ہے۔ اس کا ذکر بہ طورِ خاص میں اس لیے کررہا ہوں کہ مراد آباد میں جن جاں بازوں نے یہ کارنامہ انجام دیا' انہیں تم چاروں ہی جانتے ہو۔ یہ تمہارے ساتھی نیپو اور سراج الدولہ ہیں۔ ان کے گروپ ہی نے وہاں یہ کام دکھایا ہے۔ تفصیلات تمہیں ان سے کل خود ہی معلوم ہوجائیں گی۔"

"کیا وہ دونوں بھی یہاں راولپنڈی پہنچ چکے ہیں؟" بخت خاں نے پوچھا۔

"نہیں' مگر کل صبح تک پہنچ جائیں گے۔" مجاہدِ اوّل نے بتایا "اب تم لوگ اس مہم کی نوعیت کے بارے میں سنو جو تمہیں درپیش ہے۔" یہ کہہ کر اس نے چند لمحے توقف کیا اور پھر اس کی آواز دوبارہ سنائی دینے لگی "برطانوی دفترِ خارجہ کا ایک اہم افسر بھی لارڈ ریڈنگ کے ساتھ ہندوستان آیا ہے۔ اس کا نام ولسن ہے۔ ولسن یہاں ایک اہم مشن پر بھیجا گیا ہے۔ فارن آفس اور ڈیفنس کے بعض افسروں اور کارندوں پر مشتمل ایک سیکشن اس کے لیے مخصوص کردیا گیا ہے۔ اس مشن کا تعلق برطانیہ کی میڈی ٹرینین پالیسی سے ہے۔ ابھی تک اس مشن کی اصل نوعیت کا علم نہیں ہوسکا ہے لیکن اس کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی وجہ یہ کہ ولسن کی ہندوستان میں آمد کو بالکل خفیہ رکھا گیا ہے۔ یہ خطرناک شخص برطانوی فوج میں بھی رہ چکا ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اس کا تعلق اسلحہ سازی سے ہے۔ ولسن شیطانی دماغ کا مالک ہے۔ اسی شیطانی دماغ کی بدولت وہ فوج سے دفترِ خارجہ میں پہنچا ہے۔ ہندوستان میں اس کی آمد کو کسی خطرے کا پیش خیمہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ مشرقِ وسطیٰ سے مشرقِ بعید تک انگریز ایشیائی عوام کے خلاف اپنی ساری کارروائیوں کو ہندوستان ہی سے کنٹرول کرتا ہے۔ خصوصاً مشرقِ وسطیٰ کے مسلمانوں کے خلاف اس کا فوجی مرکز ہندوستان ہی ہے۔ اندیشہ یہ ہے کہ ولسن یہاں ہندوستان میں کسی بھیانک منصوبے پر عمل درآمد کے لیے حکمتِ عملی تیار کررہا ہے۔ ہمیں اس شخص کو اغوا کرنا ہے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ انگریز کی سازش کیا ہے! ولسن وہ شخص ہے جس پر برطانیہ میں بیٹھے ہوئے بے رحم شاطروں کو بڑا اعتماد ہے۔ تم لوگوں کو یقیناً یہ سن کر حیرت ہوگی کہ ولسن ان دنوں راولپنڈی میں ہے۔ وہ یہاں کیوں آیا اور کس لیے رکا ہوا ہے' اس بارے میں تو کچھ معلوم نہیں ہوسکا لیکن اس کی اگلی منزل کے متعلق اطلاع مل گئی ہے۔ وہ چند روز کے بعد یہاں سے سرحد کے لیے روانہ ہونے والا ہے۔ اس شخص کا پہاڑوں کی طرف جانا بھی کسی خطرناک منصوبے کی نشان دہی کررہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ سرحد روانگی سے قبل ہی اسے اغوا کرلیا جائے۔"

یہ اطلاع واقعی سنسنی خیز ہی تھی کہ ولسن اس وقت راولپنڈی میں تھا اور جلد ہی وہ یہاں سے صوبہ سرحد کا رخ کرنے والا تھا۔ میرا دل اس وقت تیزی سے دھڑک رہا تھا کہ مجاہدِ اوّل ہم میں سے کسے اس مہم کی ذمے داری سپرد کرتا ہے۔

پھر خلافِ توقع مجاہدِ اوّل نے ایک اور ہی ذکر چھیڑ دیا۔ یہ دوسری مہم ہندوستان گیر تھی۔ کچھ عرصے قبل پرنس آف ویلز ہندوستان کا دورہ کرنے کے لیے آنے والا تھا۔ یہ دورہ پہلے اس لیے منسوخ کردیا گیا تھا کہ ہندوستان کے سیاسی حالات بہتر نہیں تھے۔ اب یہاں لارڈ ریڈنگ کی آمد کے بعد گویا یہ فضا بہتر ہوگئی تھی۔ ہندو اور مسلمان آپس میں دست و گریباں ہوچکے تھے۔ اب پرنس آف ویلز کے لیے یہ خطرہ نہیں رہا تھا کہ ہندوستان میں اس کا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے کیا جائے گا۔

"اس موضوع پر ہم سارے ہندوستان کو سراپا احتجاج بنادیں گے۔ انگریز شاید اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ اس نے تمام اہم اور سرکردہ سیاسی لیڈروں کو پسِ زنداں ڈال دیا ہے تو اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے والا کوئی نہیں رہا۔" مجاہدِ اوّل کی آواز میں جوش تھا۔ اس کے بعد وہ ہمیں پرنس آف ویلز کے متوقع دورے کی تفصیلات سے آگاہ کرتا رہا۔ آخر میں وہ بولا "ولسن کے اغوا کے بعد تمہیں ملک کے مختلف حصوں میں سرگرمِ عمل ہونا ہے۔ بخت خاں! تم دہلی جاؤ گے۔ شاہین یہاں سے کلکتے کا رخ کرے گا مگر اس سے پہلے کچھ روز اسے دہلی میں رکنا ہے۔ کس لیے" یہ ہدایات مل جائیں گی۔ کل یہاں نیپو اور سراج الدولہ پہنچ جائیں گے۔ جوگیندر اور فاطمہ کو بھی یہاں سے کلکتے ہی جانا ہے۔ یہ دونوں شاہین سے پہلے وہاں پہنچیں گے۔ میں خود بمبئی جاؤں گا تاکہ وہاں پرنس آف ویلز کے شاندار استقبال کی تیاریاں مکمل کرسکوں۔ ہندوستان کی انگریز انتظامیہ کی پوری کوشش یہ ہوگی کہ پرنس آف ویلز کے دورے کے موقع پر کوئی ہنگامہ نہ ہو۔ ہماری کوشش یہ ہوگی کہ بمبئی' کلکتہ اور دہلی ہر جگہ اس موقع پر ہنگامے ہوں۔"

وقتی طور پر فاطمہ مجھ سے ایک بار پھر جدا ہونے والی تھی۔ جب مجاہدِ اوّل نے یہ کہا تھا کہ جوگیندر اور فاطمہ کلکتے جائیں گے تو بے اختیار ہم دونوں کی نظریں ایک دوسرے کی طرف اٹھی تھیں۔ اس کے باوجود میرے لیے یہ امر باعثِ اطمینان تھا کہ جلد یا بدیر خود میں بھی وہیں جانے والا تھا۔ اس سے کچھ روز پہلے مجھے دہلی میں بھی رکنا تھا۔ اس بات نے مجھے البتہ قدرے تشویش میں مبتلا کردیا تھا۔ مجھے لاہور میں پیش آنے والے واقعات یاد آگئے تھے۔ بہرحال اس وقت میں نے اپنی اصل شخصیت کی پردہ پوشی کے سبب مجاہدِ اوّل سے اس سلسلے میں کوئی سوال نہیں کیا۔

"جوگیندر!" مجاہدِ اوّل کی آواز سنائی دے رہی تھی "تم فاطمہ کو ساتھ لے کر کل ہی یہاں سے کلکتے کے لیے روانہ ہوجاؤ! وہاں پہنچ کر تمہیں کیا کرنا ہے' اس سلسلے میں کل صبح ہی تمہیں ہدایات مل جائیں گی۔"

ایک بار پھر فاطمہ کی اور میری نظریں ایک دوسرے کی طرف اٹھیں۔ مجھے قطعی یہ اندازہ نہیں تھا کہ مجاہدِ اوّل اتنی جلدی انہیں کلکتے جانے کا حکم دے دے گا۔

"صحت بہتر ہے اے مجاہد اوّل!" جوگیندر بولا "اس بہانے پتاجی سے بھی طویل عرصے کے بعد ہم دونوں بہن بھائیوں کی ملاقات ہو جائے گی۔"

"شاہین! تم ولسن کے اغوا کی مہم کا ابتدائی خاکہ تیار کرو۔ تمہیں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھنا ہے کہ یہ مہم ہر قیمت پر کامیاب ہو۔ اس خطرناک مہم کا سربراہ ٹیپو ہوگا۔ تم، بخت خاں اور سراج الدولہ اس کے ساتھ ہو گے۔ ٹیپو اور بخت خاں کے مشورے سے ترمیم و تبدیلی کے بعد حتمی حکمتِ عملی تیار کی جائے گی۔" پھر وہ اجلاس ختم ہو گیا۔ مجاہدِ اوّل نے "خدا حافظ" کہا اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد ہم نے اس گھر کا عقبی دروازہ بند کر لیا۔

وہ شب، شب مختصر تھی اور میری تمنا تھی کہ دراز سے دراز تر ہو جائے۔ مجاہدِ اوّل چلا گیا تو میں نے اسی لیے فوراً فاطمہ سے چائے بنانے کی فرمائش کر دی۔ دن کے وقت ہی ہم نے تمام ضروری سامان خرید لیا تھا۔ اس فرمائش کے پس پشت صرف یہ جذبہ کارفرما تھا کہ فاطمہ زیادہ سے زیادہ میری آنکھوں کے سامنے رہے۔ گھر میں دو کمرے تھے۔ ایک کمرے میں ان دونوں بہن بھائیوں نے اپنا ڈیرا جما لیا تھا، دوسرے میں بخت خاں اور میں نے اپنے اپنے بستر بچھا لیے تھے۔ اگر ہم سب فوری طور پر سونے کا پروگرام بنا لیتے تو یوں فاطمہ میری نظروں سے اوجھل ہو جاتی۔

میرا اندازہ تھا کہ جو کیفیت میری تھی وہی فاطمہ کی بھی ہوگی۔ یہ اندازہ اس وقت یقین میں بدل گیا جب ہم چائے پی رہے تھے۔ فاطمہ کی نظریں بار بار میری ہی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ گم صم اور خاموش سی تھی۔

"کیا بات ہے ری مسکی، تو اتنی چپ چپ کیوں ہے؟" جوگیندر نے اپنی بہن کو مخاطب کیا۔ جب اسے اپنی بہن پر زیادہ لاڈ آتا تھا تو وہ اسے "مسکی" ہی کہتا تھا۔ اس نے فضا میں موجود اداسی کو یقیناً محسوس کر لیا تھا اور شاید اس فضا کو بدلنا چاہتا تھا۔

"تم بھی تو کچھ نہیں بول رہے بھیا!" فاطمہ اداس سے لہجے میں بولی۔

"میں تو تیری وجہ سے کچھ نہیں بول رہا تھا کہ تجھے بولنے کا موقع مل جائے۔" جوگیندر نے بات بنائی۔

"ہم سب ایک دوسرے کی عادت بنتے جا رہے ہیں اور یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔" بخت خاں بات کی تہ تک پہنچ کر صاف گوئی سے بولا۔

"اور میرا خیال یہ ہے بھائی بخت خاں کہ یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں کہ ہم سب انسان ہیں، ہمارے سینوں میں دل بھی ہیں اور دلوں میں ایک دوسرے کے لیے محبت بھی ہے!" میں نے یہ الفاظ کچھ ایسے لہجے میں کہے کہ سبھی زور سے ہنس پڑے اور میں نے بھی زوردار قہقہہ لگایا۔

○☆○

فاطمہ اور جوگیندر جا چکے تھے اور میں خود کو خالی خالی محسوس کر رہا تھا۔ ٹیپو اور سراج الدولہ کی آمد نے فضا کچھ بدل دی تھی۔ جلالی کی مہم کے بعد سراج الدولہ سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ جلالی کے دورانِ قیام میں بھی سراج الدولہ کے لب و لہجے سے میں نے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ اس کا تعلق پنجاب ہی کے کسی شہر سے ہے۔ وہ بڑا خوش مزاج زندہ دل شخص تھا۔ لطیفہ گوئی بلا کا تھا۔ اسے بے شمار لطیفے یاد تھے۔ اداسی کی فضا میں اس کی آمد کو میں نے تازہ ہوا کے جھونکے کی طرح محسوس کیا۔

وہ دن دو ساتھیوں کے جانے اور دو کے آجانے کی نذر ہوا۔ رات کو مجھے ذرا مہلت ملی تو مجاہدِ اوّل کی فراہم کردہ معلومات کی روشنی میں ولسن کے اغوا کا منصوبہ اپنے ذہن میں ترتیب دیتا رہا۔ آج صبح ہی مجاہدِ اوّل کی طرف سے اس کوٹھی کا نقشہ بھی فراہم کر دیا گیا تھا جہاں ولسن کو ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ کوٹھی شہری آبادی سے ذرا ہٹ کر تھی۔ وہ ایک سرکاری عمارت تھی اور عموماً انگریز حکام کی راولپنڈی کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھی۔

اس وقت میں لالٹین کی روشنی میں کوٹھی کا نقشہ پھیلائے ہوئے اپنے خیالوں میں کھویا ہوا تھا۔ بخت خاں کا بستر اسی کمرے میں تھا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ کروٹ بدل کر سونے کی کوشش میں مصروف تھا۔ ٹیپو اور سراج الدولہ دوسرے والے کمرے میں سونے کے لیے جا چکے تھے۔

نقشے کے مطابق کوٹھی کے عقبی حصے کی طرف دور تک ناہموار ڈھلان تھی۔ بیرونی حصے میں پھاٹک سے عمارت تک پختہ راستہ تھا جس کے دونوں طرف بڑے بڑے لان اور پھولوں کی کیاریاں تھیں۔ پختہ راستہ اتنا چوڑا تھا کہ ایک کار بہ آسانی عمارت کے صدر دروازے تک پہنچ سکتی تھی۔ راستے کی دونوں جانب تھوڑے تھوڑے فاصلے سے درخت لگے ہوئے تھے۔ عمارت دو منزلہ تھی۔

خدا نے رات آرام کے لیے بنائی ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ جو قومیں اپنے اندر سے بیدار ہوتی ہیں یہ بات ان کے لیے زیادہ درست ہے۔ اس دور میں تو سارا ہندوستان اور اس کے باسی غلامی کی سیاہ رات میں زندہ تھے۔ ہر

جھوٹے اور سچے چہروں کی پہچان کھو گئی تھی۔ ارضِ وطن کا دم گھٹ رہا تھا، فضا ایسی ہی دھواں دھواں تھی، لوگ تازہ ہوا کو ترس رہے تھے۔ ہم تاریک رات کے مسافر تھے اور اس رات کا سلسلہ دراز تھا۔ ہم اسی سیاہ رات کے سینے میں شگاف ڈالنا چاہتے تھے اور اس شہرِ خورشید تک پہنچنے کے آرزو مند تھے کہ جس کے دروازے ہمارے آئندہ میں کھل سکیں۔ وہ شہرِ خورشید جو اس سیاہ رات کی فصیلوں کے پیچھے تھا۔ ہمارے لیے شام و سحر کے سلسلے بے معنی تھے۔ ہم نے اپنی جاگتی آنکھوں کی کھڑکیاں کھلی رہنے دی تھیں کہ اسی زینے سے نئی صبح کے خورشید کو ہمارے دلوں میں اترنا تھا۔ اس نوعیت کی مہمیں ہم رات ہی کو سر کرتے تھے جو اس وقت ہمیں درپیش تھیں۔ سو اس رات بھی ایسا ہی تھا۔ مجاہدِ اوّل کی جانب سے ہدایات ملنے کے بعد یہ پانچویں رات تھی۔

ہم جس شخص کو اس رات اغوا کرنے والے تھے اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کے تحفظ کی خاطر سادہ لباس میں چار مسلح فوجی ہر وقت اس کوٹھی میں موجود رہتے تھے۔ جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ یہ چاروں ہی فوجی انگریز تھے۔ ان کے علاوہ اس کا باورچی بھی انگریز ہی تھا۔ یہ وہ شخص تھا جو مصدقہ اطلاعات کے مطابق دن رات کسی بھی وقت وائسرائے اور کمانڈر انچیف سے مل سکتا تھا یا رابطہ قائم کر سکتا تھا۔

ہاں یہ وہی طرار انگریز ولسن تھا جو کسی خاص مشن پر وائسرائے کے ساتھ برطانیہ سے آیا تھا اور مجاہدِ اوّل نے ہمیں جس کے اغوا کا حکم دیا تھا۔ ہم اسی حکم کی تعمیل کرنے کے لیے نکلے تھے۔

ولسن کو اغوا کرنے کے لیے میں نے جو حکمتِ عملی ترتیب دی تھی، ٹیپو اور بخت خاں نے اسے کسی ترمیم و تبدیلی کے بغیر منظور کر لیا تھا۔ میں نے اس منصوبے میں سب سے زیادہ اہمیت موقع واردات سے تیزی کے ساتھ محفوظ فرار کو دی تھی۔ اس کوٹھی سے جہاں ولسن مقیم تھا، ہمیں چنی ہٹیاں تک پہنچنے کے لیے لازمی طور پر رات کے وقت ایسی سڑکوں سے گزرنا پڑتا جہاں پولیس گشت پر رہتی تھی۔ راولپنڈی میں بھی ہندوؤں کی خاصی آبادی تھی جن کے تحفظ کی خاطر ان دنوں پولیس رات کے وقت بھی گشت پر رہتی تھی۔ انگریز انتظامیہ اپنے چہیتوں کی ہر طرح حفاظت کرتی تھی کہ کہیں مسلمان ان کی بستیوں اور محلوں پر چڑھائی نہ کر دیں جہاں ہندو بہ کثرت آباد تھے۔ گزشتہ دنوں ملتان اور صوبہ

انہوں نے یہاں کے مسلمانوں پر بھی خاصا اثر مرتب کیا تھا۔ انگریز ہندو مسلم فساد تو چاہتا تھا لیکن یہ نہیں چاہتا تھا کہ اس فساد میں ہندو کو زیادہ نقصان ہو۔ اس کا اصل نشانہ مسلمان تھا اس لیے راولپنڈی میں ہندوؤں کے محلوں کی حفاظت کا کام پولیس کے ذمے تھا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب متعصب ہندو، راولپنڈی میں آریہ سماج کا پرچار کر رہے تھے جس کی بنیاد مسلمان دشمنی پر استوار تھی۔ "ہندوستان صرف ہندوؤں کا ہے" یہ نعرہ پہلی بار انہی آریہ سماجیوں نے اس شہر میں بلند کیا۔ راولپنڈی میں بڑی بڑی دکانیں، ملیں اور دوسرا منفعت بخش سارا کاروبار انہی آریہ سماجیوں کے ہاتھ میں تھا۔ راولپنڈی اور اس کے گردونواح میں انہوں نے اپنی الگ درس گاہیں بھی قائم کر رکھی تھیں جہاں طالب علموں کو مسلمان دشمنی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ مسلمان راولپنڈی شہر میں بھی ملتان ہی کی طرح اکثریت میں تھے اور ہندو اقلیت میں مگر عیار انگریز نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مسلمانوں کی معاشی حالت ابتر کر دی تھی۔ اس دور میں راولپنڈی کا متعصب ہندو سرمایہ دار اتنا بااثر تھا کہ اس کے لمبے ہاتھ برطانیہ اور دیگر مغربی ممالک تک پھیلے ہوئے تھے۔ انگریز نے اس شہر کے ہندو تاجروں کو ایسی مراعات دے رکھی تھیں کہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کے بزنس میں بھی پیش پیش تھے۔ ان حالات میں بھلا انگریز کب یہ پسند کرتا کہ راولپنڈی شہر کا ہندو تاجر، غریب و مظلوم مسلمانوں کے ہاتھوں لٹ جائے۔ اسی سبب راولپنڈی کی پولیس راتوں کو بھی حرکت میں رہتی تھی۔

راولپنڈی شہر کے حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے میں نے اس مہم کو سر کرنے کے لیے ایک نیا طریقہ اختیار کیا تھا۔ ہم ولسن کو اغوا کر کے راولپنڈی شہر کی کسی مرکزی شاہراہ سے گزرے بغیر موقع واردات سے صرف چند منٹ کے اندر اندر تقریباً ایک فرلانگ دور پہنچ سکتے تھے۔ اگر کوئی مختصر ترین راستہ اختیار کر کے بھی اس مقام تک پہنچنا چاہتا تو اسے خاصا لمبا چکر کاٹنا پڑتا اور وقت بھی بہت لگتا۔

کوٹھی کے عقبی ڈھلان میں گہرے خندق تھے۔ کوٹھی سے قدرے بلندی پر ایک ہموار ٹیلا سا تھا۔ ہم نے اسی ہموار ٹیلے کو اپنے فرار کے سفر کی خاطر ہیلی پیڈ کے طور پر منتخب کیا تھا۔ نشیب میں آخری خندق کے کنارے کوٹھی تھی۔ ہم نے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ ہمارے سفر کا اختتام تھا۔

سفر کے آغاز اور اختتام کے لیے ان دونوں مقامات کے انتخاب میں سروے آف انڈیا کے ایک سرویئر نے تھیوڈولائٹ سے ملاقے کا جائزہ لینے کے بعد ہماری مدد کی تھی۔ یہ سرویئر ہمارے ایک ساتھی سراج الدولہ کا دوست تھا جو اپنے اندر ایک بے قرار انقلابی روح رکھتا تھا لیکن ہم نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کا مقصد کیا ہے! اس سرویئر نے حساب کتاب لگا کر ہمیں بتایا تھا کہ ان دونوں مقامات کے مابین بہ راہِ راست فاصلہ ایک فرلانگ سے بیس پچیس گز کم تھا۔

بلندی پر ہموار ٹیلا اور نشیب میں آخری کھڈ کو پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کرنے کے لیے ہم نے ٹیلے سے بلندی پر اور نیچے آخری کھڈ میں دو بلند اور مضبوط درخت منتخب کیے تھے۔ یہ دونوں درخت رسی اور پلی کے نظام کے لیے دو ستونوں کا کام دینے والے تھے۔

کوٹھی کے آخری حصے میں کھڈوں کا یہ سلسلہ غیر آباد اور سنسان تھا۔ اس حصے کی ڈھلان خطرناک طور پر نیم عمودی تھی جس پر اترنا چڑھنا بہت مشکل تھا۔ ہماری بے ضرر سرگرمیوں کو دیکھنے والا اس علاقے میں کوئی نہ تھا۔ اگر کوئی ہمیں دیکھ بھی لیتا تو ہمارے اصل مقصد کو سمجھ نہ پاتا۔

اپنی کارروائی کے پہلے مرحلے کا آغاز ہم نے سورج نکلتے ہی کردیا تھا۔ یہ مرحلہ ہم نے نشیب سے شروع کیا تھا۔ ہم ایک مضبوط سُتلی کو نیچے نشیب سے لے کر چلے تھے اور کوٹھی کے نیچے کھڈ تک لے آئے تھے۔ یہ خاصا وقت طلب کام تھا۔ یہ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اس علاقے میں زیادہ درخت نہیں تھے۔ یہاں جھاڑیاں اور پتھر زیادہ تھے جن پر سے وہ سُتلی گزارنا ہمارے لیے دشوار نہ ہوا۔ سُتلی کو ہموار ٹیلے سے اوپر واقع درخت تک پہنچانے کا دوسرا مرحلہ ہم نے غروب آفتاب کے فوراً بعد ہی مکمل کرلیا تھا۔

رات جب خاصی بھیگ گئی، ہوا کچھ تیز چلنے لگی، لوگ گہری نیند کی آغوش میں سوگئے تو ہم پلی اور رسی کے نظام کی تکمیل میں لگ گئے۔ بلندی اور نشیب میں ستونوں کے طور پر منتخب کیے جانے والے درختوں میں دو بڑی بڑی پلیاں باندھ دی گئیں۔ ان پلیوں اور نشیب سے بلندی تک آنے والی مضبوط سُتلی کی مدد سے تقریباً پون انچ موٹا پٹ سن کا رسا دہرا کرکے دونوں پلیوں کے درمیان تان دیا گیا۔ یہ رسا ہم نے منہ اندھیرے ہی نشیب میں پہنچا دیا تھا۔ اتنا لمبا رسا بنانے میں ہم نے خاصی محنت سے کام لیا تھا۔ درمیان میں آنے والے جوڑوں کو بڑی احتیاط کے ساتھ لوہے کے تار سے اچھی طرح جوڑ دیا گیا تھا، اس طرح کہ جوڑ پر اس کی سطح قطعی ہموار رہی تھی۔ اس کے ساتھ ہی آدھا انچ موٹا رسا بھی دونوں درختوں کے درمیان تان دیا گیا تھا۔ پون انچ موٹے رسے پر اس متحرک پل کو پھسلنا تھا جس کے نیچے ہُک میں ایک بڑا سا تھیلا لٹکایا جاتا تھا نصف انچ موٹے رسے کا مقصد پل کی حرکت کو کنٹرول کرنا تھا۔

اس مرحلے کی تکمیل میں ہمیں رات کا ڈیڑھ بج گیا اور ہمارے فرار کی راہ مکمل ہوگئی۔ اس کام کی تکمیل کے بعد ہم نے ٹارچوں سے سگنل دے کر تیاری اور اطمینان کا اظہار کردیا۔ اس معلق پل کی تیاری میں ہمیں نشیب سے سراج الدولہ اور دوسرے دو مقامی سرفروشوں کی مدد بھی حاصل تھی کیوں کہ ان رسوں کو جن پر پل کو پھسلنا تھا، انتہائی سختی اور مضبوطی سے تاننا ضروری تھا تاکہ ان کے درمیان کم سے کم جھول رہے۔ اس کام کے لیے نشیب میں بنی ہوئی پن چکی کی قوت استعمال کی گئی تھی۔ جس پر ہم نے آج صبح ہی قبضہ کرلیا تھا پن چکی کا مالک ہمارے قبضے میں تھا۔

صورتِ حال یہ تھی کہ سراج الدولہ اپنے ساتھیوں سمیت نیچے تھا اور بخت خاں ہموار ٹیلے کے عقب میں واقع دوسرے بڑے ٹیلے پر اس درخت پر متعین تھا جو رسی اور پلیوں کے اس نظام کا بالائی ستون تھا۔ وہاں اس نظام کے تحفظ کی ذمے داری ایک مقامی جاں باز پر عائد تھی۔ ولسن کو اغوا کرنے کا کام مجھے اور ٹیپو کو انجام دینا تھا۔

اس وقت رات کے دو بجنے والے تھے جب ہم اصل مہم سر کرنے کے لیے حرکت میں آئے۔ رسوں پر پھسلنے والی پلی کے ہُک میں ایک اور پلی لٹکا دی گئی۔ یہ پلی آدھے انچ کے اس رسے سے بندھی ہوئی تھی جس سے متحرک پل کو کنٹرول کیا جاتا تھا۔ ٹیپو اور میں اس چھوٹی پلی سے لٹکے ہوئے پٹ سن کے بورے میں داخل ہوگئے۔ اس بورے کے نچلے حصے میں چوکور تختے رکھ دیے گئے تھے جن پر ہم دونوں کھڑے تھے۔ بورے کو اوپر کھینچ لیا گیا۔ اب ہم پل سے لٹکے ہوئے تھے۔ اس وقت بخت خاں نے ٹارچ کی روشنی سے نشیب میں اشارہ کیا۔ اگلے ہی لمحے نیچے متحرک پلی کو کنٹرول کرنے والی رسی کو ڈھیل دی جانے لگی، اسی کے ساتھ ہم اس بورے میں لٹکے ہوئے آہستہ آہستہ نیچے پھسلنے لگے۔

"خدا حافظ شاہین!" بخت خاں کی دھیمی آواز مجھے سنائی دی۔

"خدا حافظ!" میرے اور ٹیپو کے منہ سے ایک ساتھ نکلا۔

بڑی آہستگی اور روانی کے ساتھ ڈھیل دی جا رہی تھی۔

میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ رہی تھی۔ چند ہی لمحوں بعد ہم ہموار ٹیلے پر تھے۔ میں نے ٹارچ جلا کر نشیب کی طرف اشارہ کیا۔ ڈھیل دینے کا سلسلہ بند ہوگیا۔ اب ہم ہموار ٹیلے پر معلق تھے۔ ہمارا اندازہ درست ہی ثابت ہوا۔ بورا ٹیلے سے چند انچ اوپر تھا۔ متحرک پلی اب اس تیسری رسی سے بھی رکی ہوئی تھی۔ جو ہُک میں لگی ہوئی چھوٹی سی پلی کے گرد گھوم کر پٹ سن کے بورے سے بندھی ہوئی تھی۔ میں نے اس رسی کو جھٹکا دے کر بخت خاں کو اشارہ کیا۔ بخت خاں نے تیسری رسی کو ڈھیل دی اور بورا ٹیلے پر آگیا۔ ذرا ہی دیر میں ہم اس بورے سے باہر آگئے۔

میرے لیے یہ انتہائی سنسنی خیز تجربہ تھا۔ سوچنے اور کسی چیز پر عمل کرنے میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ جب میں یہ سب کچھ سوچ رہا تھا اس وقت میرے احساسات قطعی مختلف تھے۔

اس ہموار ٹیلے سے اتر کر ہم کوٹھی کے عقب میں پہنچ گئے۔ اس کوٹھی کا جو نقشہ ہمیں فراہم کیا گیا تھا ہم نے کئی مرتبہ بہ غور اسے دیکھا تھا۔ اس نقشے کو ذہن میں محفوظ کرنے کے بعد ہم اس کوٹھی کے چپے چپے سے واقف ہوگئے تھے۔ پھر میں نے اور ٹیپو نے مسلسل دو راتیں جاگ کر اس کوٹھی میں موجود لوگوں کے معمولات کا گہری نظر سے مشاہدہ کیا تھا۔ ہمیں بتایا گیا تھا کہ سادہ لباس میں چار مسلح فوجی محافظ ہر وقت اس کوٹھی میں موجود رہتے ہیں۔ ان میں دو محافظ آرام کرتے ہیں اور دو پہرا دیتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہر وقت کوٹھی کے گیٹ پر موجود رہتا ہے اور دوسرا محافظ کوٹھی کا چکر لگاتا رہتا ہے۔ ولسن کے بارے میں یہ معلوم ہوا تھا کہ وہ رات گئے تک کام کرتا ہے۔ ہمارا مشاہدہ تھا کہ کوٹھی کی نچلی منزل یعنی گراؤنڈ فلور کے ایک کمرے میں جو غالباً ولسن کا اسٹڈی روم تھا، وہاں رات تین بجے تک روشنی رہتی تھی۔ یہاں ولسن کام کرتا ہوگا۔ ٹھیک تین بجے اس کمرے کی روشنیاں بجھ جاتی تھیں۔ پھر اس کمرے کے برابر والے کمرے میں چند منٹ کو تیز روشنی ہوتی۔ یہ کمرا شب خوابی کا تھا۔ چند منٹ اس کمرے میں روشنی ہوتی، پھر گل ہوجاتی اور ہلکی سی نیلی روشنی باقی رہ جاتی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ ولسن سوا تین بجے تک سونے کے لیے لیٹ جاتا تھا۔ ٹھیک ڈھائی بجے کوٹھی کے عقبی حصے میں گشت کرنے والا محافظ گیٹ پر آتا اور گیٹ کے محافظ کے ساتھ بیٹھ کر تھرموس سے چائے نکال کے پیتا۔ یہاں دس پندرہ منٹ گزار کے وہ پھر پہرا دینے کے لیے عقبی حصے کی طرف نکل جاتا اور کہیں برآمدے میں کسی ستون سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا۔ باقی دو محافظ کوٹھی کی انیکسی میں سویا کرتے جہاں ولسن کا باورچی بھی رہا کرتا تھا۔

کوٹھی کی عقبی حصے میں بھی بڑا سا لان تھا۔ جس کے اردگرد گھنی جھاڑیوں کی باڑھ تھی گزشتہ دو راتوں کے دوران ہی میں ہم نے ان گھنی جھاڑیوں کے درمیان ایک ایسی جگہ تلاش کرلی تھی جہاں سے چاروں ہاتھ پیروں پر جھک کر ہم لان میں داخل ہوسکتے تھے۔ لان کی سمت ولسن کی خواب گاہ کا دروازہ بھی کھلتا تھا اور اسٹڈی کا بھی۔

ٹھیک ڈھائی بجے جب میں نے عقبی حصے کے محافظ کو گیٹ کی طرف جاتے دیکھا تو ایک چھوٹا سا کنکر اٹھالیا۔ میں نے وہ کنکر زور سے کوٹھی کی عقب کی طرف اندازاً اس مقام کے پاس پھینکا جہاں ٹیپو موجود تھا۔ پھر میں... خود بھی لمبا چکر کاٹ کر اسی جگہ پہنچ گیا جہاں سے ہم نے کوٹھی کے احاطے میں داخل ہونے کا فیصلہ کیا تھا۔ ٹیپو وہاں نہیں تھا۔ وہ احاطے میں داخل ہوچکا تھا۔ میں بھی کچھ ہی دیر بعد احاطے میں رینگ گیا مجھے معلوم تھا کہ ٹیپو اس وقت کوٹھی میں کس جگہ ہوگا۔

محافظ کو ابھی گیٹ کی طرف گئے پانچ منٹ ہی ہوئے تھے۔ ہمیں دس منٹ کے اندر کوٹھی کے کسی کمرے میں داخل ہوجانا تھا۔

میرے خیال میں نہ صرف ولسن بلکہ اس کے محافظ بھی یہی سمجھتے تھے کہ ولسن کے تحفظ کی خاطر کیے جانے والے انتظامات محض حکومت کے اعلیٰ افسران کا شکی پن ہے۔ انہیں یہ تاثر دینے میں غالباً خود ولسن کا ہاتھ بھی رہا ہوگا اور اسی کی اجازت سے روزانہ اس کے محافظ ایک مخصوص وقت پر ایک جگہ مل کر چائے پیتے ہوں گے۔ حد سے بڑھی ہوئی ان کی یہی خود اعتمادی ہمارے حق میں سودمند ثابت ہوئی۔

کسی پریشانی اور رکاوٹ کے بغیر میں جھاڑیوں کے درمیان سے رینگ کر چاروں ہاتھ پیروں کے بل دوڑتا ہوا کوٹھی میں اس جگہ پہنچ گیا جہاں ٹیپو میرا منتظر تھا۔ میرے وہاں پہنچتے ہی ٹیپو نے مجھے سرگوشی میں بتایا کہ خواب گاہ کا عقبی دروازہ کھلا ہوا ہے۔ چند ہی لمحوں بعد ٹیپو آہستہ سے خواب گاہ کا دروازہ کھول کر اندر رینگ گیا۔ اسے ولسن کی مسہری کے نیچے چھپنا تھا۔ میں اسی دروازے کے سامنے برآمدے کے نیچے کیاری میں لگے ہوئے پودوں کے درمیان دم سادھ کر بیٹھ گیا۔

قطرہ قطرہ وقت کا دریا بہتا رہا۔ لمحے ٹپ ٹپ گرتے رہے۔

عقبی حصے کا محافظ احاطے کا چکر لگا کر برآمدے میں پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی کرسی ولسن کی اسٹڈی کی کھڑکی کے سامنے تھی۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ محافظ دھیمی آواز میں کوئی محبت بھرا گیت گا رہا تھا۔ رات کی ان تنہائیوں میں اسے شاید ہندوستان سے ہزاروں میل دور انگلستان میں بیٹھی ہوئی اپنی محبوبہ یاد آرہی تھی۔

پھر میں نے اسی کھڑکی سے ولسن کی آواز سنی "جیکب!" اس نے محافظ کو مخاطب کیا "سب کچھ ٹھیک ہے؟"

"یس سر! حسب معمول" محافظ نے کرسی سے اٹھ کر جواب دیا۔

"گڈ نائٹ!" ولسن کی آواز ابھری۔

"گڈ نائٹ سر!" محافظ نے جواب میں کہا۔

ولسن نے کھڑکی بند کرلی۔ چند ہی لمحوں کے بعد اسٹڈی کی روشنیاں بجھ گئیں اور کھڑکی سے آتی ہوئی روشنی کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ محافظ اپنی کرسی ذرا پیچھے کھسکا کر ایک طرف قدم اٹھانے لگا۔ میں اپنی جگہ سمٹ کر اور ساکت ہو کے بیٹھ گیا۔ وہ مجھ سے بہت قریب تھا اور اس کے ہاتھوں میں گن تھی۔ معلوم نہیں کیوں اس نے اپنے شانے سے گن اتار کر ہاتھ میں لے لی تھی۔ وہ چلتا ہوا برآمدے کے آخری کونے تک گیا اور اسی انداز میں پھر واپس آکر اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ گن اب اس نے اپنی گود میں رکھ لی تھی۔ اسی عرصے میں ولسن کی خواب گاہ کی تیز روشنیاں بھی بجھ گئی تھیں اور ہلکی نیلی روشنی پھیل گئی تھی۔ عقبی احاطہ اور برآمدہ اب مکمل تاریکی میں ڈوب گئے تھے۔

لمحوں کی پیمائش بڑھتی رہی۔ میرا دل اب تیز رفتاری سے دھڑکنے لگا تھا۔ خواب گاہ سے اب ولسن کے خراٹوں کی مدھم آواز میرے کانوں میں آرہی تھی۔ منصوبے کے آخری فیصلہ کن لمحات بہت قریب آگئے تھے۔ ٹیپو کو اب سوتے ہی میں ولسن کے ہوش و حواس گم کرنا تھے۔ اسے ولسن کو کلوروفارم سنگھا کر بے ہوش کرنا اور اس کے ہاتھ پیر باندھنا تھے۔ ایسا کرنے کے بعد اسے خواب گاہ کے دروازے سے مجھے اشارہ کرنا تھا اور مجھے کرسی پر بیٹھے ہوئے محافظ کا انتظام کرنا تھا۔

جیب سے میں نے غلیل اور لوہے کا کانٹے دار غلہ نکال لیا۔ اعصاب شکن لمحات گزرتے رہے۔ میرے دانت ایک دوسرے پر مضبوطی سے جمے ہوئے تھے۔ اس سے مجھے اپنے جبڑوں میں لٹکا لٹکا سا درد محسوس ہونے لگا تھا۔ وقت تھا کہ

دروازے سے مجھے اشارہ کیا۔

میں بے آہستگی کیاری سے رینگ کر باہر آیا۔ ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی جو اس ماحول میں واضح طور پر سنی جاسکتی تھی لیکن تیز ہوا نے سرسراہٹ کی اس آواز کو اپنی سائیں سائیں کا حصہ بنالیا تھا۔ محافظ اس وقت احاطے کی طرف منہ کیے کوئی گیت گنگنانے میں مصروف تھا۔ اسے یقیناً یہ علم نہیں تھا کہ اگلے چند لمحوں میں اس کے ہونٹوں پر مچلتا ہوا وہ گیت بکھر جائے گا۔

میں گھٹنوں کے بل زمین پر کھڑا ہوا، پھر پوری قوت سے غلیل کی موٹی اور سخت ربر کھینچ لی۔ دوسرے ہی لمحے لوہے کا کانٹے دار غلہ پوری بے رحمی کے ساتھ محافظ کی کھوپڑی میں کنپٹی کے آس پاس کہیں بیٹھ گیا۔ وہ آواز نکالے بغیر ہی کرسی پر بے ہوش ہوگیا۔ پھر میں لپکتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا۔ اس خیال سے کہ جلد ہی ہوش میں آکر وہ چیخنا شروع نہ کردے، میں نے اس کے منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھنا بھی ضروری تھے۔ میں نے چند منٹوں میں یہ کام انجام دے دیا، پھر محافظ کو اس کرسی سے اٹھا کر برآمدے کے ساتھ ہی بنی ہوئی کیاری میں ڈال دیا۔ اس کی گن بھی میں نے کیاری ہی میں پھینک دی تھی۔ اس دوران میں ٹیپو بے ہوش ولسن کو اپنے کاندھے پر لاد کر برآمدے میں آچکا تھا۔

"شاہین! تم اسے لے کر چلو۔" ٹیپو دھیمی آواز میں بولا "میں اسٹڈی کی تلاشی لیتا ہوں، شاید کچھ اہم کاغذات ہاتھ آجائیں۔"

مجھے ٹیپو کی یہ تجویز پسند آئی تھی۔ میں نے بے ہوش ولسن کو اپنے شانے پر منتقل کرتے ہوئے کہا "جلدی کرنا!" میری آواز بھی دھیمی ہی تھی۔

باڑھ کو پار کرنے کے لیے میں نے ولسن کے بے ہوش جسم کو زمین پر ڈال دیا اور پھر اسے باڑھ سے باہر کی طرف گھسیٹنے لگا۔ اسی وقت ایک زوردار تحکمانہ آواز سنائی دی جو کوٹھی کی طرف سے آئی تھی۔

کسی نے انگریزی میں کہا تھا "کون ہے؟"

اس کے ساتھ ہی کوٹھی میں جیسے بھونچال آگیا تھا۔ ایک ہنگامہ مچ گئی۔ پھر میں نے گولی چلنے کی آواز سنی۔ اس کے ساتھ ٹیپو کی چیخ بھی ابھری تھی۔ اس کے بعد پے در پے دو تین فائر ہوئے اور فضا دھماکوں سے گونج اٹھی۔

میں پریشان ہوگیا لیکن کر بھی کیا سکتا تھا، اس وقت میری سب سے اہم ذمے داری اس منصوبے کی تکمیل تھی۔ اس کا تقاضا یہ تھا کہ ولسن کے بے ہوش جسم کو رسی کے پل

سے نشیب میں پہنچا دیا جائے۔ میں ولسن کو اپنے کاندھے پر ڈالے تقریباً بھاگتا ہوا ہموار ٹیلے تک پہنچا۔ میں نے ٹارچ کی روشنی سے نشیب اور بلندی پر سراج الدولہ اور بخت خاں کو خطرے کا سگنل دینے کے ساتھ ولسن کے اغوا میں کامیابی کا سگنل بھی دیا۔ ولسن کو میں نے بورے میں ڈالا اور اس مخصوص کارڈ پر جو ایک طرف سے سرخ اور دوسری طرف سے سفید تھا، کتھئی رنگ کی پینسل سے مختصر سا پیغام لکھا "خطرہ! پلی کو فوراً واپس بھیجو!"

مخصوص رنگ کے کارڈ پر مخصوص رنگ کی پینسل سے لکھی ہوئی تحریر سراج الدولہ کو یہ یقین دلانے کے لیے کافی تھی کہ میرا منصوبہ وہی تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے یہ کارڈ سیفٹی پن سے بورے میں ٹکا دیا۔ پھر بورے کو متحرک پلی میں لٹکا کر دوہرے رسے میں سے ایک رسے پر کس کے پھنسا دیا، اس کے بعد رسی کو جھٹکا دے کر بخت خاں کو اشارہ کیا کہ وہ یہ پلی اوپر کھینچ لے۔ میں نے اس چھوٹی پلی میں دوسرے کارڈ پر بخت خاں کے لیے یہ پیغام لکھ کر بھیج دیا تھا کہ وہ انتظار کرے متحرک پلی پھر اوپر آنے والی ہے۔

ذرا ہی دیر کے بعد نشیب سے متحرک پلی کو ڈھیل دی جانے لگی اور ولسن بورے میں بند نشیب کی طرف جانے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے اس تمام کارروائی میں صدیاں گزر گئیں تھیں۔ اس عرصے میں چند منٹ کے لیے کوٹھی کے اندر پے در پے فائرنگ ہوئی تھی۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ ٹیپو کا مقصد صرف یہ تھا کہ وہ آخری دم تک ولسن کے سب محافظوں کو وہیں الجھائے رکھے تاکہ مجھے ولسن کو نیچے لے جانے کا موقع مل جائے۔

کوٹھی کی طرف سے اب فائرنگ کی آوازیں آنا بند ہوگئی تھیں البتہ وہاں سے انگریزی میں چیخ پکار ضرور سنائی دے رہی تھی۔ میں اب ہموار ٹیلے سے اتر کر پھر کوٹھی کی جانب تیزی سے دوڑ رہا تھا۔ بھرا ہوا پستول میرے ہاتھ میں تھا۔

باڑھ کے پاس میں اس مقام پر بھاگتا ہوا پہنچا جہاں سے مجھے کوٹھی کے احاطے میں داخل ہونا تھا۔

"طارنوش!" جھاڑیوں کی طرف سے مجھے آواز سنائی دی۔ یہ آواز میرے لیے حیرت و استعجاب کا سبب تھی۔ مجھے میرے اصلی نام سے پکارنے والا مجاہد اوّل ہی تھا۔ یہ آواز اسی کی تھی۔

"جی جناب!" میں جواباً بولا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم واپس آؤ گے۔" مجاہد اوّل جھاڑی سے نکل کر باہر آگیا "ٹیپو زخمی اور بے ہوش ہے ولسن کا کیا کیا؟"

مختصر الفاظ میں اور جلدی جلدی میں نے مجاہد اوّل کو سب کچھ بتا دیا۔

"یہ تم نے بہت اچھا کیا۔ اب تم ٹیپو کو لے کر جاؤ۔" اسی وقت کوٹھی کی بیرونی سمت سے فائرنگ کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ اس مرتبہ فائرنگ بڑی شدید تھی۔

"یہ کیا ہوا؟" میں نے مجاہد اوّل سے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں، وہ تمہارے مقامی ساتھی ہی ہیں اور محافظوں کی توجہ گیٹ ہی کی طرف مرکوز رکھنا چاہتے ہیں۔" مجاہد اوّل نے تیزی سے کہا "اب تم جاؤ!" یہ کہہ کر مجاہد اوّل پھرتی سے باڑھ کے ساتھ ساتھ کوٹھی کے سامنے والے حصے کی طرف بڑھ گیا۔ سیاہ لباس کے سبب وہ اندھیرے ہی کا حصہ معلوم ہو رہا تھا۔

ٹیپو کو اپنے شانے پر ڈال کر میں تھوڑی دیر بعد ہی ہموار ٹیلے تک پہنچ گیا۔ کوٹھی کی طرف سے آنے والی فائرنگ کی آوازیں پھر معدوم ہوگئی تھیں۔ ہموار ٹیلے پر پلی واپس آچکی تھی۔

اصل منصوبہ یہ تھا کہ ولسن کو اغوا کر کے مجھے اسی کے ساتھ نشیب میں جانا تھا۔ ٹیپو کو یہاں سے پیدل جتی ہٹیاں کی طرف لوٹنا تھا۔ ولسن پہلے ہی نیچے جا چکا تھا۔ اس لیے مجھے ٹیپو کے ساتھ نیچے جانے میں کوئی قباحت نہیں رہی تھی۔

میں نے ٹیپو کے بے ہوش جسم کو اپنے شانے سے اتار کر بورے میں ڈالنے کے بعد نشیب اور بلندی کی مہم کی تکمیل کا اشارہ دیا۔ اس کے بعد خود مجھے بھی اسی بورے میں بیٹھنا تھا۔ معلوم نہیں کس طرح بورے میں بیٹھنے کے لیے جب میں نے پیر اٹھایا تو وہ الجھ گیا۔ کوشش کے باوجود میں اپنے جسم کا توازن برقرار نہ رکھ سکا۔ مجھے یاد ہے کہ جس وقت میں بورے میں داخل ہونے کے لیے پیر اٹھا رہا تھا تو میرے ذہن میں لمحے بھر کو یہ خیال آیا تھا کہ کہیں میرا پیر ٹیپو کے زخمی اور بے ہوش جسم پر نہ پڑ جائے! وہی ایک ایسا غافل لمحہ تھا کہ میرا پیر بورے میں الجھ گیا۔

ادھر تو میرے جسم کا توازن بگڑا ادھر رسے کو نیچے سے ڈھیل دے دی گئی۔ اس سے پہلے ہی میں بورے کو ہک میں لٹکا چکا تھا۔ میرا پیر ابھی تک بورے میں پھنسا ہوا تھا۔ بورا نشیب کی طرف جانے لگا تو میں بھی اس کے ساتھ گھسٹنے لگا۔ پھر میرا جسم ہموار ٹیلے سے گھسٹتا ہوا اس مقام تک آگیا جس

کے بعد گہرا کھڈ تھا۔ چند لمحے میں نے خود کو فضا میں معلق محسوس کیا اور پھر میرے جسم کا بوجھ پڑا تو بورے میں الجھا ہوا پیر آزاد ہو گیا۔ میں نے فضا میں قلابازی سی کھائی۔ اب میرا جسم تیزی کے ساتھ گہرے کھڈ میں گر رہا تھا۔ اتنی بلندی سے گہرے کھڈ میں گرنے کے بعد میرے زندہ بچ جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنی زندگی سے مایوس ہو جانے کے باوجود ابھی تک میرے حواس برقرار تھے۔

گزرتا ہوا ایک ایک لمحہ مجھے ایک یقینی موت سے قریب تر کرتا جا رہا تھا کہ اچانک میرے جسم کو جھٹکے سے لگے اور پھر میں نے اپنے جسم کو انتہائی ہلکا پھلکا محسوس کیا۔ تیزی کے ساتھ نیچے گرتے گرتے میرا جسم سنبھل گیا۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ میرے اندر جناتی صفات بیدار ہو گئی ہیں' وہ جناتی صفات جو خود میرے ہی وجود کا حصہ ہیں اور جو مجھے اپنے باپ ہاموس کی طرف سے ورثے میں ملی ہیں۔

پہلے بھی میں اس پراسرار تجربے سے گزر چکا تھا۔ پہلی مرتبہ مجھے یہ پراسرار تجربہ دہلی میں اس وقت ہوا تھا جب میں ایک دو منزلہ مکان کی کھڑکی سے نیچے گرا تھا۔ میرا جسم اب آہستہ آہستہ گہرے کھڈ کی طرف جا رہا تھا۔ مجھے اپنے جسم کا وزن قطعی محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

میں اس جگہ سے خاصے فاصلے پر نشیب میں اترا جہاں سراج الدولہ اور دو مقامی ساتھی موجود تھے۔

کچھ دیر میں اسی جگہ اندھیرے کا حصہ بنا کھڑا رہا۔ میں آگے بڑھنے ہی والا تھا کہ میرے جسم کو پھر شدید جھٹکے لگے اور میں زمین پر بیٹھ گیا۔ اس کیفیت سے نکلنے میں مجھے آدھے منٹ سے زیادہ نہیں لگا ہو گا کہ میرے جسم کی توانائی لوٹ آئی۔

میرے کسی بھی ساتھی کو یہ علم نہیں تھا کہ مجھ پر کیا گزری ہے اور یہ کہ میں ایک یقینی موت سے بچ گیا ہوں۔ میرے وجود کی پراسراریت سے ان کا ناآشنا رہنا ہی میرے حق میں بہتر تھا اور اس کی صرف ایک ہی صورت تھی۔ میں نے اسی پر عمل کیا۔

وقتی طور پر بخت خاں' سراج الدولہ اور میرے مقامی ساتھی میری طرف سے کچھ پریشان و فکرمند تو ضرور ہوتے۔ مگر میں نے جو قدم اٹھایا تھا اس کے بعد میری پراسرار شخصیت کا راز ان پر نہ کھلتا۔

میرا رخ اب نشیب میں کچھ فاصلے پر موجود اپنے ساتھیوں کی بجائے مخالف سمت میں تھا۔ مجھے یقین تھا کہ میرے ساتھی منصوبے کے بالکل آخری مراحل بہ خوبی طے کرلیں گے۔ اس کے لیے انہیں میری مدد کی ضرورت نہیں تھی۔ اصل مہم بہرحال سر کرلی گئی تھی۔ ہم ولسن کو اغوا کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

بقیہ حصہ منصوبے کا یہ تھا کہ ولسن کو مجاہد اول کے حوالے کر دیا جاتا۔ آخری مراحل یہ تھے کہ وہاں سے ہر وہ شے ہٹا دینا تھی جس سے یہ سراغ لگایا جا سکتا تھا کہ ولسن کو کس طرح اغوا کیا گیا! سراج الدولہ اور اس کے مقامی ساتھی بلیوں پر بندھے ہوئے رسے کو نیچے کھینچ لیتے۔ اس رسے کو وہیں زمین میں دفن کرنے کے لیے سر شام ہی سراج الدولہ اور اس کے دونوں ساتھیوں نے گہرا گڑھا کھود لیا تھا۔ اس کے بعد درخت میں بندھی ہوئی پلی بھی کھول لی جاتی۔ بلندی پر یہی کارروائی بخت خاں بھی مکمل کر لیتا اور پھر وہاں سے سراج الدولہ کو روانگی کا اشارہ دیتا۔ سراج الدولہ کو اس کا جواب ٹارچ کی روشنی سے دینا تھا۔

ان تمام کارروائیوں سے نمٹنے کے بعد سراج الدولہ کی یہ ذمے داری بھی تھی کہ وہ پن چکی کے مالک کو بھی کھول دیتا۔ کھولنے کے بعد اسے یہ دھمکی بھی دینا تھی کہ اس نے کسی سے کچھ کہا تو جان کی خیر نہیں ہو گی۔ اس کے بعد مقامی ساتھیوں کو جدا ہو جانا تھا۔ سراج الدولہ اور بخت خاں کو بٹیاں والے مکان کا رخ کرنا تھا۔ خود میرا رخ بھی اب اسی طرف تھا۔

O☆O

اس کے بعد ٹیپو اور میں تقریباً ایک ماہ تک کے لیے گھر ہی میں محدود ہو کر رہ گئے تھے۔ یہ ہدایت ہمیں مجاہد اول کی طرف سے دی گئی تھی کیوں کہ راولپنڈی میں پولیس اور خفیہ کے کارکن ہماری تلاش میں تھے۔ راولپنڈی ہی میں علی حسن کو بھی دیکھا گیا تھا۔ محکمہ خفیہ کا یہ وہی مونچھوں والا تھا جو لاہور میں مجھے پھنسوا کر غائب ہو گیا تھا۔ یہ شخص میرے ڈیڈی کے ماتحتوں میں سے تھا۔ طارنوش کی حیثیت سے وہ مجھے پہچانتا تھا اور میرے لیے یہی سب سے بڑا خطرہ تھا۔ میں اس نتیجے پر تو پہنچ چکا تھا کہ علی حسن میرے ڈیڈی ہی کے ایما پر میری نگرانی کرتا ہوا لاہور تک آیا تھا لیکن اب وہ راولپنڈی میں کیوں نظر آ رہا تھا' یہ بات میری سمجھ میں نہیں آ سکی تھی۔ لاہور سے فرار ہو کر میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پہلے لائل پور (فیصل آباد) گیا تھا' پھر وہاں سے ہم ملتان پہنچے تھے۔ ملتان کے بعد میں کچھ عرصے کراچی میں رہا تھا اور اب راولپنڈی میں تھا۔ ظاہر ہے کہ اس میں مجھے خاصا وقت لگا تھا۔ یہ تو مجھے معلوم تھا کہ سی آئی اے والے میری تلاش میں ہیں۔ میں لاہور میں ان کی قید سے نکل کر بھاگ گیا تھا۔ خاصے پولیس والے بھی میرے ہاتھوں زخمی ہوئے تھے۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا کہ وہ چپ ہو کر بیٹھ رہتے۔ جہاں جہاں میرا سراغ لگنے کے امکانات ہو سکتے تھے وہاں وہ ضرور مجھے تلاش کرنے کی کوشش کرتے۔ خفیہ کے بہرحال کچھ افراد ایسے ضرور تھے جو طارنوش کی حیثیت سے مجھے شناخت کر سکتے تھے۔ انہی میں سے ایک یہ علی حسن بھی تھا۔ لاہور میں جن لوگوں نے مجھ سے پوچھ گچھ کی تھی' وہ بھی مجھے پہچان سکتے تھے۔ کیتھی کون تھی اور خفیہ میں کس عہدے پر فائز تھی' یہ تو میرے علم میں نہیں تھا مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ وہ کسی بڑے عہدے ہی پر رہی ہو گی۔ اس نے اسی لیے تو سی آئی اے کے ڈائریکٹر ڈیسوزا کی بھی پروا نہیں کی تھی' وہ جنہیں میں اپنا ڈیڈی کہتا تھا اور جنہوں نے میری پرورش کی تھی۔ اطلاعات کے مطابق کیتھی کو کراچی میں بھی دیکھا گیا تھا۔ اسی اطلاع کے بعد میں چوکنا ہو گیا تھا اور پھر مجاہد اول نے مجھے راولپنڈی بلا لیا تھا۔ میں موجودہ حالات میں اسی نتیجے پر پہنچ سکتا تھا کہ جہاں بھی حکومت کے خلاف کوئی بڑا قدم اٹھایا جاتا تھا یا حکومت کے خلاف سرگرمیاں شروع ہو جاتی تھیں' خفیہ والے وہاں میری تلاش میں پہنچ جاتے ہوں گے۔ راولپنڈی میں ابھی ایک ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ولسن کا اغوا کوئی معمولی نوعیت کا حامل بہرحال نہیں تھا۔ ان حالات میں مجاہد اول کا یہ فیصلہ قطعی درست تھا کہ میں فی الحال گھر سے نہ نکلوں' اس وقت تک جب تک کہ حالات معمول پر نہ آ جائیں۔ مصلحتاً اور بہ طور احتیاط ان دونوں ساتھیوں کو بھی وقتی طور پر وہاں سے ہٹا لیا گیا تھا جو پہلے اسی گھر میں میرے ساتھ تھے' یعنی سراج الدولہ اور بخت خاں! اب اس گھر میں صرف میں تھا اور ٹیپو!

ولسن کے اغوا والی رات کو میں نے گھر پہنچ کر بات بنا دی تھی۔ میں دانستہ دیر سے گھر پہنچا تھا۔ سراج الدولہ اور بخت خاں میری طرف سے فکرمند تھے۔ "میں ایک لمبا چکر کاٹ کر یہاں پہنچا ہوں اس لیے دیر ہو گئی۔" میں نے کہا تھا۔

"مگر تم ٹیپو ہی کے ساتھ بورے میں کیوں نہیں بیٹھ گئے تھے؟" بخت خاں نے سوال کیا تھا۔

"منصوبے کے مطابق ٹیپو کو پیدل یہاں پہنچنا تھا۔ وہ خلاف توقع زخمی ہو کر ہوش کھو بیٹھا تو میں نے یہی مناسب سمجھا کہ اسے نشیب میں پہنچا کر خود میں اس کی جگہ پیدل یہاں پہنچوں۔ تم لوگوں نے کیوں یہ فرض کر لیا تھا کہ اس کے ساتھ میں بھی بورے میں بیٹھوں گا!"

"مگر محفوظ راستہ تو یہی تھا کہ آپ۔۔۔"

"خیر اب اس قصے کو چھوڑو!" میں نے سراج الدولہ کی بات کاٹ دی تھی اور پھر زخمی ٹیپو کی طرف متوجہ ہو گیا تھا جسے ہوش آ رہا تھا۔

ولسن کے اغوا کا ردعمل راولپنڈی میں یہ ہوا کہ شہر میں موجود تمام ڈاکٹروں کے کلینک' ان کے گھروں اور کمپاؤنڈروں کے گھروں پر بھی پولیس نگرانی کرنے لگی۔ ریلوے اور راولپنڈی سے باہر جانے والے راستوں پر بھی پولیس کی کڑی نگرانی تھی۔ پولیس اور خفیہ کا خیال تھا کہ ولسن کو اغوا کرنے والوں میں سے کم از کم ایک شخص یقیناً زخمی ہوا تھا۔ ان کے خیال کے مطابق اپنے زخمی ساتھی کے علاج معالجے کی خاطر انہیں کسی نہ کسی ڈاکٹر کے پاس پہنچنا ہی تھا۔ اس امکان کے پیش نظر کہ شاید وہ زخمی ہلاک ہو گیا ہو' قبرستان اور شمشان گھاٹ پر بھی پولیس کا پہرا تھا۔ کسی مردے کی تدفین سے قبل یا کسی ارتھی کو چتا پر پھونکنے سے پہلے پولیس کے کارندے لاش کا جائزہ لے کر اپنا اطمینان کر لیتے تھے۔

یہ تمام باتیں ہمیں اس وقت معلوم ہوئیں جب دو تین روز کے بعد بخت خاں دوبارہ ہمارے پاس آ کر رہنے لگا۔ وہ مکان دو منزلہ تھا' نچلی منزل کے علاوہ اوپر بھی دو کمرے بنے ہوئے تھے۔ بخت خاں کی آمد کے بعد ٹیپو اور میں اوپری منزل پر منتقل ہو گئے۔ بخت خاں نیچے ہی ایک کمرے میں رہا۔

بیرونی دنیا سے اب ہمارے رابطے کا ذریعہ بخت خاں ہی تھا۔ احتیاطاً اس نے کھانے پینے کا اتنا سامان گھر میں جمع کر دیا تھا کہ اب ہم گھر سے نکلے بغیر بھی ایک ماہ تک بھوکے رہے بغیر اس گھر میں گزارہ کر سکتے تھے۔

پہلے دو دن ٹیپو کی حالت بہت خراب رہی۔ اس کا زخمی بازو بری طرح پھول گیا تھا۔ گھر میں اسپرٹ اور ٹنکچر کے سوا کچھ نہ تھا۔ اسی سے میں زخم کی صفائی اور ڈریسنگ کر رہا تھا۔ تیسرے دن تنظیم سے وابستہ ایک ڈاکٹر لاہور سے ضروری دوائیں لے کر راولپنڈی پہنچا۔ وہ ایک ہفتے ہمارے ساتھ ہی مقیم رہا۔ اس کی پیشہ ورانہ توجہ اور مہارت سے ٹیپو کے بازو کا زخم جلد ہی ٹھیک ہونے لگا۔ وہ ڈاکٹر ایک ہفتے قیام کے بعد واپس چلا گیا۔ اس نے ہمیں ضروری دوائیں اور ان کے استعمال کا مکمل طریقہ سمجھا دیا تھا۔

ولسن کے بارے میں بخت خاں نے مجھے بتایا تھا کہ اغوا والی رات ہی اسے راولپنڈی سے مجاہد اول نے کہیں اور منتقل کر دیا تھا۔ مجھے نہ معلوم کیوں یہ یقین تھا کہ مجاہد اول'

ولسن پر تشدد کی انتہا کردے گا اور یہ بات اگلوا ہی لے گا کہ ہندوستان میں اس کی آمد کا مقصد کیا تھا۔

اسی دوران میں دہلی سے ایک خبر ملی کہ وہاں حکیم اجمل خاں کی صدارت میں خلافت کمیٹی کا اجلاس ہوا جس میں پانچ سو علما کے فتوے چھپوا کر ملک بھر میں تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس فتوے میں انگریزی فوج اور پولیس کی ملازمت مسلمانوں کے لیے حرام قرار دی گئی تھی۔ اس فتوے کو پہلے ہی حکومت ضبط کرچکی تھی۔ کانگریسی لیڈر گاندھی جی بھی جو ابھی تک تحریکِ خلافت کے کراچی ریزولیشن پر خاموش تھے' انہوں نے بھی اس کی حمایت کا اعلان کردیا۔ پھر بمبئی میں ہندوستان بھر کے رہنماؤں کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں بھی کراچی ریزولیشن کی تمام باتوں کو دہرایا گیا۔

اب ایک طرح سے ہندوستان نے سیاسی طور پر انگریز حکومت کے خلاف اعلان جنگ کردیا تھا۔ اس موقع پر ہندوستانیوں نے اس عزم کا اعادہ بھی کیا تھا کہ وہ پرنس آف ویلز کے دورۂ ہند کا مکمل بائیکاٹ کریں گے۔

مجھے علم تھا کہ مجاہدِ اوّل راولپنڈی سے بمبئی جاچکا تھا۔ یہ عین ممکن تھا کہ اس نے بمبئی میں جمع ہونے والے سیاسی رہنماؤں سے ملاقاتیں کی ہوں اور ان پر دباؤ ڈالا ہو کہ پرنس آف ویلز کے دورے کا سیاسی سطح پر بائیکاٹ کیا جائے۔

اطلاعات کے مطابق ملک بھر میں احتجاج' جلسے جلوس اور مظاہرے ابھی سے شروع ہوگئے تھے۔ رفتہ رفتہ تمام ہندوستان صدائے احتجاج بنتا جارہا تھا۔ حکومت سے مطالبہ کیا جارہا تھا کہ وہ مولانا محمد علی جوہر' مولانا شوکت علی' شنکر آچاریہ' مولانا عبدالکلام آزاد' مولانا حسرت موہانی' مولانا ظفر علی خاں' مولانا نصیر احمد' پیر غلام مجدد' مولانا حسین احمد اور ڈاکٹر سیف الدین کچلو کو رہا کرے۔ ان میں سے شنکر آچاریہ کو رہا کردیا گیا۔ مولانا جوہر اور ان کے ساتھیوں پر بغاوت کا جو مقدمہ قائم کیا گیا تھا اس میں انگریزی حکومت نے قانون کے کئی تقاضے پورے نہیں کیے تھے۔ کئی طے شدہ عدالتی روایات سے انحراف کیا اور یہ ثابت کردیا کہ ہر دور میں اصل قانون صرف اور صرف طاقت ہے۔ طاقت کے سامنے انصاف' حق' اقدار اور روایات کچھ نہیں۔ آئین' قانون اور کتابوں میں جو کچھ لکھا ہے بے معنی ہے۔ سچ صرف وہی ہے جو طاقت کے بل پر اقتدار میں آنے والے کے منہ سے نکلتا ہے' ہر مقدس قانون اس کی مرضی کا تابع ہوتا ہے۔

یہ وہ حالات تھے جن کی وجہ سے مجھے اور میرے دونوں ساتھیوں کو یقین تھا کہ ہمیں جلد ہی کسی اہم مہم پر روانگی کی ہدایات ملیں گی۔ مجاہدِ اوّل نے راولپنڈی سے چلتے وقت ہدایت کی تھی کہ وہ ہمیں اس شہر سے نکلنے کی اسی وقت اجازت دے گا جب ولسن کے اغوا کا معاملہ ٹھنڈا پڑجائے گا۔ حالات کے پیشِ نظر پہلے احکام واپس لے لیے گئے تھے جن کی رو سے مجھے کلکتے جانا تھا۔ فاطمہ اور جوگیندر وہیں تھے۔

میرا خیال تھا کہ انگریز حکومت شاید ولسن کو صبر کر بیٹھی تھی۔ نیپو کے بازو کا زخم بھی مندمل ہوگیا تھا' لیکن یہ ابھی کچا ہی تھا۔ وہ اپنے بازو کو پوری قوت سے استعمال نہیں کرسکتا تھا۔

پھر ایک سہ پہر سراج الدولہ ہمارے پاس پہنچ گیا۔ ہمارے لیے مجاہدِ اوّل کا پیغام لے کر آیا تھا۔ ولسن کے اغوا کے بعد مجاہدِ اوّل کے حکم پر چوتھے روز وہ راولپنڈی سے چلا گیا تھا۔ اس سے تقریباً ایک ماہ بعد میری ملاقات ہورہی تھی۔

مجاہدِ اوّل کے نئے احکام کے مطابق مجھے اور بجنت خاں کو دہلی پہنچنا تھا۔ نیپو اور سراج الدولہ کو اب کلکتے جانے کی ہدایت دی گئی تھی۔

تنظیم ان دنوں اپنے کارکن ہندوستان کے ان شہروں میں پھیلا رہی تھی جہاں دورۂ ہند کے موقع پر پرنس آف ویلز کو پہنچنا تھا۔ پھر ان سب لوگوں کو دہلی میں جمع ہونا تھا جہاں پرنس آف ویلز کے اعزاز میں ایک زبردست تقریب کا اہتمام کیا جانے والا تھا۔

حسبِ معمول بجنت خاں اس وقت بھی گھر پر نہیں تھا۔ عموماً وہ گھر سے باہر ہی رہتا تھا تاکہ باہر کی خبریں مجھ تک پہنچ سکیں۔ علی حسن ابھی تک راولپنڈی ہی میں تھا' یہ خبر بھی مجھے بجنت خاں ہی نے فراہم کی تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔

بجنت خاں رات گئے واپس آیا۔ راولپنڈی میں وہ پہلے بھی رہ چکا تھا۔ یہاں اس کے خاصے دوست تھے۔ ان میں اینگلو انڈین بھی تھے' کچھ لڑکیاں بھی تھیں وہ لوگ مختلف سرکاری محکموں میں کام کرتے تھے۔ بجنت خاں نے خاص طور پر راولپنڈی میں ان لوگوں سے دوستی اور بھی بڑھائی تھی جو محکمہ خارجہ' دفاع اور خفیہ کے محکموں سے کسی نہ کسی طور پر وابستہ تھے۔ ان لوگوں سے اسے بعض بہت اہم معلومات حاصل ہوجاتی تھیں۔ بجنت خاں ایک پروقار اور پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ اس میں بڑی صلاحیتیں تھیں۔ دوست بنانے کی صلاحیت بھی انہی میں سے ایک تھی۔ لڑکیاں اس سے بہت جلد مرعوب ہوجاتی تھیں اس کی بڑی بڑی خوب صورت آنکھوں میں جادو ہی ایسا تھا۔ لڑکیوں سے وہ بڑی شاعرانہ گفتگو کرتا تھا کیوں کہ وہ خود بھی ایک اچھا شاعر تھا۔ میں نے اس کی کئی غزلیں سنی تھیں۔ وہ "بجنت" ہی تخلص کرتا تھا اور اپنی غزل کے مقطع یعنی آخری شعر میں "بجنت" کو اس طرح استعمال کرتا تھا جس طرح حکیم مومن خاں مومن دہلوی اپنے تخلص "مومن" کو مقطع میں استعمال کرتے تھے مثلاً

عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بجنت خاں کی غزل کا ایک مقطع مجھے آج تک یاد ہے۔ میں نے اسے اس مقطع پر بڑی داد دی تھی۔

بجنت ہی اپنا سوگیا ورنہ
لوگ بیدار ہونے والے تھے

اس رات ہم دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ ہم سبھی اوپری منزل پر تھے۔ میرے ایما پر بجنت خاں بھی اپنا بستر نیچے سے اٹھالایا تھا۔ ہم چاروں ساتھی میں' نیپو' بجنت خاں اور سراج الدولہ اس پر غور کررہے تھے کہ راولپنڈی سے کس طرح نکلا جائے؟ سراج الدولہ اور بجنت خاں کے لیے تو میرے نزدیک وہاں سے نکلنا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اصل مسئلہ میرا تھا اور کسی قدر نیپو کا بھی' اس لیے کہ وہ بھی لاہور میں گرفتار ہوچکا تھا۔ حکومت دکن کی حیثیت سے اسے کم از کم خفیہ کے وہ افراد تو پہچان ہی سکتے تھے جنہوں نے اسے گرفتار کیا تھا۔ جب علی حسن دہلی سے راولپنڈی آسکتا تھا لاہور کے خفیہ والے بھی راولپنڈی پہنچ سکتے تھے۔

سراج الدولہ اس رات مجھے کچھ بجھا بجھا سا محسوس ہوا۔ اس کے مزاج میں جو شگفتگی تھی شاید سفر کی تکان کی سبب مفقود ہوگئی تھی۔ وہ بار بار جمائیاں لے رہا تھا اور کئی مرتبہ سونے کی خواہش کا اظہار بھی کرچکا تھا۔ ہم چاروں ایک ہی کمرے میں تھے اور اس رات ہم نے وہیں سونے کو ترجیح دی ورنہ نچلی منزل کے کمرے خالی تھے۔ سراج الدولہ یا ہم میں سے کوئی بھی وہاں سو سکتا تھا۔ رات کو کوئی ایک بجے ہم سب اپنے بستروں پر سونے کے لیے لیٹ گئے۔

رات کو تین بجے کے قریب اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ اس وقت سراج الدولہ کمرے کے وسط میں کھڑا تھا اور بجنت خاں نے اس پر پستول تان رکھا تھا۔ بجنت خاں ہی نے مجھے ٹھوکا دے کر اٹھایا تھا۔ پہلے پہل تو میری سمجھ میں کچھ نہ آیا کہ بجنت خاں کیا کہہ رہا ہے' پھر جب اس کی بات میری سمجھ میں آئی تو میں نے تیزی کے ساتھ اٹھ کر باہر راہداری میں کھلنے والا دروازہ بند کردیا۔ بجنت خاں مجھ سے دروازہ بند کرنے کے لیے ہی کہہ رہا تھا۔

"کیا بات ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس غدار سے پوچھو!" بجنت خاں نے پستول کی نال سے سراج الدولہ کی طرف اشارہ کیا۔

"سراج الدولہ اور غدار!" میں حیرت سے بولا "کیا ستم ظریفی تھی کہ ہمارے اس ساتھی نے ایک ایسی شخصیت کا نام اختیار کیا تھا جس کے ساتھ غداری کا تصور تک گناہ تھا۔

بجنت خاں نے مضبوط لہجے میں کہا "ہاں یہ غدار ہے اس سے پوچھو کہ اس نے ٹارچ کے ذریعے باہر کسے اشارہ کیا تھا؟"

"کیا؟" میں چونک اٹھا۔ میرے لہجے میں بے یقینی تھی۔ میری سوالیہ نظریں سراج الدولہ کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔

"میں۔ میں۔ مجبور ہوگیا تھا شاہین!" سراج الدولہ نے رک رک کر بتایا "انہوں نے میری۔ میری بیوی' بہن اور ۔۔۔ اور میرے بچے کو یرغمال بنالیا ہے۔"

سراج الدولہ نے اقرار جرم کرلیا تھا۔ میں تیزی کے ساتھ اس طرف بڑھا جہاں لالٹین رکھی تھی۔ میں اسے بجھا کر اندھیرا کردینا چاہتا تھا۔ اس طرف بڑھتے ہوئے میں نے بجنت خاں کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی۔ خطرہ سر پر آگیا تھا۔ میں نے ایک دریچے سے چار پانچ سپاہیوں پر مشتمل ایک پولیس پارٹی کو گلی میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس عرصے میں نیپو بھی جاگ گیا تھا اور متحیر انداز میں اس صورتِ حال کو دیکھ رہا تھا۔ "میں۔۔۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔" سراج الدولہ نے ایک بار پھر اپنی صفائی پیش کیا "انہوں نے میری بیوی' بچے اور بہن کو یرغمال بنا رکھا ہے۔" اس کا انداز رو دینے کا سا تھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو سراج الدولہ! مجھے پورا یقین ہے تمہاری بات پر کہ ایسا ہی ہے!" میرے لہجے میں کڑواہٹ گھل گئی۔

اس گھر کا ایک عقبی دروازہ بھی تھا۔ اسی دروازے سے مجاہدِ اوّل ایک روز اس گھر میں آیا تھا۔ یہ ان دنوں کی بات تھی جب ہم راولپنڈی آئے تھے اور مجاہدِ اوّل نے ہمیں ولسن کے اغوا کا حکم دیا تھا۔ یہ عقبی دروازہ نچلی منزل پر تھا اور ایک تنگ سی گلی میں کھلتا تھا۔

میں نے یہ دیکھنے کے لیے کہ ہم نچلی منزل پر پہنچ کر عقبی دروازے سے فرار ہوسکتے ہیں یا نہیں' اوپر سے تنگ گلی میں

جھانک کر دیکھا۔ نتیجہ وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ادھر بھی پولیس کا ایک دستہ موجود تھا۔

اس وقت مجھے خود اپنے آپ کو داد دینے کا جی چاہا۔ میں نے بہ وقتِ ضرورت اس مکان سے فرار کا تیسرا راستہ بھی پہلے ہی سے سوچ رکھا تھا اور جو سوچا تھا۔ اس کے لیے عملاً بھی تیاری کرلی تھی۔ اس مکان کے دائیں رخ پر نشیب تھا۔ کبھی وہاں کوئی تالاب وغیرہ رہا ہوگا جو سوکھ چکا تھا اور اب لوگ وہاں کوڑا کرکٹ ڈالتے رہتے تھے۔ کوڑے کرکٹ کے باوجود اب بھی خاصی گہرائی تھی۔ اس طرف صرف ایک کھڑکی تھی جو بند ہی رکھی جاتی تھی۔ کھڑکی بند رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ ادھر سے ہوا کے ساتھ ساتھ بدبو بھی آتی تھی جو محلے بھر کے کچرے سے پیدا ہوتی تھی۔ گندگی ہی کی وجہ سے مچھر بھی اس کھڑکی کے راستے کمرے میں آجاتے تھے۔ اس کھڑکی میں موجود درمیانی آہنی سلاخیں میں نے نکال دی تھیں۔ ان سلاخوں کے نکلنے کی وجہ سے اتنی جگہ ہوگئی تھی کہ ایک شخص سکڑ سمٹ کر دائیں بائیں موجود دوسری آہنی سلاخوں کے درمیان سے نکل سکتا تھا۔ انہی دائیں بائیں موجود بقیہ سلاخوں کے درمیان میں نے ایک مضبوط رسی کے دونوں سروں کو گرہ دے کر رکھ چھوڑا تھا۔ یہ کارروائی میں نے ان دنوں کی تھی جب پولیس اور خفیہ والے ولسن کے اغوا کے بعد پاگل کتوں کی طرح مجھے اور نیپو کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ کھڑکی میں مضبوط رسی اتنی لمبی تھی کہ نیچے نشیب کی سطح تک جاتی تھی۔

میں تیزی سے اسی بند کھڑکی کی طرف بڑھا اور رسی کو نشیب میں پھینک دیا۔ اس سے پہلے میں کھڑکی کھول چکا تھا اور کمرے میں ہوا کے ساتھ بدبو بھر گئی تھی۔

"نیپو!" میں بولا "چلو اترو' جلدی کرو!" میں نے یہ کہتے ہوئے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ وہاں نیم تاریکی پھیلی ہوئی تھی۔

میرے کہنے پر نیپو نے جوتے پہنے' سرہانے سے اپنا پستول نکالا' وہ تھیلا اٹھایا جس میں فوری روانگی کے لیے ضروری سامان رہتا تھا اور کھڑکی کے پاس آگیا۔ "نیچے جاکر اپنے پستول میں گولیاں بھر لینا نیپو!" بخت خاں بولا "تمہارے پستول کی گولیاں اس وقت سراج الدولہ کی جیب میں ہیں۔" نیپو رسی کے سہارے نشیب میں پھسل گیا۔

پھر میں اپنے بستر کی طرف بڑھا اور بخت خاں سے دریافت کیا "میرے پستول میں بھی گولیاں ہیں یا نہیں؟"

"ہاں" بخت خاں نے جواب دیا "نیپو کے بعد یہ میرے بستر کی طرف آیا تھا کہ میں نے اسے نشانے پر لے لیا۔"

"یقین کرو تم لوگ کہ میں سچ کہہ رہا ہوں' میرے بیوی بچے اور ــــ"

"تم خاموش رہو!" میں نے سختی سے سراج الدولہ کی بات کاٹ دی پھر اپنا پستول اور تھیلا اٹھالیا۔

اصولاً مجھے سراج الدولہ کو فوراً گولی مار دینا چاہیے تھی۔ تنظیم کا اصول یہی تھا' مگر میں نے یہ سوچ کر کہ اسے کسی بھی وقت گولی ماری جاسکتی ہے' ایسا نہیں کیا۔ اسے میں نے وقتی طور پر اس لیے زندہ رہنے دیا کہ اس سے معلوم ہوسکے' اس نے پولیس کو ہمارے اور تنظیم کے بارے میں کیا کچھ بتایا ہے۔

سراج الدولہ کو میں نے اپنے پستول کی زد پر لیتے ہوئے بخت خاں سے کہا "اب تم نیچے جاؤ' تمہارے بعد سراج الدولہ آئے گا۔ تم پستول کی زد پر لے کر اس کے ہاتھ نیپو سے پشت پر بندھوا دینا اور منہ میں کپڑا تو اسی وقت ٹھونس دو اور اوپر سے ــــ"

"ساتھی! میں ــــ سچ ــــ" اس کی آواز جیسے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

"میں تمہیں صفائی کا موقع ضرور دوں گا مگر اس وقت تم خاموش ہوجاؤ سراج الدولہ!" میں نے کہا۔

بخت خاں نے سراج الدولہ کے منہ میں ایک کپڑا ٹھونس کر اوپر سے بھی ایک بڑا رومال باندھ دیا' وہ ایسا بڑا رومال تھا جو عموماً بوڑھے یا ضعیف لوگ اپنے کاندھے پر ڈال لیتے ہیں۔ پھر بخت خاں بھی اپنا تھیلا اور پستول لے کر رسی کے سہارے نیچے نشیب میں اتر گیا۔ اس کے بعد سراج الدولہ کو بھی نیچے اترنا ہی پڑا۔ میں کھڑکی میں جھک کر اسے پستول کی زد پر لیے ہوئے تھا' نیچے سے یقیناً بخت خاں نے بھی اسے نشانے پر لے رکھا ہوگا۔

جب سراج الدولہ نصف رسی کا فاصلہ طے کرچکا تو میں تیزی سے اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔ میں نے مٹی کے تیل کا کنستر اٹھایا اور اس کا ڈھکن کھول کر ہر طرف تیل چھڑک دیا۔ میرا تھیلا شانے سے لٹکا ہوا تھا اور اب میں فرار کے لیے پوری طرح تیار تھا۔

اچانک میں نے پستول سے فائر کیا اور خود ہی زور سے چیخ ماری' پھر دوسرا' تیسرا اور چوتھا فائر کیا۔ ہر فائر کے ساتھ میں نے آوازیں بدل بدل کر "آزاد ہندوستان زندہ باد" کا نعرہ لگایا' پھر ماچس کی تیلی جلا کر بستر پر پھینک دی۔ مٹی کے تیل سے بھیگے ہوئے کپڑے اور دوسرے سامان نے فوراً ہی آگ پکڑلی۔ نچلی منزل کے دونوں دروازوں یعنی بیرونی اور عقبی

دروازوں پر ضربیں لگائی جارہی تھیں اور میں کھڑکی کی راہ سے رسی کے سہارے نیچے اتر رہا تھا۔ نیچے پہنچتے ہی میں نے رسی کے دونوں سروں پر لگی ہوئی گرہ کھولی اور رسی کو نیچے کھینچ لیا۔

اوپر مکان میں آگ خوب بھڑک رہی تھی۔ پولیس پارٹیاں مکان کے دونوں دروازوں کو توڑنے کی کوشش کررہی تھیں۔ ایک ہنگامہ جاری تھا۔ ہم چاروں نشیب میں خاصے دور نکل آئے تھے۔ اس جگہ تک مکان میں بھڑکتی ہوئی آگ کی روشنی بھی نہیں پہنچ سکتی تھی۔

میں نے مکان میں آگ لگانے کا فیصلہ اسی لیے کیا تھا کہ فوری طور پر پولیس ہمارے فرار کے بارے میں نہ سوچ سکے اور محض یہ اندازہ لگائے کہ ہم نے پولیس کے ہاتھوں گرفتار ہونے کے بجائے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ محبِ وطن افراد کے ایسے اقدامات کوئی نئی یا انوکھی بات نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ آگ بجھائے جانے کے بعد پولیس کو جب وہاں کوئی لاش نہیں ملے گی تو وہ سمجھ جائے گی کہ ہم اسے جل دے کر کھڑکی کے راستے فرار ہوگئے ہیں اس وقت تک ہم پولیس کی دسترس سے نکل کر بہت دور جاچکے ہوں گے۔ بخت خاں مصلحتاً چند روز کے لیے ہم سے الگ رہا تھا' ان دنوں جب نیپو علیل تھا۔ اس وقت بخت خاں نے جو مکان کرائے پر لیا تھا' اس کا قبضہ نہیں چھوڑا تھا۔ یہ مکان کمپنی باغ کے سامنے تھا۔ ہم سب جتی ہٹیاں کے مکان سے فرار ہوکر وہیں پہنچ گئے۔

○ ہمیں اس نئے مکان میں قیام کیے دوسرا دن تھا۔ اگلے روز میں نے وہاں سے کسی کو نکلنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ مکان میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ ہمیں اسی لیے کھانے پینے کی کسی سامان کی فراہمی کی خاطر باہر جانے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔

سراج الدولہ کا مسئلہ اس دوران میں میرے ذہن پر بوجھ تھا۔ اس کی غداری میرے لیے تکلیف دہ تھی۔ اسے اس غداری کی سزا دینا ہی تھی۔ سراج الدولہ کے لیے میرے دل میں ایک نرم گوشہ تھا جو ابھی تک مجھے اس کے بارے میں حتمی فیصلہ کرنے سے روکے ہوئے تھا۔

مقررہ وقت پر مجھے اور بخت خاں کو دہلی پہنچنے کے لیے اگلے روز ہر صورت میں راولپنڈی سے نکل جانا تھا لیکن اس میں سب سے بڑی قباحت سراج الدولہ تھا۔ دن بھر میں اسی مسئلے پر سوچتا رہا۔ ہر پہلو سے یہی نتیجہ نکلتا تھا کہ سراج الدولہ نے تنظیم سے غداری کی ہے اس لیے اسے انتہائی سزا

ملنا چاہیے انتہائی سزا یعنی موت!

سراج الدولہ بلاشبہ موت کی سزا کا مستحق تھا۔ اگر تنظیم سے اس کی غداری کو بھی درگزر کردیا جاتا تو وہ اس لیے بھی سزا کا مستحق تھا کہ اس نے ہم تینوں ساتھیوں کی زندگی خطرے میں ڈال دی تھی۔ اگر ہم اس کی بساط نہ الٹ دیتے تو خود اس کی تجویز کی ہوئی سزا کے مطابق موت کے دہانے پر پہنچ چکے ہوتے۔ ایک اعتبار سے اس نے ہم تینوں کو سزائے موت سنائی تھی۔

سراج الدولہ کا جرم بڑا سنگین تھا۔ اسے سنگین سزا ہی ملنا چاہیے تھی۔ اس کے ساتھ رحم کا سلوک کرنا خود کو اور تنظیم کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ اسے معاف کرنا اس مقصد سے غداری تھا جس کے لیے ہم نے اپنے سروں سے کفن باندھ رکھے تھے۔ سو اس رات جب بخت خاں باہر کی سن گن لے کر واپس آگیا تو عدالت سجی۔ اس کا مدعی بھی میں تھا اور منصف بھی میں۔ سراج الدولہ اپنی صفائی میں اس کے سوا کوئی اور دلیل پیش نہ کرسکا کہ پولیس نے اس کی بیوی' بہن اور بچے کو اغوا کرلیا تھا اور اسے مجبور کیا تھا کہ وہ تنظیم سے متعلق اپنے ساتھیوں کے نام پتے بتادے۔

"یہ بتاؤ سراج الدولہ کہ پولیس تم تک کس طرح پہنچ گئی؟ پولیس کو کس طرح اس بات کا علم ہوا کہ تم کسی ایسی تنظیم کے رکن ہو جو انگریزوں کے خلاف سرگرم عمل ہے؟ تم پولیس کے تجربے کیسے بنے؟" میں نے معلوم کیا۔

"ولسن کے اغوا کے بعد' ہدایات کے مطابق میں اگلے ہی روز یہاں سے اپنے شہر لائلپور (فیصل آباد) چلا گیا تھا۔ اپنے چچا کے بیٹے کو میں بڑا اچھا دوست سمجھتا تھا۔ وہ میرا ہم عمر ہے' بچپن سے میرے ساتھ پلا بڑھا ہے۔ میں نے پہلی مرتبہ اسے تنظیم سے اپنی وابستگی کے بارے میں بتادیا۔ یہی میری غلطی تھی۔ وہ بھی حب الوطنی کا زبردست دعویدار تھا۔ میں چاہتا تھا کہ وہ بھی تنظیم میں شامل ہوجائے۔"

سراج الدولہ جس وقت یہ بتا رہا تھا مجھے اپنے ماموں زاد بھائی رحمت علی اور بھائی عطا اللہ خاں یاد آرہے تھے میں بھی انہی دونوں کے توسط سے علی گڑھ میں اس تنظیم کا رکن بنا تھا مگر ان دونوں نے مجھ پر بڑی محنت کی تھی۔ تنظیم کی رکنیت سے پہلے یا اپنا راز افشا کرنے سے قبل انہوں نے مجھے اچھی طرح پرکھ لیا تھا اور ذہنی طور پر بالواسطہ تنظیم کے مقاصد کا ہمنوا بنالیا تھا۔

میں پوری توجہ سے سراج الدولہ کا بیان سن رہا تھا۔ اب وہ بتا رہا تھا "جب میں نے اس سے تنظیم میں شمولیت

کے لیے کہا تو اس نے ہامی بھرلی۔ یقین کریں کہ میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ پھر میں نے اسے تنظیم کی مختلف مہموں کے بارے میں بتایا۔ ولسن کے اغوا کی مہم بھی اسی میں شامل تھی۔ اس کے بعد وہ روزانہ مجھ سے تنظیم کے بارے میں معلومات حاصل کرتا' تنظیم کے انداز کار کے متعلق پوچھتا' ساتھیوں کے بارے میں دریافت کرتا اور۔۔۔"

"اور تم اسے سب کچھ بتاتے رہتے!" میری آواز میں چبھن تھی۔

"نہیں!" وہ مضبوط آواز میں بولا "میں نے کبھی اسے ان سوالوں کے صحیح جواب نہیں دیئے۔ پھر ایک دن میرے ایک دوست قربان علی نے مجھے بتایا کہ میرا چچا زاد میرے خلاف پولیس کا مخبر بن گیا ہے۔ میرا دوست قربان علی خود بھی پولیس کے محکمے میں ملازم تھا۔ جیسے ہی مجھے قربان علی سے یہ خبر ملی میں نے لائیلپور (فیصل آباد) سے فرار ہونے کا منصوبہ بنالیا' لیکن اسی رات میرے گھر پر غنڈوں نے دھاوا بول دیا۔ میری بیوی' بہن اور بچے کو اغوا کرلیا گیا۔ ہنگامہ فرو ہونے کے تھوڑی دیر بعد پولیس وہاں پہنچی۔ اس پولیس پارٹی کے ساتھ خفیہ کا ایک اعلیٰ افسر بھی تھا جو دہلی سے ولسن کے اغوا کے بارے میں پوچھ گچھ کے لیے وہاں آیا تھا۔ اس نے مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہا مگر میں انکار کرتا رہا۔ پھر مجھے پولیس ایک جگہ لے گئی جہاں میری بیوی' بہن اور بچے کو رکھا گیا تھا۔ اس پولیس افسر نے میرے سامنے میری بیوی اور میری بہن کا لباس تار تار کرڈالا' انہیں عریاں کرڈالا' میرے بچے کو ٹانگوں کے بل لٹکا دیا۔ پھر اس نے کہا کہ تیری بیوی اور تیری بہن کل صبح اس حالت میں مل سکتی ہیں کہ اٹھنے کے قابل نہ ہوں۔ پولیس کے یہ سانڈ رات بھر تیری آنکھوں کے سامنے انہیں بھنبھوڑتے رہیں گے۔ پھر بھی تو نے زبان نہ کھولی تو یہ تیرا بچہ جو میرے ہاتھوں میں ٹانگوں کے بل جھول رہا ہے' سامنے دیوار سے جا ٹکرائے گا۔ اس کا سر پاش پاش ہوجائے گا۔ پھر بھی تو کچھ نہیں بتائے گا تو ہم تیری ماں کو یہاں اٹھا لائیں گے اور پھر۔ پھر اس نے۔۔۔ اس پولیس افسر نے وہ زبان استعمال کی جو۔ وہ الفاظ میں۔۔۔ میں نہیں دہرا سکتا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ محض دھمکی نہیں دے رہا تھا۔" سراج الدولہ یہ کہتے ہوئے بلک اٹھا "بتاؤ ساتھی' میں کیا کرتا؟۔۔۔ میں کیا کرتا ساتھی؟" سراج الدولہ کی دردناک داستان سن کر میری رگوں میں جیسے خون کی گردش تھم سی گئی۔ میرا دل جیسے دھڑکنا بھول گیا تھا۔ کمرے میں تکلیف دہ سناٹا پھیلا ہوا تھا اور اس سناٹے کو سراج الدولہ کی ہچکیاں رہ رہ کر توڑ دیتی تھیں۔ "میں سچ کہہ رہا ہوں ساتھی سچ! اس زمین کی قسم۔ اپنی ماں کی قسم! میری غلطی تھی کہ میں نے اپنے چچا زاد کو نہ پہچانا' میں نے اسے تنظیم کے بارے میں بتایا مگر وہ بھی تنظیم کی بھلائی کے لیے ہی کیا تھا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ایسا ہوجائے گا۔" اس کی ہچکیاں اور بلند ہوگئیں۔ میں نے بخت خاں اور ٹیپو کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں اس طرح سرجھکائے بیٹھے تھے جیسے وہی مجرم ہوں۔

"بخت خاں! تمہارا کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا "تم نے ملزم کا بیان سن لیا ہے۔"

"شاہین! تم جو فیصلہ بھی کرو میں اس سے متفق ہوں۔" بخت خاں کی کمزور آواز ابھری۔

"اور ٹیپو' تمہاری کیا رائے ہے؟"

"فیصلہ کرو شاہین' میں تمہارے ساتھ ہوں۔" ٹیپو نے سرجھکائے ہوئے جواب دیا۔

بخت خاں اور ٹیپو نے فیصلے کا بوجھ مجھ پر ڈال دیا تھا۔ میں سرجھکائے سوچتا رہا۔ میں نے اس تکلیف دہ صورت حال کو ختم کرنے کے لیے آخر فیصلہ سنا ہی دیا۔ فیصلے کے الفاظ ادا کرتے ہوئے میرے کانوں میں تیز سیٹیاں سی گونج رہی تھیں۔ اس وقت مجھے خود اپنی آواز اجنبی سی محسوس ہوئی تھی۔

"نہیں۔ نہیں!" سراج الدولہ کی آواز مجھے بہت دور سے آتی سنائی دی۔ میں جیسے وہاں موجود ہوکر بھی وہاں نہیں تھا۔

"بخت خاں! اس کا منہ بند کردو۔" میں نے دوسرا حکم دیا۔

بخت خاں تیزی کے ساتھ اپنی کرسی سے اٹھا اور پھر میرے حکم کی تعمیل کرنے لگا۔

سراج الدولہ آخری وقت تک چیختا رہا کہ ابھی اسے اور کچھ کہنا ہے' مگر فیصلہ ہوچکا تھا کچھ کہنے سننے کا وقت گزر چکا تھا۔

ہر مجرم آخر وقت تک اپنی بے گناہی ظاہر کرنے کے لیے اسی طرح چیختا ہے۔ میں سوچ رہا تھا۔ اس طرح شاید وہ یہ سمجھتا ہے کہ زندگی سے اسے چند لمحوں کی مہلت اور مل جائے گی۔ وہ جنہیں سزائے موت دینے کے لیے پھانسی پر لٹکانے کے لیے لے جایا جاتا ہے۔ آخر وقت تک اسی طرح چیختے چلاتے رہتے ہیں اور اپنے بے قصور ہونے کا یقین دلاتے رہتے ہیں۔ میں نے سراج الدولہ کے لیے بھی پھانسی کا حکم دیا تھا۔

بخت خاں نے سراج الدولہ کے منہ میں رومال ٹھونس کر اوپر سے ایک کپڑا باندھ دیا' پھر اس نے ٹیپو کو اشارہ کیا۔ ٹیپو نے سراج الدولہ کے ہاتھ پشت پر باندھ دیے۔ میری نظر سراج الدولہ کی طرف اٹھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے اور یہ آنسو جیسے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ میرا فیصلہ غلط ہے۔

"میرا فیصلہ غلط نہیں ہے!" میں آپ ہی آپ بول اٹھا۔ میں شاید یہ کہہ کر اپنے ضمیر کو مطمئن کررہا تھا حالانکہ کسی نے میرے فیصلے کو غلط نہیں کہا تھا۔ میں نے مزید کہا "غدار کی یہی سزا ہے' سزائے موت! تنظیم کا یہی اصول ہے! اسے پھانسی دینے کا انتظام کرو!" یہ کہتے ہی میں اس کرسی سے اٹھ گیا جو عدالت کی کرسی کے طور پر استعمال کی گئی تھی۔ اچانک روشندان پر مخصوص دستک سنائی دی۔ ہم سب نے چونک کر اوپر دیکھا۔ پھر مجاہد اوّل کی گھرگھراتی آواز سنائی دی "تمہارا فیصلہ غلط ہے' دروازہ کھولو!"

میں نے پہلے بخت خاں کی طرف اور پھر سراج الدولہ کو دیکھا۔ موت کی پرچھائیوں کی جگہ اب مجھے سراج الدولہ کی آنکھوں میں زندگی کی چمک نظر آنے لگی تھی۔ ٹیپو دروازہ کھولنے جاچکا تھا۔ معلوم نہیں مجاہد اوّل کب راولپنڈی آگیا تھا۔ آخری اطلاعات ملنے تک وہ بمبئی ہی میں تھا۔

مجاہد اوّل اب کمرے میں آچکا تھا۔ طے شدہ اصول کے مطابق لالٹین کی لو دھیمی کرکے اسے کونے میں رکھ دیا گیا تھا۔

"شاہین! مجھے کچھ یوں محسوس ہورہا ہے کہ تم لوگوں کو سزائے موت دینے کا بہت شوق ہوگیا ہے۔" مجاہد اوّل بولا "تمہیں شاہین' کسی بھی حالت میں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اب میری غیرموجودگی میں تمہاری حیثیت کیا ہوجاتی ہے! تم میری نیابت کرتے ہو۔ سراج الدولہ کو سزا سناتے ہوئے تمہیں معاملے کے ہر پہلو پر اچھی طرح غور کرلینا چاہیے تھا۔ یہ ایک قیمتی زندگی کا مسئلہ تھا شاہین' تنظیم کے ایک سرفروش کی زندگی کا مسئلہ!"

"حالات ہی ایسے تھے جناب کہ مجھے یہ انتہائی قدم اٹھانا پڑا۔" میں نے کہا "اچھی طرح غور کرنے کے بعد ہی میں نے سزائے موت کا فیصلہ سنایا تھا۔"

مجاہد اوّل کے ایما پر پھر عدالت بجی۔ میں ایک مرتبہ پھر صدرِ عدالت کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ مجاہد اوّل نے کہا تھا کہ میں تنظیم کے ایک عام رکن کی حیثیت سے سراج الدولہ کی صفائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ اس نے کئی دلیلیں پیش کیں۔ ان میں سے بیشتر دلیلیں خالص جذباتی اور انسانی رشتوں کے تقدس کی بنیاد پر قائم کی گئی تھیں۔ اس کی آخری دلیل یہ تھی کہ قوانین انسان کے تحفظ کی خاطر بنائے جاتے ہیں۔ انسان کو قانون کا شکار بنانے کے لیے نہیں۔

میں نے نہایت مختصر بیان کے ساتھ یہ تمام دلیلیں رد کردیں۔ میں نے کہا "انسانی رشتوں اور جذباتیت سے قانون کو کوئی علاقہ نہیں ہوتا۔ قانون ایک خاص جرم کی خاص سزا مقرر کرتا ہے۔ انصاف انسانی رشتوں' ان کے تقدس' دوستی' محبت اور نفرت سے بلند ہوتا ہے۔ انصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے ان میں سے کسی کو بھی پیش نظر نہیں رکھا جاتا۔ اضطراری اور اضطرابی حالت میں سرزد ہونے والے جرائم سے ان کی سنگینی تو کم ہوسکتی ہے جرم کی نوعیت نہیں بدلتی البتہ سزا میں تخفیف ممکن ہے۔ یہ درست ہے کہ قوانین انسان کے تحفظ ہی کے لیے بنائے جاتے ہیں اور ہم نے بھی اپنی تنظیم کے تحفظ کی خاطر قوانین بنائے ہیں۔ یہ تنظیم ایسے محب وطن افراد پر مشتمل ہے جن کے سامنے انسان ہی کے بنائے ہوئے ہر معیار کے مطابق ایک اعلیٰ ترین مقصد ہے۔ سراج الدولہ نے انہی محب وطن افراد کی ہلاکت کا سامان کیا تھا۔ ہم غیر معمولی حالات میں کام کررہے ہیں۔ ایک اعتبار سے ہم حالت جنگ میں ہیں۔ ایسی صورت میں کسی بھی رکن کی معمولی سی لغزش یا کوتاہی کو جس سے تنظیم خطرے میں پڑسکتی ہو' معاف نہیں کیا جاسکتا! سراج الدولہ کو ایک موقع ملا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کو تمام حالات سے آگاہ کردیتا' مگر اس نے ایسا نہیں کیا۔ سراج الدولہ اسی بنا پر غداروں کی فہرست میں شامل ہوتا ہے۔ میں سزائے موت بحال رکھنے کا فیصلہ کرتا ہوں اور میرے نزدیک یہ فیصلہ مبنی برحق ہے۔" یہ کہہ کر میں خاموش ہوگیا کمرے میں سکوت طاری ہوگیا۔ چند لمحے انتظار کرنے کے بعد شاید مجاہد اوّل کچھ کہے' میں نے پھر بولنا شروع کیا "اب ہمارے پاس وقت کم رہ گیا ہے۔ سراج الدولہ کو پھانسی کی سزا دینے کا انتظام کیا جائے!"

اس سے پہلے کہ میں کرسی سے اٹھتا' مجاہد اوّل کی مخصوص آواز ابھری "چند واقعات اور ایسے ہیں کہ انہیں عدالت کے سامنے پیش کردینا مناسب ہے۔ انسانی جان اتنی ارزاں نہیں ہوتی کہ اسے اتنی آسانی کے ساتھ سولی پر لٹکا دیا جائے۔ میرے خیال میں ملزم کو اپنی صفائی پیش کرنے کا پورا موقع نہیں دیا گیا' اس سے پہلے ہی ملزم کی زبان بند کردی گئی' ملزم کی طرف سے میں وہ ثبوت پیش کرسکتا ہوں جو اسے بڑی حد تک بے گناہ ثابت کرتا ہے۔"

مجاہد اوّل کے ان الفاظ نے میرے دل کا بوجھ بڑھا دیا۔ مجھے یاد آیا کہ جب میرے حکم پر سراج الدولہ کی زبان بندی کی جا رہی تھی تو وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔

"میں عدالت سے سوال کرتا ہوں کہ ان حالات کے باوجود ملزم اگر کسی طرح تنظیم کو اپنے ساتھ پیش آنے والے سنگین واقعے سے آگاہ کر دیتا تو کیا وہ قابلِ معافی ہوتا؟" مجاہد اوّل نے مجھ سے سوال کیا۔

"ہاں ملزم کے پاس یہ راستہ موجود تھا اور ایسی صورت میں وہ نرمی کا حق دار تھا۔" میں نے تیزی سے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ کہا۔

"تو حقیقت یہی ہے کہ ملزم پہلی فرصت میں تنظیم کے سربراہ کو ایک خط کے ذریعے اس سے آگاہ کر چکا تھا اور وہ خط عدالت میں پیش کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر مجاہد اوّل نے اپنے ڈھیلے ڈھالے سیاہ لباس میں ہاتھ ڈال کر وہ خط میری میز پر رکھ دیا۔

کمرے میں کیوں کہ ناکافی روشنی تھی اس لیے میں نے خط اٹھا کر نہیں پڑھا اور بولا "عدالت کو یقین ہے کہ جو خط پیش کیا گیا ہے، اس میں وہی کچھ لکھا ہوگا جو عدالت کو بتایا گیا ہے۔"

پھر مجاہد اوّل نے بتایا "دہلی سے فیصل آباد آنے والے خفیہ کے اعلیٰ افسر نے سراج الدولہ کو دھمکیاں دینے کے بعد چھوڑ دیا تھا اور کہا تھا کہ وہ شام تک یہ فیصلہ کر لے، تنظیم کے بارے میں اسے جو کچھ معلوم ہے، بتاتا ہے یا نہیں! اسے یہ بھی دھمکی دی گئی تھی کہ پولیس اس دوران میں اس کی کڑی نگرانی کرتی رہے گی، فرار ہونے کا خیال اسے اپنے دل سے نکال دینا چاہیے۔ سو وہ گھر پہنچا۔ اس نے اپنے طور پر ایک منصوبہ بنایا اور اس منصوبے سے تنظیم کے سربراہ کو اس خط کے ذریعے آگاہ کر دیا۔ جو عدالت کے روبرو پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ خط سراج الدولہ نے اسی پولیس والے کو دے دیا تھا جو اس کا دوست تھا اور جس نے اسے خطرے سے قبل از وقت آگاہ کر دیا تھا۔ یہ شخص قربان علی ہماری تنظیم کا مخبر ہے اور وقتاً فوقتاً ہمیں خفیہ کے اقدامات سے آگاہ کرتا رہا ہے۔ قربان علی ہمارا مخبر ہونے کے سبب ان لوگوں میں سے ہے جو تنظیم کے سربراہ سے ہنگامی حالات میں رابطہ قائم کر سکتا ہے۔ اسے معلوم ہے کہ تنظیم کے سربراہ سے کب، کہاں اور کس طرح رابطہ قائم ہو سکتا ہے! قربان علی کو وہ خط دینے کے بعد سراج الدولہ، پولیس والوں کو مختلف شہروں میں گھماتا پھرا تاکہ قربان علی اس دوران میں مجھ تک اس کا خط پہنچانے میں کامیاب ہو جائے۔ سراج الدولہ ہی کے منصوبے کے مطابق تنظیم کا سربراہ بمبئی سے راولپنڈی پہنچا۔ اس کے بعد سراج الدولہ بھی پولیس والوں کو لے کر یہاں آیا۔ پولیس تنظیم کے سربراہ پر ہاتھ ڈالنا چاہتی تھی اور سراج الدولہ اسی بہانے اسے علی گڑھ، دہلی اور بمبئی لے گیا تھا اور پھر آخر میں اس نے کہا تھا کہ تنظیم کا سربراہ اگر ان تینوں شہروں میں نہیں تو پھر یقیناً راولپنڈی میں ہے۔ راولپنڈی میں اس کی آمد سے پہلے ہی تنظیم کا سربراہ واقعی یہاں پہنچ چکا تھا۔"

اس کے بعد مجاہد اوّل نے بتایا کہ اگر ہماری گرفتاری یقینی ہو جاتی تو ایک بھی پولیس والا وہاں سے زندہ بچ کر نہیں جاتا۔ اس وقت برابر والے خالی مکان میں مجاہد اوّل کے ساتھ تنظیم کے مسلح سرفروشوں کا ایک دستہ موجود تھا۔ وہ سب کے سب ماہر نشانہ باز تھے اور ایسی پوزیشن میں تھے کہ اشارہ ملتے ہی فائرنگ کھول دیتے اور تمام پولیس والے ڈھیر ہو جاتے۔ مگر یہ قدم آخری مرحلے پر اٹھایا جاتا۔ مجاہد اوّل نے دن کے وقت ہی چنی بیٹیاں کے اس مکان کا اچھی طرح جائزہ لے لیا تھا جہاں ہم مقیم تھے۔ نشیب کی طرف سے اس مکان کا جائزہ لیتے ہوئے وہ رسی بھی اسے نظر آ گئی تھی۔ جو میں نے کھڑکی کی سلاخوں میں باندھ رکھی تھی۔ اس نے صحیح قیاس کیا تھا کہ ہنگامی صورت حال میں ہم اسی راہ سے فرار ہوں گے اور پھر اسی مکان میں پناہ لینے پر مجبور ہوں گے جو اسی کے ایما پر بخت خاں نے کمپنی باغ کے سامنے کرائے پر حاصل کیا تھا کہ کبھی نعم البدل کے طور پر وہاں پناہ لی جا سکے۔ مجاہد اوّل نے ان حالات کو ایک خاص انداز میں اپنی انتہا تک پہنچانے کا منصوبہ بنایا تھا۔

آخر میں مجاہد اوّل نے کہا "باقی تمام باتوں سے قطع نظر میں اس بات پر خوش ہوں کہ تم لوگوں نے سراج الدولہ کی تمام رفاقتوں اور ماضی میں تنظیم کے لیے اس کی خدمات کا لحاظ کیے بغیر جو حالات تمہارے علم میں تھے اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے وہی سزا تجویز کی جس کا وہ مستحق تھا۔ میں اس پر بھی خوش ہوں کہ ایک منصف کی حیثیت سے اس سلسلے میں شاہین نے میری ابتدائی دلیلوں کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔"

اس دوران میں میرے حکم پر سراج الدولہ کو آزاد کیا جا چکا تھا۔ میں کرسیِ عدالت سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پھر ہم تینوں سراج الدولہ سے باری باری گلے ملے۔ وہ ساتھی جو ہم سے بچھڑنے والا تھا، ہمیں واپس مل گیا تھا۔ میں نے سراج الدولہ سے معافی مانگی۔

سراج الدولہ نے مجھے سینے سے چمٹا لیا اور بولا "نہیں میرے دوست! معافی کی کوئی ضرورت نہیں۔ اگر تمہاری جگہ میں بھی ہوتا تو یہی فیصلہ کرتا۔"

مجھے معلوم تھا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ وہ بھی ایسا ہی کرتا۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کیوں کہ اس نے انتہائی سنگین حالات میں بھی تنظیم سے وفاداری برقرار رکھی تھی۔

مسرت و خوشی کے جذبات سے ہم اس وقت اتنے مغلوب تھے کہ مجاہد اوّل کی وہاں موجودگی کو بھی ایک طرح سے فراموش کر بیٹھے تھے۔ اس دوران میں مجاہد اوّل کی آواز ہمیں سنائی دی۔ وہ کہہ رہا تھا "بس بھئی!" اس کی آواز بھی جذبات سے بوجھل تھی "اب تم لوگوں کو راولپنڈی سے فرار ہونے کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ سب سے پہلے شاہین اور بخت خاں کو جانا ہے تاکہ وہ وقتِ مقررہ پر دہلی پہنچ سکیں۔ شاہین! تمہیں اپنے ڈیڈی اور ممی سے ملنے کی اجازت ہے حالانکہ تمہیں وہاں بھیجنا خطرے سے خالی نہیں، مگر تمہاری امی ان دنوں سخت بیمار ہیں۔ پہلے بھی کلکتہ روانگی سے قبل میں اسی سبب تمہیں دہلی بھیجنا چاہتا تھا۔ پرنس آف ویلز کے دورے کے بعد تنظیم لائلپور (فیصل آباد) کی پولیس سے انتقام لے گی۔ اس سلسلے میں تمہیں مطلع کر دیا جائے گا۔ نیچو اور سراج الدولہ فی الحال راولپنڈی ہی میں رہیں گے۔"

حالات کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ راولپنڈی سے ہمارے فرار کی راہیں کم و بیش مسدود ہو کر رہ گئی تھیں۔ اس کا سبب پولیس کی آنکھوں میں دھول جھونک کر ہمارا فرار ہو جانا تھا۔ اب ان کے ہاتھ سے سراج الدولہ بھی نکل گیا تھا۔ اس لیے وہ تلملائے ہوئے تھے۔ پولیس اور خفیہ نے راولپنڈی کی ناکا بندی اتنی سخت کر دی تھی کہ کسی ذی روح کا ان کی نظر میں آئے بغیر وہاں سے نکل جانا ناممکن تھا مگر مجاہد اوّل نے ہمارے فرار کا بندوبست کر دیا تھا۔

میں اور بخت خاں تھوڑی ہی دیر بعد چھپتے چھپاتے ریلوے کوارٹرز پہنچے اور ایک کوارٹر پر دستک دی۔ دروازہ فوراً ہی کھول دیا گیا جیسے دروازے کھولنے والا ہماری ہی آمد کا منتظر تھا۔ وہ ریلوے انجن ڈرائیور تھا اور اگلے روز صبح سورج طلوع ہونے سے پہلے ایک ٹرین لے جانے والا تھا۔

"معلوم ہو گیا؟" بخت خاں نے اندر قدم رکھتے ہی اس سے دریافت کیا۔

"ہاں" ڈرائیور کے لہجے میں لرزش تھی۔ وہ گھبرایا ہوا سا لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف کے آثار نمایاں تھے۔

"کیا بات ہے، تم کچھ پریشان معلوم ہوتے ہو؟" بخت خاں نے پوچھا۔

اس نے پھر اسی انداز میں "ہاں" کہا "یہ پہلا موقع ہے کہ میں ایسا کام کر رہا ہوں خیر!"

انجن ڈرائیور کی پریشانی بجا تھی۔ وہ راولپنڈی سے ایک خصوصی ٹرین لے کر جا رہا تھا جس میں کئی انگریزوں اور فوجی افسران کو سوار ہونا تھا۔ وہ ایک سیدھا سادا فرض شناس سا شخص دکھائی دیتا تھا۔ وہ بہت نروس قسم کا آدمی تھا۔ کسی بھی وقت اس کے اعصاب جواب دے سکتے تھے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور بولا "یہ تمہاری اور میری خوش قسمتی ہے کہ میرے دونوں ساتھی ایک ہی کوارٹر میں مقیم ہیں تمہیں زیادہ تگ و دو نہیں کرنا پڑے گی۔ میں نے رات ہی ان سے کہہ دیا تھا کہ صبح انہیں لینے پہنچ جاؤں گا۔"

پھر اس نے بخت خاں کو کوارٹر کا پتا بتایا جس میں اس کے وہ دونوں ساتھی رہتے تھے جن کا کام انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونکنا تھا۔ اب بخت خاں اور میں اس کوارٹر کی طرف بڑھ رہے تھے جس کا پتا انجن ڈرائیور نے بتایا تھا۔

"یہ شخص نروس قسم کا ہے۔" میں نے بخت خاں سے کہا "کسی وقت بھی بزدلی دکھا سکتا ہے۔"

"ہاں، نروس بھی ہے اور بزدل بھی۔" بخت خاں بولا "مگر اسی کے ساتھ یہ اس وقت تک قابلِ اعتماد بھی ہے جب تک اس پر کوئی افتاد نہ پڑے۔ میں اسے جانتا ہوں۔ یہ اسی شہر کا رہنے والا ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں ہم اس کوارٹر پر دستک دے رہے تھے جو مطلوبہ تھا۔ وہاں وہ دونوں، انجن ڈرائیور ہی کا انتظار کر رہے تھے۔ دروازہ کھلا اور میں تیزی کے ساتھ پستول تان کر اندر پہنچ گیا۔

"خاموش رہنا!" میں نے سخت مگر دھیمی آواز میں کہا "اس وقت میرے اور بخت خاں کے چہروں پر سیاہ رومال بندھے ہوئے تھے صرف ہماری آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔

"منگا! کون ہے؟" اندر سے اس کے دوسرے ساتھی کی آواز آئی۔

اسی کے ساتھ بخت خاں پستول ہاتھ میں لیے اندرونی کمرے کی طرف لپکا۔ تھوڑی سی دیر میں ہم انہیں بے بس کر چکے تھے۔ اس سے پہلے ہم نے ان کی وردیاں اتروا لی تھیں۔ ہم نے انہیں کس کر مضبوطی سے باندھا تھا اور ان کے منہ میں کپڑے ٹھونس دیے تھے۔

اب میں ان میں سے ایک کی وردی پہن رہا تھا۔ پندرہ

منٹ میں ہم تمام کاموں سے فارغ ہو کر پھر انجن ڈرائیور کے کوارٹر کی طرف جا رہے تھے۔ دوسری وردی بخت خاں کے جسم پر تھی۔

پورا پلان مجاہد اوّل نے پہلے سے طے کر لیا تھا۔ اس کام میں تعاون کے لیے انجن ڈرائیور کو خاصی رقم دی گئی تھی۔

ہم لوٹ کر انجن ڈرائیور کے کوارٹر میں پہنچے تو وہ ہمارا ہی منتظر تھا۔ اس نے پوچھا "سب کچھ ٹھیک ہو گیا؟"

"ہاں" بخت خاں نے جواب دیا "جب تک کوئی ادھر نہیں جائے گا کسی کو معلوم نہیں ہو گا کہ ان دونوں پر کیا بیتی ہے!"

اس کے بعد ہم اسپیشل ٹرین روانہ ہونے سے پہلے انجن ڈرائیور کے ساتھ شیڈ میں پہنچ گئے۔ ڈرائیور ہی کے ساتھ ہم اس انجن میں داخل ہو گئے جو اسپیشل ٹرین میں لگا ہوا تھا۔ ڈرائیور کے انجن میں داخل ہوتے ہی وہ دوسرا ڈرائیور جو انجن کو شیڈ سے پلیٹ فارم پر لایا تھا، انجن سے اتر گیا تھا۔ اس نے یہ دیکھنے کی زحمت بھی گوارا نہیں کی تھی کہ انجن کی بھٹی میں کوئلہ جھونکنے والے کون ہیں، کون نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سب کچھ معمول کے مطابق تھا کہیں کسی گڑبڑ کا امکان معلوم نہیں ہوتا تھا۔

اس طرح راولپنڈی سے ہم فرار ہونے میں کامیاب ہوئے۔ ایک ریلوے اسٹیشن پر ہم نے اترنے سے پہلے طے شدہ پروگرام کے مطابق ٹرین رکتے ہی انجن ڈرائیور کو باندھ دیا۔ ہم نے اس کے منہ میں کپڑا بھی ٹھونس دیا اور پلیٹ فارم کی دوسری جانب اتر کر ایک طرف بڑھتے چلے گئے۔ پھر ہمیں وہاں سے دہلی پہنچنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔

اگلے تین ماہ ہندوستان کی تاریخ میں بڑے ہنگامہ خیز ثابت ہوئے۔

بمبئی میں پرنس آف ویلز کے ساحل پر اترتے ہی احتجاجی ہنگامے شروع ہو گئے۔ اگرچہ کانگریس کی پوری کوشش یہ تھی کہ پرنس آف ویلز کے دورے کا بائیکاٹ کرتے ہوئے، احتجاج تشدد کی صورت اختیار نہ کرے۔ لوگ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار صرف نعرے لگا کر کریں، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ایسا ہوتا بھی کیسے! وہاں مجاہد اوّل موجود تھا اور ہماری تنظیم کے کارکن اس موقع پر پوری طرح تیار تھے۔ مجاہد اوّل کی سخت ہدایت تھی کہ اس موقع پر ہنگامے اتنی شدت اور قوت کے ساتھ ہوں کہ پورے ہندوستان میں دھوم مچ جائے اور بمبئی کی طرح دوسری جگہوں پر بھی ایسا ہی ہو، دوسرے شہروں کو بھی شہ ملے۔

ہجوم کی نفسیات، وہ بھی ایسے ہجوم کی نفسیات بہت مختلف ہوتی ہے جو اپنی نفرت کے اظہار کی خاطر۔ طور احتجاج نعرے لگا رہا ہو۔ ظلم، جابر اور غاصب حکمرانوں سے اپنی نفرت کا اظہار کرنے والا ایسا ہجوم ذرا سی بات پر بھڑک سکتا ہے۔

سو بمبئی میں وہی کچھ ہوا جو وطن پرست تنظیم چاہتی تھی۔ ایسا شدید ہنگامہ ہوا کہ گاندھی جی کو کہنا پڑا کہ میرے خوابوں کے شہر میں آگ لگ گئی۔

بسوں اور ٹراموں کو جلا دیا گیا۔ دکانیں لوٹ لی گئیں۔ شراب خانوں پر پتھراؤ ہوا۔ جب بمبئی کی یہ خبریں پورے ہندوستان میں پھیلیں تو لوگوں کے حوصلے بلند ہو گئے۔ ہر جگہ مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان شہروں میں جہاں پرنس آف ویلز کو دورۂ ہند میں جانا تھا، وہاں مظاہروں اور ہنگاموں کی تیاریاں زور و شور سے شروع ہونے لگیں۔ انگریز حکومت بوکھلا اٹھی۔ رضا کار تنظیمیں خلافِ قانون قرار دے دی گئیں۔ ہندوستان کے گوشے گوشے میں سیاسی لیڈروں اور کارکنوں کی گرفتاریاں ہوئیں۔ اس کے باوجود طوفان تھا۔ پرنس آف ویلز کے دورے کا بائیکاٹ تشدد سے ہم آہنگ ہوتا رہا۔ پرنس آف ویلز کے دورۂ کلکتہ سے قبل پورے ہندوستان میں گرفتار ہونے والوں کی تعداد پچیس ہزار سے تجاوز کر گئی۔ یہ اس وقت کی انگریز حکومت کے اعداد و شمار ہیں عام خیال یہ ہے کہ ہر صوبے سے اتنی تعداد میں لوگ زیرِ حراست لیے گئے تھے۔

حکومت نے ان ہنگاموں کو روکنے کے لیے سیاسی سطح پر مذاکرات کیے جو ناکام رہے۔ یہ مذاکرات کلکتے میں ہوئے جہاں وائسرائے برطانیہ کے شہزادے کے دورے کے انتظامات کے سلسلے میں گیا ہوا تھا۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کہتا تھا کہ پرنس کی کلکتے آمد کے موقع پر ہنگامے نہ ہوں، سیاسی بنیادوں پر گرفتار کیے جانے والے افراد کو رہا کر دیا جائے گا۔ ان گرفتار شدگان میں مولانا جوہر اور ان کے ساتھی شامل نہیں تھے۔ وائسرائے مولانا جوہر اور ان کے ساتھیوں کو رہا کرنے پر آمادہ نہیں ہوا۔ اسی سبب اس کی پیشکش مسترد کر دی گئی۔ سیاسی سطح سے مولانا جوہر اور ان کے ساتھیوں کی رہائی کے مطالبے کے ساتھ ساتھ یہ مطالبہ بھی شامل تھا کہ تحریر، تقریر، انجمن سازی اور صحافت کی آزادی بحال کی جائے۔ یہودی بچے لارڈ ریڈنگ نے یہ مطالبات نہیں مانے۔

سیاسی سطح پر کی جانے والی یہ تمام کوششیں بے ثابت ہوئیں۔ پرنس آف ویلز کلکتے پہنچا تو وہاں بھی ہنگامے

نے اس کا استقبال کیا جوگیندر اور فاطمہ، دونوں بہن بھائی وہاں بہت پہلے پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے مجاہد اوّل کے حکم پر پہلے ہی ہنگاموں کے لیے فضا تیار کر رکھی تھی۔ ان کے ساتھ بنگال بھر کے جیالے سرفروش تھے۔ اس موقع پر انگریز حکومت اور کانگریس، دونوں ہی فریق کوئی سمجھوتا کرنا نہیں چاہتے تھے۔

لارڈ ریڈنگ یہ بات اچھی طرح جانتا تھا کہ بنگال میں ہنگامے ضرور ہوں گے کیوں کہ ہنگامے کانگریس نہیں وہاں موجود دوسری زیرِ زمین انقلابی تحریکیں کریں گی۔ اس نے اسی لیے ایسی شرط رکھی تھی کہ سیاسی لیڈر اسے رہا نہ کرنے دیں۔ کانگریس بھی جانتی تھی کہ بنگال میں ہنگامے روکنا اس کے بس کی بات نہیں، سو وہ یہ وعدہ کرنے پر تیار نہ تھی۔

بعد میں کانگریس، کلکتے میں ان ہنگاموں کی کلغی اپنے سر پر سجاتی رہی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہنگامے بنگال کی انہی زیرِ زمین تنظیموں اور وطن پرست تنظیم کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ تھے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ وطن پرست تنظیم کا رابطہ ان خفیہ تحریکوں سے قائم ہوا اور اس کا سہرا جوگیندر اور فاطمہ کے سر تھا۔ اس سے ہماری کارروائیوں کو ایک نئی جہت اور ایک نئی سمت ملی۔ جلالی کی مہم میں جوگیندر نے میرے سامنے یہی تجویز رکھی تھی۔ میں نے دہلی میں مجاہد اوّل کے سامنے یہ تجویز پیش بھی کی تھی مگر اس وقت وہ دونوں بہن بھائی وطن پرست تنظیم کے رکن نہیں بنے تھے۔ مجاہد اوّل نے اسی لیے اس وقت یہ تجویز قبول نہیں کی تھی۔ کلکتے میں مجاہد اوّل کی اجازت سے جوگیندر اور فاطمہ نے اسی تجویز پر عمل کیا تھا۔

بنگال اس دور میں بھی ہر دور کی طرح ایک ایسا آتش فشاں تھا جو وقفے وقفے سے لاوا اگلتا رہتا تھا۔ جنگ پلاسی سے اب تک وہ ہر دور میں غاصبوں کے خلاف مصروفِ پیکار رہا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں ہندوستان میں سب سے پہلے آزادی کے لیے مسلح جدوجہد کرنے والی تنظیمیں قائم ہوئی تھیں۔ یہی وہ سرزمین تھی جس کے انقلابیوں کے لیے امریکہ میں مقیم ہندوستانیوں نے چندہ اکٹھا کر کے ایک جاپانی جہاز خریدا تھا اور امریکہ میں اسے اسلحہ لدوا کر ہندوستان کے لیے بک کر دیا تھا۔ یہ جہاز سنگاپور سے بہ خیریت گزر گیا تھا لیکن ہندوستان پہنچنے سے قبل انگریز حکومت کو اس کی سن گن مل گئی تھی۔ اسلحہ سے لدا ہوا یہ جہاز اس وقت انگریز بحریہ نے پکڑ لیا جب وہ جزائر انڈیمان سے کلکتے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بنگال کے انقلابیوں کی جانب سے اسلحہ اسمگل کرنے کی یہ

کوشش تو ناکام ہو گئی لیکن یہیں سے بنگال میں زیرِ زمین تحریکوں کی داغ بیل پڑی۔ ان میں تشدد پسند اور دہشت پسند تحریکیں بھی شامل ہیں۔

پرنس آف ویلز جب کلکتے کا دورہ کر رہا تھا اور وہاں ہنگامے ہو رہے تھے تو میں دہلی میں تھا۔ اس عرصے میں دو مرتبہ میں پولیس کے ہتھے چڑھنے سے بچا۔ دوسری مرتبہ تو پولیس نے میری گرفتاری کے لیے گھر پر بھی چھاپا مارا تھا۔ اس وقت میں بخت خاں سے ملنے گیا ہوا تھا۔ لاہور سے میرے متعلق دہلی یہ رپورٹ پہنچ چکی تھی کہ میں پولیس کو مطلوب ہوں۔ ڈیڈی ان دنوں دہلی میں نہیں تھے۔ وہ شملے اور دہلی کے درمیان شٹل کاک بنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے کہ وہ انگریز انتظامیہ کا ایک اہم پرزہ تھے اور پرنس کے دورے کے انتظامات ان کے فرائض میں داخل تھے۔

میرے لیے یہ بہتر ہی ہوا تھا کہ ڈیڈی دہلی میں نہیں تھے ورنہ خدا جانے کیا ہنگامہ ہوتا! پولیس کو مطلوب ہونے کے سبب اب میں فی الحال علی گڑھ کا رخ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ اپنی تعلیم، نصابی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اور پڑھائی شروع ہو گئی تھی۔ اس سے قطع نظر میں اگر پولیس کو مطلوب نہ بھی ہوتا تو اس وقت علی گڑھ نہ جا سکتا۔ میرے نزدیک اوّلیت تنظیم کو تھی اور اب میں تنظیم کا صرف معمولی کارکن نہیں بلکہ مجاہد اوّل کا نائب بھی تھا۔ مجھ پر بڑی ذمے داریاں تھیں۔

جس روز میری گرفتاری کے لیے گھر پر چھاپا پڑا، ممی سخت بیمار تھیں۔ بار بار ان پر بے ہوشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ اس وقت بھی وہ بے ہوش ہی تھیں۔ جب پولیس گھر پر پہنچی۔ یہ باتیں مجھے گھر کے ملازمین سے معلوم ہوئیں۔ ملازمین نے ممی کی علالت کے پیشِ نظر اس سلسلے میں انہیں کچھ نہیں بتایا تھا۔ ڈاکٹروں نے بتایا کہ ممی کے دماغ میں رسولی ہے۔ وہ بہت کمزور ہو گئی تھیں۔ ملازمین ہی سے مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ ڈیڈی انہیں علاج کی غرض سے برطانیہ لے جانا چاہتے تھے مگر ڈیڈی کو اس کی فرصت نہیں مل رہی تھی۔ غلامی بھی کیسی مجبوری ہے کہ شریکِ حیات، زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی اور وہ شخص جو اس کا علاج کرا سکتا تھا اپنے آقاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگا ہوا تھا۔ میرا دل ممی کی حالت دیکھ کر بہت کڑھتا مگر میں انہیں علاج کے لیے برطانیہ یا کسی اور ملک نہیں لے جا سکتا تھا۔ انگریز حکومت بھلا اپنے ایک غدار کو یوں کس طرح ملک سے باہر جانے کی اجازت دے دیتی! وہ تو ہندوستان کے ایک شہر سے دوسرے

شہر جانے کے لیے مجھ پر پہرے بٹھادیتی تھی' میرے راستے میں جال بچھادیتی تھی!

اس کے علاوہ دوسری ستم ظریفی یہ تھی کہ وہ شخص جس کی پوری زندگی انگریز کو سیلوٹ کرتے گزری تھی' وہ جو ڈائریکٹر انٹیلی جنس تھا' اسی کے گھر پر پولیس نے چھاپا مارا تھا۔ موجودہ حالات کے پیش نظر ہی میں نے اپنی ننھیال کا رخ بھی نہیں کیا تھا کہ کہیں وہ لوگ میری وجہ سے کسی مصیبت میں گرفتار نہ ہوجائیں ورنہ میں اپنے مرحوم ماموں زاد اور تنظیمی ساتھی بھائی رحمت علی کی تعزیت کرنے وہاں ضرور جاتا۔ بھائی رحمت علی تنظیم ہی کے حکم پر جنوبی ہند گئے تھے جس طرح میں ملتان گیا تھا۔ وہیں وہ شہید کردیئے گئے تھے۔

تنظیم کا پروگرام یہ تھا کہ دہلی میں پرنس آف ویلز پر قاتلانہ حملہ کیا جائے' لیکن انتظامات اتنے سخت تھے کہ ہمیں کچھ کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اگر ہماری تنظیم پرنس آف ویلز پر قاتلانہ حملہ کرنے میں کامیاب ہوجاتی تو شاید ہندوستان کی آزادی کی راہ مختلف ہوتی۔

اسی دوران میں ڈیڈی دہلی آچکے تھی اور ان کی آمد سے ایک روز قبل میں نے گھر چھوڑ دیا تھا۔ آنے سے قبل انہوں نے ٹیلی گرام دیا تھا۔ ممی سے رخصت ہو کر اور انہیں یہ دلاسا دے کر کہ میں تعلیم کے حصول کی غرض سے اب علی گڑھ جارہا ہوں' میں نے عارضی طور پر بخت خاں کے ساتھ سکونت اختیار کرلی تھی۔ اس نے کوچہ چیلان میں ایک مکان کرائے پر لے رکھا تھا جو دہلی میں تنظیم کے ارکان کا مرکز بنا ہوا تھا۔

دہلی میں ہم پرنس آف ویلز پر قاتلانہ حملہ تو نہیں کرسکے مگر اس کی خدمت پر مامور ایک انگریز افسر کو اغوا کرنے میں کامیاب ہوگئے۔ اس انگریز افسر کے اغوا سے ہم نے فائدہ بھی اٹھایا۔ اسی اغوا کی بنیاد پر ہم نے لائیلپور (فیصل آباد) میں سراج الدولہ کے اہلِ خاندان کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کا انتقام لینے کے متعلق فیصلہ کیا۔

ہم لوگ ٹھیک اسی دن لائیلپور (فیصل آباد) پہنچے تھے جس روز عام سول نافرمانی کا فیصلہ سیاسی سطح پر کیا گیا تھا۔ یہ کانفرنس بردولی میں ہوئی تھی۔ جس میں عام سول نافرمانی کا فیصلہ ہوا۔ کانفرنس نے بردولی کے محصول دہندوں سے اپیل کی تھی کہ وہ آئندہ ہدایات تک حکومت کو لگان اور دوسرے محاصل ادا نہ کریں اس اعلان کے ساتھ ہی گاندھی جی نے حکومت کو یہ الٹی میٹم دیا تھا کہ اگر اب بھی حکومت ان کے مطالبات تسلیم کرلے تو وہ سول نافرمانی ملتوی کردیں گے۔

گاندھی جی کا یہ الٹی میٹم بڑا بچپسا تھا جس میں حکومت سے براہِ راست تصادم سے گریز کرنے کی خواہش پوشیدہ تھی۔

سہ پہر کو ہم لائیلپور (فیصل آباد) پہنچے تھے۔ دہلی ہی کے دورانِ قیام میں سراج الدولہ' راولپنڈی سے اور جوگیندر کلکتے سے دہلی پہنچ گیا تھا۔ فاطمہ کو وہ کلکتے ہی میں اپنے والد موہن لال کے پاس چھوڑ آیا تھا۔ ایسا اس نے مجاہدِ اوّل کے حکم پر کیا تھا۔ ورنہ فاطمہ اس کے ساتھ دہلی آنا چاہتی تھی۔ تیتو میر بھی مجاہدِ اوّل کے ایما پر ہمارے ساتھ تھا۔ یہ وہی تھا جس سے میری ملاقات پہلی بار جلالی کی مہم کے دوران میں ہوئی تھی۔ ان ساتھیوں کے علاوہ بخت خاں بھی دہلی سے ہمارے ساتھ چلا تھا۔

اسٹیشن پر ہمارا استقبال سراج الدولہ کے دوست قربان علی نے کیا۔ راولپنڈی میں مجھے مجاہدِ اوّل سے معلوم ہوچکا تھا کہ قربان علی خفیہ پولیس کے محکمے میں ہمارے لیے مخبری کے فرائض انجام دیتا تھا۔ قربان علی پر اس کے محکمے کے افسران کو شک ہوگیا تھا۔ اس لیے مجاہدِ اوّل کے حکم پر اس نے استعفیٰ دے دیا تھا۔

لائیلپور (فیصل آباد) میں ہمیں ایک ایسے محفوظ ٹھکانے کی ضرورت تھی جہاں کوئی ہم پر ہاتھ نہ ڈال سکے۔ عارضی طور پر ہم قربان علی کے گھر ٹھہر گئے تھے۔ قربان علی' چوک گھنٹا گھر کے قریب بھوانہ بازار کے عقب میں رہتا تھا۔ ہمارے نزدیک یہ محفوظ پناہ گاہ نہیں تھی۔ میں نے بخت خاں اور اپنے دوسرے ساتھیوں سے مشورہ کرنے کے بعد ایک دلیرانہ فیصلہ کیا اور اسے عملی جامہ پہنانے کا قطعی ارادہ کرلیا۔

ادھر سورج غروب ہوا' ادھر میں اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ پولیس کے ایک اعلیٰ افسر کے گھر پہنچ گیا۔ اس کے گھر کی نشان دہی قربان علی نے کی تھی۔ اس پولیس افسر کے گھر میں کل تین افراد تھے' وہ اس کی بیوی اور اس کی جوان بیٹی! ان کے علاوہ ایک ملازم تھا جو باہر کا کام کرتا تھا۔

وہ پولیس افسر ہم سے بہت تپاک سے ملا۔ پھر ہم نے اس کے گھر پر قبضہ کرلیا' اس کے گھر والوں کو یرغمال بنا لیا۔ یہ سب کچھ اتنی آسانی سے ہوگیا کہ خود مجھے بھی اس پر حیرت ہوئی۔

"اب تم اپنی کمر میں سخت درد کی وجہ سے چل بھی نہیں سکتے!" حالات پر قابو پانے کے بعد میں نے اس سے کہا۔

"ہم۔ مگر کیوں؟" وہ گڑبڑا کر بولا "میں تو ٹھیک ہوں"

"تم سے جو کچھ کہا جارہا ہے وہی کرو!" میں نے سختی سے کہا "ہم سب سراج احمد کے دوست ہیں سمجھے!" سراج الدولہ کا اصل نام سراج احمد ہی تھا اور لائیلپور (فیصل آباد) آنے کے بعد خود اسی نے ہمیں اپنا اصل نام بتایا تھا۔ اب اس کا نام کم از کم ہمارے لیے راز نہیں رہ سکتا تھا۔

"سراج کون؟"

"وہ جس کی بیوی' بہن اور بچے کو پولیس کے غنڈوں سے اغوا کرایا گیا تھا۔"

پولیس افسر کی آنکھیں دہشت سے پھیل گئیں "تو۔ تو تم کیا۔ کیا چاہتے ہو؟"

"انتقام!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں "پولیس سے انتقام!"

مجاہدِ اوّل نے ہمیں یہی حکم دیا تھا اور ہم اسی لیے لائیلپور (فیصل آباد) آئے تھے۔ میں نے اس اعلیٰ پولیس افسر سے غلط نہیں کہا تھا۔

آدمی پورے طور پر نہ فرشتہ ہوتا ہے نہ شیطان! سو ہم بھی فرشتے نہیں تھے' ہاں آدمی سے انسان بننے کی کوشش میں ضرور تھے۔ ہمیں معلوم تھا کہ آدمی کو بھی انسان ہونا میسر نہیں۔ وہ پولیس افسر جو اس وقت ہماری گرفت میں تھا' اپنے اندر آدمی ہو یا انسان اس سے قطع نظر ہمارے لیے صرف یہ جاننا کافی تھا کہ وہ بھی اسی جابرانہ نظام کا ایک حصہ تھا جس نے پوری ہندوستانی قوم کو مفلوج بنا رکھا تھا۔ ہمارے ایک ساتھی سراج الدولہ پر فیصل آباد کی پولیس نے جو انسانیت سوز ظلم کیا تھا' ہم اسی ظلم کا جواب دینے آئے تھے۔ خاموشی سے ظلم برداشت کرلینا ہمارے نزدیک ظلم کا ساتھ دینے کے برابر تھا۔

میں نے جب اس اعلیٰ پولیس افسر کو فیصل آباد میں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی آمد کا مقصد بتایا تو وہ گڑگڑانے لگا' اپنی صفائی پیش کرنے لگا کہ میں نے کچھ نہیں کیا۔ اس کے بعد وہ ہم سے ہر ممکن تعاون کرنے پر آمادہ ہوگیا۔

ہمارا مقصد محض یہ تھا کہ وہ پولیس افسر اپنی بیماری کا بہانہ کرکے اپنے گھر تک محدود ہوجائے اور ہمیں اس کی طرف سے کسی قسم کی کارروائی کا اندیشہ نہ رہے۔ وہ سمجھ چکا تھا کہ اس کا سابقہ کن لوگوں سے ہے! اسے ہم نے خود یہ بتادیا تھا کہ ہمارا تعلق وطن پرست تنظیم سے ہے۔ وہ ہماری تنظیم سے ناآشنا نہیں تھا۔ ہم نے پرنس آف ویلز کی خدمت پر مامور انگریز افسر کو اغوا کرکے اپنی تنظیم کی طرف سے وائسرائے کو یہ الٹی میٹم بھیجا تھا کہ سراج کے اہلِ خاندان کو رہا نہ کیا گیا تو ٹھیک اس روز جب پرنس آف ویلز دہلی میں اپنا دربار سجائے گا' اغوا کیے جانے والے انگریز افسر کی لاش کسی مقام پر لٹکی ہوئی پائی جائے گی اور اس دن جو بھی انگریز افسر کہیں دکھائی دیا' اسے گولی ماردی جائے گی' خواہ اس کا نتیجہ کچھ بھی ہو۔ اسی الٹی میٹم کے نتیجے میں سراج کے اہلِ خاندان کو رہائی ملی تھی۔

اس پولیس افسر کی بیوی اور نوجوان بیٹی کو ہم نے ایک کمرے میں بند کردیا تھا اور سراج پستول لیے ہوئے ان کے سر پر مسلط تھا۔ ہمیں یقین تھا کہ اب وہ پولیس افسر اپنی بیوی اور بیٹی کی جان بچانے کی خاطر ہمارے حق میں کوئی غلط قدم اٹھانے کی کوشش نہیں کرے گا۔ جو ملازم باہر کا کام کرتا تھا' اسے باہر سے باہر ہی ٹہلا دیا گیا تھا۔ جس وقت ہم نے اس پولیس افسر اور اس کے اہلِ خانہ کو یرغمال بنایا تھا' ملازم باہر گیا ہوا تھا ویسے بھی وہ رات کو چھٹی کرجاتا تھا۔ ہمارے کہنے پر پولیس افسر نے اسے ایک ماہ کی چھٹی دے دی تھی اور وہ غریب اس پر خوش ہوگیا تھا۔ اسے شبہ تک نہیں ہوا ہوگا کہ اس کا افسر کس حال میں ہے۔

فیصل آباد میں حکومت کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے کے لیے ہم نے سراج اور اس کے اہلِ خاندان ہی کو بنیاد بنایا تھا۔ اس ہنگامے کی پوری منصوبہ بندی میں نے ہی کی تھی۔ اسی منصوبے کے مطابق کانگریس اور خلافت کے ایک مشترکہ جلسے میں سراج کی بیوی' بہن اور بچے کو اسٹیج پر لایا گیا۔ قربان علی اور تنظیم کے دوسرے ساتھیوں نے جن کا تعلق فیصل آباد ہی سے تھا' اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔ ہماری ہی تنظیم کا ایک ساتھی جو خلافت تحریک کا رکن بھی تھا' اس نے بڑے درد انگیز پیرائے میں سراج کے اہلِ خانہ کو پیش آنے والے واقعات سے عوام کو آگاہ کیا۔ میں خود اس جلسے میں جوگیندر کے ساتھ موجود تھا۔ ہمارا ساتھی جب پیش آنے والے واقعات کا آخری حصّہ بیان کررہا تھا تو اس وقت تک لوگ انتہائی مشتعل ہوچکے تھے۔ اسی کے نتیجے میں وہ حکومتِ وقت کے خلاف نعرے بلند کرنے لگے تھے۔

دوسرے دن صبح سارے فیصل آباد شہر کے بچے بچے کی زبان پر یہ واقعات تھے۔ برطانوی قومی پرچم کی طرح چوک گھنٹا گھر سے آٹھ راستے ادھر ادھر نکلتے ہیں۔ ان آٹھوں راستوں پر چلنے والے اس روز دن بھر انہی واقعات کو دہراتے رہے اور پھر شام کو ایک احتجاجی جلسہ ہوا۔ یہ جلسہ

سراج کے گھر سے کچھ ہی فاصلے پر بھوانہ بازار میں ہوا تھا۔ اس جلسے میں سراج کی بیوی نے روتے ہوئے ان واقعات کو خود اپنی زبانی بیان کیا۔ اس سے پولیس کے خلاف نفرت و اشتعال میں کچھ اور اضافہ ہوا۔ جلسہ ختم ہونے کے بعد لوگ چوک گھنٹا گھر کی طرف پولیس کے خلاف نعرے لگاتے ہوئے گئے۔ راستے میں انہیں جو پولیس والا بھی نظر آیا' اس پر انہوں نے آوازے کسے اور برا بھلا کہا۔

بھوانہ بازار میں ہونے والے اس احتجاجی جلسے کے بعد فیصل آباد کے مختلف علاقوں میں احتجاجی اجتماعات ہونے لگے۔ اشتعال رفتہ رفتہ بڑھتا رہا۔ قربان علی جو پہلے خفیہ میں ملازم تھا اور پولیس کے محکمے میں رہ کر تنظیم کے لیے مخبری کے فرائض انجام دیتا تھا' استعفیٰ دینے کے بعد اب نمایاں طور پر ہر جگہ سرگرم دکھائی دیتا تھا۔ حکومت کے خلاف ہر احتجاجی جلسے میں وہ پیش پیش ہوتا تھا۔ میں نے اسے محتاط رہنے کا مشورہ دیا۔ مجھے یہ خطرہ پیدا ہوگیا تھا کہ اسے گرفتار کرلیا جائے گا۔ اس نے میرا مشورہ قبول کرلیا مگر اس وقت تک دیر ہوچکی تھی۔ اسے گرفتار کرلیا گیا۔ اشتعال اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔

جس روز قربان علی گرفتار ہوا سراج کا چچا زاد محمود ہماری گرفت میں آگیا۔ وہ بہت رویا گایا' بڑی منت سماجت کی اور یقین دلانے لگا کہ آیندہ کبھی ایسی حرکت نہیں کرے گا مگر زخمی سانپ کو زندہ چھوڑ دینا اپنی ہی موت کو دعوت دینے کے مترادف ہوتا ہے۔ ہماری نظر میں اس کا جرم ناقابل معافی تھا۔ اسی کے جرم کی پاداش میں تو سراج اور اس کے گھر والوں کو زندگی اور موت کی کشمکش سے گزرنا پڑا تھا اور فیصل آباد کی پولیس وطن پرستوں' یعنی ہماری تلاش میں سرگرداں ہوگئی تھی۔ محمود نہ صرف برادر کشی کا مرتکب ہوا تھا بلکہ اس نے پولیس سے مخبری کرکے یہ ثابت کردیا تھا کہ اس کا ضمیر مرچکا ہے۔

"کسی مردہ ضمیر شخص کو جینے کا کوئی حق نہیں!" میں نے گویا فیصلہ سنادیا۔

یہ سن کر محمود' سراج کے قدموں میں گر گیا۔ سراج کو وہ دوستی اور خاندان کے واسطے دے رہا تھا۔

"تو نہ میرا بھائی ہے اور نہ دوست!" سراج نفرت و حقارت سے بولا اور پھر میں محمود کو جو سزا سنا چکا تھا' وہ سزا اسے دے دی گئی۔ محمود کو اپنی جان سے گزرنا ہی پڑا کہ بے ضمیروں کی یہی سزا ہے۔

محمود کی لاش جب ایک درخت سے لٹکی ہوئی پائی گئی تو اسی کے ساتھ فیصل آباد پولیس کے نام ایک خط بھی تھا۔ جس میں وطن پرست تنظیم نے محمود کے قتل کی ذمّے داری قبول کرلی تھی۔

شہر میں یہ خبر پھیلتے دیر نہ لگی کہ پولیس سے سراج کی مخبری کرنے والے کو سراج کے ساتھیوں نے قتل کردیا ہے۔ اس سے پہلے یہاں ایک انگریز افسر کے اغوا کی خبر بھی پھیل چکی تھی' جس کی جان بچانے کے لیے حکومت نے سراج کے اہل خانہ کو رہا کیا تھا۔

محمود کو قتل ہوئے ایک ہی روز گزرا تھا کہ ہمارے تنظیمی ساتھیوں نے فیصل آباد کے مختلف علاقوں سے بدمعاش صورت پولیس والوں کو بھی برآمد کرلیا جنہوں نے سراج کے گھر میں گھس کر عورتوں کو بے دردی سے پیٹا تھا اور جنہیں خفیہ کے اعلیٰ افسر نے سانڈ کہا تھا۔

ان دونوں واقعات کے سبب فیصل آباد والوں کے حوصلے بڑھ گئے۔ وہ انتہائی پرجوش نظر آنے لگے۔ انہیں یہ خوشی تھی کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو ظالموں کو جواب دے سکتے ہیں' ظالم و جابر حکومت سے پنجہ کرسکتے ہیں۔

ہمارے لیے اب فیصل آباد میں فضا ہموار ہوچکی تھی۔ میرا بنایا ہوا منصوبہ اب اپنی تکمیل کے آخری مراحل میں تھا۔ انگریز کے ٹکڑوں پر پلنے والے پالتو کتوں سے انتقام لینے کا وقت قریب آچکا تھا۔ بارود کے ڈھیر کو چنگاری دکھانے کی دیر تھی اور اس کا موقع خود پولیس نے فراہم کردیا۔

اس رات فیصل آباد کی پولیس نے بڑے بڑے چھاپے مارے۔ وہ وطن پرست تنظیم کے کارکنوں کو گرفتار کرنا چاہتی تھی' خصوصاً ان کارکنوں کو جنہوں نے ایک مخبر کی لاش انہیں بہ طور تحفہ پیش کی تھی۔ اس میں کسی کا بھی کوئی لحاظ نہیں کیا گیا۔ جس پر ذرا سا بھی شبہ ہوا' اس کے گھر پر پولیس نے دھاوا بول دیا۔ پولیس ہم تک نہ پہنچ سکی۔ ہم تو پہلے ہی اس کا بندوبست کرچکے تھے۔ ہم نے ایک ایسے شخص کے گھر کو اپنی پناہ گاہ بنایا ہوا تھا کہ پولیس وہاں چھاپا مارنے کا تصور بھی نہیں کرسکتی تھی۔

صبح ہوئی تو سارا شہر صدائے احتجاج بنا ہوا تھا۔ ابتدا اسکولوں سے ہوئی۔ لڑکے اسکولوں سے باہر آگئے اور انہوں نے پتھراؤ شروع کردیا۔ پولیس حرکت میں آئی۔ اس نے اسکولوں کے بچوں پر لاٹھی چارج کردیا۔ اس میں پولیس نے متعدد لڑکوں کو پکڑ بھی لیا۔

دوسرے ہی روز پولیس کی پے در پے زیادتیوں کے خلاف احتجاجی جلوس نکلا۔ کیوں کہ پرنس آف ویلز ابھی تک ہندوستان ہی میں تھا اس لیے حکومت کی طرف سے تمام صوبوں کی انتظامیہ کو سخت ہدایات جاری کی گئی تھیں کہ وہ مظاہرین کا راستہ نہ روکے اور جلوسوں کو گزرنے دے۔ اس کا مقصد ممکنہ ٹکراؤ اور ہنگاموں کو روکنا تھا۔ کلکتے میں ہونے والے ہنگاموں کے بعد اگرچہ دوسرے مختلف شہروں میں بھی حکومت کے خلاف مظاہرے جاری تھے مگر وہ پرامن طور پر ختم ہوجاتے تھے۔ پولیس محض خاموش تماشائی کا کردار ادا کررہی تھی۔ انگریز کی یہ حکمت عملی کامیاب جارہی تھی لیکن ہم نے فیصلہ کیا تھا کہ فیصل آباد میں ایسا نہیں ہونے دیں گے۔

شہر کی مختلف سڑکوں سے گزرتا ہوا احتجاجی جلوس گھنٹا گھر پہنچا' پھر وہاں سے اس نے بھوانہ بازار کا رخ کیا اور سراج کے گھر تک پہنچ گیا۔ وہاں کی جیالے نوجوانوں نے جلوس سے خطاب کیا۔ پولیس نے ابھی تک اسکول کے ان متعدد طلبہ کو رہا نہیں کیا تھا جنہیں گزشتہ روز لاٹھی چارج کرتے ہوئے پکڑا تھا۔ اطلاعات کے مطابق ان تمام طلبہ کو اسی تھانے میں رکھا گیا تھا جہاں سے سراج کے اہل خانہ کو تھانے کے لیے پولیس کا دستہ بھیجا گیا تھا۔ احتجاجی جلوس اب اسی تھانے کی طرف بڑھ رہا تھا۔

یہ جلوس اب تک جہاں سے بھی گزرا تھا وہاں کوئی پولیس والا موجود نہیں تھا۔ پولیس کو ہدایت تھی کہ وہ تھانے کی چار دیواری تک محدود رہے اور جلوس خواہ کتنے ہی اشتعال انگیز نعرے کیوں نہ لگائے کسی قسم کی کوئی کارروائی نہ کی جائے۔

جوگیندر اور تیتو میر اس احتجاجی جلوس کے درمیان میں تھے۔ میں اور بخت خاں جلوس کے پچھلے حصّے میں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ جلوس پرزور نعرے لگاتا اور پولیس کو برا بھلا کہتا ہوا تھانے کے سامنے سے گزرتا رہا۔ آدھے سے زیادہ جلوس جب تھانے کے سامنے سے گزر گیا تو مجھے بے چینی ہونے لگی۔ اگر سارا جلوس اسی طرح تھانے کے سامنے سے گزر جاتا تو پھر ہمارا مقصد ہی فوت ہوجاتا۔ میں نے اسی لیے فوری طور پر کارروائی کا فیصلہ کیا۔

ایسے مواقع پر عموماً لوگ اس کے منتظر رہتے ہیں کہ کوئی پہلا پتھر چلا دے۔ انہیں تو بس شہ ملنا چاہیے! سو میں نے پولیس کے خلاف تین چار پرزور نعرے لگائے۔ ہجوم نے ان نعروں کا جواب دیا اور پھر میں نے جھک کر پہلا پتھر اٹھا ہی لیا۔ بخت خاں نے بھی میری تقلید کی۔ میں نے پتھر پھینکا جو سیدھا

ایک پولیس والے کو جا کر لگا۔ بخت خاں بھی مجھ سے پیچھے نہیں رہا۔ اسی کے ساتھ جلوس میں شامل دوسرے افراد بھی پتھراؤ کرنے لگے۔ لوگوں کو شہ مل چکی تھی۔ اب انہیں کوئی بھی پتھراؤ کرنے سے نہیں روک سکتا تھا۔

جو پولیس والے تھانے کے باہر متعین تھے' انہوں نے بدحواس ہوکر فائرنگ شروع کردی۔ انہیں یقیناً یہ خطرہ ہوگیا تھا کہ کہیں مشتعل ہجوم ان پر حملہ نہ کردے! مگر یہی ان کی سب سے بڑی حماقت تھی۔ فائرنگ کی آواز سنتے ہی تمام جلوس تھانے کی طرف پلٹ پڑا۔ لوگ پولیس والوں سے بھڑ گئے۔ سپاہی فائرنگ کرتے ہوئے تھانے میں گھس گئے اور پھر دروازہ بند کرکے اندر بیٹھ گئے۔ انہیں تو پسپا ہونا ہی تھا کیوں کہ ان کے پاس گولیاں ختم ہوگئی تھیں۔

اس ہوائی فائرنگ کا مقصد لوگوں کو ڈرانا ہی تھا' مگر ڈرنے کی بجائے وہ اور شیر ہوگئے تھے۔ پولیس کی پسپائی کے دوران ہی میں ایک سپاہی ہجوم کے درمیان پھنس گیا تھا۔ ذرا ہی دیر میں مشتعل ہجوم نے اسے موت کی نیند سلا دیا۔ اسی کے ساتھ فضا نعروں سے گونج اٹھی۔

اب ہجوم کا حوصلہ اور بڑھ گیا۔ اس کے باوجود لوگ تھانے کی طرف بڑھنے سے ہچکچا رہے تھے۔ انہیں ایک بار پھر جوش دلانے اور راستہ دکھانے کی ضرورت تھی۔ میں نے کچھ ہی فاصلے پر موجود بخت خاں کو مخصوص اشارہ کیا اور پھر زوردار نعرہ لگا کر تھانے کی طرف بڑھا۔

"آؤ ساتھیو!" بخت خاں نے میری آواز میں آواز ملائی اور چلتا ہوا میرے قریب پہنچ گیا۔

"آؤ!" کی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

پھر ایک گروہ تھانے کے احاطے میں داخل ہوگیا۔ اس کے بعد گیٹ سے داخل ہوکر انسانی سیلاب احاطے میں پھیل گیا۔

یہ بڑے نازک لمحے تھے۔ تھانے کی عمارت اب مشتعل ہجوم کے نرغے میں تھی۔ لوگوں کو اشتعال دلانے کے بعد انہیں قابو میں رکھنا تقریباً ناممکن ہوتا ہے۔ بخت خاں' جوگیندر' تیتو میر اور میرے علاوہ اس ہجوم میں جتنے بھی تنظیمی ساتھی موجود تھے' ان سبھی پر ایک بڑی ذمّے داری عائد تھی۔ یہ ذمّے داری ان اسکول کے طلبہ کو صحیح سلامت تھانے سے نکالنے کی تھی جو پولیس کی حراست میں تھے کیوں کہ اب پروگرام کے مطابق تھانے کو آگ لگائی جانے والی تھی۔

میں نے مقامی تنظیمی ساتھیوں کو اپنے اردگرد جمع کرنے

کے لیے پہلے سے طے شدہ نعرہ لگایا۔ پھر جیسے ہی تھانے کو آگ لگائی گئی اور آگ سے بچنے کے لیے پولیس والے دروازے کھول کر باہر نکلے' ہم نے انہیں چھاپ لیا۔ حوالات کی چابیاں ملتے ہی ہم سب بھڑا مار کر تھانے کی عمارت میں گھس گئے۔

ان طلبہ کی تعداد پندرہ سولہ کے قریب ہوگی۔ جنہیں ہم نے حوالات سے بہ حفاظت نکال کر تھانے کی عقبی چار دیواری سے فرار کرادیا۔ اس دوران میں مشتعل ہجوم' تھانے کی عمارت سے باہر آنے والے پولیس والوں کے ٹکڑے ٹکڑے کرچکا تھا۔ لاشوں کے یہ ٹکڑے جلتی ہوئی آگ میں جھونک دیئے گئے تھے۔ اب وہ ہجوم اپنی مرضی کا مالک تھا اور اسے کوئی بھی قدم اٹھانے سے نہیں روکا جاسکتا تھا۔ میں اور میرے تمام تنظیمی ساتھی کھسکتے ہوئے تھانے کے احاطے سے باہر آگئے۔ اب ہمیں اپنی محفوظ پناہ گاہ پر واپس پہنچنا تھا۔

کچھ ہی دیر کے بعد ہم اس جلوس کے واقعات سراج الدولہ کو سنا رہے تھے۔ پولیس افسر' اس کی بیوی اور بیٹی سہمے ہوئے سے ہماری باتیں سن رہے تھے۔ انہیں شاید یہ خوف تھا کہ اب ان کی باری آنے والی ہے۔ پھر پولیس افسر نے اپنے اس خوف کا اظہار بھی کردیا۔

"تمہاری میزبانی اور مکمل تعاون کے سبب ہم تمہاری جاں بخشی کردیں گے۔" میں نے اسے تسلی دی۔

انگریز کے خلاف جدوجہد میں یہ پہلا موقع تھا کہ مشتعل ہجوم نے سرکار کے ٹکڑوں پر پلنے والوں سے ایسا بھیانک انتقام لیا تھا۔

فیصل آباد میں ہونے والے اس ہنگامے کی اصل وجوہ کا علم کسی سیاسی رہنما کو نہ ہوسکا۔ خود گاندھی جی نے اس واقعے پر شدید رنج و غم کا اظہار کیا اور یہ بھی کہا کہ کانگریس سے اس کا کوئی تعلق نہیں' کانگریس کا کوئی لیڈر یا کارکن اس ہنگامے کی قیادت نہیں کررہا تھا۔ انہوں نے اس واقعے کو سول نافرمانی ملتوی کرنے کا جواز بنالیا جس کا اعلان کچھ ہی عرصے قبل انہوں نے بردولی میں کیا تھا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ابھی عوام نے ان کے عدم تشدد کے فلسفے کو دل سے قبول نہیں کیا ہے۔ اس طرح گاندھی جی نے سول نافرمانی کے اعلان سے فیصلہ کن بغاوت کی سمت جو قدم اٹھایا تھا' واپس لے لیا۔ پیش قدمی کیے بغیر انہوں نے پسپائی اختیار کرلی۔ لوگوں کے دلوں میں جو لاوا کروٹیں لینے لگا تھا وہ سمندر کے جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ گاندھی جی کی اسی پالیسی کے نتیجے میں اسی سال کانگریس دو حصوں میں بٹ گئی۔

حالانکہ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک ملتوی کرکے انگریز حکومت کو استحکام بخشا تھا' اس کے باوجود اگلے ہی ماہ انہیں گرفتار کرلیا گیا۔

اندولال یاجنک ایک زمانے میں گاندھی جی کے سیکریٹری رہے ہیں' انہوں نے شاید ٹھیک ہی لکھا ہے کہ انگریز حکومت نے گاندھی جی کی گرتی ہوئی ساکھ بحال کرنے کے لیے ان کی گرفتاری کا ڈھونگ رچایا تھا۔

ہم بہرحال اپنے مقصد میں کامیاب ہوچکے تھے۔ ہم اس لیے ہنگامے کے فوراً بعد اسی رات فیصل آباد سے نکل گئے تھے۔

○☆○

جس شب ہم فیصل آباد سے چلے' اس سے دو روز پہلے ہی مجاہد اوّل کا پیغام مجھے مل چکا تھا۔ مجاہد اوّل کا یہ پہلا پیغام تھا جس میں مجھے کوئی حکم دینے کے بجائے مشورہ دیا گیا تھا۔ وہ پنجاب میں نہیں تھا مگر اسے پنجاب کے حالات سے پوری طرح آگہی تھی۔ اس نے اپنا نائب ہونے کی حیثیت سے مجھے اس صوبے میں ہونے والی تمام سرگرمیوں سے آگاہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے بنگال کے تفصیلی حالات بھی لکھے تھے اور مشورہ دیا تھا کہ میں فی الحال پنجاب ہی میں رہوں' یہ زیادہ بہتر ہے۔ اس پیغام کے ساتھ ہی پنجاب کے مختلف شہروں میں تنظیم کے جو کارکن تھے' ان کی فہرست اور ان کے کوائف بھی درج تھے۔ کراچی کے دوران قیام میں بالکل اسی طرح صوبہ سندھ میں سرگرم کارکنوں کی فہرست مجھے فراہم کی گئی تھی جسے میں نے زبانی یاد کرکے پھاڑ دیا تھا۔ موجودہ فہرست کے متعلق بھی مجھے یہی ہدایت دی گئی تھی۔ یہ کسی عام آدمی کے لیے یقیناً انتہائی مشکل تھا' لیکن میرے لیے بہرحال مشکل ثابت نہ ہوا۔ مجاہد اوّل کو بھی میرے حافظے پر بھروسا تھا اور خود مجھے بھی۔ ملتان کی مہم کے بعد اوّل نے مجھے حافظے پر بھروسا کرنے کی تاکید کی تھی۔ قدرت کا یہ عطیہ تھا کہ اس نے مجھے بہترین حافظے سے نوازا تھا۔

اس رات میں دیر تک پنجاب اور بنگال دونوں صوبوں کے سیاسی حالات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ بنگال میں میرا دل پنجاب میں دماغ۔ میں جیسے دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ اوّل نے مجھے سخت آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ یہ ایسا معاملہ تھا کہ میں تنظیم کی نیابت کے باب میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ نہیں کرسکتا تھا۔ جو بھی فیصلہ کرنا تھا خود مجھے ہی کرنا تھا۔

بنگال کے شہر کلکتے میں فاطمہ تھی اور اس سے بچھڑے ہوئے مجھے یوں محسوس ہورہا تھا جیسے صدیاں گزر گئی ہوں۔ حالانکہ اتنے زیادہ دن نہیں ہوئے تھے۔ کیا جانے وہ مجھے کس حال میں اور کس لیے نظر آئی تھی کہ بھلائے نہیں بھولتی تھی۔ کوئی اور اسے دیکھتا تو شاید مجھ سے سودا کی زبان میں یہی کہتا ہے

سودا جو ترا حال ہے ایسا تو نہیں وہ
کیا جانیے تو نے اسے کس آن میں دیکھا

تو ساری بات دیکھنے ہی کی تو ہے' اگر دیکھنے والی آنکھ میسر ہو! ازل سے ایک ہی کہانی تو چلی آرہی ہے' آدم و حوا کی کہانی! مگر اس ایک کہانی کے کتنے رنگ' کتنے پہلو ہیں! کہانیاں کہنے والے اپنے اپنے لفظوں میں یہی ایک کہانی کہہ رہے ہیں' سننے والے پوری دلچسپی' پورے انہماک سے یہی ایک کہانی سنے جارہے ہیں اور سنتے سنتے اوب نہیں رہے۔ ایک ہی حوا ہے جو نسل بعد نسل آدم کو رجھائے جارہی ہے اور آدم اس کے عشق میں جلا ہے' مگر میرا معاملہ ذرا سا مختلف تھا۔ میں تو آدم زاد ہوکر بھی آدم زادہ نہیں تھا۔ میرے باپ ہاموس نے بھی ایک آدم زادی ہی سے عشق کیا تھا اور اس "جرم" کی پاداش میں اپنی جان سے گزر گیا تھا اور میں بھی اسی مرض میں مبتلا تھا۔ میرا مذہب' میرا دین' ایمان عشق تھا اور وجہ تخلیق کائنات بھی تو عشق ہی ہے! میرے نزدیک بہ قول میر وہ سخت "کافر" تھا جس نے سب سے پہلے مذہب عشق اختیار کیا تھا۔ سو میرا عشق مجھے بنگال کی طرف کھینچ رہا تھا اور ارض وطن سے کیا ہوا عہد اس پر اکسا رہا تھا کہ میں ابھی پنجاب ہی میں رہوں۔ اب میں اس پر ایک پچھتاوا سا محسوس کررہا تھا کہ میں نے فاطمہ کے آنچل کو پرچم کیوں بنادیا! ایک تھکے ہارے مسافر کے لیے زلفوں کی چھاؤں کیوں حرام کردی! فاطمہ اگر تنظیم کی رکن نہ بنی ہوتی تو اس پر صرف میرا اختیار ہوتا' مگر اب وہ اپنی مرضی کی مالک نہیں رہی تھی۔ اس نے اپنے اختیار کو خود ایک عہد کی زنجیر پہنادی تھی اور اس میں' میں بھی برابر کا شریک تھا۔ پہلے میں نے اور شاید فاطمہ نے بھی کچھ اور ہی سوچا اور سمجھا تھا شاید یہ کہ اس طرح زندگی کی بھیڑ میں ہم ایک دوسرے کے قریب رہ سکیں گے' قدم سے قدم ملا کر چل سکیں گے۔ یہ خواب اس وقت مجھے بڑا حسین معلوم ہوا تھا اور اب یہی میری آنکھوں میں چبھ رہا تھا۔

میں پنجاب میں تھا اور فاطمہ بنگال میں۔ بنگال کے حالات ایسے تھے کہ فی الحال وہاں میرے بغیر بھی کام چل سکتا تھا اور چل رہا تھا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوسکتا تھا کہ میں جوگیندر کو بھی وہیں بھیج دیتا۔ جوگیندر وہاں کے معاملات کو بہ آسانی سنبھال سکتا تھا۔ مجاہد اوّل کے نائب کی حیثیت سے مجھے یہی فیصلہ کرنا چاہیے تھا۔ کافی غور و خوض کے بعد آخر کار میں نے اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کردیا تھا۔

جوگیندر اور سراج الدولہ نے میرے اسی فیصلے کے مطابق فیصل آباد سے کلکتے کا رخ کیا۔ میں' بخت خاں اور تیتو میر لاہور روانہ ہوگئے۔ مجاہد اوّل کو اپنے فیصلے سے میں نے دوسرے دن صبح ہی ایک خط کے ذریعے آگاہ کردیا تھا۔ وہ اس وقت نینی تال میں تھا۔

ادھر تو ہم فیصل آباد میں پولیس سے انتقام لے رہے تھے' ادھر لاہور میں اس کے برعکس تنظیم کے گرد پولیس کا گھیرا تنگ ہوتا جارہا تھا۔ اس دوران میں وہاں جو کچھ ہوا تھا' مجاہد اوّل نے اپنے پیغام کے ذریعے مجھے اس سے مطلع کردیا تھا۔ مجاہد اوّل نے اپنے اس شبے کا اظہار بھی کیا تھا کہ ممکن ہے لاہور میں کچھ "کالی بھیڑیں" بھی تنظیم کے ارکان میں شامل کرلی گئی ہوں۔ وہاں پے درپے جو واقعات پیش آئے تھے سو وہ اسی طرف اشارہ کررہے تھے۔ خفیہ کے محکمے سے وابستہ کیتھی نے لاہور میں گویا تنظیم کو مفلوج بنا کے رکھ دیا تھا۔ وہ اور اس کا ایک انگریز ساتھی جارج دونوں مل کے ایک اور ایک گیارہ ہوگئے تھے۔ حکومت کو یہ اطلاع مل گئی تھی کہ لاہور میں وطن پرست تنظیم کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ شملے سے اسی لیے بہ طور خاص جارج کو لاہور بھیجا گیا تھا۔ وہ عیار شخص' کیتھی ہی کی طرح بڑی صاف ستھری اردو بولتا تھا۔ خفیہ سے وابستہ انگریز افسران کے لیے اس زمانے میں یہ لازمی شرط تھی کہ وہ اردو پر قدرت رکھتے ہوں۔

مجاہد اوّل ہی کے پیغام سے پہلی مرتبہ مجھے کیتھی کے محکمہ جاتی عہدے کا علم ہوا تھا۔ وہ ڈپٹی چیف آف انٹیلی جنس تھی' مگر اسی کے ساتھ ساتھ اسے انگریز ہونے کے ناتے کچھ خصوصی اختیارات بھی حاصل تھے' ایسے اختیارات جو چیف آف انٹیلی جنس ہونے کے باوجود میرے ڈیڈی تک کو حاصل نہیں تھے۔ یہ بات سمجھ میں آنے والی تھی۔ میرے ڈیڈی بہرحال ہندوستانی تھے۔ حکمرانوں سے ان کا مذہبی رشتہ تو ضرور تھا مگر زمین کا رشتہ نہیں تھا۔ لاہور کے پہلے دوران قیام میں جو گرہ میرے ذہن میں پڑگئی تھی' اب کھلی تھی۔ مجھ پر لاہور کے سی آئی اے سینٹر میں جب تشدد کیا جارہا تھا تو مجھے اسی لیے حیرت ہوئی تھی سی آئی اے والوں نے اس کا لحاظ بھی نہیں کیا تھا کہ میں ان کے محکمے کے چیف کا منہ بولا بیٹا

ہوں یا یہ کہ میری پرورش ایک عیسائی گھرانے میں ہوئی ہے۔ میرا نام بھی ایسا تھا کہ جس سے عام آدمی یہ اندازہ نہیں لگا سکتا تھا' میں مسلمان ہوں یا میرا تعلق کسی اور مذہب سے ہے۔

لاہور ہی میں مجھے یہ اندازہ بھی ہو گیا تھا کہ میرے مکمل کوائف سی آئی اے والوں کے پاس موجود ہیں۔ ظاہر ہے کہ انہوں نے یہ کوائف اسی شخص سے حاصل کیے تھے جس نے میری پرورش کی تھی اور جسے میں "ڈیڈی" کہتا تھا۔ یہ جاننے کے بعد کہ چیف آف انٹیلی جنس ڈیسوزا سے میرا کوئی خونی رشتہ نہیں اور یہ کہ میں مسلمان ہوں' انگریز حکومت میرے ساتھ کوئی نرمی کس طرح کر سکتی تھی! میرے والد ہاموس کے بارے میں شاید ڈیڈی نے حکومت کو کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا ہو اس لیے کہ ان کے اس بیان کو دروغ گوئی ہی پر محمول کیا جاتا کہ میں جن زادہ ہوں۔ اس راز کو افشا نہ کرنے کی خاطر وہ بہ آسانی یہ کہہ سکتے تھے کہ میری ماں سے شادی کرنے کے بعد میرے والد کا کوئی سراغ نہیں مل سکا وغیرہ! یہ تو محض ایک مفروضہ تھا۔ ڈیڈی نے اس صورتِ حال کو کس طرح فیس کیا ہوگا۔ یہ تو وہی بہتر جان سکتے تھے۔ ان سے میری ملاقات کو اب تقریباً ایک سال ہونے والا تھا۔ راولپنڈی سے میں دہلی ہی گیا تھا مگر اس وقت ڈیڈی' دہلی میں نہیں تھے۔ جب وہ دہلی آئے تو اس سے پہلے ہی میں گھر چھوڑ چکا تھا۔ میں دانستہ ان سے نہیں ملا تھا کیوں کہ میرے اور ان کے راستے اب واضح طور پر الگ الگ ہو چکے تھے۔ وہ اس جابرانہ نظام کا ساتھ دے رہے تھے جس کے خلاف میں برسرِپیکار تھا۔ اس کے باوجود میرے دل میں ان کی انتہائی عزت تھی۔ انہوں نے مجھے باپ کی شفقت ہی دی تھی۔ جوان ہونے تک تو مجھے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں ان کی اولاد نہیں ہوں۔ انہوں نے اور ممی نے مجھے کبھی یہ احساس نہیں ہونے دیا تھا کہ میرے والد اس دنیا میں نہیں ہیں۔ یوں گویا انہوں نے ایک یتیم کے سر پر ہاتھ رکھ کر کم از کم اپنی آخرت تو سنوار ہی لی تھی۔ میری نظر میں ان کا اتنا ہی احترام تھا جتنا اپنے سگے باپ کا ہو سکتا تھا۔ اسی حقیقت کے ساتھ دوسرا بڑا سچ یہ تھا کہ میں کسی بھی مرحلے پر اپنے ڈیڈی کی محبت یا احترام کے پیشِ نظر ملک و قوم کی آزادی کا سودا نہیں کر سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ڈیڈی سے مصالحت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔

میں ان حالات میں دوبارہ لاہور کی طرف پلٹا تھا۔

اطلاعات کے مطابق لاہور میں میرے دو تنظیمی ساتھی خفیہ والوں کی گرفت میں آ گئے تھے۔ ان میں سے ایک نے تفتیش کے دوران میں خود ہی موت کو گلے لگایا تھا اور دوسرے ساتھی پر اس قدر تشدد کیا گیا تھا کہ وہ اپنی جان سے گزر گیا تھا۔ یہ "کارنامہ" جارج اور کیتھی نے انجام دیا تھا۔ جارج آفیسر آن اسپیشل ڈیوٹی کے طور پر لاہور آیا تھا اور "اسپیشل ڈیوٹی" دینا اس نے شروع کر دی تھی۔

یہ اطلاعات مجھے فیصل آباد میں آخری بڑا ہنگامہ ہونے سے پہلے ہی مل گئی تھیں۔ شاید اسی کا ردِعمل تھا کہ میں نے حکومت کے کارندوں سے انتقام لینے میں کسی بھی قسم کی نرمی نہیں برتی تھی۔ پنجاب اور خصوصاً لاہور کے موجودہ حالات میں مجھے بنگال جانا خود غرضی لگا تھا اور میں نے مجاہدِ اوّل کا مشورہ قبول کر لیا تھا۔ مجاہدِ اوّل کا نائب ہونے کی حیثیت سے اب میں پنجاب میں کوئی بھی قدم اٹھا سکتا تھا۔

فیصل آباد کے دوران قیام میں جو کامیاب حکمتِ عملی میں نے اختیار کی تھی' اس نے میرے اندازِ فکر کو بڑی حد تک بدل دیا تھا۔

لاہور پہنچتے ہی میں نے اپنے تنظیمی ساتھیوں کی ایک ہنگامی میٹنگ طلب کر لی تھی جس میں انہیں نئی حکمتِ عملی کی وضاحت کرتے ہوئے میں نے کہا "اب اینٹ کا جواب پتھر سے دیا جائے گا! ہم ظالموں سے ان کے ظلم کا حساب لیں گے!" پھر میں نے انہیں جارج اور کیتھی کے بارے میں بتایا۔ "اب ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے گا اور ہم راہِ فرار اختیار نہیں کریں گے! مگر اس سے بھی پہلے ہمارے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرنے والے کس طرح خفیہ والوں کے ہتھے چڑھ گئے؟ ہم سے کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی غلطی ضرور ہو رہی ہے۔" وہ جس کا تنظیمی نام ظفر تھا' میں نے اسے بولنے کا موقع دیا۔

"اب تک ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں اور مجاہدِ اوّل کو بھی اس سے آگاہ کر چکے ہیں کہ تنظیم کے نو منتخب ارکان ہی میں سے کوئی پولیس کے لیے مخبری کر سکتا ہے۔" ظفر نے بولنا شروع کیا "گزشتہ سال بھر کے عرصے میں ہماری تعداد دوگنی ہو چکی ہے۔ میری مراد صرف لاہور شہر سے ہے۔ تنظیم کی رکنیت سازی میں کم از کم اس شہر کی حد تک عجلت سے کام لیا گیا ہے۔"

"اس کی ذمے داری کس پر عائد ہوتی ہے؟" میری اجازت سے بخت خاں نے ظفر سے سوال کیا۔ اس میٹنگ کی صدارت بہرحال میں کر رہا تھا اور میٹنگ میں شریک کوئی بھی شخص میری اجازت حاصل کیے بغیر بولنے کا مجاز نہیں تھا۔

ظفر نے بخت خاں کے سوال کا جواب دینے سے پہلے

اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص کی طرف دیکھا۔ اس شخص نے مجھ سے بولنے کی اجازت چاہی۔

"بخت خاں کے سوال کا جواب آپ دینا چاہتے ہیں دلاور؟" میں بولا۔ اس شخص کا تنظیمی نام یہی تھا۔

"جی ہاں جناب!" دلاور نے کہا "اس کی ذمے داری مجھی پر عائد ہوتی ہے۔ مجھے اپنی غلطی کا اعتراف ہے۔ میں ظفر کے خیال سے متفق ہوں۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا!" میری تیوریوں میں ایک دم بل پڑ گئے اور لہجہ بھی بدل گیا "کیا آپ یہ سمجھتے ہیں کہ آپ کا اعتراف دو قیمتی جانوں کے برابر ہے؟ بولیں! کیا اس طرح تلافی ممکن ہے؟ ۔ جواب دیں!" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میری آواز میں مزید سختی آ گئی۔

دلاور کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ مجھے تنظیم میں اس کی حیثیت کا پورا احساس تھا' وہ لاہور شہر میں تنظیم کا نگرانِ اعلیٰ تھا اور کسی بھی نئے رکن سے حلف لینے کا مجاز بھی تھا' لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ جواب دہی ضروری تھی۔

"مجھے آپ کی نیت پر ہرگز شبہ نہیں" میں نے دلاور کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت اور جھکی ہوئی گردن دیکھ کر اس کے کچھ بولنے سے پہلے مزید کہا "اس کے باوجود غلطی بہرحال غلطی ہے۔ ہم اپنی ہتھیلیوں پر سروں کے چراغ لے کر اپنے گھروں سے نکلتے ہیں کہ غلامی کی اس سیاہ رات میں ہمارے پیچھے آنے والوں کو اپنی منزل کا صحیح راستہ نظر آ جائے۔ ان حالات میں ہم کسی معمولی سی غلطی کو بھی برداشت کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ دلاور! کیا آپ کو اس بات کا احساس ہے؟"

"جی ہاں شاہین' میں جانتا ہوں۔" دلاور نے مجھے میرے تنظیمی نام سے مخاطب کیا "میں دراصل اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ شاید ہماری افرادی قوت بڑھ جانے سے تنظیم اس شہر میں مزید مضبوط ہو جائے گی۔ مجھ سے جو غلطی ہو چکی ہے' میں اس کی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہوں۔ میں نے اسی لیے پہلے ہی مرحلے میں اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا۔"

"آپ نے اپنے حاصل شدہ اختیارات کے سبب اس شہر میں تنظیم کو خطرے سے دوچار کر دیا ہے اور اسی کے نتیجے میں گزشتہ دنوں ہمارے دو سرفروش ہم سے ہمیشہ کے لیے بچھڑ گئے ہیں۔ میں مجاہدِ اوّل کا نائب ہونے کی حیثیت سے آپ کو تنظیم کے موجودہ عہدے سے معزول کرتا ہوں۔ آپ نے خود کو اس کا اہل ثابت نہیں کیا۔ کیا آپ تنظیم کے ایک معمولی رکن ہونے کی حیثیت سے ہمارا ساتھ دینے پر آمادہ ہیں؟"

مجھے علم تھا کہ دلاور کا جواب کیا ہوگا۔ یہی جواب تقریباً ایسی ہی صورتِ حال میں مجاہدِ اوّل کو میں نے بھی دیا تھا۔ یہ واقعہ کراچی کا تھا جب مجاہدِ اوّل نے ملتان مہم کی تحریری رپورٹ لکھنے پر مجھے معزول کر کے جوگیندر کو اس دستے کا سربراہ بنا دیا تھا جو عملاً بخت خاں کی جگہ ملتان میں جس کی سربراہی میں کر رہا تھا۔ دلاور نے بھی وہی جواب دیا اور یہ تنظیم سے اس کی وفاداری کا ثبوت تھا۔

دلاور کا جواب اگر نفی میں ہوتا یا میں یہ محسوس کر لیتا کہ اس کے جواب میں اخلاص کی خوشبو نہیں تو صورتِ حال مختلف ہوتی۔ وطن پرست تنظیم ایسی تنظیموں میں داخلے کا راستہ تو مشکل ہوتا ہی ہے۔ مگر ان سے نکلنے کا صرف اور صرف ایک ہی راستہ ہوتا ہے اور یہ راستہ بس ایک ہی سمت جاتا ہے' موت اور صرف یقینی موت کی سمت! مجھے نہیں معلوم کہ دلاور کو یہ بات معلوم تھی یا نہیں البتہ میرا ہاتھ اس وقت پستول کے دستے پر ضرور تھا جب وہ میرے سوال کا جواب دینے والا تھا۔ کوئی ایسا شخص جو تنظیم کے رازوں سے واقف ہو جائے اور پھر تنظیم کے کسی فیصلے سے انکار کرے تو اس کا واضح مطلب بدعہدی یا دوسرے الفاظ میں غداری ہی ہوتا ہے۔ غدار کی سزا ایسی تنظیموں میں موت ہی ہوتی ہے کیوں کہ کسی ایک شخص کی غداری کی وجہ سے تنظیم کے بقیہ ارکان کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ سو یوں! ایک شخص کے مفاد پر اجتماعی مفاد کو قربان نہیں کیا جاتا۔ اسے سنگ دلی اور بے رحمی بھی کہا جا سکتا ہے۔ مگر یہ ضروری ہوتی ہے۔ اس کے بغیر نظم و ضبط برقرار رکھنا ممکن نہیں ہوتا۔ زیرِ زمین تنظیمیں ایسے ہی سخت قوانین پر عمل کر کے اپنا تحفظ کرتی ہیں۔

دلاور کا جواب سننے کے بعد میں نے اطمینان کا سانس لیا' پھر بولا "دلاور! آپ کی غلطی کی کم سے کم سزا یہی ممکن تھی کہ آپ کے اختیارات سلب کر لیے جائیں۔ آپ کی جگہ یہ اختیارات شیر بہادر کے سپرد کیے جاتے ہیں۔" یہ کہتے ہوئے میں نے خوب صورت چہرے والے اس نوجوان کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر چھوٹی چھوٹی مونچھیں بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ اس کے سرخ و سفید چہرے پر جذبوں کی تحریر صاف پڑھی جا سکتی تھی۔

اس نے اٹھ کر میرا شکریہ ادا کیا۔ وہاں موجود چاروں مقامی تنظیمی ساتھیوں میں عمر کے اعتبار سے وہی سب سے چھوٹا تھا' مگر اسے اختیارات دینے کا سبب عمر نہیں اس کے وہ کوائف تھے جو میری نظر سے گزر چکے تھے۔ اتنی سی عمر میں وہ بڑی قیامت شے تھا۔ شیر بہادر اس کا تنظیمی نام ہی تھا۔

مجھے اس کا اصل نام بھی معلوم تھا کیوں کہ مجھے جو فہرست فراہم کی گئی تھی اس میں ارکان کے اصل اور تنظیمی نام دونوں ہی درج تھے۔

شیر بہادر کو مبارک باد دینے والا پہلا شخص دلاور ہی تھا۔ اس نے بڑے پرجوش اور کھرے لہجے میں کہا تھا "مجھے اس پر بے انتہا خوشی ہے کہ لاہور میں تنظیم کی قیادت ایک نوجوان کے سپرد کی گئی ہے' ایسے نوجوان کے سپرد جو کئی بار کڑی آزمائشوں سے گزر چکا ہے۔"

"شیر بہادر! تمہیں یہ ذمے داری سپرد کی جاتی ہے کہ تین دن کے اندر اندر دلاور کی معاونت سے تنظیم کے نو منتخب ارکان کے بارے میں فیصلہ کن رپورٹ دو!" میں نے کہا "تمہیں اس کام کے لیے اس سے زیادہ وقت نہیں دیا جاسکتا۔ دلاور کو تمہارا معاون محض اس لیے بنایا گیا ہے کہ یہ نو منتخب ارکان کی نشان دہی کرسکیں جن سے ظاہر ہے' تم واقف نہیں ہوگے۔"

مقامی تنظیمی ساتھیوں میں سے چوتھے فرد کا تنظیمی نام مجاہد تھا۔ میں نے اب اسے مخاطب کیا "مجاہد! تم اور ظفر' بخت خاں اور ٹیپو میر کے ساتھ مل کر شملے سے یہاں بھیجے جانے والے عیار انگریز جارج کو ٹھکانے لگاؤ گے۔ اس دستے کی سربراہی بخت خاں کریں گے۔ تین دن کے اندر اندر اس اہم مہم کے ابتدائی مراحل طے ہوجانا چاہئیں۔ اس سلسلے میں ضروری ہدایات تمہیں اور ظفر کو بخت خاں سے مل جائیں گی۔ تین دن کل سے شمار ہوں گے۔ اور اب آخری ہدایت! یہاں موجود چاروں مقامی ساتھیوں کے علاوہ فی الحال تنظیم کے کسی بھی رکن سے کوئی تنظیمی کام نہیں لیا جائے گا۔ تنظیم نے کیا نئے فیصلے کیے ہیں' اس کا علم یہاں موجود افراد کے سوا کسی کو بھی نہیں ہونا چاہیے' خواہ وہ شخص تنظیم کا کوئی پرانا رکن ہو یا نیا! یہ احکام اس وقت تک کے لیے ہیں جب تک ہم کسی "کالی بھیڑ" کا سراغ لگا کر اسے اس کے انجام تک نہیں پہنچا دیتے۔ کوئی سوال؟" میں نے باری باری اپنے تمام ساتھیوں کی طرف دیکھا۔

کسی نے بھی کوئی سوال نہیں کیا اور میں نے میٹنگ ختم ہونے کا اعلان کردیا۔

ظفر' دلاور اور مجاہد میٹنگ ختم ہونے کے کچھ ہی دیر بعد چائے پی کر رخصت ہوگئے۔ شیر بہادر وہیں رہ گیا کیوں کہ وہی ہمارا میزبان تھا۔

لاہور پہنچنے کے دوسرے ہی دن مجھے وہ خبر مل گئی جس کے لیے ایک ایک دن گن رہا تھا۔ یہ اس شخص کے رہا ہونے کی خبر تھی بعد میں جس کی موت پر ایک زمانے نے رشک کیا۔

سو اس شخص کو رہا کردیا گیا جس نے قتل حسینؓ کو مرگ یزید کہا تھا۔ ہاں یہ وہی مولانا محمد علی جوہر تھے جنہوں نے میرے سینے میں تحریک آزادی کی شمع روشن کی تھی جن کا دیدار میں نے پہلی بار دہلی میں کیا تھا اور جن کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میری روح میں اترتے چلے گئے تھے۔

پھر میں نے لاہور ہی کے دوران قیام میں یہ بھی سنا کہ رہائی ملنے کے بعد جب مولانا جوہر امرتسر کانگریس سیشن میں شرکت کے لیے پہنچے تو سارا شہر ان کی زیارت کے لیے امنڈ آیا۔

یہ ۱۹۲۳ء کا واقعہ ہے مگر لگتا ہے جیسے کل ہی کی بات ہو۔ وقت کتنی تیزی سے گزر جاتا ہے!

تنظیم کے حلقہ اہل فکر میں سے ایک اہم شخصیت لاہور میں بھی موجود تھی۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے وطن پرست تنظیم کے بڑے گائڈ لائن لیتے تھے۔ ان کے مشوروں کو غور سے سنتے تھے۔ تنظیم کے لیے سوچنے والے ان افراد کی حیثیت دماغ کی سی تھی۔ کراچی میں ایسے ہی سوچنے والے ایک دماغ سے میری ملاقات ہوچکی تھی۔ ان کو ہم سید صاحب کہتے تھے جن کا ذکر میں اپنی سرگزشت میں کرچکا ہوں۔ لاہور میں چودھری عنایت تھے۔ پنجاب کی فہرست میں سب سے پہلا نام انہی کا تھا۔ چودھری صاحب کے کوائف میں میرے لیے جو سب سے اہم بات تھی وہ یہ کہ ان کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا اور اس حلقۂ احباب میں علامہ اقبال کا نام بھی شامل تھا۔ میں گویا ان کے ذریعے علامہ سے مل سکتا تھا۔ جیسا کہ میں پہلے بھی بیان کرچکا ہوں کہ اس وقت تک علامہ نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا تھا مگر ان کے افکار ملت اسلامیہ پر اثر انداز ہونے لگے تھے۔ ان کی شاعری مسلمانوں کے دل کی آواز بنتی جارہی تھی۔ میرے سیاسی آئیڈیل مولانا محمد علی جوہر کی رہائی پر انہوں نے جو اشعار لکھے تھے' ان سے بھی میں بہت متاثر ہوا تھا۔

میں چودھری عنایت سے ملا اور ان سے پنجاب کے سیاسی حالات پر میری تفصیلی گفتگو ہوئی۔ اس گفتگو سے کچھ نئے امکانات روشن ہوئے۔ چودھری صاحب نے اسی روز شام کو میری دیرینہ خواہش پوری کردی۔ علامہ اقبال سے وہ ملاقات آج تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ میں نے اس مختصر ملاقات میں ایک بات بہ طور خاص محسوس کی کہ علامہ نہ صرف ایک بڑے شاعر ہیں بلکہ وہ اعلیٰ تر قائدانہ صلاحیتیں بھی رکھتے ہیں۔ پھر مستقبل نے میرے اس احساس پر مہر صداقت ثبت کردی۔

جس شام میں علامہ اقبال سے مل کر لاہوری گیٹ کی طرف لوٹ رہا تھا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ کچھ آنکھیں میری نگرانی کررہی ہیں۔ میں نے اپنے ٹھکانے پر واپسی کا ارادہ ترک کردیا۔ اب میرا رخ بادشاہی مسجد کی طرف تھا۔ مغرب ہونے والی تھی اور میں نے مغرب کی نماز بادشاہی مسجد میں پڑھنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں اس دوران میں اپنا شک دور کرلینا چاہتا تھا۔

وہ دو تھے اور ان میں سے ایک کو پہچاننا میرے لیے کچھ ایسا زیادہ مشکل نہیں ہوا۔ اسے میں نے اور اس نے مجھے بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ہرچند کہ اس کا حلیہ بالکل بدلا ہوا تھا۔ مگر وہ اپنے چہرے کے خدوخال نہیں بدل سکا تھا۔ اس کی سب سے بڑی پہچان ٹوٹی ہوئی کلائی تھی جس پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ پلاسٹر چڑھی کلائی اس پٹی میں پڑی تھی جو اس کی گردن سے بندھی تھی۔ یہ وہی بھاری آواز والا تھا جس نے سی آئی اے میں مجھ پر تشدد کیا تھا۔ اسے دیکھ کر میری آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب وہ تیز اور چمکدار پھل والا استرا میری آنکھوں کے سامنے گھما گھما کر مجھے دھمکیاں دے رہا تھا۔ اس کی کلائی میں نے ہی توڑی تھی۔

میں جب مغرب کی نماز پڑھ کر بادشاہی مسجد سے نکلا تو وہ صدر دروازے کے باہر کاندھے پر جھولی ڈالے فقیروں کے بھیس میں کھڑا تھا۔

"اللہ کے نام پر!" میں نے اس کی بھاری آواز سنی۔ وہ کسی کے آگے ہاتھ پھیلا رہا تھا۔

آج اللہ کے نام پر تجھے موت ملے گی! میں نے دل ہی دل میں کہا اور اس پر اچٹتی ہوئی سی نظر ڈال کر آگے بڑھ گیا۔ مجھے قریب آتے دیکھ کر اس نے اپنے چہرے کو اس چادر سے چھپانے کی ناکام کوشش کی تھی جو وہ اوڑھے ہوئے تھا۔ اس کا ساتھی میرے ہی ساتھ نماز پڑھ کر باہر آیا تھا اور اب کچھ فاصلے سے میرے پیچھے آرہا تھا۔

وہ دونوں خفیہ والے شاید یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ ان کی لاٹری نکل آئی۔ میرا سراغ مل جانا ان کے نزدیک لاٹری نکل آنے ہی کے برابر تھا۔ گزشتہ تین روز سے لاہور میں میری آزادانہ نقل و حرکت کا یہی منطقی نتیجہ نکلنا تھا۔ میں نے دانستہ خود کو خطرے میں ڈالا تھا۔ آج ہی صبح میں نے مجاہد اول کو تفصیلی رپورٹ بھیجی تھی اور اسے لاہور کے نئے حالات سے مطلع کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے آئندہ اقدامات سے بھی آگاہ کردیا تھا۔

میں اس نقل و حرکت کے دوران میں پوری طرح چوکنا اور محتاط رہا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ لاہور میں ایسے لوگ موجود ہیں جو طارنوش کی حیثیت سے میری شناخت کرسکتے ہیں۔ مجھے یہ بھی خبر تھی کہ ان دنوں لاہور میں خفیہ والوں نے تنظیم کے لیے جال بچھا رکھا ہے اور پاگل کتوں کی طرح ہماری بو سونگھتے پھر رہے ہیں۔ میں اگر انتہائی چوکنا اور محتاط نہ ہوتا تو شاید ان دونوں کو نظر انداز کرجاتا۔ میں تو چاہتا ہی یہ تھا کہ جو خفیہ والے مجھے پہچانتے ہیں' سامنے آجائیں۔ اس اعتبار سے میں اپنے مقصد میں کامیاب رہا تھا۔

جس زمانے کا میں ذکر کررہا ہوں' اس زمانے میں لاہور کو باغوں کا شہر کہا جاتا تھا۔ یہ باغ اندرون شہر بھی تھے اور شہر سے باہر بھی۔ سو میں آہستہ قدمی سے ایک باغ کی طرف چل دیا۔ میرا انداز چہل قدمی کا سا تھا۔ دن کے اجالے رات کے سیاہی میں آہستہ آہستہ مدغم ہورہے تھے۔ جس راہ پر میں آگے بڑھ رہا تھا وہ شہر سے باہر جارہی تھی۔ وہ باغ مجھے دور ہی سے نظر آگیا تھا۔ باغ کے قریب پہنچتے ہی میں اچانک پلٹا اور کچھ ہی دور اس جعلی فقیر کو دیکھا۔ اس کا ساتھی غائب تھا۔ وہاں اس کے اور میرے سوا دور دور تک کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ میرے پلٹتے ہی اس نے ایک پیڑ کے تنے کی اوٹ میں چھپنا چاہا تھا مگر پھر نہ جانے کیا سوچ کر اپنے شانے پر پڑی ہوئی جھولی میں ہاتھ ڈال کر آہستہ آہستہ میری ہی طرف بڑھنے لگا تھا۔

مجھے جس لمحے کا انتظار تھا' آخر وہ لمحہ آہی گیا۔ اس کا ہاتھ جھولی سے باہر آچکا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں پستول دیکھا۔ پستول کی نال میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔

"طارنوش! تم بھاگنے کی کوشش نہیں کروگے۔ میں تمہیں زندہ گرفتار کرنا چاہتا ہوں۔" اس کی بھاری آواز مجھے سنائی دی۔ اب وہ مجھ سے کچھ فاصلے پر آکے رک چکا تھا اور اس کی تیز نظریں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

"تمہارا ساتھی دکھائی نہیں دے رہا' وہ کہاں گیا؟" میں نے پُرسکون آواز میں کہا "کیا تم نے اسے دوسرے کتوں کو جمع کرنے بھیج دیا ہے؟"

"بکواس نہ کر!" وہ چیخ اٹھا "میں چاہوں تو تجھے یہیں گولی مار سکتا ہوں۔"

میرا مقصد اسے طیش دلانا تھا اور وہ طیش میں آچکا تھا۔ میں اس وقت ایک انتہائی خطرناک کھیل کھیل رہا تھا' ایک ایسا کھیل جو شاید کسی نے نہ کھیلا ہو۔ میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ پر

گولی چلادے۔
"چوہے! تو مجھے گولی مارے گا!" یہ کہتے ہوئے میں زور سے ہنس پڑا "تجھے بل سے باہر نکالنے ہی کے لیے تو میں لاہور آیا ہوں۔"
"طارنوش!" وہ حلق کے بل چیخا۔
"تو نے مجھے گولی ماردی تو اپنے باپ جارج کو کیا جواب دے گا؟" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔
"اس کا مطلب یہ ہے کہ تجھے بہت کچھ معلوم ہے اور اب۔۔۔"
اس نے یقیناً کچھ اور بھی کہا تھا جسے میں ٹھیک طرح سن نہیں سکا۔ ہاں مجھے اتنا احساس ضرور ہوگیا تھا کہ وہ مجھے گولی ماردینا چاہتا تھا۔ ان الفاظ کے ساتھ ہی میں نے شدید گرمی محسوس کی تھی اور میرا جسم پسینے میں ڈوب گیا تھا۔ اگلے ہی لمحے میرا وجود نادیدہ ہوچکا تھا۔ عین اسی لمحے اس کے پستول نے شعلہ اگلا تھا۔ جس مقصد سے میں نے وہ خطرناک کھیل کھیلا تھا اس میں مجھے کامیابی ہوچکی تھی۔ دانستہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر میں نے اپنی خوابیدہ جناتی صفات میں سے ایک صفت کو بیدار کرلیا تھا۔ یہ صفات مجھے اپنے باپ ہاموس کی طرف سے ورثے میں ملی تھیں۔ جب بھی میری زندگی کو شدید خطرہ لاحق ہوتا تھا خود بہ خود یہ صفات بیدار ہوجاتی تھیں۔ میں انہیں خود متحرک کرنے پر قادر نہیں تھا۔
مجھے اپنی آنکھوں کے سامنے غائب ہوتا دیکھ کر خفیہ کا وہ مخص سحرزدہ سا ہوگیا تھا۔ اس کی نظریں اسی جگہ جمی ہوئی تھیں جہاں چند لمحے پہلے میں اسے نظر آیا تھا۔ میں اس دوران میں اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔
جس وقت میں اس کے ہاتھ سے پستول چھین رہا تھا' دور سے مجھے ایک پولیس جیپ آتی دکھائی دی۔ میرا اندازہ درست ہی نکلا تھا۔ اس خبیث نے اپنے ساتھی کو کسی قریبی تھانے کی طرف بھیجا تھا۔
وہ جو اس لمحے میرے سامنے بدحواس اور دہشت زدہ سا کھڑا تھا' اس کی گردن پر جانے کتنے بے گناہوں کا خون تھا۔ اسے کیتھی کے دستِ راست کی حیثیت حاصل رہی تھی' یہ تو خود میں بھی اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا تھا۔ جب میں سی آئی اے والوں کی قید میں تھا تو خود اسی شخص نے اعتراف کیا تھا کہ ہمیں تو اس کی اجازت بھی ہے' حکومت کے خلاف سرگرمیوں میں ملوث افراد کو گولی ماردیں۔ چند لمحے پہلے اس نے مجھ پر گولی چلا کر اپنا یہی حق استعمال کیا تھا اور اب میں اپنا حق استعمال کرنا چاہتا تھا' وہ حق جو ہر ذی روح کو حاصل ہے'

اپنی زندگی بچانے کا حق! اس نے خود کو قاتل ثابت کردیا تھا اور قاتل کی سزا موت ہے۔
اسے جہنم رسید کرنے میں مجھے صرف چند ہی لمحے لگے تھے۔ میں نے اسی کے پستول کی گولی اس کے دل میں اتاردی تھی۔ اور پھر وہ پستول اس کے ہاتھ میں تھمادیا تھا۔
اس کا ساتھی پولیس کو لے کر جب وہاں پہنچا تو وہ دم توڑ چکا تھا۔ میں وہیں موجود تھا اور میرے لیے ایک ایک لمحہ قیمتی تھا۔ مجھے علم نہیں تھا کہ جانے کب اور کس لمحے میرا وجود نادیدہ نہ رہے اور ابھی ایک کام باقی تھا۔ پولیس والے تو مرنے والے کی موت کا معما حل کرنے میں مصروف ہوگئے اور میں نے اس عرصے میں وہ دوسرا کام بھی نمٹادیا۔ وہاں موجود افراد کو صرف یہی معلوم ہوسکا تھا کہ جو خفیہ والا زندہ تھا اس نے چیخنا شروع کردیا تھا اور پھر اس کی چیخیں دم توڑ گئی تھیں۔ میری انگلیوں کی آہنی گرفت اب اس کی گردن پر تھی اور اس کی آنکھیں ابلی پڑرہی تھیں۔ اس کے دونوں ہاتھ خود اس کی گردن پر تھے۔
"ارے۔۔۔ اسے کیا ہورہا ہے!" کسی پولیس والے نے اپنے دوسرے ساتھیوں کو اس طرف متوجہ کیا تھا۔
"یہ۔۔۔ یہ تو خود اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ رہا ہے۔" کوئی دوسرا خوف زدہ سی آواز میں بولا۔
پھر چند ہی لمحوں میں اس کا جسم ڈھیلا پڑگیا۔ کھیل ختم ہوچکا تھا۔ میں نے ان دونوں کو ختم کرکے اپنے دو ساتھیوں کی موت کا انتقام لے لیا تھا۔ بھاری آواز والا اگر اپنے ساتھی سے میری نشان دہی نہ کرجاتا تو شاید میں اسے زندہ چھوڑ دیتا۔
پولیس کے نزدیک ان دونوں خفیہ والوں نے خودکشی کی تھی اور ان میں سے ایک تو خود ان کی آنکھوں کے سامنے مرا تھا۔

وہاں مزید رکے بغیر میں نے واپسی کا سفر شروع کردیا۔ میں جلد از جلد اس جگہ سے دور نکل جانا چاہتا تھا۔ اردگرد اب خاصا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ ابھی میں داتا دربار کے قریب نہیں پہنچ سکا تھا کہ مجھے انتہائی ٹھنڈک کا احساس ہوا اور پھر مجھے میرا جسم واپس مل گیا۔
چند قدم چلتے ہی مجھے اسنیٰ کی مخصوص خوشبو محسوس ہوئی۔
"طارنوش!" اس نے مجھے مخاطب کیا "یہ تم کیا کرتے پھر رہے ہو؟"
"میں وہی کررہا ہوں اسنیٰ جو مجھے کرنا چاہیے۔" میں

نے اسنیٰ کے نادیدہ وجود کو جواب دیا۔
"مگر اس کے لیے تم نے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔" اس کے لہجے میں خفگی سی تھی "تمہیں اس کے لیے اپنی زندگی خطرے میں ڈالنے کا کوئی حق نہیں۔ اس طرح تم اس حصار سے باہر نکل جاتے ہو جو میں نے تمہاری حفاظت کے لیے قائم کیا ہے۔ کیا تم بھول گئے کہ عالم جنات میں بھی تمہارے دشمن موجود ہیں۔"
"ہاں اسنیٰ مجھے معلوم ہے' مگر پہلے تو کبھی تم نے مجھے اس خطرے سے آگاہ نہیں کیا۔" میں چکرا کر رہ گیا۔
"پہلے کبھی اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی۔" وہ بولی "اس سے پہلے کبھی تم نے دیدہ و دانستہ اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالا تھا۔ سنو! جب تمہارے اندر جناتی صفات پیدا ہوجاتی ہیں تو تم آدم زادوں کے ہر وار سے بچ جاتے ہو مگر اسی کے ساتھ ساتھ ایک بڑے خطرے کی حدود میں داخل ہوجاتے ہو۔ عین ممکن ہے کہ ان لمحات میں تمہارا سراغ لگانے والے کافر جنات تم تک پہنچ جائیں' وہی جنہوں نے تمہارے باپ اور میرے بھائی ہاموس کو قتل کیا تھا۔ میرے بچے! میں تمہیں تاکید کرتی ہوں کہ آیندہ کبھی خود اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالو گے۔ اللہ پر بھروسا رکھو کہ وہ بڑا کارساز ہے۔ انشاء اللہ تم ہر شر سے محفوظ رہو گے۔ سورۂ جن کی جو آیات میں نے تمہیں تعلیم کی تھیں' اب انہی کے ساتھ سورۃ الناس کا ورد بھی کرتے رہا کرو!" ان الفاظ کے ساتھ ہی اسنیٰ کی مخصوص خوشبو معدوم ہوگئی۔
مجھ پر اس وقت ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی اور میں جیسے خود بہ خود سورۃ الناس کا ورد کرتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ عربی زبان جاننے کے سبب میں جو کچھ پڑھ رہا تھا' اسے سمجھ بھی رہا تھا۔ اسی سورت میں جنات اور آدمیوں کے شر سے اللہ کی پناہ چاہی گئی ہے اور میں دونوں ہی کے شر سے محفوظ رہنا چاہتا تھا۔
لوہاری گیٹ تک پہنچتے ہوئے مجھ پر وہی نامانوس سی کیفیت طاری رہی اور میں غیر ارادی طور پر سورۃ الناس کا ورد کرتا رہا۔
میں نے اپنے ساتھیوں کو جو تین دن کی مہلت دی تھی وہ آج ختم ہورہی تھی۔ شیر بہادر اور دلاور مجھے گھر ہی پر ملے البتہ بخت خاں ابھی نہیں لوٹا تھا۔ میرے لیے دروازہ شیر بہادر ہی نے کھولا تھا۔ ہم تینوں نشست گاہ میں آبیٹھے۔
"کیا رہا؟" میں نے سوالیہ نظریں شیر بہادر کی طرف اٹھائیں۔ شیر بہادر کو آج تنظیم کے نو منتخب ارکان کے

بارے میں تفصیلی رپورٹ پیش کرنا تھی۔
"اس کالی بھیڑ کا سراغ مل گیا شاہین!" شیر بہادر نے مجھے میرے تنظیمی نام سے مخاطب کیا۔
"کون ہے وہ؟" میں نے فوراً سوال کیا۔
"اس کے لیے ماضی کا صیغہ استعمال کرنا زیادہ بہتر ہے شاہین! کیوں کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں رہا۔" شیر بہادر بولا "میں معذرت خواہ ہوں کہ کوشش کے باوجود اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکا۔"
"نہیں شیر بہادر' اس میں معذرت کی کوئی بات نہیں۔ ہاں میں یہ ضرور جاننا چاہوں گا کہ تمہیں اس کی غداری کا ثبوت مل گیا تھا یا نہیں؟"
"شیر بہادر نے میری موجودگی میں عین اس وقت اسے گولی ماری جب وہ کیتھی کی کار سے اتر کر اپنے گھر کی طرف بڑھ رہا تھا۔" اس بار شیر بہادر کی بجائے دلاور نے میرے سوال کا جواب دیا۔
"اور کیتھی؟" میں نے پوچھا۔
"افسوس کہ وہ بچ کر نکل گئی۔" شیر بہادر نے بتایا' پھر مجھے بقیہ تفصیلات سے آگاہ کرنے لگا۔
دلاور نے دو نئے ارکان پر اپنے شک کا اظہار کیا تھا۔ گزشتہ تین روز سے دلاور اور شیر بہادر انہی دونوں کی نقل و حرکت پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ آج شام ہی انہیں اپنے مقصد میں کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ وہ نوجوان کیتھی کی زلف گرہ گیر کا شکار ہوگیا تھا۔ دلاور کو اس پر شک اس لیے ہوا تھا کہ کچھ دنوں سے اس کی جیبیں بھری ہوئی رہنے لگی تھیں جب کہ اس کا تعلق ایک غریب گھرانے سے تھا۔ شک کی دوسری وجہ یہ تھی کہ خفیہ کے ہتھے چڑھ جانے والے ہمارے دونوں ساتھی اسی نوجوان کے قریبی عزیز تھے۔ انہی دونوں کے ایما اور سفارش پر اس نوجوان کو تنظیم کا رکن بنایا گیا تھا۔
ابھی گفتگو جاری ہی تھی کہ بخت خاں اور تیتو میر بھی آگئے۔
لاہور میں وہ دن ہمارے لیے خوش قسمتی کا تھا کیوں کہ بخت خاں نے جارج کے ٹھکانے کا سراغ لگالیا تھا۔
بخت خاں بہت پرجوش تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "شاہین! ہم آج ہی رات اسے بھی ٹھکانے لگادیتے ہیں۔"
"نہیں" میں نے انکار کردیا "ہمیں کم از کم دو تین روز تک قطعی خاموش رہنا ہے۔ مصلحت کا تقاضا یہی ہے۔ ہمیں لاہور آئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں! یہاں آنے کے دوسرے دن سے ہم نے اپنے کام کا آغاز کیا ہے۔ یوں

گویا ہمیں آج پورے تین دن ہوئے ہیں۔ ان تین دنوں میں حکومت کے لیے تین لاشوں کا تحفہ کافی ہے۔" آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے میرا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔

"تین لاشیں؟" بخت خاں حیران ہو کر بولا۔

"ہاں" میں نے مسکرا کر جواب دیا "ایک لاش ان کے مخبر کی اور دو لاشیں خود خفیہ والوں کی جو آج ہی شام میرے ہاتھوں مارے گئے۔"

پھر میں نے اس طرح اپنے ساتھ پیش آنے والا واقعہ بیان کیا کہ میرے ساتھیوں پر میری پراسرار قوتوں کا راز نہ کھلے۔

○☆○

وطن پرست تنظیم کے سوچنے والے دماغ چودھری عنایت سے میری ملاقاتیں جاری رہیں۔ میں انہی کے توسط سے پنجاب کے ان سرکردہ سیاسی لیڈروں سے ملا جو اس خطے کی سیاست میں بڑی اہمیت رکھتے تھے۔ اب مجھ پر یہ بات پوری طرح واضح ہوئی کہ مجاہدِ اول' ارضِ پنجاب کو اتنی اہمیت کیوں دے رہا تھا اور اس نے مجھے فی الحال اسی خطے میں رہنے کا مشورہ کیوں دیا تھا! چودھری عنایت نے ان رہنماؤں سے میرا تعارف علی گڑھ کے ایک پُرجوش طالب علم کی حیثیت سے کرایا تھا۔

لاہور میں پولیس' خفیہ اور انگریز انتظامیہ۔ تین افراد کے قتل کا خلاف توقع کوئی ردِعمل نہیں ہوا۔ میں سمجھ رہا تھا کہ لائل پور (فیصل آباد) کی طرح یہاں بھی بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ شروع ہو جائے گی' پولیس جگہ جگہ چھاپے مارے گی اور ظاہر ہے کہ اس دوران میں پولیس سے روایتی حماقتیں سرزد ہوں گی' مگر ایسا نہیں ہوا۔ نتیجتاً میں نے اپنے ذہن میں جو منصوبہ تشکیل دیا تھا اسے بروئے کار لانے کا موقع نہیں ملا۔ کیتھی اور جارج اس معاملے میں کمال ہوشیاری دکھا گئے تھے۔ اس کا سبب غالباً یہ رہا ہو گا کہ وہ لائل پور (فیصل آباد) والی کہانی یہاں دہرانا نہیں چاہتے تھے۔ وہاں جو کچھ بھی ہوا تھا۔ ہماری تنظیم نے اس کی ذمے داری قبول کی تھی۔ لاہور میں بھی اسی نوعیت کے واقعات کا مطلب حکومتِ پنجاب کی بدنامی پر منتج ہوتا۔ ملتان مہم کی ناکامی کا بدلہ میں نے لائل پور (فیصل آباد) میں لے لیا تھا۔ تین افراد کی قتل کی دہشت انگیز کارروائی پر انتظامیہ کی طرف سے کوئی ردِعمل نہ ہونا میرے لیے حیران کن ہی تھا۔

جارج کا قتل بھی انتظامیہ کو مشتعل کر سکتا تھا لیکن مجھے اس سے پہلے ہی ایک موقع مل گیا۔ شاہ عالمی والا واقعہ اسی کے نتیجے میں رونما ہوا۔

اس شام مجھے شیر بہادر حسبِ معمول شہر کی رپورٹ دے رہا تھا "وہ اپنے آپ کو کوئی (شاعر) کہتا ہے اور ہے تک بند!" شیر بہادر نے بتایا۔

شیر بہادر سے میں اس شخص کے بارے میں تفصیلات معلوم کر رہا تھا جس کا نام اس نے دھرم ویر بتایا تھا۔ بخت خاں اور تیتو میر بھی میرے ساتھ ہی بیٹھے تھے۔ کسی میٹنگ کے بجائے ہم چاروں ساتھی اس وقت دوستانہ فضا میں گفتگو کر رہے تھے۔

تیتو میر اپنے مزاج کی شگفتگی کے سبب شیر بہادر کی بات سن کر بول اٹھا "اپنا یار بخت خاں اس سلسلے میں کوئی حتمی فیصلہ دینے کا مجاز ہے میرے بھائی! یہ شعبہ تمہارا نہیں بخت خاں کا ہے' وہ مذکورہ شخص کے بارے میں سراغ لگائے کہ وہ شاعر ہے یا تک بند!"

"بھائی توتا کہانی! میرا خیال ہے کہ تک بندی کا اندازہ لگانے کے لیے کسی شخص کا شاعر ہونا ضروری نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ تیتو میر کو چھیڑنے کی خاطر عموماً میں اسے "توتا کہانی" کہتا تھا۔ یہ لقب میں نے اسے جلالی کی مہم میں دیا تھا۔

"لیکن شاہین' تم اس شخص میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟" بخت خاں نے مجھے مخاطب کیا "ایسے نہ جانے کتنے تک بند لاہور میں ہوں گے۔"

"بخت خاں! برادرِ عزیز' تمہیں شاید یہ معلوم نہیں کہ میں گزشتہ کئی روز سے اس مسئلے پر غور کر رہا ہوں۔"

"یعنی اس میں کوئی مسئلہ بھی درپیش ہے؟ تم اس شخص کی تک بندی کو مسئلہ بنانا چاہتے ہو؟" تیتو میر نے پھر مداخلت کی۔

"میں اسے مسئلہ نہیں بنانا چاہتا بلکہ اس شخص کی تک بندی بہ ذاتِ خود ایک مسئلہ ہے۔ اس کی تک بندی کیا گل کھلا رہی ہے تم اگر شیر بہادر سے معلوم کر لو تو ہوش اڑ جائیں گے تمہارے!" میں تیتو میر کی طرف دیکھ کر بولا۔

"تو پھر فی الفور ہوش اڑائے جائیں' مابدولت ہمہ تن گوش ہیں۔" تیتو میر نے ہنس کر کہا۔

پھر جب میرے کہنے پر شیر بہادر نے اس ہندو شاعر کی تک بندی کے بارے میں بتایا تو واقعی تیتو میر کے ہوش اڑ گئے۔

"اگر ایسا ہے تو۔ تو پھر اس حرام زادے کو سزا دینا بے حد ضروری ہے۔" تیتو میر پرجوش نظر آنے لگا "اور یہ سزا' سزائے موت سے کم نہیں ہونا چاہیے!"

بخت خاں کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ میں نے اسے مخاطب کیا "تم کیا کہتے ہو؟ کیا تیتو میر کی رائے سے تم بھی متفق ہو؟"

"میں دراصل یہ سوچ رہا ہوں شاہین کہ وہ ایسا کیوں کر رہا ہے؟ کوئی بلا سبب تو آگ سے نہیں کھیل سکتا۔" بخت خاں نے اظہارِ خیال کیا "یہ تو خود دھرم ویر کو بھی معلوم ہو گا کہ اس کی تک بندی سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوتے ہیں۔"

"اس اہم نکتے پر کل سے میں بھی غور کر رہا ہوں اور ایک نتیجے پر پہنچ چکا ہوں۔" میں نے کہا "اس کی دیدہ دلیری کا مطلب صرف یہ ہے کہ کوئی اس کی پشت پناہی کر رہا ہے' کوئی ایسا ذمے دار شخص جس پر دھرم ویر کو پورا بھروسا ہے۔ بھروسا ان معنوں میں کہ اگر مسلمانوں نے اس کے خلاف کوئی قدم اٹھایا تو اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ اسے دیدہ دلیری ہی کہا جا سکتا ہے کہ عین اس وقت جب مسجد وزیر خاں میں باجماعت نماز ہوئی' یہ کل مغرب کا واقعہ ہے۔۔۔ تو مغرب کی نماز کے وقت دھرم ویر اپنے کچھ ساتھیوں کو لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس کے ساتھیوں میں سے ایک کے گلے میں ڈھولک لٹک رہی تھی۔ ڈھولک کی تھاپ کے ساتھ دھرم ویر اور اس کی منڈلی نے دل آزارانہ اشعار گانا شروع کر دیے۔ شیر بہادر! تم بخت خاں اور تیتو میر کو بھی اس واقعے کی تفصیل بتاؤ۔"

"پہلی دل آزارانہ بات تو یہ ہے کہ وہ کمینہ اپنی تک بندی کو نعوذ باللہ وحی کہتا ہے۔ شاہ عالمی ہی میں اس حرام زادے کی دکان ہے' کپڑے کی۔ اس کی دکان پر عموماً ہندو غنڈوں کی بھیڑ بھی رہتی ہے۔ اپنے ساتھیوں کے ساتھ کبھی کبھار وہ ڈھولک بجاتا ہوا نکلتا ہے اور اس ٹولی کو "دھرم منڈلی" کہتا ہے۔" شیر بہادر تفصیلات بیان کرنے لگا "پہلے بھی کبھار جب اسے شرارت سوجھتی تھی تو وہ اپنی ٹولی کے ساتھ دن کے وقت بازار میں گاتا بجاتا ہوا نکل آتا تھا۔ دوسرے دکانداروں اور امن پسند لوگوں نے کئی بار اسے ایسا کرنے سے منع بھی کیا' مگر وہ نہیں مانا۔ اصل مسئلہ اس کے اشعار ہی ہیں۔ ان اشعار میں وہ مسلمانوں کا کھلے عام مذاق اڑاتا ہے۔ اپنی اس تک بندی کے متعلق وہ یہ کہتا پھرتا ہے کہ آسمان سے ایک فرشتہ اترتا ہے اور وہ مجھے یہ اشعار سکھاتا ہے۔ اپنے ان اشعار کو وہ "دھرم کوتائیں" کہتا ہے۔

ان میں سب سے افسوس ناک امر یہ ہے کہ وہ ہمارے بزرگانِ دین اور فاتحین کو بھی نہیں بخشتا' جو چاہتا ہے بکواس کرتا ہے۔ کل تو اس نے حد ہی کر دی۔ اس کی دکان کے پچھلے حصے میں بھنگ گھوٹی گئی۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے خوب بھنگ پی' پھر وہ اور اس کے ساتھی ڈھولک کی تھاپ پر گاتے بجاتے نکلے۔ اس وقت مغرب کی اذان ہو رہی تھی اور نمازی مسجد وزیر خاں کی طرف جا رہے تھے۔ وہ حرام زادہ بھی اپنی منڈلی کے ساتھ مسجد کی طرف بڑھ آیا۔ پھر ادھر نماز شروع ہوئی ادھر دھرم ویر اور اس کے ساتھیوں نے زور زور سے گانا شروع کر دیا۔ اشعار یا تک بندی وہی تھی جس کا میں ذکر کر چکا ہوں۔ نماز ختم ہونے سے پہلے وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر وہاں سے چمپت ہو گیا۔"

"ظاہر ہے کہ اس کی یہ ذلیل حرکت نمازیوں کو انتہائی ناگوار ہونا چاہیے۔" تیتو میر بولا "بازار والوں نے آج اس کی خبر نہیں لی؟"

"کیوں نہیں!" شیر بہادر نے جواب دیا "آج دوپہر تو جھگڑا ہوتے ہوتے رہ گیا۔ لوگوں نے گزشتہ روز کی حرکت پر اس سے جواب طلبی کی تو وہ بولا کہ اب تو میں روز یہی کروں گا جسے روکنا ہے مجھے روک کے دکھائے! اسی پر بات بڑھ گئی۔ اسے پہلے سے اندازہ تھا کہ لے دے ہو گی اس لیے اس نے ہندو غنڈے دکان پر جمع کر رکھے تھے۔ اس کی دیدہ دلیرانہ جواب کی وجہ سے وہ لوگ سخت مشتعل ہو گئے جو اسے سمجھانے گئے تھے۔ نوبت باقاعدہ جھگڑے تک پہنچ جاتی کہ بازار کے کچھ بزرگ ہندوؤں نے دھرم ویر کی طرف سے معافی مانگ لی۔ یوں یہ بلا ٹلی۔"

"شاہین! تم نے محسوس کیا کہ اس کے پیچھے کوئی سوچی سمجھی سازش بھی ہو سکتی ہے۔" بخت خاں نے مجھے متوجہ کیا۔

"ہاں یہ ممکن ہے۔ کوئی بھی بڑا جھگڑا ایسی ہی چھوٹی چھوٹی باتوں سے شروع ہوتا ہے۔ تم شاید یہ کہنا چاہتے ہو کہ دھرم ویر کا یہ فعل انفرادی نہیں ہے۔"

"بالکل!" بخت خاں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا' پھر کہنے لگا "اس واقعے کو سرسری طور پر نہیں سمجھنا چاہیے۔ لاہور میں یہ ہندو مسلم فساد کا نقطۂ آغاز بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ اگر واقعی یہ کوئی سازش ہے اور انگریز انتظامیہ لاہور میں ہندو مسلم فساد کی راہ ہموار کر رہی ہے تو ہمیں کوئی بھی قدم بہت سوچ سمجھ کر اٹھانا ہو گا۔ میں یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ مجاہدِ اول نے ہمیں ملتان اسی لیے بھیجا تھا کہ ہم ہندو مسلم فساد نہ ہونے دیں' یہ الگ بات کہ ہماری مہم ناکام رہی اور

وہاں فساد ہو کر رہا۔ اس معاملے میں تنظیم کی مداخلت کا مطلب یا نتیجہ ہندو مسلم فساد کی صورت میں نکل سکتا ہے۔"

بخت خاں غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ اس کے امکانات یقیناً تھے مگر وہ ایک بات بھول رہا تھا۔ میں نے اسی کی طرف بخت خاں کی توجہ مبذول کرائی "فرض کرو' ہم اس معاملے میں نہیں پڑتے' تو کیا اس طرح جو ہونے والا ہے وہ نہیں ہوگا؟"

"ہم اسے روکنے کی کوشش تو کر سکتے ہیں!"

"اسی طرح جیسے ملتان میں ہم نے کوشش کی تھی۔ بخت خاں؟"

"نہیں' کوئی اور راستہ بھی ہو سکتا ہے۔"

"کیا؟"

"سوچنا پڑے گا کوئی راستہ!" بخت خاں پر فکر انداز میں بولا' بہرحال یہ معاملہ ہے نازک! اگر اس کے پیچھے واقعی کوئی سازش ہے تو۔ تو پھر آج ہی سے حکومت کے ایجنٹ افواہیں پھیلانا شروع کر دیں گے۔ اس واقعے کو بڑی آسانی سے بہانہ بنایا جا سکتا ہے۔"

"تم نے ایک بات اور نظر انداز کر دی ہے بخت خاں!" میں بولا "وہ یہ کہ اس طرح کے واقعات سے ہندو شرپسند عناصر کے حوصلے بڑھ جائیں گے۔ دوسری طرف اس سے یہ ہوگا کہ مسلمانوں میں بے حسی اور بددلی پھیلے گی' اگر ایسے واقعات کو نہ روکا گیا!"

"لیکن روکنے کا مطلب۔"

"ٹکراؤ ہوگا نا؟ یہی کہنا چاہتے ہو تم؟"

"ہاں"

"ہماری پوری کوشش یہی ہوگی کہ یہ ٹکراؤ ہندو مسلم فساد کی شکل اختیار نہ کرے' لیکن میں تیتو میر کی اس رائے سے پوری طرح متفق ہوں بخت خاں کہ دھرم ویر کو اس کی گستاخیوں کی سزا ضرور ملنا چاہیے!" میری آواز آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے پرجوش ہو گئی "یار ہم بے غیرت تو نہیں ہیں نا کہ سب کچھ خاموشی سے سنتے اور برداشت کرتے رہیں' صرف اس لیے کہ کہیں ہندو مسلم فساد نہ ہو جائے یہاں!"

ہرچند کہ ہم ساتھیوں کے درمیان دوستانہ ماحول ہی میں گفتگو ہو رہی تھی مگر وہ سبھی تنظیم میں میری حیثیت سے بھی واقف تھے۔ ان کے علم میں تھا کہ میں کوئی بھی قدم اٹھانے یا فیصلہ کرنے میں خود مختار ہوں۔ شاید بخت خاں نے اسی لیے مزید بحث نہیں کی۔ ہاں مجھے چند مشورے ضرور دیئے۔ اسی کے مشورے پر میں نے یہ بات مان لی کہ دھرم ویر کی نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے اور یہ معلوم کیا جائے' اس کی ڈوری کس کے ہاتھ میں ہے! یہ کام شیر بہادر کے سپرد کر دیا گیا۔ روز و شب دھرم ویر کی نگرانی کے لیے کم از کم چار ساتھیوں کی ضرورت تھی۔ شیر بہادر یہ کام مقامی تنظیمی ساتھیوں میں کسی کے ذمے بھی کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ بخت خاں ہی کا مشورہ بھی میں نے قبول کر لیا کہ میں بہ ذاتِ خود بھی دھرم ویر سے مل کر اسے ٹٹولنے کی کوشش کروں اور اندازہ لگاؤں کتنے پانی میں ہے!

دوسرے ہی دن ہندوؤں کے مخصوص لباس میں تیتو میر اور میں شاہ عالمی پہنچ گئے۔ آدمی کا چھو سو لباس انداز گفتار اور آواز بھی اس کے کردار کو بڑی حد تک میں معاون ہوتے ہیں۔ میں نے اسی لیے دھرم ویر کو ایک دیکھ لینا مناسب سمجھا تھا۔ اس کی دکان مسجد وزیر خاں زیادہ دور نہیں تھی۔ شیر بہادر نے کپڑے کی اس چھوٹی دکان کی نشان دہی کر دی تھی اور لوٹ گیا تھا۔ وہاں جانے میرا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ محل وقوع سے آگاہی ہو جائے۔

ہم دونوں گاہک بن کر اس کی دکان پر پہنچ گئے اور دیکھنے لگے۔ کپڑا تو ہمیں خریدنا نہیں تھا' ہم تو اسے قریب سے دیکھنے اور ممکن ہو تو چند جملوں کا تبادلہ کرنے آئے تھے۔ اس وقت دکان پر وہ اکیلا ہی تھا۔ ویسے بھی دکانیں کھلے ہی دیر ہوئی تھی۔

کپڑا دیکھتے ہوئے میں کن انکھیوں سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ عادی ہے۔ ماتھے پر بڑا سا نمایاں قشقہ (تلک' ٹیکا) اس ثبوت تھا کہ وہ خود کو مذہبی ظاہر کرتا تھا۔ مجموعی طور پر کے چہرے کی بناوٹ سے پتا چلتا تھا کہ وہ بڑا کائیاں ہے۔ کا اظہار بھی اس نے ذرا ہی دیر میں کر دیا۔

یونہی کاوکت ہے' کچھ لینا دینا ہے تو لو ورنہ رستہ منہ بنا کر بولا "یہ دکھاؤ' وہ دکھاؤ! تمہیں چاہیے کیا آخر؟"

میں اسے محض بتانے کی خاطر بولا "تمہاری دکان ڈھنگ کا کپڑا ہی نظر نہیں آ رہا تو خریدیں کیا! ہم تو یہ ادھر آ گئے تھے کہ چلو اپنے ہندو بھائی کی دکان ہے اسی فائدہ ہو جائے تو اچھا ہے ورنہ تو یہاں مسلوں کی دکانیں ہوں گی۔"

میری بات پر چینے کے بجائے اس نے مجھے بڑے سے دیکھا۔ یہ اثر یقیناً میرے آخری الفاظ ہی کا تھا۔ دانستہ "مسلوں" کا لفظ استعمال کیا تھا جو عموماً متعصب ہندو بہ طور تضحیک مسلمانوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔

"تم لوگ اپنی بولی سے ادھر کے تو نہیں لگتے!" انداز تصدیق طلب سا تھا۔

"ہاں ہم یوپی سے یہاں آئے ہیں پر تمہیں اس سے کیا!" یہ کہہ کر میں تیتو میر سے مخاطب ہوا "چل بھئی رام پرشاد کسی میلے کی دکان ہی پر چلتے ہیں' یہاں اس شہر میں تو ہر طرف یہی دکھائی پڑتے ہیں۔ اپنے یوپی میں ایسا نہیں ہے۔" یہ کہتے ہی میں اٹھ کھڑا ہوا۔

"بیٹھو تم لوگ!" دھرم ویر جلدی سے بولا "کپڑا شپڑا لینا نہ لینا' گل تو کرو بادشاہو! دسو یوپی دا کی حال اے؟ تسی غلط سمجھ رہے او اتھوں دی ناک دی وچ نکیل پا ہ دی اے!" وہ آدھی اردو آدھی پنجابی ٹھوکنے لگا۔

"چھوڑو جی!" میں نے ہنس کر اس کے لہجے کی نقل اتاری "ادھر کچھ نئیں ہونا۔ ہم نے یوپی میں مسلوں کا جینا حرام کر دیا ہے۔ کیوں رام پرشاد؟" میں نے تیتو میر سے تائید چاہی۔ مقصد دھرم ویر کو بانس پر چڑھانا تھا۔

تیتو میر فوراً میری تائید میں آہستہ سے ہنس کر بولا "ٹھیک جی! انہیں کیا بتانا' کہاں الہ آباد کہاں لاہور! وہاں ہمارا پلہ بھاری ہے اور یہاں مسلوں کا! قدم قدم پر تو یہاں مسجدیں ہیں' مندر تو بس نام کو ہیں۔ یہیں سامنے مسجد نظر آ رہی ہے۔"

بس پھر کیا تھا' دھرم ویر چڑھ گیا بانس پر! اور بکنے لگا۔ پھر اسے کچھ خیال آیا اور مجھ سے بولا "یہ پر کی سے کیا مطلب ہے؟ کیا تم کوئی کوی ہو۔"

"نہیں" میں نے کہا "میں اپنیاس (ناول) لکھتا ہوں۔"

"اور اسی کو بتا کیں کہتے ہیں۔" اس کا سینہ پھولنے لگا۔ میں نے یہ سوچ کر کہ کہیں وہ اپنی "بکواس" سنانا شروع نہ کر دے فوراً ہی کہہ دیا "مجھے کویتا سننے کا کوئی شوق نہیں۔ کویوں اور شاعروں وائروں کو میں زیادہ پسند نہیں کرتا' بے پر کی اور بے مقصد ہانکتے رہتے ہیں۔"

"مگر میری کویتاؤں کا ایک خاص مقصد ہے۔" پھر وہ مقصد بیان کرنے لگا جو مجھے پہلے ہی معلوم تھا۔ اس کے باوجود بھی "اچھا" کہہ کر میں نے اظہارِ حیرت ضرور کیا۔ اس پر وہ کہنے لگا "ٹھہرے کہاں ہو تم لوگ؟"

"کیوں' کیا پکڑوانا ہے ہمیں؟" تیتو میر نے بے تکلفی سے ہنس کر کہا۔

"یہ بات نہیں یار جی! میں تو تم لوگوں کو یہ دکھانا چاہتا تھا کہ ہم بھی یہاں دب کے نہیں رہتے۔"

"وہ کیسے؟" میں نے پوچھا۔

"اگر ثبوت اپنی آنکھوں سے دیکھنا ہے تو کل شام کو

ادھر آ جانا۔ میں نے مسلوں کی چھاتی پہ مونگ دلنے کے لیے ایک دھرم منڈلی بنائی ہے۔" دھرم ویر بڑکیں مارنے لگا اور ہمیں انجان جان کر اپنی "دھرم منڈلی" کا حالیہ "کارنامہ" بیان کرنے لگا جو پہلے ہی ہمارے علم میں تھا۔

"اتنے ویر (بہادر) نہ بنو دھرم ویر جی' دھر لیے جاؤ گے کسی روز!" میں نے دانستہ پانسا پھینکا کہ وہ کھلے۔

میری بات پر وہ زور سے ہنس پڑا۔ جیسے میں نے انتہائی احمقانہ بات کہہ دی ہو' پھر کہنے لگا "او جی چھڈو! کوئی ماں دا لال انگل نئیں اٹھا سکدا! اتھوں ساڈا وڑا ٹیکا اے۔"

"کیوں انگلی نہیں اٹھا سکتا' تم کیا شہر کوتوال لگے ہوئے ہو؟" تیتو میر نے اسے مزید بولنے کی شہ دی۔

معلوم نہیں اس بدذات نے کیسے یہ تاڑ لیا کہ ہم دونوں اسے بانس پر چڑھا رہے ہیں یا پھر اجنبیوں کے سامنے کچھ منہ سے نہیں پھوٹا' بات کو بس ہنس کر ٹال گیا۔ ہم اتنی دیر اس کی دکان پر بیٹھے تھے اور اسے اپنی طرف سے کسی شے میں جتلا بھی نہیں کرنا چاہتے تھے اس لیے اوڑھنے کے لیے ایک چادر خرید لی۔ چلتے وقت اس نے آئندہ روز شام کو آنے کی ہمیں پھر دعوت دی۔ اس نے شام چار اور ساڑھے چار بجے کے درمیان ہم سے آنے کو کہا تھا۔

ہمارا وہاں آنا ان معنوں میں سودمند رہا تھا کہ ہمیں آئندہ روز وہاں برپا ہونے والے ہنگامے کا علم پہلے ہی سے ہو گیا تھا۔ واپسی میں میرا ذہن بہت تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس روز رات گئے تک میں نے دھرم ویر کے قتل کا منصوبہ ترتیب دے لیا۔ اس منصوبے سے میں نے اپنے ساتھیوں کو بھی آگاہ کر دیا تھا۔

"کل اس دریدہ دہن کی زندگی کا آخری دن ہوگا۔" میں نے سوچنے سے پہلے بخت خاں کو مخاطب کیا تھا۔ جو میرے ہی کمرے میں برابر والی چارپائی پر دراز تھا۔

"انشاء اللہ" بخت خاں نے پرعزم لہجے میں جواب دیا تھا۔

دوسرے روز وقت مقررہ پر میں اور میرے ساتھی شاہ عالمی پہنچ گئے۔ دھرم ویر نے ہمیں چار سے ساڑھے چار بجے شام کا وقت دیا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ جو کچھ بھی ہونا تھا' شام ساڑھے چار بجے کے بعد ہی ہونا تھا۔ گزشتہ دن کی طرح آج میرے جسم پر کافروں کا لباس نہیں تھا' نہ تیتو میر یا میرے دوسرے ساتھیوں نے ایسا کیا تھا۔ پستول ہم چاروں ہی ساتھیوں کے پاس موجود تھے مگر ہم نے بہ مجبوری ہی ان کے استعمال کا فیصلہ کیا تھا۔ ہم چاروں دو دو کی ٹکڑیوں میں

آگے پیچھے چل رہے تھے۔ آگے آگے شیر بہادر کے ساتھ تیتو میر تھا اور چند قدم کے فاصلے سے میں بخت خاں کے ساتھ ساتھ تھا۔ بازار کا ایک پھیرا لگا کر ہم دھرم ویر کی دکان کے سامنے سے گزرے۔ اس وقت ساڑھے چار بجنے والے تھے۔ دھرم ویر کی دکان میں ہمیں تین چار ہٹے کٹے ہندو نظر آئے جو اپنے چہروں اور لباس ہی سے غنڈے نظر آرہے تھے۔ دکان کے باہر ایک مونڈھے پر پتلا دبلا ایک تلک دھاری (ماتھے پر ٹیکا لگانے والا) شخص نظر آیا۔ اس کے جسم پر صرف ایک دھوتی تھی جسے آدمی وہ جسم کے نچلے حصے پر باندھے ہوئے تھا اور آدمی جسم کے بالائی حصے پر اوڑھ رکھی تھی۔ داڑھی اور سر کے لمبے بالوں کی وجہ سے وہ سادھو قسم کی کوئی شے معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے پیروں میں کھڑاؤں تھے اور گود میں ڈھولک رکھی تھی۔ اس شیطان صورت ڈھونگیے کو دیکھ کر مجھے یقین ہو گیا کہ میں نے جو اندازہ لگایا تھا' وہ سو فیصدی درست تھا۔ دھرم ویر آج بھی نماز کے وقت اپنی کمینگی دکھانے والا تھا۔

اسی دن صبح مجھے شیر بہادر نے یہ اطلاع دی تھی کہ دھرم ویر گزشتہ رات ایک بااثر ہندو سیٹھ سے ملا تھا۔ سرکاری حلقوں میں اس ہندو سیٹھ کی رسائی تھی اور اسے بڑی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ لاہور کے سیاسی بازی گروں سے بھی سیٹھ کے مراسم تھے۔ سیٹھ حکم چند اور دھرم ویر کے تعلقات کی نوعیت کیا تھی اور دونوں میں کیا قدر مشترک تھی' یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا' لیکن دھرم ویر کی نگرانی کرنے والے ہمارے ساتھیوں نے اتنا بھی سراغ لگا لیا تھا تو بہت تھا۔ اس سے کم از کم مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ دھرم ویر کی پشت پر کون ہے اور اس ڈوری کا سرا کہاں سے ہلایا جا سکتا ہے! لاہور کے سرکاری حلقوں سے سیٹھ حکم چند کے تعلقات میرے لیے ایک واضح اشارہ تھے۔ دھرم ویر اسی کھونٹے پر اچھل رہا تھا۔

ہم گزشتہ روز بھی یہاں آئے تھے مگر پولیس والوں کو نہیں دیکھا تھا مگر آج ایسا نہیں تھا۔ بازار میں کئی جگہ اور خاص طور پر مسجد وزیر خاں کے آس پاس آج پولیس والے نظر آرہے تھے اور یہ بات خالی از علت نہیں ہو سکتی تھی۔

جس وقت ہم ٹہلتے ہوئے مسجد کے قریب پہنچے تو بخت خاں نے مجھ سے سرگوشی کی "اس حرام زادے نے تو پہلے ہی سے خاصا بندوبست کر رکھا ہے۔"

"ہاں' میں بھی دیکھ رہا ہوں۔" میں نے بھی دھیمی آواز میں جواب دیا "اب ہمیں بہت محتاط اور چوکنا رہنا پڑے گا۔ کام دکھاتے ہی یہاں سے ہوا ہو جانا ہے۔"

عصر کی اذان ہوئی تو ہم چاروں ساتھی کچھ ہی دیر کے بعد دیگرے مسجد میں داخل ہو گئے۔ اسی وقت دور ڈھولک کی آواز سنائی دی۔ میں سمجھ گیا کہ دھرم ویر کی اس کی دکان سے روانہ ہو چکی ہے۔ جو لوگ وضو کر جماعت کھڑی ہونے کا انتظار کر رہے تھے' ان کے چہروں تناؤ نظر آنے لگا۔ دکانیں بند ہونے کا ابھی وقت نہیں ہوا اس لیے مسجد میں خاصے نمازی تھے۔ ہم چاروں ساتھی کر کے دانستہ الگ الگ بیٹھے تھے۔ اسی کے ساتھ ہم خیال رکھا تھا کہ پچھلی صفوں میں رہیں۔ ڈھولک کی آواز رفتہ رفتہ بہت قریب آچکی تھی۔ جماعت کھڑی ہونے میں ہی منٹ رہ گئے تھے کہ مسجد کے دروازے کی طرف سے ویر کی بلند آواز سنائی دی۔ اس نے الاپ لے کر آزارانہ تک بندی شروع کر دی تھی۔ اس کے ساتھ پھاڑ پھاڑ کر اس کے اشعار دہرانے لگے اور ڈھولک زور سے بجنے لگی۔

جماعت کھڑی ہوئی اور اسی کے ساتھ ڈھولک کی اور شیطانی آوازوں میں شدت آگئی۔ یوں لگتا تھا جیسے ویر کی ٹولی مسجد کے دروازے ہی پر جمی ہوئی ہے۔ سماعت سے جو الفاظ ٹکرا رہے تھے انہیں سن کر میرا جوش مار رہا تھا۔ بار بار میں یہ کوشش کر رہا تھا کہ میری توجہ نماز ہی کی طرف رہے مگر مجھے اس میں کامیابی ہو رہی تھی۔ اتنے شور میں بھلا میں اپنی کوشش میں بھی کیسے ہوتا! وہاں پولیس موجود تھی' یہ میں اپنی آ سے دیکھ چکا تھا لیکن پولیس کی وہاں موجودگی کا سبب شرپسندوں کو تحفظ فراہم کرنا تھا۔ پولیس کی وہاں موجو تو ان کے حوصلوں کو اور بڑھا دیا ہوگا' میرے لیے زیادہ مشکل نہیں تھا۔

اس نوعیت کا یہ پہلا واقعہ تھا کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے صبر کا امتحان لینا شروع کیا۔ بعد میں تو ہ نے اسے اپنا ایک مؤثر ہتھیار ہی بنا لیا تھا۔ جہاں انہیں برپا کرنا ہوتا وہ ایسی ہی حرکتیں کرنے لگتے۔ ہندو تاریخ میں متعدد مقامات پر ہندو مسلم فسادات کے ا واقعات کا ذکر موجود ہے۔ ایسے واقعات پھر ہندوستا تمام ہی علاقوں میں ہوئے۔ ذاتی طور پر لاہور میں مجھے اس کا تجربہ ہوا۔ یہ تجربہ میرے لیے سوہان روح تھا پڑھنا دوبھر ہو گیا۔ یقیناً یہی حال دوسرے نمازیوں کا بھی دھرم ویر کے بے تکے "اشعار" دل میں خنجر بن کر اتر تھے جن میں وہ کھلے عام ہمارے مذہب کا مذاق اڑا رہا تھا۔ برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ سلام پھیرنے کے بعد جب پیش امام نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو اس وقت بھی ڈھولک کی تھاپ جاری تھی۔

جماعت میں بوڑھے بھی تھے اور میری طرح نوجوان بھی' ظاہر ہے کہ جو حال میرا تھا' سبھی کا تھا۔ غصے کے مارے سبھی کے چہرے تمتما رہے تھے۔

دعا مانگتے ہی بخت خاں اپنی جگہ سے اٹھا اور اس نے مختصر الفاظ میں بڑی پرجوش و مدلل تقریر کی۔ اس مختصر سی تقریر نے دھرم ویر کے خلاف نفرت اور غصے کو نقطۂ عروج پر پہنچا دیا۔ نوجوانوں نے نعرۂ تکبیر بلند کیا اور پھر مسجد کے دروازے کی طرف جھپٹ پڑے۔ انہی میں خود میں اور میرے دونوں ساتھی شیر بہادر اور تیتو میر بھی شامل تھے۔ بخت خاں سب سے پیچھے تھا۔

مسجد سے باہر آتے ہی مشتعل مجمع دھرم ویر منڈلی پر ٹوٹ پڑا۔ ایسے مواقع پر پولیس عموماً تماشائی کا کردار ادا کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ موقع پر موجود نہ ہو۔ مسجد سے نکلتے ہی میں نے خود اپنی آنکھوں سے آس پاس موجود پولیس والوں کو بھاگتے دیکھا۔ معاملہ اگر دو چار دس افراد تک محدود ہوتا تو شاید پولیس اپنا "فرض" ادا کرنے سے نہ چوکتی' مگر وہاں تو ایک ہجوم تھا وہ بھی مشتعل! پولیس والے یقیناً مسجد سے بلند ہونے والے نعرۂ تکبیر کو سنتے ہی وہاں سے کھسکنے لگے ہوں گے۔ انہوں نے شاید یہ اندازہ لگا لیا ہوگا کہ وہ دھرم ویر کو نہ بچا سکیں گے۔

ڈھولکیا تو اسی وقت ریلس لگا گیا تھا جب اس نے نمازیوں کو مسجد سے نکلتے دیکھا تھا مگر ہندو غنڈے پٹے بغیر نہیں بھاگ سکے تھے۔ دھرم ویر بھی فرار ہونے کی فکر میں تھا' مگر وہ کس طرح اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتا! اس کا بلیک وارنٹ تو گزشتہ شب ہی جاری ہو چکا تھا۔ میں نے اور میرے دونوں ساتھیوں نے شروع ہی سے اسے نظر میں رکھا تھا۔ وہ ہم چاروں ساتھیوں کے نرغے میں آگیا۔ ہم چاروں ہی کے ہاتھوں میں کھلے ہوئے کراری دار بڑے چاقو تھے۔

دھرم ویر کے سینے پر پہلا وار میں نے ہی کیا تھا' دوسرا وار پہلو سے شیر بہادر نے کیا اور اس کا پیٹ چیر دیا۔

"ہے رام!" وہ گرتے گرتے چیخا۔

"مارو' مارو' مارو!" ہر طرف سے صدائیں بلند ہو رہی تھیں۔ ہم چاروں ساتھی ہی وہاں نہیں تھے بلکہ نماز پڑھ کر نکلنے والے دوسرے نوجوان بھی ہمارے ساتھ تھے۔ ہم نے

بقیہ کام ان پر چھوڑ دیا۔ اصل کام ہم انجام دے چکے تھے۔ آخری وار اس پر بخت خاں نے کیا تھا۔ اس نے دھرم ویر کی گردن پر چاقو پھیرا تھا۔

پہلا وار کرتے ہی میں پیچھے ہٹ گیا اور اپنی جگہ ایک نوجوان کو دے دی تھی جو اسی ہجوم میں شامل تھا۔ خون آلود چاقو کو میں نے انتہائی سرعت کے ساتھ بڑے سے ایک رومال میں لپیٹ کر نیفے میں اڑس لیا تھا۔ ایسا ہی میرے دوسرے ساتھیوں کو بھی کرنا تھا۔ پستول استعمال کیے بغیر ہی ہمارا کام چل گیا تھا کیوں کہ پولیس نے اس معاملے میں مداخلت نہیں کی تھی۔ اگر پولیس مداخلت بھی کرتی تو دھرم ویر زندہ نہ بچتا۔ ہم اسے گولی مار دیتے۔

دھرم ویر کے قتل کا منصوبہ میں نے اس طرح ترتیب دیا تھا کہ قتل کا الزام کسی فرد واحد پر نہ آسکے۔

ہمارے لیے یہ بھی مشکل نہیں تھا کہ خاموشی کے ساتھ دھرم ویر کو ٹھکانے لگا دیتے مگر اس سے وہ نتائج حاصل نہ ہوتے جو ہمارے پیش نظر تھے۔ ہم اس گستاخ کے قتل کو ہندوؤں کے لیے درس عبرت بنا دینا چاہتے تھے۔ اس نے جس طرح کھلے عام ہمارے مذہب کا مذاق اڑایا تھا' ہم بھی اسی طرح کھلے عام اسے سزا دینے کا فیصلہ کر چکے تھے تاکہ آیندہ کوئی متعصب ہندو ایسی ہمت و جرات نہ کر سکے۔

کوئی ایسا شخص جو نقص امن کا سبب بن رہا ہو' قانون اس کا ساتھ نہیں دیتا اور فیصلہ مفاد عامہ کے حق میں ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اگر وہ شخص ہجوم کے ہاتھوں مارا جائے اور اس کے قاتل یا قاتلوں کا سراغ نہ مل سکے تو عموماً ایسے کیسز داخل دفتر کر دیئے جاتے ہیں۔ میرا اندازہ یہ تھا کہ کم از کم اس کیس میں ایسا نہیں ہوگا۔ انتظامیہ پے در پے حماقتوں کا ثبوت دے گی اور ہماری تنظیم کو اس کے خلاف مزید عملی اقدامات کا موقع مل جائے گا۔

انگریز نے آمر ہونے کے باوجود جمہوریت کا ڈھونگ رچا رکھا تھا اور انگریز ہی کیا ہر آمر کا یہی وتیرہ ہوتا ہے! ہمارا مقصد اس ڈھونگ کا پردہ چاک کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ انتظامیہ اس سلسلے میں یک طرفہ کارروائی کرے گی اور بعد میں ہوا بھی یہی۔ میرے اندازے درست ثابت ہوئے۔ دھرم ویر کے قتل اور پولیس کی کارروائی نے بڑی حد تک انگریز کا اصل چہرہ بے نقاب کر دیا۔ یہ ذکر میں بعد میں کروں گا پہلے اس روز کا پورا واقعہ بیان کر دوں۔

ہم چاروں ساتھی شاہ عالمی سے فرار ہو کر آگے پیچھے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گئے تھے۔

پہلے ہم نے اپنے اپنے خون آلود چاقو دھوئے اور ان رومالوں کو جلادیا جن میں چاقو لپٹے تھے۔ پھر شیر بہادر چائے بنالایا اور ہم چاروں ساتھی پیش آنے والے واقعے کے ردِعمل پر گفتگو کرنے لگے۔ گفتگو کی ابتدا میں نے ہی کی "کیا خیال ہے بھائی بخت خاں، اس واقعے کو بہانہ بنا کر انگریز انتظامیہ لاہور میں بھی ہندو مسلم فساد کرادے گی یا نہیں؟"

"شاہین! میں نے تو پہلے ہی یہ خدشہ ظاہر کیا تھا۔" بخت خاں نے جواب دیا "اس کے امکانات سو فیصد ہیں۔"

"میرا خیال یہ ہے کہ گزشتہ سال اور اس وقت کے سیاسی حالات میں بڑا فرق ہے۔" شیر بہادر بولا "اس وقت تقریباً مسلمانوں کے سارے ہی صفِ اوّل کے لیڈر جیل میں تھے اور اب وہ جیل سے باہر ہیں۔"

"تمہاری مراد مولانا جوہر اور ان کے ساتھیوں سے ہے؟" میں نے کہا۔

"جی ہاں! انہیں رہائی ملے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے۔ کم از کم اس موقع پر حکومت یہ نہیں چاہے گی کہ دوبارہ اس کے لیے کوئی مسئلہ پیدا ہو۔ پھر یہ کہ کوکاناڈ (مدراس) میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا ہے جس کے متعلق یہ خبر گرم ہے کہ مولانا جوہر اس اجلاس کی صدارت کریں گے۔ ایسے وقت میں حکومت ہند مسلم فساد کرانے کی متحمل نہیں ہو سکتی، خواہ وہ فساد پنجاب کے کسی شہر میں ہو یا کسی اور صوبے میں۔"

شیر بہادر کی بات میں وزن تھا۔ میں نے اس سے اتفاق کیا مگر بخت خاں اور تیتومیر کی رائے ہم دونوں سے مختلف تھی۔ وہ شیر بہادر کے سیاسی تجزیے سے متفق نہیں تھے۔

لاہور میں ہندو مسلم فساد ہوتا یا نہ ہوتا، ہمیں دونوں ہی صورتوں میں حالات پر پوری نظر رکھنا تھی۔ اس ضمن میں اسی روز میں نے ضروری اقدامات کے لیے احکام جاری کر دیے۔ انہی احکام کے نتیجے میں دوسرے ہی دن صبح مجھے رپورٹ مل گئی کہ پولیس نے کیا قدم اٹھایا ہے!

پولیس نے گزشتہ رات ہی شاہ عالمی سے تقریباً ڈیڑھ سو افراد کو گرفتار کرلیا تھا۔ اس میں المناک پہلو یہ تھا کہ ان تمام افراد کو قریبی تھانے کی حوالات ہی میں رات بھر قید رکھا گیا تھا۔ حوالات میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ گرفتار کیے جانے والے ڈیڑھ سو افراد کو اس میں رکھا جاتا پھر یہ کہ موسم گرمی کا تھا۔ پیاس کے مارے لوگوں کا برا حال ہو گیا اور آٹھ دس افراد گرمی اور پیاس کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے۔ رات بھر لوگ پانی کے لیے چیختے چلاتے رہے مگر ان کی ایک نہیں سنی گئی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بھی دھرم ویر کا قاتل نہیں تھا۔ وہ سبھی مظلوم اور بے گناہ تھے۔ کسی ایسی ممکنہ صورتِ حال سے نمٹنے کے لیے رات ہی کو میں نے پوری تیاری کرلی تھی۔

ہاتھ سے لکھے ہوئے وہ چار بڑے بڑے پوسٹر تھے جو چاروں ساتھیوں نے رات کو لکھے تھے۔ ان چاروں کی عبارت ایک ہی تھی۔ یہ چاروں پوسٹر لاہور شہر میں جن مقامات پر لگائے جانے تھے، وہ بھی دن کے اجالے میں، بہرحال یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔ ان میں سے ایک شاہ عالمی میں، دوسرا پولیس ہیڈ آفس کی دیوار پر، تیسرا تھانے کی دیوار پر جہاں ڈیڑھ سو بے گناہ افراد کو قید رکھا گیا تھا اور چوتھا پوسٹر سی آئی اے سینٹر کی دیوار پر۔

اس پوسٹر کی عبارت مقتول دھرم ویر کے خلاف تھی۔ آخر میں وطن پرست تنظیم نے اس قتل کی ذمے داری قبول کی تھی۔

"ایک شرپسند ہندو کے قتل ہونے پر ڈیڑھ سو مسلمانوں کی گرفتاری انتظامیہ کی جانب داری کا ثبوت ہے۔"

سرخ روشنائی سے جلی حروف میں مندرجہ بالا جملہ ان چاروں پوسٹروں پر لکھ دیا گیا۔

ہم چاروں ساتھی گزشتہ روز لوگوں کے سامنے آ چکے تھے اور بخت خاں نے تو مسجد وزیر خاں میں تقریر بھی کی تھی، اس لیے یہ مجبوری مقامی ساتھیوں ہی کو یہ اہم کام انجام دینا تھا۔ مجاہد، دلاور اور مظفر کے علاوہ ایک اور با اعتماد ساتھی کے سپرد میں نے یہ کام کیا۔

میں جلد از جلد بے گناہ لوگوں کی رہائی کا آرزو مند تھا لیکن اس غلط فہمی کا شکار بہرحال نہیں تھا کہ صرف ذمے داری قبول کرلینے سے بات بن جائے گی۔ انتظامیہ پر دباؤ ڈالنے کے لیے میں اور بہت کچھ سوچ چکا تھا۔ سیٹھ حکم چند کا اغوا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی تھی۔ مقامی ساتھیوں نے اسے میرے حکم پر گزشتہ شب ہی اغوا کیا تھا۔ سیٹھ کو موچی گیٹ کے ایک مکان میں رکھا گیا تھا۔

ہرچند کہ ان حالات میں میرا موچی گیٹ جانا خطرے سے خالی نہیں تھا مگر مجھے وہاں جانا ہی تھا۔ بخت خاں اور تیتومیر کو وہیں چھوڑ کر میں شیر بہادر کے ساتھ موچی گیٹ روانہ ہو گیا۔

وہ مکان ایک تانگے والے کا تھا۔ جس میں سیٹھ کو اس کی بڑی سی حویلی سے اغوا کر کے لایا گیا تھا۔ تانگے والے بشیر کی بیوی مر چکی تھی۔ دو بیٹیاں تھیں جو اپنے گھر کی ہو چکی تھیں۔ بشیر وہاں اکیلا ہی رہتا تھا۔ اب اس کے دکھ سکھ کی ساتھی صرف ایک گھوڑی تھی جسے وہ بڑے چاؤ سے بنا سنوار کر رکھتا تھا۔ اس کی ضروریات محدود تھیں جب دو وقت کی روٹی کا سہارا ہو جاتا تو وہ اپنے گھر لوٹ آتا۔ بالکل ان پڑھ ہونے کے باوجود بشیر روزے نماز کا بہت پابند تھا۔ اسے صرف چند آیتیں یاد تھیں اور نماز پڑھنا آتا تھا مگر اس کا ایمان بہت مضبوط تھا۔ لاہور میں تنظیم کے سابق نگراں دلاور کو وہ اپنا محسن سمجھتا تھا۔ دلاور نے اس وقت بشیر کا ساتھ دیا تھا جب بشیر کی بیوی زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا تھی۔ یہ راہِ راست تنظیم سے بشیر کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن کئی مواقع پر محض دلاور کی وجہ سے بشیر نے تنظیم کا ساتھ دیا تھا۔ دلاور نے مجھے اس کے بارے میں یہ ساری باتیں گزشتہ رات ہی بتادی تھیں اور میری اجازت و اطمینان کے بعد یہ طے پایا تھا کہ سیٹھ حکم چند کو اغوا کرنے کے بعد بشیر کے گھر میں رکھا جا سکتا ہے۔

شیر بہادر کے ساتھ جب میں موچی گیٹ کے اس مکان کے دروازے پر پہنچ کر رکا تو ادھر ادھر کا جائزہ لے کر شیر بہادر نے دروازے پر دستک دی۔

چند ہی لمحے بعد دروازے کی دوسری جانب سے قدموں کی چاپ ابھری اور دروازے کے قریب آ کر رک گئی۔

"چراغ بجھا دو!" شیر بہادر نے شناختی الفاظ ادا کیے۔ یہ وہ شناختی الفاظ تھے جو چند روز پہلے ہی مقرر کیے گئے تھے۔

"صبح ہونے والی ہے۔" اندر سے جواب ملا۔

دروازہ کھلتے ہی شیر بہادر اور میں نے اندر قدم رکھا۔ ایک مقامی تنظیمی ساتھی نے ہمارے لیے دروازہ کھولا تھا۔ اس کا تنظیمی نام نصرت تھا۔ بشیر روزی کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ سیٹھ حکم چند کو میرے ایما پر وہاں تنہا نہیں چھوڑا گیا تھا نصرت وہاں اس کی نگرانی کے لیے موجود تھا۔ ہم اندر پہنچ گئے تو نصرت نے دروازہ اندر سے بند کرلیا۔ پھر وہ ہمارے آگے آگے چلنے لگا۔

گھر کا صحن عبور کرتے ہوئے ہم تینوں ہی ساتھیوں نے اپنے چہرے نقابوں میں چھپالیے۔ صحن کے بعد ہم ایک دالان سے گزر کر اس کمرے کے سامنے جا کر رک گئے۔ جس کا دروازہ مقفل نظر آرہا تھا۔ نصرت نے جیب میں ہاتھ ڈال کر تالے کی چابی نکالی اور آگے بڑھ کر تالا کھولنے کے بعد کنڈی کھولی۔

سیٹھ حکم چند نے شاید کبھی یہ سوچا بھی نہیں ہو گا کہ اسے کسی ایسی جگہ رات بسر کرنا پڑے گی جہاں اس کے ناز

اٹھانے والا کوئی موجود نہ ہو۔ وہ ٹوٹی ہوئی سی ایک چارپائی سے بندھا ہوا تھا اور چارپائی دیوار کے سہارے کھڑی تھی، منہ پر کپڑا بندھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں رقص کر رہی تھیں۔ اس کی طرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے جیب سے پستول نکال لیا۔ معلوم نہیں، وہ کیا سمجھا کہ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔

"آنکھیں کھول دو سیٹھ حکم چند!" میں نے اس کی پھولی ہوئی توند پر پستول کی نال رکھ دی۔

اس نے فوراً میرے حکم کی تعمیل میں آنکھیں کھول دیں اور خوف زدہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔

"یہ پستول میں نے محض اس لیے نکالا ہے سیٹھ کہ تمہیں یقین ہو جائے تمہاری زندگی اور موت کے درمیان فاصلہ بہت کم ہے، کوئی بھی لمحہ تمہاری زندگی کا آخر لمحہ ثابت ہو سکتا ہے۔ منہ سے کپڑا کھلتے ہی اگر تم نے چیخنے چلانے کی کوشش کی تو اپنی موت کے ذمے دار خود ہو گے۔" میں نے یہ کہہ کر نصرت کو مخاطب کیا "اس کے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دو اور دونوں ہاتھ بھی رسیوں کی گرفت سے آزاد کردو!" پھر میں ایک قدم پیچھے ہٹ گیا "یہ لو!" پستول میں نے کچھ سوچ کر شیر بہادر کو تھمادیا اور گراری دار رامپوری چاقو نکال لیا۔ یہ وہی چاقو تھا جس سے میں نے دھرم ویر پر پہلا وار کیا تھا۔ یہ چاقو مجھے اس لیے زیادہ پسند آیا تھا کہ کسی شخص کو دہشت زدہ کرنے کے لیے اس کی گراریوں سے نکلنے والی آواز بڑا اہم کام انجام دیتی تھی۔ پستول میں یہ خوبی نہیں تھی۔ میں اس وقت سیٹھ حکم چند کو دہشت زدہ کر کے ہی اس کی زبان کھلوانا چاہتا تھا۔ اس کے علاوہ میرا مقصد اس سے ایک اعتراف نامے پر دستخط کرانا بھی تھا۔ اعتراف نامے کا مضمون میرے ذہن میں تھا۔ قلم اور کاغذ شیر بہادر ساتھ لایا تھا۔ زبان کھولنے کی صورت میں سیٹھ حکم چند کے اغوا سے کچھ اور بھی فائدہ اٹھایا جا سکتا تھا۔ وہ فائدہ کیا ممکن تھا، اس کا انحصار سیٹھ کے بیان پر تھا۔

سرخ و سفید چہرے والا سیٹھ خاصا صحت مند تھا، سر پر مخصوص انداز کی سفید پگڑی بندھی ہوئی تھی۔ گال اس حد تک پھولے ہوئے تھے کہ چھوٹی چھوٹی آنکھیں گوشت اور چربی کے اندر دھنسی ہوئی سی تھیں۔ پیٹ بڑا، قد لمبا تھا۔ کریم کلر کا ریشمی کرتا اور سفید دھوتی باندھے ہوئے تھا، گلے میں سونے کی زنجیر پڑی تھی جو اس کی امارت کی نشانی تھی۔ پیروں میں خوب صورت کام والے پشاوری سینڈل تھے۔ اس کمرے میں خاصی بلندی پر ایک روشندان تھا جس سے ہوا

اندر آرہی تھی اور دن کا اجالا بھی۔ دائیں جانب سلاخوں دار کھڑکی بھی تھی جسے بند کردیا گیا تھا۔ کھلے ہوئے دروازے سے بھی اجالا اندر آرہا تھا۔ پھر بھی کمرے میں گرمی تھی اور دھندلکا سا بھی۔ بشیر نے گھر کی فالتو اور ٹوٹی پھوٹی چیزیں وہاں ڈال رکھی تھیں۔ میں نے اندازہ لگایا کہ کمرا عموماً بند ہی رہتا ہوگا اس لیے وہاں ہلکی سی بو بھی تھی۔ جو ایسی جگہ پیدا ہوجاتی ہے جہاں ہوا کا گزر نہ ہو۔ یہ کمرا بہرحال سیٹھ حکم چند کے شایانِ شان نہیں تھا۔ اس کی حویلی میں تو نوکر بھی اس سے اچھے کمروں میں رہتے ہوں گے' لیکن ہمیں اس کی پروا نہیں تھی۔ سیٹھ کی حیثیت ہمارے لیے ایک قیدی کی تھی۔

نصرت نے جب اس کے ہاتھ کھول دیے اور منہ پر بندھا ہوا کپڑا بھی ہٹادیا تو وہ منہ کھول کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ میری دھمکی کا اس پر خاطر خواہ اثر ہوا تھا۔ اس نے چیخنے چلانے کی کوشش نہیں کی تھی۔

"یہ چاقو دیکھ رہے ہو سیٹھ!" میں نے اسے مخاطب کیا اور پھر آہستہ آہستہ چاقو کھولنے لگا۔ میری نظریں اس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ توقع کے مطابق اس کے چہرے پر دہشت کے آثار دکھائی دینے لگے "یہی چاقو میں نے دھرم ویر کے سینے میں اتارا تھا اور اسی سے میں تمہاری پھولی ہوئی توند میں بھری غلاظت باہر نکال کر پھینک سکتا ہوں۔ اس سے میں تمہارا دل بھی چھید سکتا ہوں اور اسے تمہاری موٹی گردن پر بھی پھیر سکتا ہوں مگر شاید تم زندہ رہنا چاہتے ہو بولو ٹھیک کہہ رہا ہوں میں؟"

شدتِ خوف سے اس کی آواز نہیں نکل رہی تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ بولنا چاہتا ہے مگر بولنے میں کامیاب نہیں ہورہا۔

"سنو سیٹھ! ہم تمہیں قتل کرنا نہیں چاہتے۔" میری آواز میں قدرے نرمی آگئی "تمہیں بہ حفاظت تمہاری حویلی میں پہنچا دیا جائے گا۔ تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگایا جائے گا' مگر اس کی ایک شرط ہے!" میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"جے۔ بولو!" اس کی زبان پہلی بار کھلی۔

"پانی پیو گے؟" میں نے ہمدردی سے پوچھا تو اس نے اقرار میں سرہلادیا "پانی لاؤ!" مڑ کر میں نے نصرت سے کہا۔ نصرت پانی لینے چلا گیا تو میں پھر بول اٹھا "سیٹھ! ہم انسانوں کے ساتھ انسانوں کا سا سلوک کرتے ہیں اور درندوں کے لیے موت کا پیغام بن جاتے ہیں۔ تم خود ہی ٹھنڈے دل سے سوچو کہ اللہ کا نام لینے والوں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے! کیا قصور ہے ان کا جو تم غیر ملکی آقاؤں کے اشارے پر ان کا جینا حرام کررہے ہو؟ یہ غیر ملکی لٹیرے تو ایک دن یہاں سے چلے ہی جائیں گے۔ پھر اس دھرتی پر تمہیں اور ہمیں ہی رہنا ہے۔ ہم اور تم تو صدیوں سے یہاں ایک ساتھ رہتے آئے ہیں' پھر اب کیا ہوگیا؟ تم کیوں اس زمین پر فساد بو رہے ہو۔ تمہارے ہی عقیدے کے مطابق یہ دھرتی تمہاری ماں ہے۔ ہمارا تو عقیدہ نہیں۔ ہم تو ساری زمین کو اللہ کی زمین کہتے ہیں' مگر کبھی ہم نے تمہارے عقیدے کو ٹھیس نہیں لگائی۔ تم نے دھرتی ماتا کہا تو ہم نے تمہاری دل جوئی کی خاطر تم سے رشتہ محبت و اخوت استوار رکھنے کی خاطر وسیع القلبی کا مظاہرہ کیا اور تمہاری ہی آواز میں آواز ملا کر مادرِ وطن کہا۔ ہمارے خلوص کو تم نے ہمارا احساسِ کمتری سمجھا اور برتری کے جنون میں مبتلا ہوگئے! بولو کیا کبھی ہم نے تمہارے مذہب کا مذاق اڑا کر تمہاری دل آزاری کی؟"

اسی وقت نصرت پانی لے کر آگیا۔ سیٹھ حکم چند کے ہاتھ کانپ رہے تھے اس لیے پانی چھلکنے لگا۔ پھر نصرت نے اسے اپنے ہاتھ سے پانی پلایا۔

"اب شاید تم بولنے کے قابل ہو سیٹھ!" چند لمحے بعد میں نے کہا "میرے سوالوں کے جواب دو اور یہ سمجھ کر جواب دو کہ غلط جواب دینے کی صورت میں تمہارے ساتھ کوئی رعایت نہیں کی جائے گی۔ میرا پہلا سوال یہ ہے کہ دھرم ویر سے تمہارا کیا تعلق تھا؟ آخری بار پھر تمہیں تاکید کرتا ہوں کہ جھوٹ بولنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا ورنہ صرف تم ہی قتل نہیں کیے جاؤ گے بلکہ تمہاری حویلی میں تمہارے خاندان کے ایک فرد کو بھی زندہ نہیں چھوڑا جائے گا۔"

میری دھمکی کارگر ثابت ہوئی۔

"دھرم ویر سے میری دور کی رشتے داری تھی۔" سیٹھ نے میرے پہلے سوال کا جواب دیا۔

"پرسوں رات وہ تمہارے پاس کیوں آیا تھا؟" میں نے دوسرا سوال کیا۔

"وہ۔ وہ پولیس۔" سیٹھ حکم چند ہکلانے لگا۔

"بولو' رکو مت!" میں نے اسے ٹوکا "ہمیں خود بھی کچھ معلوم ہے' ہم صرف تصدیق چاہتے ہیں اور سنو! جو کچھ معلوم ہے اس سے تمہارے جھوٹ یا سچ کا اندازہ ہمارے لیے مشکل نہیں ہوگا' ہاں جھوٹ بول کر تم مشکل میں ضرور پڑجاؤ گے۔"

"بازار والوں پر دھونس جمانے کے لیے وہ پولیس بندوبست چاہتا تھا۔"

"پھر تم نے یہ بندوبست کردیا' ہے نا؟"

اس نے گردن ہلائی۔

"کس سے بات کی تم نے اس کے لیے؟"

"ڈی آئی جی رابرٹ سے۔"

"ڈی آئی جی سے کیا کہا تم نے؟ کس لیے پولیس چاہیے؟ یہ بتایا تم نے اسے؟"

"ہاں بتایا تھا۔"

"کیا بتایا تھا؟" میں اسے سوچنے کا موقعہ دینا نہیں چاہتا تھا اس لیے تابڑ توڑ سوال کیے جارہا تھا۔

"یہ۔ یہی کہ۔" وہ پھر ہکلانے لگا "کہ دھرم ویر کیا۔ کیا کرنے والا ہے!"

"انگریز ڈی آئی جی کے علاوہ اور کس کس کے علم میں یہ بات تھی؟"

"اور۔ سبھی۔ ان سبھی کو معلوم تھا جو۔ جنھوں نے میرے ذریعے دھرم ویر کو رقم دی تھی۔"

"کون لوگ تھے رقم دینے والے؟"

"میری۔ میری ہی طرح دو۔ دوسرے ہندو سیٹھ اور۔ اور جاگیردار۔"

"کتنی رقم تمہارے ذریعے اب تک دھرم ویر کو دی گئی ہوگی؟"

"وہ۔ وہ اپنی کویتاؤں کی کتاب بھی چھپوانا چاہتا تھا۔ دس ہزار سے اوپر دے لیے ہوں گے اسے اور۔ اتنے ہی ابھی دینے تھے۔"

"تمہارا حصہ اس میں کتنا تھا؟"

"کل دو ہزار جس میں سے ایک ہزار میں دے چکا تھا۔"

"بقیہ دس ہزار روپے جو اسے دیے جانا تھے' وہ تمہارے ہی پاس تھے؟"

"نہیں ابھی چار ہزار ہی جمع ہوئے تھے' بقیہ لوگوں سے آج رقم ملنے والی تھی' مگر اب۔ اب تو وہ۔ وہ مارا ہی گیا۔"

"مارا نہیں گیا بلکہ مار دیا گیا!" میرے لہجے میں سختی آگئی۔ پھر میں نے پوچھا "تم لکھنا پڑھنا تو جانتے ہو گے؟" اس نے اقرار میں سرہلایا تو میں بولا "یہ تمام باتیں جو تم نے مجھے بتائی ہیں لکھ دو!"

"تم۔ تم کیا۔ اس کا کیا کرو گے؟" وہ گھبرانے لگا۔

"اگر تمہیں اپنی اور اپنے گھر والوں کی زندگی عزیز ہے سیٹھ تو وہی کرو جو تم سے کہا جارہا ہے۔"

پھر سیٹھ حکم چند کو اعتراف نامہ لکھنا ہی پڑا۔ ابتدائی عبارت میں نے خود بول کر اس سے لکھوائی تھی۔

"اپنے ضمیر کے بوجھ سے مجبور ہو کر میں بہ قیدِ ہوش و حواس یہ اعتراف کرتا ہوں کہ۔" بقیہ باتیں وہی تھیں جو وہ بیان کرچکا تھا۔

جب اس نے اعتراف نامے پر دستخط کردیے تو میں نے اس سے کہا "اس سازش کا اعتراف کرنے کی صورت میں قانون تمہیں سلطانی گواہ کی حیثیت دے سکتا ہے' سنو! جب تمہیں عدالت میں طلب کیا جائے تو تم اس اعتراف سے پھرو گے نہیں۔ تم نے اپنے وکیلوں یا کسی اور کے بہکائے میں آکر اگر عدالت میں یہ بیان دیا کہ تم سے زبردستی یہ اعتراف نامہ لکھوایا گیا ہے تو عدالت ہی میں تمہیں گولی ماردی جائے گی۔ ہم تم سے زیادہ دور نہیں ہوں گے۔ اگر تم وہاں بھی کسی طرح بچ گئے تو بھی زندہ نہیں بچو گے! تمہاری بچت کی صرف یہی صورت ہے کہ تم نے جو کچھ اعتراف نامے میں لکھا ہے' عدالت کے روبرو بھی وہی کہو گے۔ اس کے علاوہ چار ہزار روپے کی وہ رقم بھی ہمارے آدمیوں کے حوالے کردو گے جو دھرم ویر کو دی جانا تھی۔"

"مم۔ مگر وہ۔ وہ لوگ جنھوں نے یہ رقم میرے حوالے کی تھی اب۔ اب دھرم ویر کے قتل کے بعد رقم واپس مانگیں گے۔"

"ہاں یہ تو ہے!" میں چبھتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ایسی صورتِ حال میں بھی وہ ہوسِ زر کا شکار تھا۔ اپنی بات جاری رکھتے ہوئے میں نے مزید کہا "تو پھر یہی بہتر ہے سیٹھ کہ تم دوسرے سیٹھوں کی رقم واپس کردینا۔ بیس ہزار کی رقم تو خود تمہارے لیے بھی کوئی ایسی بڑی بات نہیں ہے۔ تم خود اپنے پاس سے بھی ہماری تنظیم کا مطالبہ پورا کرسکتے ہو۔ تم نے شاید ایک محاورہ سنا ہو کہ سیانا کوا ہمیشہ گو کھاتا ہے۔ اس وقت تم نے بھی سیانا بننے کی کوشش کی ہے اور یہ بھول گئے کہ تم مجرم ہو اور اپنے جرم کا اعتراف کرچکے ہو۔ ہر جرم کی کوئی نہ کوئی سزا ضرور ہوتی ہے تم نے اور تمہارے ہم مذہبوں نے بلا سبب ایک کمینے شخص کی مالی امداد صرف اس لیے کی کہ وہ مسلمانوں کے مذہب کا مذاق اڑائے' ان کے بزرگوں کی شان میں گستاخی کرے' دل آزاری کا سبب بنے۔ اس شخص کو تو سزا مل گئی جس نے براہِ راست یہ جرم کیا تھا مگر اس کے جرم میں تم اور دوسرے ہندو سیٹھ بھی برابر کے شریک تھے جواب دو ایسا ہی تھا؟"

سیٹھ حکم چند کا سر جھک گیا اور یہ جھکا ہوا سر ہی میرے سوال کا جواب تھا۔

"ہم لوگ اور اس شہر کی انتظامیہ بھی اس جرم میں شریک تھی۔ انتظامیہ کے ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کو علم تھا کہ کیا ہونے والا ہے، مگر اس نے مجرموں کو گرفتار کرنے کے بجائے ان کی پشت پناہی کی، انھیں تحفظ فراہم کرنا چاہا۔ انتظامیہ سے تو خیر ہم نمٹ لیں گے اور اسے بھگت رہے ہیں مگر تم لوگوں کو کیوں معاف کردیں! تمھیں اور تمھارے دوسرے ساتھیوں کو بھی جرمانہ بھگتنا پڑے گا۔ پہلے تو میں نے سوچا تھا کہ صرف چار ہزار جرمانہ کافی رہے گا، لیکن اب جرمانے کی رقم تمھاری کج بحثی کے بعد دس ہزار مقرر کی جاتی ہے۔ یہ وہی رقم ہے جو تم اور تمھارے ساتھی سیٹھ، دھرم ویر کو ادا کرنے والے تھے۔ اب تم یہ رقم ہماری تنظیم کو ادا کرو گے۔" میں نے فیصلہ سنایا "ہم اس رقم کی ادائیگی کا ذمے دار تمھیں مقرر کرتے ہیں۔ تم اپنے ساتھی ہندو سیٹھوں سے چندہ کرکے یہ رقم جمع کرو یا پھر اپنے پاس سے ادا کرو، ہمیں اس سے کوئی سروکار نہیں۔ جرمانے کی رقم بہرحال تمھیں ادا کرنا ہوگی۔"

دس ہزار روپے کی رقم اس زمانے میں خاصی بڑی رقم کہلاتی تھی مگر سیٹھ تکھم چند ایسے لوگوں کے لیے یہ رقم بہت معمولی تھی۔

"رقم کی وصولیابی کے لیے تمھاری رہائی کے تیسرے دن وطن پرست تنظیم کا کوئی بھی رکن تمھارے پاس پہنچ جائے گا۔ تم اسے جرمانے کی رقم ادا کرنے کے پابند ہوگے! اسی کے ساتھ یہ بھی نہ بھولنا کہ جو لوگ تمھیں تمھاری حویلی سے اغوا کرکے یہاں لاسکتے ہیں وہ تمھیں قتل بھی کرسکتے ہیں۔ تم نے یا تمھارے ساتھیوں میں سے کسی نے بھی اس سلسلے میں زبان کھولی یا اپنے بدیسی آقاؤں کی مدد لینا چاہی تو تمھیں ختم کردیا جائے گا۔ تم اپنے ساتھیوں کو بھی یہ بات بتا سکتے ہو۔"

یہ کہہ کر میں نصرت کی طرف مڑا "سیٹھ کو کچھ کھلایا پلایا؟"

"ابھی نہیں" نصرت نے بتایا "خود میں نے بھی ابھی ناشتا نہیں کیا۔"

"ہم یہاں موجود ہیں تم بازار سے ناشتا لے آؤ۔"

"ٹھیک ہے" وہ سرہلا کر دروازے کی طرف بڑھا۔

میں نے شیر بہادر کو اس کے ساتھ جانے کا اشارہ کیا تاکہ گھر کا دروازہ بند کرلے۔

وہ دونوں چلے گئے تو سیٹھ نے ڈرے ڈرے سے لہجے میں مجھ سے پوچھا "مجھے کب رہائی ملے گی؟"

"اس کا انحصار حالات پر ہے سیٹھ!" میں نے جواب دیا "اس میں دیر بھی لگ سکتی ہے اور یہ کام جلدی بھی ہوسکتا ہے۔"

"میری بچی۔۔۔وہ۔۔۔وہ رو رو کر پاگل ہوجائے گی۔ صرف وہی۔۔۔وہی میری اکلوتی ہے۔" سیٹھ تکھم چند گھگیانے لگا۔

"اور بیوی؟" میں نے پوچھا "اسے تمھاری کوئی فکر نہیں ہوگی؟"

"وہ ان دنوں اپنے بھتیجے کے ساتھ جالندھر گئی ہوئی ہے اپنے بیمار باپ سے ملنے۔"

"تمھاری بچی کی کیا عمر ہے؟ اسے ماں کے ساتھ کیوں نہیں بھیج دیا؟"

"اس کی تعلیم کا نقصان ہوتا۔ وہ۔۔۔ کم عمر نہیں ہیں سال کی ہے۔"

"تمھیں اپنی ایک بچی کا اتنا خیال ہے سیٹھ کہ ایک رات گھر سے تمھارے غائب ہوجانے پر وہ رو رو کر پاگل ہوجائے گی جب کہ وہ کوئی بچی بھی نہیں ہے! معلوم ہے تمھیں کہ کل رات دھرم ویر کو قتل کرنے کے الزام میں پولیس نے کتنے لوگوں کو پکڑا ہے!" پھر میں نے اسے تفصیل بتائی اور کہا "ان کی بھی بیٹیاں اور بچے ہوں گے۔ سوچو سیٹھ کہ ان کے دل پر کیا گزر رہی ہوگی؟ انھیں تو حوالات میں ایک بوند پانی بھی نہیں ملا۔ بولو بتاؤ یہ ظلم نہیں ہے کیا؟ یہ ظلم ان پر کیوں ہوا؟ کس کے اشارے پر ہوا؟ اس کا اصل سبب کون تھا؟ کیا تمھیں بھی یہ بتانے کی ضرورت ہے! خدا کی لعنت ہو تم پر اور تم جیسوں پر! تم کس منہ سے رعایت طلب کررہے ہو؟ اپنی اس بچی کے نام پر جو ناز و نعم میں پل کر جوان ہوئی ہے۔ جس نے اب تک زندگی میں کوئی دکھ نہیں اٹھایا ہوگا۔ تم اس کے نام پر رحم کی بھیک مانگ رہے ہو! اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھو سیٹھ کہ تم نے کتنا بڑا ظلم کیا ہے!"

"مجھے معاف کردو! میں۔۔۔میں اب ساری زندگی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا۔" سیٹھ تکھم چند بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

"میں کون ہوتا ہوں تمھیں معاف کرنے والا! اس سے معافی مانگو سیٹھ جو تمھیں اور مجھے سبھی کو معاف کرنے والا اور عزت و ذلت دینے والا ہے۔ تمھیں وہی معاف کرسکتا ہے، میں نہیں۔ رہی تمھاری رہائی کی بات تو ابھی اس سلسلے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ پولیس نے جن ڈیڑھ سو بے گناہوں کو قید کر رکھا ہے ان کا تو کوئی فیصلہ ہوجانے دو۔"

"اس میں تو بہت دیر لگ جائے گی۔" وہ گھبرا کر کہنے لگا۔

اسی دوران میں شیر بہادر دروازہ بند کرکے لوٹ آیا تھا۔ اس موقع پر وہ بول اٹھا "ہم نے سنا ہے سیٹھ کہ سرکاری

حلقوں میں تمھاری بات بڑی توجہ سے سنی جاتی ہے اور تم بڑے اثر و رسوخ کے مالک ہو۔ فرض کرو ہم تمھیں رہا کردیں تو کیا تم ان بے گناہوں کی رہائی کے لیے کوشش کرسکتے ہو جو پولیس کی حراست میں ہیں؟"

شیر بہادر کے اس سوال نے مجھے ایک اور ہی راہ سجھادی۔ میں نے کہا "سیٹھ کی طرف سے میں یقین دہانی کراسکتا ہوں کہ تم جو چاہتے ہو، وہی ہوگا۔"

"بالکل!" سیٹھ تکھم چند کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں چمک اٹھیں "اگر تم لوگ مجھے رہا کردو تو آج ہی میں ڈی آئی جی اور دوسرے ذمے دار حکام سے اس سلسلے میں بات کرسکتا ہوں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ بے گناہ لوگوں کو چھوڑ دیا جائے گا۔"

"تو پھر ٹھیک ہے سیٹھ! آج ہی تمھیں رہا کردیا جائے گا"

لیکن ایک شرط پر!" میں بولا۔

"وہ کیا؟" سیٹھ پرامید آواز میں کہنے لگا۔

"تمھیں ایک خط لکھنا پڑے گا۔"

"کس کے لیے؟ کسے؟" سیٹھ نے سوال کیا۔

"اپنی بچی کو" میں نے بتایا۔

"جب۔۔۔بچی کو؟ پر کیوں؟ تم۔۔۔تم لوگ کیا۔۔۔کیا کرنا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں۔ یقین کرو کہ اس کی عزت و آبرو محفوظ رہے گی۔"

"مگر۔۔۔کیا مطلب ہے اس سے تمھارا؟ میں۔۔۔میں ہرگز اسے تمھارے کہنے پر کوئی خط وط نہیں لکھوں گا۔ چاہے تم لوگ مجھے قتل ہی کیوں نہ کردو۔" وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"خط تو خیر اب تمھیں لکھنا ہی پڑے گا! ویسے ہم نے جس طرح تمھیں اغوا کیا ہے، تمھاری بچی کو بھی اغوا کرکے لاسکتے ہیں، لیکن بہتر یہی ہے کہ تم ہمیں اس پر مجبور نہ کرو۔ بات دراصل یہ ہے سیٹھ کہ ہم تمھارے وعدے پر کیسے یقین کرلیں کہ تم رہائی ملنے کے بعد سب بے گناہ گرفتار ہونے والے مسلمانوں کو پولیس کی گرفت سے چھڑانے کے لیے پوری کوشش کروگے؟ اس عرصے میں تمھاری بچی ہماری مہمان رہے گی۔"

"اور۔۔۔اور اگر بھگوان نہ کرے اعلیٰ حکام نے میری بات نہ مانی پھر؟۔۔۔پھر کیا ہوگا؟۔۔۔اور پھر میں۔۔۔میں یہ کیسے یقین کرلوں کہ تم لوگ میری بچی کے ساتھ اچھا سلوک کروگے۔ اسے مہمان بنا کر رکھو گے۔"

"تو نہ کرو یقین! ہم تمھاری خوشامد تو نہیں کررہے۔ ہمارے پاس دوسرا راستہ بھی ہے۔ ہم تمھاری بچی کو بھی اٹھوا لیتے ہیں، مگر اس صورت میں وہ ہماری مہمان نہیں، قیدی ہوگی۔ ہم اسے بھی تمھاری ہی طرح باندھ کر رکھیں گے، پھر شاید تمھیں عقل آجائے گی۔"

"یہ۔۔۔یہ تو ظلم ہے۔ تم لوگ اپنی زبان سے پھر رہے ہو۔"

"ہم نے کیا زبان دی تھی تمھیں؟ بولو؟ تم ہی اپنی رہائی کے لیے سودے بازی کررہے تھے۔"

"نہیں ہونا مجھے رہا۔۔۔مار ڈالو مجھے مگر تمھیں تمھارے خدا کا واسطہ میری بچی کو اغوا نہ کرو۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔

"اس کے اغوا پر تو تم ہی مجبور کررہے ہو ہمیں! مان لو میری بات! اسے خط لکھ دو کہ تمھارے بھیجے ہوئے آدمی کے ساتھ دس ہزار روپے لے کر چلی آئے۔ یہ اچھی طرح سمجھ لو سیٹھ کہ اسے اب آنا ضرور ہے۔ خواہ اغوا ہوکر آئے، خواہ اپنی مرضی سے۔"

کچھ دیر سیٹھ تکھم چند خاموش رہا اور آنسو اس کی آنکھوں سے بہتے رہے، پھر وہ بڑبڑانے لگا جیسے اپنے آپ سے باتیں کررہا ہو۔ "بھگوان جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جب۔۔۔جب وہ کمینہ مجھے بہکانے میں کامیاب ہوگیا اور میں نے اس کی بات مان لی ورنہ آج یہ دن نہ دیکھنا پڑتا۔"

"کس کمینے کی یاد آرہی ہے تمھیں سیٹھ؟" میں نے پوچھ لیا۔

"وہی جو تم لوگوں کے ہاتھوں مارا گیا، دھرم ویر! اسی نے مجھے بہکایا تھا۔"

"اور تم کسی بھولے بچے کی طرح اس کے بہکانے میں آگئے!" میں طنز آمیز انداز میں ہنسا "سنو! سارا الزام اس پر رکھ کے تم خود کو پارسا ظاہر نہیں کرسکتے! ہم اتنے بے عقل نہیں ہیں کہ تمھاری باتوں میں آجائیں گے۔ اگر تمھارے دل میں کھوٹ نہ ہوتا تو تم کبھی بھی اس کی بات نہ مانتے۔"

اسی وقت دور سے دروازے پر دستک دینے کی آواز سنائی دی اور شیر بہادر لپک کر کمرے سے نکل گیا۔ میں چوکنا ہوگیا۔ آنے والا نصرت ہی تھا۔ وہ ناشتا لے آیا تھا۔

"ناشتا کرو سیٹھ! اور اس عرصے میں فیصلہ کرلو کہ ہم سے تعاون پر آمادہ ہو یا نہیں! تعاون کرنے کی صورت میں تم فائدے میں رہو گے۔ دوسری صورت میں بھی ہوگا وہی جو ہم چاہیں گے۔ یقین کرو کہ ہم نہیں چاہتے کہ تمھاری آنکھوں کے سامنے ہمیں اسی کمرے میں تمھاری لاڈلی بچی کے گلے پر

چاقو پھیر دیں۔ تم شاید اسے اپنی آنکھوں کے سامنے تڑپ تڑپ کر مرتے ہوئے دیکھنا پسند نہیں کرو گے۔" میں نے اسے راہِ راست پر لانے کے لیے ایک بار پھر دھمکی دی اور اس کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اپنی جوان بیٹی کا ذکر کر کے وہ بری طرح پھنس گیا تھا "اگر ہم اسے اغوا کر کے یہاں لائے تو پھر قتل ہی کرنا پڑے گا جو ہم نہیں چاہتے اسی لیے تم سے کہہ رہے ہیں کہ اسے خط لکھ کر بلوالو۔ اسے ہم یہاں نہیں اچھی جگہ رکھیں گے اور اس وقت رہا کر دیں گے جب بے گناہ مسلمان پولیس کی قید سے نکل آئیں گے۔ سنو! ہم نے پولیس کو اس سے بھی آگاہ کر دیا ہے کہ دھرم ویر ہمارے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ اس طرح تمہارے لیے ان لوگوں کو رہا کرانے میں آسانی ہو جائے گی۔ دوسری طرف مسلمان بھی تمہارے ممنونِ احسان ہو جائیں گے کہ ہندو ہونے کے باوجود تم ان کی رہائی کے لیے اپنے اثر و رسوخ استعمال کر رہے ہو۔ یہ سودا گھاٹے کا نہیں ہے سیٹھ سوچ لو خوب اچھی طرح!"

اس دوران میں نصرت نے گرم گرم پوریاں کا دونا سیٹھ کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ اسی دونے میں آلو کی بھجیا بھی تھی۔

بھوک بڑی ظالم شے ہوتی ہے۔ کچھ دیر تو سیٹھ دونا پکڑے رہا اور پوریاں نہیں کھائیں، پھر جانے کیا سوچتے ہوئے اس نے سر ہلایا اور پوریاں کھانے لگا۔ ناشتا کر کے پانی پینے کے بعد سیٹھ میری طرف دیکھ کر بولا "تم لوگ مجھے بھلے مانس لگتے ہو میری سمجھ میں ایک بات آئی ہے۔ میں تمہاری قید ہی میں رہنے کو تیار ہوں۔ یہاں رہ کر بھی میں ان لوگوں کو رہا کرانے کی کوشش کر سکتا ہوں جو پولیس کی حراست میں ہیں۔"

"وہ کیسے؟" میں نے دریافت کیا۔

"میں اپنے دوستوں کے نام تمہیں خط لکھ کر دے دیتا ہوں۔ وہ بھی میری ہی طرح اثر و رسوخ والے ہیں میرے۔"

"نہیں!" میں نے اس کی بات کاٹ دی "فضول ہے یہ!"

"کیوں؟ اس طرح بھی تو تمہارا کام ہو جائے گا۔"

"کوئی کام نہیں ہو گا۔" میں نے انکار میں سر ہلایا "تم کل رات سے غائب ہو اور یہ اطلاع اب تک تمہارے سب دوستوں تک پہنچ چکی ہو گی۔ ایسی صورت میں ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہیں ہو گا کہ تم نے کن حالات میں یہ خط لکھے ہوں گے! اور یہ کیوں بھول رہے ہو سیٹھ حکم چند کہ تمہارے بااثر دوست احباب ان خطوں پر ہرگز یقین نہیں کریں گے۔ کیا وہ یہ نہیں جانتے ہوں گے کہ تم مسلمانوں کے دوست نہیں دشمن ہو! ٹھیک ہے سیٹھ، تم اپنی ضد پر اڑے رہو۔ اب رات کو تم سے اسی وقت ملاقات ہو گی جب تمہاری بیٹی بھی یہیں اسی کمرے میں بندھی ہو گی اور اسے ہم پچھاڑ کر تمہارے سامنے ذبح کریں گے!" یہ کہتے ہی میں نصرت کی طرف مڑا "سیٹھ کے منہ پر کپڑا باندھ دو! ہم اب رات کو آئیں گے۔" پھر میں نے شیر بہادر کی طرف دیکھا "چلو!"

میں نے پلٹ کر دروازے کی طرف قدم بڑھایا ہی تھا کہ سیٹھ حکم چند کی آواز ابھری "ٹھہرو بھگوان کے لیے رک جاؤ، میری ایک بات سن لو۔"

مجھے یہی توقع بھی تھی کہ میری دھمکی رائیگاں نہیں جائے گی۔ میں رک گیا اور پھر اس کی طرف مڑ کر بولا "کہو!"

"دیکھو، میرے پاس بہت دولت ہے۔ میں۔ میں تم لوگوں کو دس ہزار سے زیادہ رقم دے سکتا ہوں۔ اس سے دگ۔ دگنی بھی۔ رقم دے سکتا ہوں۔ تم میری شیلا۔ اسے۔ اسے اغوا نہ کرو!" وہ رو دینے کے قریب تھا۔ اس روز مجھے اندازہ ہوا کہ ایک باپ کو اپنی بیٹی سے کتنی محبت ہوتی ہے۔ سیٹھ حکم چند کو اپنی زندگی سے زیادہ اپنی بیٹی کی جان پیاری تھی اور یہی اس کا ویک پوائنٹ تھا۔

سیٹھ کی بات سن کر میں ہنس دیا اور بولا "تم شاید اس غلط فہمی کا شکار ہو سیٹھ کہ ہم دولت کے لالچ میں آجائیں گے۔ تمہارے خیال میں کیا ہم نے تمہیں اسی لیے اغوا کیا ہے؟ جرمانے کی ادائیگی سے یہ نہ سمجھو سیٹھ کہ تم ہمیں خرید سکتے ہو۔ غریبوں کا خون چوس چوس کر تم نے جو دولت جمع کی ہے، ہم اس پر تھوکنا بھی پسند نہیں کرتے۔ بتاؤ، کیا تمہیں اغوا کر کے لانے والوں کے لیے یہ ممکن نہیں تھا کہ تمہاری تجوری بھی خالی کر دیتے؟ کیا تم اپنی زندگی بچانے کے لیے تجوری کی چابیاں دینے سے انکار کر دیتے؟۔۔ میرا خیال ہے کہ تم ایسا نہیں کرتے! ہم لوگ ڈاکو نہیں ہیں سیٹھ! ہم اس ملک کے بتیس کروڑ عوام کے ہمدرد ہیں جن میں ہندو اور مسلمان سبھی شامل ہیں۔ ہماری جنگ انگریز سے ہے اور انگریز کے ان پالتو غلاموں سے بھی ہے جو ہندوستان میں اپنے آقاؤں کے مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں۔ کس لیے؟ اس لیے سیٹھ کہ وہ تمہاری طرح اپنی تجوریوں کے منہ بھر سکیں، اپنی آنے والی نسلوں تک کے لیے زر و جواہر چھوڑ جائیں! تمہارے آقاؤں نے اس ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹا ہے اور اسے لٹوانے والے تم ہو۔ بھوک اور افلاس کی ماری ہوئی آبادیاں تم پر نوحہ کرتی ہیں۔ بھوک سے بچے بلک بلک کر

بھوکے سو جاتے ہیں اور تمہاری شیلا میں اٹھلاتی پھرتی ہیں۔ تمہارے بچے کبھی بھوکے نہیں سوتے اس لیے کہ تم نے پردیسیوں سے اپنے ضمیر کا سودا کر لیا ہے۔ تم بک چکے ہو، تمہیں خریدا جا چکا ہے اسی لیے تم سمجھتے ہو کہ دولت سے ہر چیز خرید لو گے۔ تم ہماری بولی لگا رہے ہو! تم جو خود بکاؤ مال ہو۔ آخری بار سن لو سیٹھ کہ تمہارے پاس صرف اور صرف ایک راستہ ہے، دوسرا کوئی راستہ نہیں۔ عزت و آبرو کے ساتھ رہائی یا ذلت کی موت! تم اس میں سے جو راستہ چاہو منتخب کر سکتے ہو۔"

"مجھے سوچنے دو۔۔ سوچنے دو مجھے!" میرے چپ ہوتے ہی سیٹھ حکم چند بول اٹھا۔

"سوچو، ضرور سوچو! مگر اتنا خیال رکھنا کہ تم ہمیں فریب نہیں دے سکتے۔ نہ بے وقوف بنانے میں کامیاب ہو سکتے ہو۔"

سیٹھ حکم چند کے لیے میں نے اس کے سوا کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا کہ وہ میری بات مان لے اور اپنی بیٹی شیلا کے نام خط لکھ دے۔ آخر کار اسے ہتھیار ڈالنا ہی پڑے مگر ایک شرط کے ساتھ! اور وہ شرط سیٹھ نے بیان کر دی۔

"قرآن شریف لاؤ!" میں نے نصرت سے کہا، پھر سیٹھ حکم چند کو مخاطب کیا "سیٹھ! میں قرآن پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کرنے پر آمادہ ہوں کہ تمہاری بیٹی کی جان اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی مگر تمہیں بھی گیتا اور رامائن پر ہاتھ رکھ کر یہ عہد کرنا ہو گا کہ مظلوم مسلمانوں کو پولیس کی حراست سے رہا کرانے کے لیے سچے دل سے ہر امکانی کوشش کرو گے۔"

"مجھے منظور ہے۔" سیٹھ حکم چند نے اقرار کر لیا۔

قرآن تو بشیر کے گھر میں موجود تھا البتہ گیتا اور رامائن کے حصول میں کچھ وقت ضرور لگا۔ میں نے اور سیٹھ حکم چند نے عہد کر لیا اور پھر وہ اپنی بیٹی شیلا کو خط لکھنے لگا۔ خاصی بحث و تکرار کے بعد مجھے اپنے مقصد میں کامیابی ہو ہی گئی تھی۔

"شیلا جب ہماری مہمان بن جائے گی سیٹھ تو تمہیں رہا کر دیا جائے گا۔" میں نے سیٹھ حکم چند سے وہ خط لے لیا "اس وقت تک تمہیں یہ قید برداشت کرنا پڑے گی۔" یہ کہتے ہی میں نے شیر بہادر کو چلنے کا اشارہ کیا۔ نصرت نے سیٹھ کے منہ پر کپڑا باندھ دیا اور پھر دونوں ہاتھ بھی آزاد نہیں چھوڑے۔

سیٹھ حکم چند سے اعتراف نامہ اور شیلا کے نام خط لے کر میں شیر بہادر کے ساتھ لوہاری گیٹ پہنچ گیا۔

بخت خاں اور تیتو میرے پہنچنے سے میری آمد کے منتظر تھے۔ اس دوران میں دلاور اور ظفر بھی وہاں پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے اور بقیہ دونوں ساتھیوں نے طے شدہ مقامات پر پوسٹر لگا دیے تھے۔

"کیا رہا شاہین، کچھ کامیابی ہوئی؟" بخت خاں نے مجھ سے دریافت کیا۔

"کامیابی سی کامیابی!" یہ کہہ کر میں نے اسے تفصیلات سے آگاہ کر دیا۔ پھر اسے وہ اعتراف نامہ بھی دکھایا جو سیٹھ حکم چند سے لکھوایا تھا۔

"لیکن شاہین، اس اعتراف نامے کی ضرورت تو اس وقت پڑ سکتی ہے جب عدالت تک نوبت پہنچ جائے۔" بخت خاں بولا "ممکن ہے پولیس کی سطح پر ہی یہ معاملہ ختم ہو جائے۔"

"اور ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو۔" میں نے کہا "معاملہ ایک قتل کا ہے اور پولیس نے اس سلسلے میں بڑے پیمانے پر گرفتاریاں کی ہیں۔ سیٹھ حکم چند اپنی بیٹی کی زندگی بچانے کے لیے کتنا ہی اثر و رسوخ کیوں نہ استعمال کر لے، پولیس کا محکمہ اور والوں کو اپنی کارکردگی بھی تو دکھائے گا۔ یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ جو لوگ گرفتار کیے گئے ہیں، موجودہ حکمتِ عملی اختیار کرنے کی صورت میں ان کی بڑی تعداد ابتدائی تفتیش کے بعد چھوڑ دی جائے، لیکن یہ بہرحال نہیں ہو سکتا کہ سبھی افراد رہا کر دیے جائیں۔ کچھ کا چالان تو پولیس کو عدالت میں پیش کرنا ہی پڑے گا۔ اس وقت یہ اعتراف نامہ کام آئے گا۔"

○☆○

گھوڑا گاڑی میں وہ نازک اندام سوار ہوئی تو میں نے خوشبو کا ایک جھونکا محسوس کیا اور پھر اس پر نظر پڑتے ہی میرے حواس جیسے گم ہو گئے۔ مجھے یوں لگا کہ وقت کی طنابیں کھنچ گئی ہوں اور اس نے آگے بڑھنے کے بجائے مجھے ماضی میں پہنچا دیا ہو۔ میں ایک ہی لمحے میں لاہور سے دہلی پہنچ گیا تھا اور وہ لمحہ بڑا قاتل لمحہ تھا۔ دو افراد کے درمیان ایسی مشابہت سنی ضرور تھی مگر اس کا عملی تجربہ مجھے پہلی بار ہوا تھا۔ وہی ابرو، وہی رخسار و لب، وہی زلف بردوش چلتا پھرتا شراب خانہ، وہی جسم کی لچک، آنکھوں کی چمک سب کچھ وہی تھا تو پھر میں کیسے ہوش میں رہتا۔

مجھے نہیں معلوم کہ کب گھوڑا گاڑی چلی اور کب اس کے یاقوتی لبوں نے جنبش کی "میرے پتا جی ٹھیک تو ہیں نا؟"

"ہاں" میں اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔

"یہ تم مجھے یوں دیوانوں کی طرح کیوں دیکھے جا رہے ہو؟

کیا بات ہے؟"

میں اسے کیا یہ جواب دیتا کہ اے غارت ایمان تو میرے ایک بچھڑے ہوئے خواب کی پرچھائیں ہے۔ میں اسے کیسے بتا دیتا کہ اس کی ایک جھلک نے مجھ پر کیا سحر طاری کر دیا ہے، مجھے کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے! میں اسے کس طرح یقین دلاتا کہ ایک خوشبو نے زلفوں زلفوں اپنا جال بچھا دیا ہے۔ ایک چہرہ وقت کی گرد میں چھپ کر پھر نمودار ہو گیا ہے اور یہ کہ اس چہرے نے مجھے سخت آزمائش میں ڈال دیا ہے! وہ سردار بلونت سنگھ کی بیٹی کلونت کور تھی کہ سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا؟ میں دلی میں تھا یا لاہور میں! وقت آگے کی طرف بھاگ رہا تھا کہ پیچھے کی طرف! میں طارنوش تھا کہ شاہین! وہ میری پہلی محبت تھی کہ ایک اجنبی لڑکی! کچھ دیر تو مجھے کوئی احساس ہی نہ رہا۔ میں حال اور ماضی کے درمیان وقت کی صلیب پر لٹکا رہا اور میری چشم تصور نے کلونت کور کو پانڈیج کے ایک گھر میں قتل ہوتے دیکھا اور پھر میری سماعت سے اس کی چیخیں ٹکرائیں۔

ہوش میں آؤ طارنوش! تم خطرے میں ہو۔ ایک سرگوشی ابھری۔ آشا! پراسرار سرگوشی! اسنی کی سرگوشی!

"کون ہو تم؟" میرے ہونٹ جیسے خود بہ خود حرکت کرنے لگے۔ میں ابھی تک اپنے حواسوں میں نہیں تھا۔

"کیا کہہ رہے ہو تم؟ کیا تمہیں نہیں معلوم کہ میں سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا ہوں؟ کیا تم مجھے میرے پتا جی کے پاس لے کر نہیں چل رہے؟ مجھے تو پہلے ہی تم لوگوں پر شبہ ہو گیا تھا کہ تم لوگ دھوکے باز ہو اسی لیے جب میں کپڑے بدلنے اندر گئی تھی تو سیتا سے گھوڑا گاڑی کے پیچھے آنے کو کہہ دیا تھا۔" شیلا یہ سمجھی کہ میں اسنی سے نہیں اس سے مخاطب ہوں۔

سیٹھ حکم چند کی عیار بیٹی شیلا کی بات سن کر میرے چودہ طبق روشن ہو گئے۔ شاید پراسرار اسنی کی مخصوص خوشبو غائب ہو چکی تھی۔ اس نے مجھے بروقت خطرے سے آگاہ کر دیا تھا اور خطرے کی نوعیت کا علم مجھے شیلا سے ہو گیا تھا۔

وہ کلونت کور نہیں شیلا تھی اور جب وہ شیلا ہی تھی تو کسی رعایت کی مستحق نہیں تھی۔ جب وہ گھوڑا گاڑی میں سوار ہوئی تھی تو مجھے اسی وقت اسے بے ہوش کر دینا چاہیے تھا مگر میں اس کے حسن قیامت خیز کی بھول بھلیوں میں گم ہو گیا۔ شیر بہادر اسے گھوڑا گاڑی میں سوار کرا کے جا چکا تھا۔ گھوڑا گاڑی کا کوچوان مجاہد تھا۔ شیر بہادر ہی سیٹھ کی کوٹھی میں جا کر شیلا سے ملا تھا اور اسے سیٹھ کا خط دیا تھا اور بتایا تھا کہ کوٹھی کے احاطے میں جو گھوڑا گاڑی کھڑی ہے اس میں بیٹھ جائے'

اسے اس کے باپ کے پاس پہنچا دیا جائے گا۔ میرے ہی ایما پر شیلا سے یہ کہا گیا تھا۔ شیلا کے بہ ظاہر محفوظ اور بے خطر اغوا کا منصوبہ میں نے ہی بنایا تھا۔

بہ ظاہر معصوم سی نظر آنے والی اس دوشیزہ نے مجھے اور میرے ساتھی مجاہد کو خطرے میں ڈال دیا تھا۔ سیتا نامی شخص سیٹھ حکم چند کا کوئی وفادار ملازم ہی ہو سکتا تھا۔ جو کسی سواری پر گھوڑا گاڑی کے تعاقب میں ہو سکتا تھا۔ یوں تو میری مقتول محبوبہ سے اس لڑکی کی حیرت انگیز مشابہت نے وقتی طور پر میرے حواس گم کر دیئے تھے اور میں اسے کلوروفارم نہیں سنگھا سکا تھا مگر یہ میرے حق میں بہتری ہوا تھا۔ اگر فوری طور پر میں اسے بے ہوش کر دیتا تو وہ مجھے خطرے کی نوعیت سے آگاہ نہ کر پاتی۔

گھوڑا گاڑی پر چادر بندھی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں بڑے گھرانوں کی بعض خواتین بھی عموماً پردہ کرتی تھیں۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ اس سے یہ فائدہ اٹھانا مقصود تھا کہ گھوڑا گاڑی کے اندر جو کچھ ہو باہر سے نظر نہ آ سکے۔ وہ گھوڑا گاڑی کی پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھی اور میں بھی دوانستہ اس سیٹ سے نہیں ہٹا تھا۔ گھوڑا گاڑی کی سیاہ چھتری تنی ہوئی تھی اور اس کے عقبی حصے کے درمیان میں سیٹ کے اوپر ہی سیاہ ریگزین کا پردہ پڑا تھا جس سے باہر دیکھا جا سکتا تھا۔

یہ سوچ کر میں نے اس پردے کو ذرا سا ہٹایا اور باہر دیکھا ہوا بولا "خواہ مخواہ جھوٹ بول رہی ہو تم! گھوڑا گاڑی کے ساتھ تو کوئی نہیں آ رہا۔ تمہارا ملازم تمہیں کوئی دے گیا؟ اگر تم واقعی سچ بول رہی ہو!" یہ کہہ کر میں تحقیر آمیز انداز میں ہنسا جیسے اس کا مذاق اڑایا ہو۔

گھوڑا گاڑی اس وقت ایک ایسی سڑک سے گزر رہی تھی جس پر سواریاں زیادہ نہیں تھیں۔ میں نے دو سائیکل سواروں کو دیکھا تھا اور ایک تانگا پیچھے آ رہا تھا۔

میری بات کے رد عمل میں اس نے غصیلی آواز میں کہا "سیتا ایسا نہیں کر سکتا!" پھر وہ بھی عقبی پردے سے جھانکنے لگی اور چلا کر بولی "دیکھو وہ آ رہا ہے سائیکل پر! بڑے عقل مند بن رہے تھے کہ کوئی ساتھ نہیں آ رہا! تمہیں شاید کم نظر آتا ہے ہونہہ!" اس کا انداز بھی تمسخر اڑانے والا تھا۔

"کہاں؟" میں نے بھی جھانک کر کہا "مجھے تو کوئی دکھائی نہیں دیتا۔"

"وہ۔ ادھر وہ رہا! جو سر پر کپڑے کی ٹوپی پہنے ہوئے ہے۔" اس نے نشان دہی کر دی۔ انداز مجھے چڑانے والا تھا۔ "مفضول مگر اس کر دی ہو تم! ہو گا وہ کوئی راہ گیر! ادھر دیکھتی

مجھ پر رعب ڈالنے کے لیے جیسے تم اپنا ملازم بتا رہی ہو۔" میں ہنس پڑا۔

پھر وہ "ارے ارے" ہی کہتی رہ گئی اور میرا ایک ہاتھ اس کے منہ پر جم گیا۔ چند ہی لمحوں کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔ میں نے رومال اس کے منہ سے ہٹا کر اسے سیٹ پر لٹا دیا۔ ایسا کرتے ہوئے میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی تھی اور میں بار بار خود کو یہ باور کرا رہا تھا کہ وہ لڑکی میری محبوبہ کی ہم شکل ضرور ہے مگر محبوبہ نہیں۔ اس کے جسم کے زاویے اور قوسیں میری آنکھوں میں کھبی جا رہی تھیں۔ جیب میں رومال رکھتے ہوئے میں نے اس کی طرف سے نظریں ہٹائیں اور سامنے والی سیٹ پر گھٹنوں کے بل کھڑے ہو کر آہستہ سے مجاہد کو آواز دے کر اپنی طرف متوجہ کیا۔

میں نے مجاہد کو ہدایت دی کہ وہ گھوڑا گاڑی کو لوہاری گیٹ لے جانے کے بجائے کسی سنسان سڑک پر لے جائے۔ اسے میں نے خطرے سے آگاہ کر دیا تھا شیلا کے ملازم سے جان چھڑانے کی صرف یہی صورت تھی۔

میری ہدایت پر مجاہد نے گھوڑا گاڑی کا رخ موڑ دیا۔ خاصا لمبا فاصلہ طے کر کے اور شاہی قلعے کو پیچھے چھوڑتی ہوئی اب گھوڑا گاڑی جہانگیر کے مقبرے کی طرف جا رہی تھی۔ سیتا اب تک تعاقب میں لگا ہوا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسے یہ علم نہیں تھا کہ اس کی مالکن پر کیا گزر چکی ہے۔ وہ اتنا اناڑی تھا کہ گھوڑا گاڑی سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ میں عقبی پردے سے جھانک جھانک کر اسے دیکھتا جا رہا تھا۔

مجاہد کو میں اپنے ارادے سے آگاہ کر چکا تھا اسی لیے گھوڑا گاڑی روکے جانے کا منتظر تھا۔

آخرکار وہ لمحہ آ ہی گیا جب مجاہد نے مجھے اشارہ دیا۔ سڑک کے کنارے پوری طرح گھوڑا گاڑی رکنے سے پہلے ہی میں نیچے کود گیا۔ میرا چہرہ نقاب کے پیچھے تھا۔

تقریباً جست بھرتا ہوا میں سیتا کے قریب پہنچا۔ پھر اس سے پہلے کہ وہ سمجھتا، میں نے اسے سائیکل سے نیچے گرا لیا۔ وہ چیخا اور اسی وقت میرا گھونسا پوری قوت سے اس کی کنپٹی پر پڑا۔ اس کے بعد میں نے بہ طور احتیاط کلوروفارم میں بسا ہوا رومال بھی جیب سے نکال کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔

ذرا سی دیر کے بعد گھوڑا گاڑی تیز رفتاری کے ساتھ شہر کی طرف دوبارہ واپس جا رہی تھی۔ میری کوشش تھی کہ شیلا کی طرف نہ دیکھوں مگر بار بار نظریں ادھر اٹھ جاتی تھیں۔ اس کی ایک سیاہ لٹ سفید رخسار پر جھول رہی تھی اور ابھرے ابھرے ہونٹ ذرا سا کھلے رہ گئے تھے جیسے

ساری کا پلو بھی ڈھلک گیا تھا۔ اس کے حسین سراپا سے روشنی سی پھوٹ رہی تھی۔ نازک سی وہ لڑکی خود بے ہوش تھی اور مجھے بھی ہوش سے بیگانہ کرنے کے درپے تھی۔

"معلوم نہیں قدرت کیوں میرا امتحان لے رہی ہے!" میں بڑبڑانے لگا۔ پھر میں نے سوچا "وہ کوئی بھی ہو، اسے دیکھنا کوئی گناہ تو نہیں" اس خیال نے میری نظروں کو بےباک کر دیا اور پھر مجھے وہ رنگ بھی نظر آنے لگے جو میری نگاہوں سے پوشیدہ تھے۔ انہی رنگوں کی برسات میں نہاتے ہوئے وہ سفر تمام ہوا۔ ان حالات میں وہ آخری مرحلہ طے کرنا میرے لیے کسی تیز نشے سے کم نہیں تھا۔ جب اس جسم دیباد حریر کو میں نے جھک کر اپنے بازوؤں پر اٹھا لیا۔

دن کا وقت تھا اس لیے مجاہد نے گھوڑا گاڑی کو گھر کے دروازے سے لگا کر کھڑا کیا تھا۔ گلی میں آمدورفت جاری تھی۔ شیلا کو اٹھائے ہوئے مجھے انتہائی تیزی کے ساتھ گھر کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہو جانا تھا مگر عین اس وقت جب مجاہد کا اشارہ ملنے میں اس نے شیلا کو بازوؤں میں بھرے گھوڑا گاڑی کے اندر سیٹ پر بیٹھا ہوا تھا۔ مجاہد اس وقت اشارہ کرتا جب آس پاس کوئی نہ ہوتا۔

مجھے یاد نہیں کہ کتنے لمحے گزرے کہ صدیاں بیت گئیں اور میں اس مجسمہ رنگ و خوشبو کو اپنی آغوش میں سمیٹے بیٹھا رہا۔ بس اتنا یاد ہے کہ نشہ تیز سے تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ وقت شاید رک گیا تھا یا مجھے رکتا محسوس ہوا تھا۔ بہرحال کچھ نہ کچھ ایسا ہوا ضرور تھا ورنہ مجاہد کی آواز میں سن لیتا۔ اس نے کچھ کہا یقیناً تھا مگر کیا؟ یہ میں نہیں سن سکا تھا۔ اس کی آواز مجھے کہیں بہت دور سے آتی سنائی دی تھی۔ میں تو جہان رنگ و بو میں کسی کے ساتھ ساتھ جیسے بہت دور نکل گیا تھا۔

"شاہین!" دوسری بار مجھے مجاہد کی آواز بہت واضح سنائی دی اور میں چونک اٹھا۔ اس نے تقریباً چیخ کر مجھے پکارا تھا اس کے بعد پے در پے دھماکوں سے فضا گونج اٹھی تھی۔

خطرہ! خطرہ! میرے اندر جیسے کوئی چیخا اور میں جیسے ہوش میں آ گیا۔

میں نے شیلا کو تیزی کے ساتھ پچھلی سیٹ پر لٹا دیا اور پھر دوسرے ہی لمحے پستول نکال کر گھوڑا گاڑی پر بندھی ہوئی چادر کا ایک سرا ہٹایا۔ اسی لمحے فائر ہوا اور میں پیچھے ہٹ گیا۔ یہ فائر گھر کے کھلے ہوئے دروازے کی طرف سے ہوا تھا۔ ایک لمحے کے ہزارویں حصے میں میرے اندر یہ احساس جاگا کہ وہ گھر اب محفوظ نہیں رہا۔ اس پر یقیناً ہمارے دشمنوں کا قبضہ ہو چکا ہے۔ میں نے لپک کر مخالف سمت کا پردہ اٹھایا

اور کسی طرف سے پھر گولی چلی اور پردے کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔

"تمہیں گھیرا جاچکا ہے' خود کو قانون کے حوالے کردو! ورنہ تمہیں گولیوں سے چھلنی کردیا جائے گا! فائر روکا جارہا ہے' گھوڑا گاڑی سے باہر آجاؤ!" کسی نے چیخ کر یہ الفاظ ادا کیے۔ اس کا لہجہ بتا رہا تھا کہ وہ میرا ہم وطن نہیں کوئی انگریز تھا۔ یہ آواز گلی کی طرف سے آئی تھی۔ چند لمحوں کے توقف سے وہی آواز پھر ابھری "اگر تمہارے پاس اسلحہ ہے تو اسے باہر پھینک دو! ہم تین تک گنیں گے۔ تم اگر گنتی پوری ہونے کے باوجود باہر نہیں آئے تو فائر کھول دیا جائے گا' ایک۔"

اس سے قطع نظر کہ سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا' میری مقتول محبوبہ کلونت کور کی ہم شکل تھی۔ اس کی جان بچانا مجھ پر فرض تھا۔ میں نے قرآن پر ہاتھ رکھ کر اس کی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کا عہد کیا تھا۔ ایسی صورت میں اگر میں خود کو قانون کے حوالے نہ کرتا تو مقابلہ کرتے ہوئے زندہ بچتا کہ نہ بچتا شیلا ضرور ماری جاتی۔ گھوڑا گاڑی پر گولیوں کی بارش کردی جاتی۔ ایک فیصلے تک پہنچنے کے باوجود میں نے تاکید کے بعد اپنا پستول باہر نہیں پھینکا۔ میں نے پستول اپنی جیب میں رکھ لیا تھا۔

پھر جب میں پردہ ہٹا کر باہر کودنے والا تھا تو اسی انگریز کی بلند آواز گلی میں گونجی "دو!"

اس کے ساتھ ہی میں ہاتھ اٹھائے باہر آگیا اور اسی لمحے میری نظر بائیں جانب پڑی۔ میرے دل پر جیسے شدید ضرب لگی۔ ایک کھلونا ٹوٹ گیا تھا' ایک خوشبو بکھر گئی تھی۔ ایک مجاہد اپنے وطن پر قربان ہوگیا تھا' ایک وطن پرست اپنی جان کا نذرانہ دے کر گمنام شہیدوں میں اپنے نام کا اضافہ کرگیا تھا' ایک ساتھی مجھ سے بچھڑ گیا تھا۔ ہاں وہ جس نے آخری بار مجھے پکارا تھا' وہی مجاہد جو کوچوان بنا ہوا تھا' اس کی لاش خون میں ڈوبی ہوئی مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر پڑی تھی۔

میری آنکھوں میں خون اتر آیا اور میں نے چاروں طرف خون ہی خون دیکھا۔

"آگے آؤ!" مجھے حکم دیا گیا۔ یہ آواز میرے عقب سے آئی تھی۔

میں مڑا اور قہر آلود نظروں سے حکم دینے والے کی طرف دیکھا۔ دائیں جانب کچھ ہی فاصلے پر وہ موجود تھا۔ اس کے قریب چار باوردی سپاہی رائفلیں تانے کھڑے تھے۔ گھوڑا گاڑی اسی طرف سے گلی میں داخل ہوئی تھی حکم دینے والا کوئی انگریز ہی تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

شدید غصے اور جذبۂ انتقام نے صورتِ حال کی سنگینی سے مجھے قطعی بے نیاز کردیا۔

"آرہا ہوں' میں آرہا ہوں' تمہاری موت بن کر آرہا ہوں!" میں پوری قوت سے چیخا اور ان کی طرف بڑھا۔

"فائر! بھون دو اسے!" انگریز نے بلند آواز میں سپاہیوں کو حکم دیا اور پھر خود بھی میرا نشانہ لیا۔

یہی وہ لمحہ تھا کہ جب میری آتشِ جاں تیز ہوگئی۔ میرا وجود دہکتے ہوئے انگاروں کی نذر ہوکر ان ظالموں کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ عین اسی لمحے پے درپے دھماکے ہوئے اور آگ آگ کے درمیان سے گزر گئی۔ یہ "آگ" مجھے اپنے باپ ہاموس کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ نادیدہ ہوجانے کی پراسرار صفت نے میری زندگی بچالی تھی اور یہ اذیت ناک تجربہ' ایک تخلیق سے دوسری تخلیق کی طرف سفر' آدم زاد سے جن زادہ بن جانے کا اسرار میرے لیے نیا نہیں تھا مگر اس مرتبہ دانستہ میں نے اپنی زندگی کو خطرے میں نہیں ڈالا تھا بلکہ ایک عیار انگریز نے مجھ سے دغا کی تھی' مجھے دھوکا دیا تھا۔ خود کو قانون کے حوالے کرنے کا مقصد اس کے سوا اور کیا تھا کہ اس گرگٹ نے مجھے حراست میں لینے کا جھانسا دیا تھا۔ یہ فریب دے کر اس نے مجھے گھوڑا گاڑی سے اترنے پر آمادہ کیا اور پھر جب میں رائفلوں کی زد میں آگیا تو اپنے زرخرید غلاموں کو حکم دیا کہ مجھے بھون دیں۔ وہ اگر مجھے یہ دھوکا نہ دیتا تو شاید صورتِ حال مختلف ہوتی۔ پھر شاید میرا وجود نادیدہ نہ بن جاتا' میرے اندر موروثی صفات بیدار نہ ہوتیں۔

ادھر میں ان کی نظروں سے اوجھل ہوا ادھر سب سے پہلے انگریز افسر تیزی کے ساتھ مڑ کر سپاہیوں کو دھکا دیتا ہوا بھاگا۔ میں نے کسی ایسے چیتے کی طرح جست بھری جو اپنے شکار پر جھپٹتا ہے۔ میں جیسے اڑتا ہوا اس کے قریب پہنچ گیا اور اس کی ایک ٹانگ پکڑ کر گھسیٹ لی۔ وہ چیختا ہوا منہ کے بل زمین پر گرا۔ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر میں نے اسے چیر دیا اور وہ موت کے منہ میں پہنچ گیا۔ پھر میں پلٹ کر ان سپاہیوں کی طرف بھاگا جو اپنے آقا کی چیخ سن کر اسی طرف دوڑے ہوئے آرہے تھے۔ وہ بھی میرے نزدیک کسی رحم کے مستحق نہیں تھے۔ آناً فاناً انہیں بھی میں نے موت کی میٹھی نیند سلا دیا۔ گلی میں اب چھ لاشیں پڑی تھیں جن میں سے ایک لاش میرے ساتھی' میرے شہید مجاہد کی تھی۔

میں واپس گھر کی طرف پلٹ رہا تھا تو میری سماعت سے

اپنے ساتھی تیتومیر کی جگر خراش چیخ ٹکرائی اور میری روح میں اتر گئی۔ میرے پیروں میں جیسے پر لگ گئے تھے۔ میں ہوا کے کسی تیز جھکڑ کی طرح گھر کے کھلے ہوئے دروازے سے اندر داخل ہوا۔

"جارج زبان کھلوانا جانتا ہے' تو بول اب تیری باری ہے! ورنہ یہ خون آلود سنگین اب تیرے سینے میں اتر جائے گی۔ بتا طارنوش کہاں ہے؟" میں نے اندر والے کمرے سے ایک انگریز کی اجنبی آواز سنی۔

"تیری قضا آگئی کمینے! طارنوش آگیا!" میں ضبط نہ کرسکا اور چیخ اٹھا۔ اس لمحے مجھے خود اپنی آواز غیر انسانی اور اجنبی لگی۔

میں سمجھ گیا کہ وہی درندہ میرے ساتھیوں پر ظلم توڑ رہا تھا' انہیں موت کی نیند سلا دینے کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ جسے شملے سے افسرِ اسپیشل ڈیوٹی بنا کر لاہور بھیجا گیا تھا۔ آج وہ خود ہی سامنے آگیا تھا۔ آج خود اس کی موت اسے وہاں کھینچ کر لے آئی تھی۔

میری آواز سن کر وہ دوڑتا ہوا کمرے سے نکلا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں رائفل دیکھی جس پر سنگین لگی ہوئی تھی اور سنگین سے تازہ تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ اس کے قریب پہنچتے ہی میں نے رائفل چھین لی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

اب خون آلود سنگین لمحہ بہ لمحہ اس کی طرف بڑھ رہی تھی۔ دہشت سے اس کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ سنگین اب اس کے سینے تک پہنچ گئی تھی۔

"جارج! اب یہ خون آلود سنگین تیرا سینہ چھیدے گی۔" میں پھنکارا "تجھے طارنوش کی تلاش تھی طارنوش تیرے سامنے کھڑا ہے مگر تو مجھے نہیں دیکھ سکتا اس لیے کہ طارنوش اندھوں کو نظر نہیں آتا۔"

"بھ... بھوت... بھوت!" وہ خوف زدہ ہوکر چیخا اور پھر مڑ کر بھاگا۔

"رک جا قاتل!" میں اس کی طرف لپکا "اے میرے تیتومیر کے قاتل رک جا! تو اپنی موت سے نہیں بھاگ سکتا۔"

وہ صحن میں اس جگہ پکڑا گیا جہاں ہم ساتھی بیٹھ کر وضو کرتے تھے۔ میں نے اس کی ایک کلائی تھام رکھی تھی اور وہ سردی کھائے ہوئے کسی چوہے کی طرح کانپ رہا تھا۔ میں نے ہلکا ہی سا جھٹکا دیا تھا کہ وہ زمین پر گر پڑا۔ انتہائی خوف نے اس کے چہرے کو مسخ کردیا تھا۔

پھر میں نے اسے جہنم کے دہانے تک پہنچانے میں دیر نہیں کی۔ میں نے اس کا سینہ چھید ڈالا۔ اس کی چیخیں سن کر دو سپاہی بھاگتے ہوئے صحن میں آئے مگر میں اندر کمرے کی طرف دوڑا۔ رائفل میں نے صحن ہی میں پھینک دی تھی۔

کمرے میں چار سپاہی اور موجود تھے۔ جارج نے گویا پورے لاؤ لشکر کے ساتھ چھاپا مارا تھا۔ تیتومیر کی لاش بھی کمرے میں پڑی تھی۔ دو سپاہیوں نے بخت خاں کو جکڑ رکھا تھا اور بقیہ دو سپاہی دلاور کو قابو میں کیے ہوئے تھے۔ بخت خاں کو پشت کی طرف سے اور دونوں بازو پیچھے کی طرف موڑ کر ایک سپاہی جکڑے ہوئے تھا اور دوسرا رائفل کی نال سینے پر رکھے اس کے سامنے کھڑا تھا۔ یہی صورتِ حال دلاور کے ساتھ بھی تھی۔ وہ دونوں سپاہی جو باہر مجھے نظر آئے تھے۔ وہ شاید تیتومیر کو قبضے میں کیے ہوں گے۔ تیتومیر کی شہادت کے بعد اب وہ اپنے ساتھیوں کو وہاں چھوڑ کر باہر کی خبر لینے جاسکتے تھے۔

مجھ پر تو اس وقت خون سوار تھا ہی! تیتومیر کی لاش دیکھ کر میں اور بھی جنون میں مبتلا ہوگیا۔ میں نے اس سپاہی کی گردن دبوچ لی جو بخت خان کے سینے پر رائفل رکھے کھڑا تھا۔ وہ ڈھیر ہوا تو دوسرے رائفل والے کی باری آئی۔

اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے دو ساتھیوں کو خاموشی سے ڈھیر ہوتے دیکھ کر بقیہ دونوں سپاہیوں کے اوسان خطا ہوگئے۔ یہ وہ دونوں تھے جو بخت خاں اور دلاور کو پیچھے سے پکڑے ہوئے تھے۔ رائفل والوں کو گرتے دیکھ کر میرے دونوں ساتھی' سپاہیوں سے بھڑ گئے۔ میں نے زمین پر پڑی ہوئی ایک رائفل اٹھائی اور ان دو میں سے ایک کو ٹھنڈا کردیا۔ بخت خاں نے اسے گرتے دیکھا تو دوسری رائفل پر جھپٹا۔ دوسرا سپاہی' بخت خاں کی گولی سے مارا گیا۔ یہ دوسرا سپاہی' دلاور سے زور آزمائی کررہا تھا۔ باہر صحن میں جو دو سپاہی موجود تھے' ان میں سے ایک گولیاں چلنے کی آوازیں سن کر بھاگتا ہوا کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ اس کا کاسۂ سر ٹکڑوں میں تبدیل ہوگیا۔ اس پر میں نے گولی چلائی تھی۔

اسی لمحے مجھے شدید ٹھنڈک کا احساس ہوا تو میں کمرے سے نکل بھاگا۔ رائفل اب بھی میرے ہاتھ میں تھی۔ اجل گرفتہ آخری سپاہی میرے رستے میں آکر خود ہی مارا گیا۔ وہ وحشت زدہ سا ہوکر گھر کے دروازے کی طرف بھاگ رہا تھا۔

پھر میں جیسے ہی گھر کے دروازے تک پہنچا۔ میرا جسم مجھے واپس مل گیا۔ دروازے کے سامنے کھڑی ہوئی گھوڑا گاڑی کا میں نے پردہ اٹھا کر دیکھا۔ شیلا ابھی تک بے ہوش پڑی تھی۔ میں دوبارہ گھر کے اندر جانے کے لیے پلٹنے ہی والا

تھا کہ مجھے عقب سے دوڑتے ہوئے قدموں کی آواز سنائی دی۔ وہ بخت خاں تھا جو شہید تیتو میر کی لاش اپنے بازوؤں پر اٹھائے اندر سے بھاگتا ہوا آ رہا تھا۔ اسی کے ساتھ دلاور بھی تھا اور اس کے ہاتھ میں رائفل تھی۔ یقیناً اس نے کسی مردہ سپاہی کی رائفل پر قبضہ کر لیا تھا۔

"شاہین!" مجھ پر نظر پڑتے ہی بخت خاں چیخا "یہ۔ یہ تمہاری تو تا کمانی۔" آگے وہ ایک لفظ نہ کہہ سکا اور اس کا گلا رندھ گیا۔

میرے دل پر گھونسا لگا، مگر میں ضبط کر گیا اور بخت خاں سے کہا "میرے شہید کو گھوڑا گاڑی میں لٹا دو۔ اور اس شہید مجاہد کو بھی جو ادھر محو خواب ہے۔ دلاور! تم اسے اٹھاؤ۔ رائفل مجھے دے دو!"

گلی اس طرح سنسان پڑی تھی جیسے وہاں کوئی ذی روح نہ رہتا ہو۔ دن کے وقت ایسا سناٹا طاری تھا جس سے ہول آ سکے۔ گھروں کے دروازے تو الگ کھڑکیاں تک بند کر لی گئی تھیں۔

دونوں شہیدوں کی لاشیں گھوڑا گاڑی میں رکھ دی گئیں۔ میں اور بخت خاں بھی اندر بیٹھ گئے۔ دلاور اب کاظم کی جگہ کوچوان بن گیا تھا اور وہی گھوڑا گاڑی کو ایک نئے ٹھکانے کی طرف لے جا رہا تھا۔ یہ نیا ٹھکانا بھاٹی گیٹ میں کرائے پر حاصل کیا ہوا ایک مکان تھا جو کسی ایسے ہی موقع کے لیے لیا گیا تھا۔ یہ مکان پنجاب کے دوسرے علاقوں اور شہروں سے آنے والے مسلمان کارکنوں کے لیے مخصوص تھا۔ شیر بہادر سے مجھے اس ٹھکانے کے بارے میں تین روز قبل معلوم ہوا تھا۔ راولپنڈی سے تنظیم کا ایک رکن فتح خاں لاہور آیا تھا، اسے وہیں ٹھہرایا گیا تھا۔ فتح خاں ہی کے ذریعے مجھے راولپنڈی میں مقیم نیو کا پیغام ملا تھا۔ اس نے مجھ سے پیغام میں یہ دریافت کیا تھا کہ ابھی راولپنڈی ہی میں رکنا ہے یا اجازت ہو تو میرے پاس لاہور چلا آئے؟ لاہور کے حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے اسے ایک خط کے ذریعے میں نے اپنے پاس بلانے کا فیصلہ کیا تھا مگر وہ خط ابھی پوسٹ نہیں کر سکا تھا۔ اس کے علاوہ فتح خاں کو بھی میں نے لاہور ہی میں روک لیا تھا۔ لوہاری گیٹ سے چلتے ہوئے دلاور نے مجھے بتایا تھا کہ ہماری اگلی منزل کون سی ہے۔

O☆O

وہ شب ہمارے لیے شب گریہ تھی۔ ہم نے اپنے دونوں شہیدوں کو اس گھر کے کچے صحن میں دفن کر دیا تھا۔ بخت خاں اور میں اداس بیٹھے تھے۔ دلاور اور فتح خاں گھوڑا گاڑی لے کر موچی گیٹ گئے ہوئے تھے۔ انہیں اس گھوڑا گاڑی میں سیٹھ حکم چند کو بے ہوش کر کے شہر میں کہیں چھوڑ آنا تھا۔ دلاور کو میں نے یہ تاکید کر دی تھی کہ سیٹھ حکم چند کو بے ہوش کرنے سے پہلے بتا دیا جائے، اس کی بیٹی شیلا ہماری مہمان ہے۔ اسے کوئی گزند نہیں پہنچے گا، اگر سیٹھ حکم چند نے اپنا عہد پورا کیا یعنی زیر حراست مسلمانوں کی رہائی کے لیے اپنے اثر و رسوخ سے کام لیا! سیٹھ کو یہ بھی بتایا جانا تھا کہ اسے اس کی حویلی کے بجائے شہر کے کسی بھی حصے میں یہ حالت بے ہوشی چھوڑ دیا جائے گا تاکہ وہ کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔

سیٹھ حکم چند کی حویلی سے شیر بہادر کو بھی موچی گیٹ میں بشیر تانگے والے ہی کے گھر پہنچنا تھا اور اس وقت تک وہیں نصرت کے ساتھ رہنا تھا جب تک سیٹھ کو رہائی نہ مل جائی۔ سو شیر بہادر بھی وہیں تھا۔ میں اسی لیے شیر بہادر کی طرف سے فکرمند نہیں تھا۔ اسے میں نے دلاور ہی کے ذریعے لوہاری گیٹ میں پیش آنے والے اندوہناک واقعے سے آگاہ کر دیا تھا اور اب بھاٹی گیٹ بلا لیا تھا۔

اس خونی معرکے میں جاسج سمیت دشمن کے بارہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ پھر بھی یہ سودا ہمیں بہت مہنگا پڑا تھا۔ ہمارے دو ساتھی ہمیشہ کے لیے ہم سے بچھڑ گئے تھے۔ ان دو قیمتی جانوں کے نقصان نے میرے دل کو لہولہو کر دیا تھا۔ اس شب جب میں ایک خط کے ذریعے مجاہد اوّل کو اس واقعے کی روداد لکھ رہا تھا تو میرا دل خون کے آنسو رو رہا تھا۔ یہ تفصیلی رپورٹ لے کر آئندہ روز صبح ہی صبح فتح خاں کو دہلی روانہ ہونا تھا۔ مجاہد اوّل اب دہلی میں تھا۔

اپنے کرب کو لفظوں کا پیرہن دینے کی خاطر میں اس لیے آمادہ ہو گیا تھا کہ شاید اس طرح میرے دل کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔ میں لالٹین کی روشنی میں خط لکھتا رہا اور بخت خاں مجھ سے کچھ ہی فاصلے پر سر جھکائے سوچ میں گم بیٹھا رہا۔

جب میں اس رپورٹ کی آخری سطور لکھ رہا تھا تو دروازے پر دستک سنائی دی۔ بخت خاں خاموشی سے اٹھ کر چلا گیا۔

شیر بہادر، دلاور اور فتح خاں موچی گیٹ سے لوٹ آئے۔ شیر بہادر، بخت خاں کی رہنمائی میں شہید ساتھیوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے آنگن کی طرف چلا گیا۔ میں نے اس عرصے میں آخری سطریں لکھ لیں اور تفصیلی رپورٹ کو ایک لفافے میں بند کر دیا۔

"فتح خاں! تمہیں کل صبح دہلی روانہ ہونا ہے۔" میں نے فتح خاں کو مخاطب کیا جو دلاور کے ساتھ چٹائی پر بیٹھا تھا "یہ رپورٹ اہم نوعیت کی ہے اس لیے ڈاک کے ذریعے نہیں بھیجی جا سکتی۔"

"بہتر ہے جناب! اور کوئی حکم؟" فتح خاں بوجھل سی آواز میں بولا۔ ہم سبھی سوگوار تھے۔ ان میں ہمارا ساتھی فتح خاں بھی شامل تھا۔

"کل صبح ہی تمہاری روانگی سے قبل میں تمہیں بتاؤں گا کہ دہلی پہنچ کر مجاہد اوّل تک یہ پیغام تمہیں کس کے ذریعے بھیجنا ہے۔" میں نے مزید کہا۔

اس وقت رات کے ساڑھے دس بجنے والے تھے۔ طبیعت اتنی بوجھل اور اداس تھی کہ ابھی تک ہم ساتھیوں میں سے کسی نے گزرے ہوئے واقعے کے متعلق ایک لفظ بھی ایک دوسرے سے نہیں کہا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ جب میں مجاہد مرحوم اور شیر بہادر کے ساتھ لوہاری گیٹ سے سیٹھ حکم چند کی کوٹھی کے لیے روانہ ہو گیا تھا تو میرے پیچھے وہاں کیا گزری تھی؟ کب اور کیسے مقتول جاسج وہاں پہنچ گیا تھا؟ نہ ہی بخت خاں نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ جب وہاں گولیاں چل رہی تھیں اور لاشیں گر رہی تھیں تو میں کہاں تھا؟ ہم سبھی پر ایک اداسی محیط تھی۔ کوئی بھی ہم میں سے نہ کچھ کہہ رہا تھا نہ پوچھ رہا تھا۔ میری ہی طرح شاید سب کے دل درد سے بوجھل تھے اور نیند آنکھوں سے روٹھ گئی تھی۔ ہم سب ایک درد کے رشتے میں بندھے تھے اور یہ رشتہ اتنا مضبوط تھا کہ شاید خون کا رشتہ بھی اس قدر مضبوط نہ ہو۔

ہم میں سے کسی نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ شیر بہادر بہرحال لاہور میں ہمارا میزبان تھا کچھ سوچ کر اسی نے مجھ سے کہا "شاہین! آپ کھانا کھا لیجیے! یہاں کھانا پکانے کا سارا سامان موجود ہے۔ میں اور بھائی فتح خاں کچھ پکا لیتے ہیں۔" یہ الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کی آواز میں جھجک سی تھی جیسے بہ مجبوری اسے کھانے کے لیے پوچھنا پڑا ہو۔

"تم لوگ کھا لو، مجھے بھوک نہیں ہے۔" میں نے جواب دیا۔ جو کچھ میں نے کہا غلط نہیں کہا تھا۔ میری بھوک پیاس واقعی اڑ گئی تھی۔ ہاں اس وقت مجھے سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا کا ضرور خیال آیا کہ وہ بھی بھوکی ہو گی۔ اسے ہم نے دوپہر کے بعد اس کی حویلی سے اغوا کیا تھا۔ اگر اس نے دوپہر کا کھانا کھا بھی لیا ہو گا تو رات کا کھانا بہرحال نہیں کھایا تھا۔ ہم تو خیر کچھ کھاتے نہ کھاتے مگر شیلا کا معاملہ مختلف تھا۔ اسے بھوکا رکھنا ظلم ہوتا۔ اس مکان میں لا کر ہم نے اسے ایک کمرے کے اندر بند کر دیا تھا اور باہر کے اس کمرے کے دروازے پر تالا ڈال کر پھر جیسے اسے بھول ہی گئے تھے۔ اس کے بعد ہم اپنے ساتھیوں کو دفنانے کے لیے قبریں کھودنے لگے تھے۔ شہیدوں کو کفن نہیں دیا جاتا۔ ہم نے اسی لیے مجاہد اور تیتو میر کو انہی کپڑوں میں جو وہ پہنے ہوئے تھے، قبروں میں اتار دیا تھا۔ ایسے میں بھلا ہمیں شیلا کیا یاد آتی! اب شیر بہادر نے کھانے کے لیے کہا تھا تو پہلی بار مجھے اس کا دھیان آیا تھا۔ اسی کے ساتھ یہ خیال بھی ذہن میں ابھرا کہ اسے اب تک ہوش آ جانا چاہیے۔ پھر ایک اور خدشے نے سر ابھارا کہ کہیں ہوش آتے ہی وہ چیخنا چلانا شروع نہ کر دے۔ رات کے سناٹے میں اس کی چیخیں دور دور تک سنائی دے سکتی تھیں۔ اور ہم ایک نئے خطرے سے دوچار ہو سکتے تھے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کمرے کے دروازے پر جو تالا پڑا تھا، اس کی چابی دلاور کے پاس تھی۔ میں نے اسے مخاطب کیا "دلاور! تم میرے ساتھ آؤ! لالٹین بھی اٹھا لو۔"

دلاور کچھ کہے بغیر لالٹین اٹھا کر میرے ساتھ ہو لیا۔ فتح خاں اسی کمرے میں موجود دوسری لالٹین جلانے لگا تھا۔

بائیں جانب باورچی خانے کے بعد ہی وہ کمرا سامنے کے رخ پر تھا۔ لالٹین زمین پر رکھ کر دلاور نے تالا کھولا، پھر کنڈی نیچے گرا کر دروازے کو آہستہ سے اندر کی جانب دھکا دیا۔ میں نے جھک کر لالٹین اٹھائی اور کمرے میں داخل ہو گیا۔ تاریک کمرا روشن ہوتے ہی میرے اعصاب پر ایک چھناکا سا ہوا۔ کمرا بالکل خالی تھا اور شیلا غائب تھی۔

اداسی کا غبار ذہن پر چھایا ہو تو ہر شے کا تاریک ہی پہلو سامنے آتا ہے۔ میرے ساتھ بھی اس وقت کچھ ایسا ہی تھا۔ میرے دل و دماغ اپنے شہید ساتھیوں کے غم سے نڈھال تھے۔ شاید اسی سبب فوری طور پر میرے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ ایک مقفل کمرے سے کسی لڑکی کا غائب ہو جانا قطعی طور پر ناممکن ہے۔ میں تو اس وقت چونکا تھا جب مجھے دائیں جانب کچھ فاصلے پر ہلکی سی آہٹ سنائی دی تھی۔ میں تیزی سے اس طرف پلٹا اور پھر طویل سانس لے کر رہ گیا۔

دائیں جانب مجھے اسی کمرے سے ملحق ایک کوٹھری کا کھلا ہوا دروازہ نظر آرہا تھا۔ شیلا ہوش میں آنے کے بعد اندھیرے میں یقیناً سمت کا اندازہ نہیں لگا سکی اور اس کوٹھری کے دروازے سے اندر چلی گئی۔ میں نے سوچا اور کوٹھری کے دروازے کی طرف لالٹین ہاتھ میں لیے بڑھا۔ دلاور نے بھی میری تقلید کی۔ عین اسی لمحے ہلکی سی نسوانی چیخ میری سماعت سے ٹکرائی اور پھر گڑگڑاہٹ سی سنائی دی۔ میں چونک کر اٹھا اور پلٹ کر دلاور کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی حیرت کے آثار تھے۔ خوف زدہ سی نسوانی چیخ معدوم ہو چکی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے کچھ کہے بغیر تیزی کے ساتھ اس کوٹھری میں داخل ہو گئے۔

چھوٹی سی وہ کوٹھری لالٹین کی روشنی میں جگمگا اٹھی تھی۔ وہاں قدم رکھتے ہی ایک بار پھر میں حیرت زدہ رہ گیا۔ کوٹھری بھی قطعی خالی تھی۔ وہاں ہم دونوں ساتھیوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ چند ہی لمحے پہلے میں نے ایک نسوانی چیخ سنی تھی جو ظاہر ہے کہ فریب سماعت نہیں ہو سکتی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق شیلا ہی چیخی تھی مگر وہ کیوں چیخی تھی اور کہاں غائب ہو گئی تھی؟ یہ سوال میرے لیے کسی معمے سے کم نہیں تھا۔

"تم نے بھی چیخ سنی تھی نا؟" جانے کس خیال کے تحت میں نے دلاور سے تصدیق چاہی۔

"جی ہاں" دلاور نے جواب دیا اور مزید بولا "چیخ کے ساتھ ہی گڑگڑاہٹ بھی سنائی دی تھی' ایسی آواز جو کسی بھاری شے کے لڑھکنے یا اپنی جگہ سے ہٹ جانے پر پیدا ہوتی ہے۔"

دلاور کی اس بات سے میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کوندا۔

"کہیں اس عمارت میں کوئی خفیہ تہ خانہ تو نہیں؟" میں نے دلاور سے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"اس سلسلے میں تو مالک مکان ہی حتمی طور پر کچھ بتا سکتا ہے" دلاور بولا "وہ یہیں بھاٹی گیٹ ہی میں رہتا ہے' اس سے تصدیق کی جا سکتی ہے۔"

"تصدیق ہمارے لیے کسی خطرے کا پیش خیمہ بھی ثابت ہو سکتی ہے۔ ہمیں خود ہی اس خفیہ تہ خانے کا سراغ لگانا چاہیے" میں نے کہا۔

[illegible] کوٹھری کا جائزہ لینے لگا۔ کوٹھری کا فرش اور دیواریں پتھر کے چوکور ٹکڑوں کو جوڑ کر بنائی گئی تھیں۔ ایک جگہ دیوار پر پتھروں کے جوڑ کے درمیان مجھے مسالا نظر نہیں آیا۔ میں نے اس پر دباؤ ڈالا تو خلاف توقع وہ اندر دھنستا چلا گیا اور اسی وقت جیسے میرے پیروں کے نیچے سے زمین سرکنے لگی اور ہلکی سی گڑگڑاہٹ سنائی دی۔ میں اچھل کر ایک طرف ہٹ گیا۔ میں لمحہ بھر پہلے جس پتھر پر کھڑا تھا' وہ زمین میں غائب ہوتا چلا جارہا تھا پھر چند ہی لمحوں کے بعد وہ اپنی جگہ واپس آگیا۔ مجھے یا دلاور کو اس تاریک خلا میں جھانکنے کا موقع نہیں مل سکا تھا۔

وہ کسی تہ خانے کا راستہ ہی ہو سکتا تھا جس کا میں نے سراغ لگایا تھا۔ نادانستگی میں شیلا کا ہاتھ دیوار پر اس پڑ گیا ہوگا جس کے دبنے سے فرش کا پتھر زمین میں دھنسا اور پھر وہ تہ خانے میں جا پڑی ہوگی۔ معلوم نہیں مالک مکان نے وہ خفیہ تہ خانہ کس غرض سے بنوایا تھا؟ اس سوال پر غور کرنے کے بجائے اس وقت پہلے شیلا کو تہ خانے سے نکالنا ضروری تھا۔ میرے اندازے کے مطابق وہ شاید بے ہوش ہو گئی تھی اگر ایسا نہ ہوتا تو فرش پر خلا پیدا ہوتے ہی اس کے چیخنے چلانے کی آوازیں ضرور سنائی دیتیں۔

کچھ سوچ کر میں نے دلاور کو چند ہدایات دیں اور پھر لالٹین ہاتھ میں لیے اسی بڑے سے چوکور پتھر پر کھڑا ہو گیا۔ دلاور نے میری ہدایت کے مطابق دیوار والے پتھر پر ساتھ ہی دباؤ ڈالا اور میں خلا میں دھنسنے لگا۔ وہ پتھر کافی تیزی سے بائیں جانب کھسکا اور میں تہ خانے میں جا گرا۔ تہ خانہ زیادہ گہرا نہیں تھا۔ میں کیوں کہ پہلے سے چوکنا تھا اس لیے گرتے گرتے اپنے جسم کا توازن بگڑنے نہ دیا ورنہ ہاتھ سے لالٹین ضرور گر جاتی۔ فرش پر ذرا سی دور کسی صورت میں مجھے شیلا نظر آگئی۔ وہ واقعی بے ہوش تھی۔

میں نے نظر اٹھا کر دیکھا' تہ خانے کی چھت زیادہ اونچی نہیں تھی۔ خلا ابھی تک برقرار تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نے دلاور سے کہا تھا کہ وہ دیوار کے پتھر پر دباؤ برقرار رکھے تاکہ راستہ بند نہ ہو مگر اب نہ صرف خود اس تہ خانے سے نکلنے کا مسئلہ درپیش تھا بلکہ شیلا کو بھی وہاں سے نکالنا تھا۔

"دلاور!" میں نے بلند آواز میں اپنے ساتھی کو پکارا "اپنی مدد کے لیے بخت خاں کو بلا لو اور ایک مضبوط رسی لے آؤ!"

"میرے ہٹنے سے راستہ بند ہو جائے گا' میں دباؤ۔۔۔"

"ہو جانے دو بند' پھر کھول لینا!" میں نے اس کی بات کاٹ دی۔

دوسرے ہی لمحے ہلکی سی گڑگڑاہٹ کے ساتھ خلا بند ہو گیا۔ اسی کے ساتھ مجھے قدرے گھٹن کا احساس ہوا۔ ممکن ہے تہ خانے میں بھی خلا پیدا کرنے کا کوئی نظام رہا ہو مگر میں نے اس کا سراغ لگانے کی کوشش نہیں کی۔

کچھ ہی دیر بعد چھت میں پھر خلا نظر آنے لگا۔ اسی کے ساتھ ایک موٹی سی رسی نیچے پھینکی گئی اور بخت خاں کی آواز آئی۔

بے ہوش شیلا کو اس تہ خانے سے نکالنا مشکل ثابت نہ ہوا ہم نے اسے وہاں سے ایک اور کمرے میں منتقل کر دیا۔ اسے ہوش میں لایا گیا تو وہ بے انتہا خوف زدہ تھی۔ میں نے اسے حقیقت سے آگاہ کیا اور تسلی دی۔ وہ اس طرح میری باتیں سن رہی تھی جیسے یقین نہ ہو۔

"تم یہاں سے فرار ہونے یا چیخنے چلانے کی کوشش نہیں کرو گی تو ہم تمہیں اپنے مہمان کی طرح رکھیں گے۔ بہ صورت دیگر ہمیں تمہارے ہاتھ پاؤں باندھنے پڑیں گے اور تم بھی یقین کرو کہ یہاں تمہاری عزت و آبرو اور زندگی محفوظ رہے گی پھر جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں' جلد ہی تم رہا کر دی جاؤ گی۔"

میری بات کے جواب میں وہ کچھ نہ بولی اور اس نے سر جھکا لیا۔ ہم میں سے کوئی بھی اس کے سامنے اپنا چہرہ چھپائے بغیر نہیں آیا تھا۔ میرے چہرے پر نقاب تھی۔ اس کے بعد میں' بخت خاں کے ساتھ اس کمرے سے نکل آیا۔ وہاں ہم نے ایک لالٹین چھوڑ دی تھی تاکہ اندھیرے میں وہ زیادہ خوف زدہ نہ ہو۔

شیر بہادر نے فتح خاں کی مدد سے کھانا بنا لیا۔ پہلے شیلا کو کھانا بھجوایا گیا اور پھر نہ چاہتے ہوئے بھی اپنے ساتھیوں کی خاطر مجھے چند لقمے لینے ہی پڑے۔

دوسرے دن ہمارے حواس کسی قدر قابو میں آئے تو گزشتہ روز پیش آنے والے واقعے پر گفتگو ہوئی۔ لوہاری گیٹ کے ٹھکانے کا علم خفیہ والوں کو کس طرح ہو گیا' اس سلسلے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا مگر قیاس یہی تھا کہ دلاور کا تعاقب کرتے ہوئے وہ لوگ وہاں پہنچے تھے۔ ادھر دلاور وہاں پہنچا ادھر دروازے پر دستک ہوئی۔ بخت خاں وغیرہ نے یہ سمجھا کہ کوئی ساتھی ہی آیا ہوگا۔ ان کا دھیان دلاور کی طرف گیا تھا۔ گمان غالب یہ تھا کہ کسی طرح انہیں دلاور پر شبہ ہو گیا تھا اور وہ دلاور کی نگرانی کر رہے تھے۔ دلاور کی نگرانی کرتے ہوئے انہوں نے دروازے کھلوانے کے لیے شناختی الفاظ بھی سن لیے ہوں گے۔ یہی شناختی الفاظ دروازہ کھلوانے کے لیے خود انہوں نے بھی ادا کیے تھے اور پھر گھر میں اچانک داخل ہو کر اسلحہ کے زور پر سب کو قابو میں کر لیا تھا۔ ان کے نگراں افسر جارج نے کچھ مسلح افراد کو باہر بھی گھر کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ ہمارے کچھ اور ساتھی بھی اس چوہے دان میں آکر پھنس سکتے ہیں۔ اس کا یہ خیال غلط ثابت نہیں ہوا تھا۔

بخت خاں اور دوسرے ساتھیوں سے انگریز افسر میرے بارے میں سوالات کر رہا تھا کہ طارنوش کہاں ہے؟ میرے کسی بھی ساتھی کو میرا اصل نام معلوم نہیں تھا اس لیے انہوں نے لاعلمی ہی کا اظہار کیا کہ وہ طارنوش نامی کسی شخص کو نہیں جانتے اگر وہ میرے اصل نام سے واقف بھی ہوتے تو بھی ان کا جواب یہی ہوتا۔

جارج نے دھمکیوں سے کام نہ چلتے دیکھ کر تشدد کا سہارا لیا مگر ظاہر ہے جو بات ان کے علم ہی میں نہیں تھی کس طرح بتا دیتے۔ میں اسی اثنا میں گھر کے باہر پہنچ گیا پھر جو کچھ ہوا' میرے سامنے ہوا۔

"معلوم نہیں یہ طارنوش کون ہے جس کے بارے میں جارج ہم سے پوچھ گچھ کر رہا تھا؟" بخت خاں کا انداز خود کلامی کا سا تھا۔

"ممکن ہے کہ وہ بھی کوئی ہمارا ہی ساتھی ہو جس سے ہم ناواقف ہوں" میں نے خیال آرائی کی "اگر ایسا نہ ہوتا تو خفیہ والوں کو اس کی تلاش نہ ہوتی۔"

"مجھے کچھ یاد سا پڑتا ہے شاہین کہ جس وقت ٹیپو میر کو شہید کر دیا گیا اور جارج نے مجھے قتل کرنے کی دھمکی دی تو میں نے ایک نامانوس اور اجنبی سی آواز سنی تھی۔ کیوں دلاور؟ تم نے بھی سنی تھی نا وہ آواز!"

"ہاں" دلاور نے تصدیق کی "کسی نے چیخ کر کہا تھا کہ تیری قضا آگئی کمینے! طارنوش آگیا!"

"اور پھر اچانک بازی پلٹ گئی تھی" بخت خاں کہنے لگا "جارج باہر بھاگ گیا تھا اور پھر ہم نے اس کی چیخیں سنی تھیں۔ اس کے بعد ہمیں یوں لگا جیسے کمرے میں کوئی نادیدہ پُراسرار وجود وہاں موجود سپاہیوں کے لیے پیغام اجل بن گیا ہو۔ وہ سپاہی جو مجھ پر سنگین تانے کھڑا تھا' اسے میں نے خود بہ خود ڈھیر ہوتے دیکھا اور پھر دوسرے سپاہی کا بھی وہی حشر ہوا۔ دوسرا سپاہی وہ تھا جو دلاور کے سینے پر سنگین رکھے کھڑا تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ زندہ بچ جانے والے دو سپاہیوں میں سے صرف ایک میری گولی کا نشانہ بنا تھا۔

دوسرے سپاہی پر کس نے گولی چلائی تھی؟ یہ سوال بھی حیران کن ہے۔"

"جو واقعات تم لوگوں نے بیان کیے ہیں' ان سے صرف ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے کہ کوئی پُراسرار وجود ہماری مدد کررہا ہے۔ وہ کون ہے؟ اس سوال سے قطع نظر ہمارے لیے یہی جاننا کافی ہے کہ وہ ہمارا ہمدرد اور مددگار ہے۔ اسے ہم تائید ایزدی یا غیبی امداد بھی کہہ سکتے ہیں" میں نے بات کو ختم کرنے کی غرض سے کہا' کیوں کہ ان تمام باتوں کا کوئی عقلی جواز ممکن نہیں تھا اور ساتھیوں کو کسی طرح مطمئن بھی کرنا تھا۔

"جارج کو مخاطب کرکے کہا گیا تھا کہ طارنوش آگیا" بخت خاں نے کہا "پھر اس کے بعد بازی پلٹی تھی اور پُراسرار واقعات پیش آئے تھے۔ اس سے یہ نتیجہ بھی تو نکلتا ہے کہ وہ پُراسرار وجود طارنوش ہی ہوسکتا ہے۔" بخت خاں درست اندازے لگا رہا تھا۔

میں سوچ رہا تھا کہ اگر کسی مرحلے پر میرے ساتھیوں کو یہ معلوم ہوگیا' میں ہی طارنوش ہوں تو پھر ان پر میری پُراسرار قوتوں کا راز کھل جائے گا۔ میں یہ کسی قیمت پر نہیں چاہتا تھا۔ میں نے اسی لیے دانستہ اس خیال سے اتفاق نہیں کیا اور بولا "مگر بخت خاں اگر طارنوش واقعی کوئی پُراسرار وجود ہوتا تو پھر جارج اس کے بارے میں تم لوگوں سے کیوں پوچھ گچھ کرتا؟ پھر یہ کہ اگر وہ آگیا تھا تو کسی کو نظر کیوں نہیں آیا؟"

"شاہین! نظر نہ آنے کی وجہ سے تو اس کا پُراسرار وجود ہوسکتا ہے" بخت خاں نے جواب دیا "لیکن تمہارا سوال واقعی اُلجھا دینے والا ہے۔ خفیہ والے کسی پُراسرار وجود کے بارے میں کس طرح جان سکتے ہیں؟"

کافی دیر یہی موضوع زیر بحث رہا مگر ظاہر ہے کہ کوئی کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا۔ سوائے قدرت کی طرف سے غیبی مدد کے ان واقعات کا کوئی اور جواز پیش کیا جانا' ممکن نہیں تھا۔

دلاور کے بارے میں کیوں کہ یہ شبہ ہوچکا تھا کہ وہ قانون کی نظر میں آچکا ہے' اس لیے میں نے اسے فوری طور پر لاہور چھوڑ دینے کا حکم دیا۔ فتح خاں میرا پیغام لے کر اسی روز صبح دہلی روانہ ہوچکا تھا۔ لاہور میں جو کچھ ہوا تھا' پُراسرار واقعات کا ذکر حذف کرکے اس کی تفصیلی رپورٹ مجاہدِ اوّل کو روانہ کردی تھی۔

اس دن کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ تقریباً ڈیڑھ سو افراد میں سے ایک سو بائیس افراد کو پولیس نے ابتدائی تفتیش کے بعد رہا کردیا تھا۔ اب بھی پولیس کی حراست میں ساٹھ افراد تھے۔ یہ وہ لوگ تھے جنھیں پولیس نے دھرم دیو کو قتل کرنے کے الزام میں گرفتار کیا تھا۔

پیش آنے والے روح فرسا واقعے کے سبب وقتی طور پر میں نے تنظیم کی تمام تر سرگرمیاں موقوف کردیں۔

اس طرح دس روز گزر گئے۔ اس دوران میں تین افراد کے سوا پولیس نے تمام افراد کو چھوڑ دیا۔ ان تینوں افراد کے بارے میں معلوم ہوا کہ یہ لوگ پولیس کو پہلے سے مطلوب تھے۔ ان پر دیگر مقدمات بھی تھے۔ ان کا چالان عدالت میں پیش کردیا گیا۔ اس سلسلے میں سیٹھ حکم چند اور دوسرے ہندو سیٹھوں نے مسلمانوں کی رہائی کے لیے انتہائی کوشش کی اور اہلِ لاہور کے لیے یہ بات بہت حیران کن تھی۔ انھیں علم نہیں تھا کہ ہندو سیٹھوں کے دل میں اچانک مسلمانوں کا درد کیسے پیدا ہوگیا تھا؟ کیوں کہ وطن پرست تنظیم نے دھرم دیو کے قتل کی ذمّے داری قبول کرلی تھی اس لیے پولیس کا کیس خاصا کمزور تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سیشن جج نے پہلی ہی پیشی میں مقدمہ خارج کردیا۔ بقیہ تینوں افراد بھی کم از کم اس کیس سے بری کردیے گئے۔ ان پر جو دوسرے کیس تھے وہ البتہ قائم رہے جن سے ہمارا کوئی تعلق نہیں تھا۔ وعدے کے مطابق ہم نے سیٹھ حکم چند کی بیٹی شیلا کو اس کے گھر پہنچا دیا تھا۔ میں نے اس عرصے میں دانستہ اس کے سامنے جانے سے گریز کیا تھا تاکہ اسے دیکھ کر مجھے اپنی مقتول بہن کلونت کور کی یاد نہ آجائے۔ سیٹھ حکم چند سے میں نے اعتراف نامہ لکھوا لیا تھا' اسے عدالت میں پیش کرنے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ شیلا کو رہا کیا جارہا تھا تو وہ ہماری بے حد ممنون تھی' اس نے کہا تھا "مجھے معلوم نہیں تھا کہ مسلمان ایسے بھی ہوتے ہیں۔ بچپن ہی سے مجھے تو کچھ اور ہی بتایا گیا تھا۔ میں تو مسلمانوں کو انتہائی ظالم اور عزت و آبرو کا دشمن سمجھتی تھی" یہ ایک متعصب ہندو گھرانے کی نوجوان دوشیزہ کے الفاظ تھے۔

وہ گیارہواں دن تھا جب مجاہدِ اوّل کی طرف سے لاہور سے کلکتے روانگی کا حکم ملا۔ میں یہ حکم سن کر خوش

کیوں کہ کلکتے ہی میں فاطمہ بھی تھی۔ اس سے بچھڑے مجھے ایک عرصہ ہوگیا تھا لیکن حکم کے ساتھ ہی جو ہدایات ملی تھیں ان پر عمل کرتے ہوئے مجھے وہاں جو کیندر یا فاطمہ سے فوری طور پر رابطہ قائم نہیں کرنا تھا۔ اس کے باوجود میرے لیے یہی کم خوش کن بات نہیں تھی کہ میں وہاں' اس شہر میں جارہا تھا' جہاں فاطمہ تھی۔

لاہور سے کلکتے روانگی کسی نئی مہم ہی کے سلسلے میں ممکن تھی' اس کا مجھے کچھ کچھ اندازہ تھا مگر مہم کی نوعیت کا قطعی علم نہیں تھا۔ کلکتہ میرے لیے ایک نیا شہر تھا۔ میں اس سے پہلے وہاں نہیں گیا تھا۔ مجاہدِ اوّل نے مجھے ایک بند لفافہ بھی بھیجا تھا۔ یہ پیغام مجھے کلکتے میں سیٹھ صدیق کو پہنچانا تھا۔ سیٹھ صدیق اس زمانے میں کلکتے کی جانی پہچانی شخصیات میں سے ایک تھے۔ مجھے یقین سا تھا کہ وہ پیغام میرے ہی بارے میں ہوگا۔ سیٹھ صدیق کلکتے کے بہت بڑے مسلمان تاجر تھے جن کی دریا دلی کے قصے زبان زد خاص و عام تھے۔ تحریکِ خلافت کے لیے وہ دل کھول کر چندہ دیتے تھے۔ مجھے سیٹھ صدیق ہی کو مجاہدِ اوّل کا پیغام پہنچانا تھا۔ اسی کے ساتھ مجاہدِ اوّل نے مجھ پر یہ پابندی لگادی تھی کہ سیٹھ صدیق کو خط پہنچانے کے بعد میں دوبارہ ان سے اسی وقت ملوں گا جب متوقع مہم کی تکمیل ہوجائے گی۔ مہم کے بارے میں ضروری ہدایات مجھے کلکتے ہی میں ملنا تھیں۔ کلکتے کے ساتھ ہی فاطمہ کا تصور میرے لیے انتہائی سکون بخش تھا۔ وہ میرے دل کے قریب رہتی تھی مگر قریب رہ کر بھی کتنی دور دور تھی۔ اس وقت فاطمہ کا خیال مجھے یوں لگا جیسے میں کسی قلعے کی شکستہ اور جلتی ہوئی فصیل کے کنگورے پر کھڑا ہوا دشمن کی منجنیقوں سے اُبلتے ہوئے پتھروں اور جلتے تیروں کی بارش کو اپنے سینے پر روک رہا ہوں اور فاطمہ بہت دور کسی پُرسکون سی وادی میں بنی ہوئی کٹیا کے دروازے پر جلتا ہوا دیا لیے کھڑی ہے تاکہ میں اندھیری رات میں رستہ نہ بھول جاؤں۔ فاطمہ میرے لیے دھنک کے خوش نما رنگوں کی کمان تھی جسے میں دیکھ سکتا تھا جس کے رنگوں میں میرا ذہن نہا سکتا تھا لیکن جسے میں چھو نہیں سکتا تھا۔

O☆O

ٹرین تیز رفتاری سے کلکتے کی طرف اُڑی جارہی تھی۔ فرسٹ کلاس کے اس چھوٹے سے کمپارٹمنٹ میں ہم اکا دکا ہی مسافر تھے۔ میرے ساتھ لاہور سے صرف بخت خاں ہی چلا تھا مگر کلکتے پہنچ کر ہم دونوں کو الگ ہوجانا تھا۔ اس کی سکونت کا بندوبست مجھ سے الگ کیا گیا تھا۔ اسے کولوٹولہ کی ایک بلڈنگ میں ٹھہرایا تھا۔

لاہور میں جو واقعات پیش آئے تھے' انھیں میں نے اپنے ذہن سے دانستہ جھٹک دیا تھا۔ وہاں سے چلتے وقت تیتو میر کی یاد میرا سینہ چھلنی کررہی تھی کہ وہ وہیں کی مٹی کا حصہ بن چکا تھا مگر پیش قدمی کرنے والے فوجی کبھی پلٹ کر یہ نہیں دیکھتے کہ پیچھے کیا ہوا؟ کون دشمن کی چلائی ہوئی گولی کا شکار ہوا؟ انھیں تو بس سامنے اپنے ہدف پر نظر رکھتے ہوئے بڑھنا ہوتا ہے۔ میرا ذہن اب متوقع مہم کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ جو ظاہر ہے کہ حکومتِ وقت کے خلاف ہی ہوسکتی تھی۔

میں اور بخت خاں بقیہ مسافروں سے دور انگریزوں کے خلاف اپنی جدوجہد پر مصروف گفتگو تھے۔ ہماری آوازیں دھیمی تھیں۔ میں بخت خاں سے کہہ رہا تھا "ہماری جدوجہد ضرور کامیاب ہوگی بخت خاں! ہماری زندگی میں نہیں تو آنے والی نسل کی زندگی میں! مجھے صرف اتنا یقین ہے کہ میں اور میرے ساتھی اس جنگِ آزادی کا ہراول ہیں جو لڑی جانے والی ہے اگر ہم نے اپنا فرض دیانت داری سے انجام دیا تو ہمارے پیچھے آنے والوں کو آگے بڑھنے میں آسانی ہوگی میرے دوست!"

"اس کے باوجود کبھی کبھی میرا دل ڈوب سا جاتا ہے شاہین! مجھے اعتراف ہے کہ میں مایوسیوں کا شکار ہوجاتا ہوں۔" بخت خاں بولا۔

"وہ کیوں؟" میں نے حیرانی سے پوچھا کیوں کہ پہلے کبھی بخت خاں نے ایسی باتیں نہیں کی تھیں۔

"وہ اس لیے شاہین کہ میں اپنے لوگوں کو بٹتے اور تقسیم ہوتے دیکھ رہا ہوں" بخت خاں نے گہرا سانس لیا "ہندوستان ایک ملک ہے مگر یہاں کے لوگ گروہ در گروہ بٹ رہے ہیں۔ سب سے پہلی تقسیم ہندو اور مسلمان کی ہے پھر ہندو اور مسلمان مزید ٹکڑیوں میں منقسم ہیں۔ ٹھیک ہے' اس وقت ہندو مسلم ایکتا کا بہت چرچا ہے' خاص طور پر جب سے مولانا جوہر اور ان کے ساتھی رہا ہوئے ہیں؟ گاندھی جی اچھوتوں کی دل جوئی میں مصروف ہیں۔ اتحاد کے لیے بڑی کوششیں کی جارہی ہیں۔ اس اتحاد کے مظاہرے بھی جاری ہیں مگر اسی کے ساتھ اس اتحاد کو مستحکم ہونے سے پہلے ہی بکھیر دینے کی کوششیں بھی ہورہی ہیں۔"

"یہ دنیا اسی آویزش اور تصادم کا نام ہے بخت خاں!" میں نے کہا "میرا خیال ہے کہ اس تصادم سے ایک نئی قوت اور توانائی جنم لے گی۔"

"میں اتنی خوش فہمیوں کے ساتھ زندہ نہیں رہ سکتا" بخت خاں بولا "میں اس کا بھیانک انجام دیکھ رہا ہوں۔ اتحاد اور ایکتا کی باتیں جو اس وقت ہو رہی ہیں' وہ سب مجھے مصنوعی معلوم ہو رہی ہیں' بے سود لگتی ہیں۔"

"کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"ایک طرف ہم ہندوستانی ایکتا کی باتیں کرتے ہیں' دوسری طرف ہم آپس کی تقسیم اور تفریق کو گہرا کرتے جا رہے ہیں۔ ہر اسٹیشن پر ہندو پانی اور مسلمان پانی کی آوازیں جب میں سنتا ہوں تو چونک اٹھتا ہوں۔ جب ہم پانی کو ہندو اور مسلمان میں تقسیم کر سکتے ہیں تو پھر کیا نہیں کر سکتے! یہ آوازیں سن کر میرے اندر سے آواز ابھرتی ہے شاہین کہ ایک دن ہندو ہندوستان اور مسلمان ہندوستان کی صدائیں بھی لگیں گی اور پھر ہندوستان کی تقسیم کو کوئی نہیں روک سکے گا۔" بخت خاں کی آواز بھرا گئی۔ اس کے چہرے سے انتہائی دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

میں سوچنے لگا' بخت خاں واقعی سچ کہہ رہا تھا۔ میں نے کبھی اس انداز میں نہیں سوچا تھا۔

"اور جب یہ آوازیں لگیں گی تو ہندو اور مسلمان دونوں ہندوستان کے لیے سوتیلی ماں بن جائیں گے" بخت خاں کہہ رہا تھا "وہ اس تقسیم پر آمادہ ہو جائیں گے۔ اس وقت ہندوستان کی کوئی سگی ماں نہ ہوگی جو بڑھ کر یہ کہے کہ نہیں اس کے دو ٹکڑے نہ کرو' یہ دوسرے کو دے دو!"

"یار' تم تو بڑی ہولناک تصویر دکھا رہے ہو" میں نے کہا۔

"یہ تصویر میں اکثر اپنے تصور میں دیکھتا ہوں۔ دونوں قوموں کے افراد میں چھپا ہوا انسان مر رہا ہے۔ آخر ہمارے لیڈر جو اتحاد اور ایکتا کے راگ الاپتے ہیں' ہندو پانی اور مسلمان پانی کی تفریق ختم کیوں نہیں کرتے؟ ایک پلیٹ فارم سے لمبے چوڑے دعووں سے پُر تقریریں کرنے والے لیڈر اسٹیشنوں پر آکر ہندو پانی اور مسلمان پانی کو ملا کیوں نہیں دیتے!"

"مگر اس انداز میں سوچنے سے فائدہ کیا بخت خاں!" میں بولا "ہمیں تو بس اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ جو مقصد ہمارے سامنے ہے اسے حاصل کیا جائے۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاہین! مگر جو کچھ میں نے کہا ہے' وہ حقیقت ہے۔ جو لنگڑی لولی ہندو مسلم ایکتا اس وقت قائم ہوئی ہے' انگریز اسے تباہ کرنے پر تلا ہوا ہے۔ اس کے اشارے پر بہت سے ہندو اور مسلمان اس اتحاد کو ختم کرنے پر تُلے ہوئے ہیں۔"

مستقبل کے انہیں اندیشوں اور وسوسوں میں سفر تمام ہوا۔ کلکتے شہر کا کوئی ریلوے اسٹیشن نہیں۔ دریائے ہگلی کے ایک کنارے پر کلکتہ شہر آباد ہے۔ اور دوسرے کنارے پر ہاوڑا شہر۔ ٹرینیں ہاوڑا اسٹیشن ہی پر رکتی ہیں۔ دریائے ہگلی پر ہاوڑا برج ہے جسے کلکتہ شہر کی عظمت کا نشان کہا جا سکتا ہے۔ یہ بے ستون پل دنیا کے عجائبات میں سے ایک ہے۔ اتنا بڑا پل کسی ستون کے بغیر کمان کی صورت نظر آتا ہے۔

ہر چند کہ بخت خان اور مجھے ایک ہی طرف جانا تھا۔ لوئر چیت پور روڈ سے کولوٹولہ زیادہ دور نہیں تھا مگر ہم دونوں ہاوڑا ریلوے اسٹیشن ہی پر جدا ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ جیسے ہی مجھے موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے سے فاطمہ اور جوگیندر کی طرف جانے کی اجازت مل گئی' میں وہاں پہلی فرصت میں پہنچوں گا۔ جوگیندر کے والد سوہن لال' ٹالی گنج میں رہتے تھے۔ یہ ہندوؤں کی آبادی کا بہترین اقامتی علاقہ تھا۔ جوگیندر مجھے اس سلسلے میں بتا چکا تھا۔ ٹالی گنج میں موہن لال جی کی کوٹھی کا پتا میرے پاس موجود تھا۔ مجھے یقین تھا کہ مجاہد اوّل کی طرف سے فاطمہ اور جوگیندر کے ساتھ رہنے کی اجازت مل جائے گی۔

میں موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے میں پہنچ گیا جو لوئر چیت پور روڈ پر تھا۔ مسافر خانہ ڈھونڈنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی۔ ہاتھ رکشا والے نے مجھے وہیں لے جا کر اتارا۔ میں اپنے پروگرام سے تین روز پہلے ہی کلکتے پہنچ گیا تھا۔

میرا یہ فیصلہ کہ مجھے مجاہد اوّل کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے کوئی ہدایت ملنے سے پہلے ٹالی گنج کا رخ نہیں کرنا چاہیے' درست ہی ثابت ہوا۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ قبل از وقت کلکتے پہنچ گیا ہوں تو جوگیندر اور فاطمہ سے مل لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ تین دن میں ان کے ساتھ گزار کے مقررہ دن مسافر خانے میں آ جاؤں گا۔ یہ میرے دل کی آواز تھی جو فاطمہ کے قرب کا خواہش مند تھا مگر میرے ذہن نے دل کی اس خواہش پر فرض کو ترجیح دی۔

مجھے ابھی مسافر خانے میں آئے ہوئے آدھا گھنٹا ہی گزرا ہوگا کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ ایک اجنبی شخص دروازے پر کھڑا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے شناختی الفاظ دہرائے "ہم پانی میں آگ لگا سکتے ہیں" یہ نئے شناختی الفاظ تھے۔

میں نے جواب دیا "خزاؤں کا سکوت خشک پتوں کے ساز پر کسی اداس لے میں نغمۂ بہار ہے" یہ جوابی شناختی الفاظ

تھے۔

اس نے مجھے اور میں نے اسے ان الفاظ کے ذریعے پہچان لیا۔ وہ اندر آ گیا۔ میں حیران تھا کہ وہ اس وقت کیوں اور کیسے میرے پاس پہنچ گیا؟ میں تو تین دن پہلے کلکتے آ گیا تھا۔ میں نے اس سے کہا "مجھے حیرت ہے' میرا خیال تھا کہ مجھے تین دن انتظار کرنا پڑے گا۔"

"مجھے رات ہی تار ملا تھا ساتھی شاہین!" اس نے کہا "ورنہ ہمارے پاس بھی یہ اطلاع تھی کہ آپ کیم کو یہاں پہنچیں گے" اس نے جیب سے تار نکالا "یہ دیکھیں!"

تار دہلی سے دیا گیا تھا۔ تار کا وہ حصہ پھاڑ دیا گیا تھا جس پر تار وصول کرنے والے کا نام اور پتا لکھا ہوتا ہے۔ تار کا مضمون یہ تھا "شاہین ۳۰ کو کلکتے پہنچ رہا ہے۔ مال کی بکنگ منسوخ ہو چکی ہے۔ مزید دو کریٹ نہیں بھیجے جا سکتے" میں نے تار کا مضمون پڑھ کر اسے تار واپس کر دیا۔

"دیکھا آپ نے!" نووارد نے کہا "اس طرح ہمیں آپ کے آنے کی اطلاع ہوئی تھی۔"

"باقی دو جملوں کا مطلب کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اس کا مطلب ہے کہ متوقع مہم منسوخ کر دی گئی ہے۔ یہاں مزید جن دو ساتھیوں کو پہنچنا تھا' اب وہ نہیں آئیں گے۔"

"مہم کیوں منسوخ کر دی گئی؟" میں نے معلوم کیا۔

"یہ مجھے نہیں معلوم ساتھی!" آنے والے نے کہا "میں آپ کو صرف یہ اطلاع دینے آیا تھا کہ اگلے ہفتے' آج ہی کے دن شام ٹھیک چار بجے وکٹوریہ میموریل کے سامنے' میرا مطلب ہے مین گیٹ کے سامنے آپ موجود ہوں۔ آپ کے ہاتھ میں گاندھی جی کے اخبار ینگ انڈیا کا تازہ شمارہ ہونا چاہیے۔ ٹھیک چار بجے جب آپ مین گیٹ کے سامنے سے گزریں تو جھک کر اپنے جوتے کا فیتہ کھول کر باندھیں' یوں جیسے آپ فیتہ کس رہے ہوں۔ فیتہ کسنے کے بعد آپ "ینگ انڈیا" کا شمارہ موڑ کر بغل میں دبا لیں اور رومال سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے آگے چلے جائیں۔ سمجھ گئے نا آپ؟ اگلے ہفتے آج ہی کے دن' شام چار بجے وکٹوریہ میموریل اور ینگ انڈیا کا تازہ شمارہ! جب آپ مین گیٹ کے سامنے سے گزریں گے تو۔۔۔" اس نے ہدایات دہرائیں۔

"کیا یہ ضروری ہے کہ میں اسی مسافر خانے میں مقیم رہوں؟" میں نے دریافت کیا۔

"اس سلسلے میں میرے پاس کوئی ہدایت نہیں ساتھی!" وہ بولا "البتہ یہ ہدایت ضرور ملی ہے کہ اس عرصے میں آپ کلکتے کے محلوں' آبادیوں اور شاہراہوں سے جتنا زیادہ سے زیادہ واقف ہو سکتے ہیں' واقف ہو جائیں۔"

"اور کچھ؟"

"فی الحال اور کچھ نہیں۔ اب کوئی آپ سے رابطہ قائم نہیں کرے گا" اس نے جواب دیتے ہوئے بتایا "اچھا میں چلتا ہوں' خدا حافظ!"

میں نے پھر دروازہ بند کر لیا اور پلنگ پر لیٹ گیا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اچانک وہ مہم منسوخ کیوں کر دی گئی جس کے بارے میں مجھے معلوم تک نہیں تھا کہ تھی کیا؟ میں نے آنے والے ساتھی سے اس سلسلے میں پوچھا بھی تھا مگر جب اس نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اصرار کرنا ضروری نہیں سمجھا کیوں کہ یہ بات تنظیم کے بنیادی اصولوں کے خلاف تھی۔ تنظیم کی ایک طے شدہ پالیسی تھی کہ کسی بھی مہم کے بارے میں صرف اتنے ہی ساتھیوں کو علم ہوتا جنہیں متعلقہ مہم میں براہ راست حصہ لینا ہوتا یا مہم کے کسی مرحلے پر ان کی مدد کرنا ہوتی۔ یہی وجہ تھی کہ جب بھی کسی ساتھی کو کوئی مہم سونپی جاتی' اس سے رازداری کا حلف بھی لیا جاتا۔

میرا تنظیمی ساتھی مجھے اطلاع دے کر کبھی کا جا چکا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ میرا کلکتے آنا بے سود ہی رہا لیکن شاید اب مجھے اسی شہر میں کوئی نہ کوئی مہم سونپی جانی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اگلے ہفتے وکٹوریہ میموریل کے سامنے پہنچنے کی تاکید کی گئی تھی۔ اصل مہم کیوں ملتوی کی گئی؟ یہ سوال میرے ذہن میں چپک کر رہ گیا تھا۔ کیا حکومت کو ہمارے ارادوں کا علم ہو گیا تھا؟ یہ امکان بہرحال نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کالی بھیڑیں کہاں نہیں ہوتیں' تو پھر وہ کالی بھیڑ کون تھی؟

اب میرے لیے مسافر خانے میں رکنا محال تھا۔ میں نے فوراً ہی وہاں سے جوگیندر کی کوٹھی میں منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کا اصل سبب تو فاطمہ سے ملاقات ہی تھی لیکن اس کے علاوہ میں جوگیندر سے بھی گفتگو کرنا چاہتا تھا اور آج ہی رات سیٹھ صدیق سے مل کر مجاہد اوّل کا خط انہیں پہنچانا چاہتا تھا۔

میں مطلوبہ پتے پر ٹالی گنج پہنچ گیا تو جوگیندر اور فاطمہ مجھے دیکھ کر حیران ہی تو رہ گئے۔

"خیریت؟" جوگیندر میرے سینے سے لگ کر بولا۔ فاطمہ سامنے ہی کھڑی تھی۔ اس طرف جوگیندر کی پشت تھی۔ میں نے ہونٹوں کو نیم دائرے کی صورت میں بنا کر ایک محبت بھرا اشارہ کیا۔ جواب میں وہ یاقوتی لب بھی حرکت کرنے لگے۔ مجھے اپنا دل ان حسین لبوں کے درمیان دھڑکتا محسوس ہوا۔

اسی وقت جوگیندر مجھ سے الگ ہوکر بولا "تم اچانک لاہور سے یہاں کب اور کیسے پہنچ گئے؟"

مختصراً میں نے اسے حالات سے آگاہ کردیا۔

"شاہین! تمہیں۔ یوں اچانک اپنے سامنے دیکھ کر یقین سا نہیں آرہا آنکھوں پر!" فاطمہ کی نظریں میرے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔

"اشنان (غسل) کروگے؟" جوگیندر نے کہا "میرا خیال ہے تمہیں وہاں سے فوراً ہی بھاگنا پڑا ہے۔"

"پہلے میری بات سن لو" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے جوگیندر کو مخاطب کیا "یہ تو میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں کہ متوقع مہم منسوخ ہوچکی ہے۔ میں اسی لیے تم لوگوں کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں اب!"

"مہم کی منسوخی کی اطلاع مجھے بھی ہوگئی ہے" جوگیندر نے بتایا "پہلے کسی متوقع مہم کے آغاز ہونے کی خبر ملی تھی مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ اس سلسلے میں پنجاب سے تمہیں بنگال بلالیا جائے گا۔ بہرحال اس پر ہم بعد میں بات کریں گے' فی الوقت تم نہادھوکر تازہ دم ہوجاؤ۔"

غسل کرنے کے بعد کپڑے تبدیل کرکے جب میں باتھ روم سے آیا تو ڈرائنگ روم میں فاطمہ اور جوگیندر چائے پر میرا انتظار کررہے تھے۔

"کیوں' یہاں تمہارے پتا جی کے ساتھ کوئی اور نہیں رہتا؟" میں نے دریافت کیا۔

"دو ملازم ہیں" جوگیندر نے بتایا "اور ہفتے میں تین چار دن کوئی نہ کوئی مہمان آتا جاتا ہی رہتا ہے" پھر وہ ہنسا "کوئی بہت ہی راز کی بات ہے تو بتاؤ' باہر چلے چلتے ہیں" یہ کہتے ہوئے اس نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔

"سوچ لو جوگیندر بھیا!" فاطمہ بولی "جب تک شاہین جی یہاں ہیں' تم کوئی بات مجھ سے چھپ کر نہیں کرسکتے۔"

چائے پیتے ہوئے جوگیندر نے سیاست پر گفتگو شروع کردی۔ گزشتہ کئی روز سے میں اخبارات نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس نے مجھے گزشتہ تاریخ کا ایک اخبار دیا۔ وہ کہنے لگا "لو یہ دیکھو! یہ کانگریس کا تازہ ترین ریزولیوشن پڑھو!" اخبار دے کر وہ ڈرائنگ روم سے چلا گیا۔ فاطمہ میرے پاس رہ گئی۔ تشنہ کامان محبت کے لیے یہ موقع غنیمت تھا۔ فاطمہ نے میری مسیحائی میں دیر نہ کی اور میں نہال ہوگیا۔

"بھیا! آتے ہوں گے اور ابھی تمہیں ریزولیوشن بھی پڑھنا ہے" اس کے سانسوں کی حرارت مجھ سے دور ہوگئی۔

"اخبار اس وقت ہمارا سب سے بڑا رقیب بن گیا ہے" میں نے کہا۔

"اب تو تم ساتھ ہی رہو گے پھر ایسی بے قراری کیا ہے؟" وہ مسکرا کر بولی۔ سرخ رنگ کی ساڑھی میں وہ ایک مہکتا ہوا گلاب معلوم ہورہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد جوگیندر واپس آیا تو میں ریزولیوشن پڑھ چکا تھا۔

"اب بتاؤ کیا خیال ہے؟" وہ سامنے والی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہنے لگا۔

"انتہائی مایوس کن ریزولیوشن ہیں" میں نے تبصرہ کیا "یہ ریزولیوشن ہندوستان سے غداری ہیں بلکہ شرمناک پسپائی کے مترادف ہیں۔"

"تم نے ٹھیک کہا شاہین!" جوگیندر بولا "یہ اس ملک اور اس کے عوام سے غداری ہیں۔ ان کے ذریعے اصل بڑی تحریک کو سبوتاژ کرنے کی کوشش کی گئی ہے جس کے نتیجے میں کراچی خلافت کانفرنس نے بعض ایسے اہم اور انقلابی ریزولیوشن پاس کیے تھے جو ایک طرح سے برطانوی حکومت کے خلاف اعلان جنگ تھے۔ کانگریس کے ان ریزولیوشنوں میں ایک جھنکار تو سنائی دیتی ہے مگر یہ جھنکار جنگ کے نقارے کی نہیں' بھڑکتے الاؤ پر پانی ڈالنے سے پیدا ہونے والی سنسناہٹ کی آواز ہے" جوگیندر اپنی رو میں کہے جارہا تھا "کراچی خلافت کانفرنس نے اعلان کیا تھا کہ ہندوستان کے عوام' پولیس اور فوج کی ملازمتوں کا بائیکاٹ کریں گے۔ مولانا محمد علی جوہر نے اس کانفرنس میں جو تقریر کی تھی' وہ ایک باغیانہ تقریر تھی جس کے نتیجے میں ان پر اور ان کے ساتھیوں پر بغاوت کا مقدمہ چلا اور سزا ہوئی۔ مولانا جوہر کی وہ آواز پورے ہندوستان کی آواز تھی مگر اب مولانا جوہر کی رہائی کے بعد ان ریزولیوشنوں سے ایسا لگتا ہے کہ کانگریس کو وہ طبل جنگ ہی سنائی نہیں دیا جس پر کراچی میں تھاپ پڑی تھی۔"

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کانگریس سے یہ چوک کیسے ہوگئی؟" میں نے کہا۔

"یہ بھول چوک کی بات نہیں ہے میرے دوست! یہ ایک سوچی سمجھی حرکت ہے" جوگیندر کی آواز پُرجوش اور پُریقین تھی "گاندھی جی نے سوراج کے قیام کے لیے ایک سال کی مدت دی تھی۔ انہوں نے یہ دعوے کیے تھے کہ یکم اگست کو ہندوستان میں سوراج قائم ہوجائے گا پھر انہوں نے یہ مدت جنوری تک بڑھادی۔ اس سوراج کے قیام کا تیسرا مرحلہ انہوں نے فوج اور پولیس کی ملازمتوں سے علیحدگی کو قرار دیا تھا۔ اس اعتبار سے بھی دیکھا جائے تو گاندھی جی اور کانگریس کا یہ فرض تھا کہ وہ اس ضمن میں

کوئی ریزولیوشن پاس کرتے' کراچی خلافت کانفرنس سے بڑھ کر ریزولیوشن پاس کرتے مگر انہوں نے تو خلافت کانفرنس کے اس ریزولیوشن کی حمایت میں بھی کلمہ خیر نہیں کہا۔ کانگریس اور گاندھی جی کا یہ رویّہ مجرمانہ ہے" یہ کہہ کر جوگیندر خاموش ہوگیا۔

"ہوسکتا ہے کانگریس نے اس معاملے میں خلافت کمیٹی سے مشورہ کرکے یہ روش اپنائی ہو" میں نے اپنا خیال پیش کیا۔

"کیا بات کرتے ہو شاہین!" اس مرتبہ جوگیندر کا لہجہ تیکھا تھا "تم شاید کھل کر کچھ کہنے سے اس لیے بچ رہے ہو کہ تم مسلمان اور میں ہندو!" جوگیندر چند لمحوں کو خاموش ہوگیا۔ بات واقعی کچھ ایسی ہی تھی مگر پھر بھی میں نے اظہار نہیں کیا۔ جوگیندر کہہ رہا تھا "مگر میں شاہین' تمہیں بھی اور خود کو بھی صرف ہندوستانی سمجھتا ہوں' انسان سمجھتا ہوں! انسانیت میرے نزدیک سب سے بڑا مذہب ہے۔ مجھے بتاؤ شاہین! کیا تمہاری جدوجہد صرف مسلمانوں کے لیے ہے؟ یا پھر ہندوستان کے تمام باشندوں کے لیے ہے؟"

"ہماری جدوجہد کا مقصد ہندوستان کی آزادی ہے' ہندوستان کے تمام باشندوں کی آزادی" میں بولا۔

"اگر مجھے یہ یقین نہ ہوتا تو میں کبھی تمہارے ساتھ نہ ہوتا" جوگیندر پُرجوش آواز میں کہنے لگا "اسی وجہ سے میرے لہجے میں تلخی ہے۔ تمہیں یاد ہے' خلافت کانفرنس نے اعلان کیا تھا کہ فوج اور پولیس کے مقاطعے کی تحریک پورے ہندوستان کی امنگوں اور خواہشوں کی مظہر ہوگی۔ اب اگر کانگریس اس ریزولیوشن کی حمایت نہیں کررہی تو اس کا مطلب یہی ہے کہ کانگریس' فوج اور پولیس کے مقاطعے کی حمایت میں نہیں ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ کانگریس اس وقت ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی ہے۔ اس پر ہندوؤں کا قبضہ ہے اور خلافت تحریک کا تعلق خاص طور پر مسلمانوں سے ہے۔ کانگریس نے خلافت کانفرنس کی اس قرارداد کی حمایت نہ کرکے مسلمانوں کو اس تحریک سے الگ کرنے کی سازش کی ہے جس میں وہ آج تک ہندوؤں کے ساتھ شریک رہے ہیں۔ اس کا مقصد صرف یہ باور کرانا ہے کہ پولیس اور فوج کے مقاطعے کی تحریک صرف مسلمانوں تک محدود ہے۔ پتا ہے' اس طرح ہم پھر اٹھارہ سو ستاون میں آگئے ہیں۔ ہم آزادی سے اتنی ہی دور چلے گئے ہیں جتنے اٹھارہ سو ستاون میں تھے۔ کتنی ہولناک پسپائی ہے یہ!"

جوگیندر جو کچھ کہہ رہا تھا' صحیح تھا۔ کانگریس نے مولانا محمد علی جوہر اور خلافت تحریک کے ساتھ بے وفائی کی تھی۔ کانگریس اگر ایسا نہ کرتی تو شاید ہندوستانیوں کو وہ تمام مراعات مل جاتیں جس کا وہ مطالبہ کررہے تھے۔

"میں نے کہا تھا کہ کانگریس کے ان ریزولیوشنوں کی جھنکار بھڑکتی ہوئی آگ پر پانی پھینکنے کی آواز ہے" جوگیندر کہہ رہا تھا "اس کا ثبوت بدیسی کپڑوں کو نذر آتش کرنے کا ریزولیوشن ہے' گویا یہ اقدام فوج اور پولیس کے بائیکاٹ سے زیادہ اہم ہے۔ لوگوں کو اس معاملے میں پاگل بنانے کے لیے کل کا دن بھی مقرر کردیا گیا ہے تاکہ وہ یہ سوچ بھی نہ سکیں کہ کانگریس انہیں دھوکا دے چکی ہے۔ یہ ہے سیاسی پینترے بازی! اب عالم یہ ہے کہ سیاسی کارکنوں' رضاکاروں اور طلبہ کو اس کام پر لگادیا گیا ہے کہ وہ کلکتے کے گلی کوچوں میں گھوم رہے ہیں' ہر گھر اور ہر در کو کھٹکھٹا رہے ہیں اور بدیسی کپڑے جمع کررہے ہیں۔ یہی بمبئی میں بھی ہورہا ہے۔ لوگ ہیں کہ اصل تحریک کو بھول گئے ہیں۔ انہیں یہ احساس بھی نہیں ہے کہ وہ پسپائی اختیار کررہے ہیں۔ وہ اصل تحریک سے ہٹ کر اس کے صرف ایک محدود حصے ہی کو اصل تحریک سمجھنے لگے ہیں۔ پولیس اور فوج کے مقاطعے کو تو چھوڑو' وہ تو یہ بھی بھول گئے ہیں کہ سوراج کی اصل تحریک کیا ہے۔ کانگریس نے بہت بڑا ظلم کیا ہے اگر وہ کراچی خلافت کانفرنس کی حمایت کرتی تو یہ آزادی کی سمت ایک لمبی چھلانگ ہوتی مگر کانگریس نے اس مرحلے پر ہندوستانیوں کی ٹانگ کھینچ لی ہے۔"

میں بولا "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر ان سیاست دانوں کو کیا ہوگیا ہے؟"

"ہاں" جوگیندر نے تائید کی "سوچنے کی بات یہ ہے کہ بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ کرنے سے کیا فائدہ؟ برطانیہ سے صرف تین کروڑ پاؤنڈ کا کپڑا ہندوستان آتا ہے اگر ہم مقاطعہ کرکے اپنی ضروریات کا تمام کپڑا ہمیں تیار کرنے لگیں تو کیا اس نقصان سے برطانوی استعمار کا ہندوستان سے خاتمہ ہوجائے گا؟ کیا برطانوی شہنشاہیت اس سے ختم ہوجائے گی؟ برطانیہ یہاں سے جتنی دولت سمیٹ رہا ہے' یہ تین کروڑ پاؤنڈ اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہیں۔ کانگریس نے جو رویّہ اختیار کیا ہے' بہت افسوس ناک ہے۔ مجھے تو یوں لگتا ہے شاہین کہ ہندو پانی اور مسلمان پانی کا نعرہ سیاست میں بھی داخل ہوگیا ہے۔ ہندوستان کی سیاست اب ہندو سیاست اور مسلمان سیاست میں تقسیم ہوچکی ہے۔ جب سیاست بٹ جاتی ہے تو لوگ بٹ جاتے ہیں' جب لوگ بٹ جاتے ہیں تو

ملک تقسیم ہوجاتے ہیں۔ کانگریس نے بہت نقصان کیا ہے اور اس نقصان کی تلافی ناممکن ہوگی!"

جوگیندر کے خیالات حیرت انگیز طور پر بخت خاں سے مماثل تھے۔ لاہور سے کلکتہ آتے ہوئے اس نے بھی تقریباً ایسی ہی باتیں کی تھیں۔ دو ذہن اپنی اپنی جگہ حالات وواقعات کا ایک ہی طرح اور ایک ہی سمت میں تجزیہ کررہے تھے مگر یہ باتیں تھیں بہت سچی اور کھری! وہ سینا واقعی ہندوستان کی سیاست کا ایک اہم موڑ تھا جب ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی مخالف سمتوں میں کھڑے تھے۔

ہماری یہ گفتگو بہت دیر جاری رہی۔ معاً باہر سے موٹر کے ہارن کی آواز آئی اور فاطمہ یہ کہتی ہوئی باہر لپکی "پتا جی آگئے۔"

سیٹھ موہن لال اس مخلوط ہندو مسلم تہذیب کا جیتا جاگتا نمونہ تھے جو ہندوستان میں صدیوں کے ملاپ سے پیدا ہوئی تھی۔ وہ اپنے بھائی لالہ مرلی دھر سے قطعی مختلف تھے جس سے میری ملاقات جلالی کی مہم کے دوران میں ہوئی تھی۔ جوگیندر اور فاطمہ ان کی تربیت اور ان کے مزاج کا جیتا جاگتا نمونہ تھے۔ ایک ہندو گھرانے کی لڑکی سیٹھ موہن لال کی بیٹی سیتا' اب مسلمان ہو کر فاطمہ بن چکی تھی اور اپنے باپ کے گھر میں رہ رہی تھی' یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی' بڑے دل گردے کی بات تھی۔ مجھے اپنے گھر میں دیکھ کر سیٹھ جی نے بے پناہ مسرت کا اظہار کیا پھر وہ بھی ہماری گفتگو میں شریک ہوگئے تھے۔

دن ڈھل چکا تھا اور شام کے سائے گہرے ہوچکے تھے۔ میں نے جوگیندر سے کہا کہ میں سیٹھ صدیق کے گھر جانا چاہتا ہوں جنہیں ایک خط دینا تھا۔

"ضرور جاؤ!" سیٹھ موہن لال بولے "کار لیتے جاؤ جوگیندر! تمہیں وہاں کلکتے اور ہندوستان کی سیاست کا رخ دیکھنے کو بھی ملے گا۔"

"میں بھی چلوں گی" فاطمہ بول اٹھی "کیوں پتا جی' چلی جاؤں؟"

"مجھے کیا اعتراض ہوسکتا ہے! شاہین اور جوگیندر سے پوچھ لو۔"

تھوڑی دیر بعد ہم تینوں ہی سیٹھ صدیق کے گھر جارہے تھے۔ سیٹھ صدیق پارک سرکس کے علاقے میں رہتے تھے۔ جوگیندر کو بھی ان کے گھر کا علم تھا۔ میں جوگیندر کے ساتھ اگلی سیٹ پر بیٹھا تھا اور فاطمہ پچھلی سیٹ پر موجود تھی۔ اس وقت سورج غروب ہوچکا تھا۔ کلکتے کی سڑکیں روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ یہ ہندوستان کا سب سے بڑا شہر تھا۔ یہ وہ شہر تھا جہاں کبھی رات نہیں ہوتی تھی۔

جب ہم سیٹھ صدیق کے گھر پہنچے تو وہاں بہت سے لوگ جمع تھے۔ لان میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں۔ کلکتے کے سیاسی کارکن اور رضاکار ان کرسیوں پر بیٹھے تھے' گھاس پر بیٹھے تھے اور ادھر ادھر کھڑے تھے۔ سبھی کا موضوع گفتگو اس وقت بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ تھا۔ اگلے دن ہندوستان کے دو بڑے شہروں کلکتے اور بمبئی میں تاریخ کی سب سے بڑی ہولی جلائی جانے والی تھی۔

ہم تینوں ان کے درمیان سے گزرتے ہوئے ڈرائنگ روم کی طرف آئے۔ ڈرائنگ روم میں اس وقت اجلاس ہورہا تھا۔ اس اجلاس میں کلکتے کے مقامی سیاست دانوں کے علاوہ کانگریس کی مرکزی کمیٹی میں شرکت کے لیے کلکتے آنے والے دوسرے سیاست داں بھی تھے۔ سیٹھ صدیق نے ان سب کو ڈنر پر مدعو کررکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ اس وقت ہم اندر نہیں جاسکتے تھے۔ میں نے جیب سے لفافہ نکالا اور دروازے پر موجود ملازم کو دیتے ہوئے کہا "سیٹھ صدیق صاحب کو یہ لفافہ دے دینا" ان سے کہنا کہ علی گڑھ سے آیا ہوں اور ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

ملازم وہ لفافہ لے کر اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ملازم پھر باہر آیا "ادھر آیئے!" اس نے کہا۔

ہم تینوں اس کے پیچھے چلتے ہوئے کوٹھی کے پہلو میں آگئے۔

"آیئے؟" ملازم نے ایک دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

جوگیندر اور فاطمہ وہیں رک گئے "ٹھیک ہے تم جاؤ" ہم یہیں کھڑے ہیں۔"

"ارے نہیں یار!" میں بولا "تم بھی آجاؤ! اب تم سے کیا پردہ رہا ہے!" میں نے جوگیندر کا ہاتھ پکڑلیا پھر ہم آگے پیچھے کمرے میں داخل ہوگئے۔ ہر طرف دیواروں کے ساتھ الماریاں کھڑی تھیں اور الماریوں میں قرینے سے کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ سیٹھ صدیق ان روایتی سیٹھوں میں سے نہیں تھے جو صرف سرمائے کے بل بوتے پر ہر شعبے میں اپنی برتری منوانے کی کوشش کرتے ہیں وہ اگر خود صاحب علم یا عالم نہیں تھے تو انہیں کم از کم صاحب علم حضرات کی صحبت ضرور میسر تھی اور علم کا ذوق بھی یقیناً تھا ورنہ وہاں کتابیں اتنے سلیقے سے سجی ہوئی نظر نہ آتیں۔ اسی کمرے میں ایک کونے میں رکھی ہوئی میز پر کاغذات اور قلمدان موجود تھے۔

"آپ لوگ یہاں انتظار کریں۔ سیٹھ جی ابھی آتے ہیں" ملازم نے کہا اور ہمیں وہاں چھوڑ کر چلا گیا۔

ہم تینوں کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تقریباً پندرہ منٹ بعد سیٹھ صدیق کمرے میں داخل ہوئے۔ خلافِ توقع وہ چھریرے بدن کے نوجوان ثابت ہوئے۔ میں انہیں ادھیڑ عمر یا عمر رسیدہ سمجھا تھا۔ ان کے چہرے پر وہ سنجیدگی اور وقار تھا جو اس سیاسی دباؤ کا عطیہ تھا جس میں وہ زندگی گزار رہے تھے۔ قومی سیاست کی ذمے داریوں نے انہیں وقت سے پہلے بردبار و باوقار بنادیا تھا۔

"معاف کیجیے شاہین صاحب!" سیٹھ صدیق نے کہا' "میٹنگ آخری دور میں تھی اس لیے مجھے دیر ہوگئی" پھر انہوں نے جوگیندر کو مخاطب کیا "اور سناؤ جوگیندر' تمہارے پتا کا کیا حال ہے؟"

"ٹھیک ہیں جناب! دعا ہے آپ کی" جوگیندر نے کہا۔

"شاہین صاحب! میں نے خط پڑھ لیا ہے" سیٹھ صدیق پھر مجھ سے مخاطب تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ خط میں کیا لکھا تھا۔ "بے فکر رہیں' آپ کو جب بھی' جس وقت بھی اور جس قسم کی بھی مدد درکار ہو' میں حاضر ہوں۔ دن یا رات کے جس حصے میں بھی آپ چاہیں مجھ سے آکر مل سکتے ہیں۔ آپ جیسے سرفروش ہی ہندوستان کی امید ہیں۔ کاش میں بھی آپ لوگوں کی صفوں میں ہوتا۔"

"آپ اب بھی ہماری ہی صفوں میں ہیں جناب!" میں بولا "آپ جس انداز میں ہندوستان کی خدمت کررہے ہیں' ہم سب اس سے واقف ہیں اگر ہمارے دوسرے سرمایہ دار بھی آپ کی راہ پر چلنے لگیں تو ہم اپنی جنگ بہت جلد جیت سکتے ہیں۔"

"میں کیا کررہا ہوں بھئی!" سیٹھ صدیق نے کہا "یہ تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اپنا سر دینے سے زیادہ آسان بات یہی ہے کہ آدمی اپنی جیب خالی کردے۔ تم لوگوں نے قوم کے لیے اپنا سر دینے کی پیشکش کی ہے۔ میں شاید بزدل ہوں' ایسا نہیں کرسکتا۔"

"نہیں جناب! مجھے بتایئے کہ صرف آپ ہی اس سلسلے میں' سرمایہ دار طبقے کے اندر سرفہرست کیوں ہیں؟"

"ہاں میرا نام۔" سیٹھ صدیق نے کہا "مگر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اپنا نام بھی نہیں آنے دیتے۔ سیٹھ موہن لال ہی کو لے لو' اس جیسے لوگ میرے ساتھ نہ ہوں تو میری خدمات اور میری کوششیں بے معنی ہوجائیں۔"

"آپ بلاوجہ پتا جی کو اتنی اہمیت دے رہے ہیں" جوگیندر بول اٹھا۔

"یہ بلاوجہ نہیں ہے جوگیندر!" سیٹھ صدیق نے کہا "خیر چھوڑو' کبھی موقع ملا تو بتاؤں گا کہ تمہارے پتا جی کے ہمارے اوپر کیا کیا احسانات ہیں!۔۔۔ ہاں تو شاہین صاحب!" سیٹھ صدیق نے پھر مجھے مخاطب کیا "کلکتے میں جب تمہارا کام ختم ہوجائے تو مجھ سے مل لینا۔ ویسے تم اس سے قبل بھی مل سکتے ہو۔"

"بہتر ہے جناب!" میں نے اقرار میں سرہلایا۔

سیٹھ صدیق نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "یہ بات میں نے اس خط کی روشنی میں کہی تھی۔ میرے یار نے لکھا ہے کہ شاہین اپنا کام ختم کرنے کے بعد مجھ سے ملے گا کیوں کہ میں بہت مصروف رہتا ہوں" سیٹھ صدیق نے یہ جملے "ڈرامائی" انداز میں کہے "میرے یار کو یہ نہیں معلوم کہ صدیق کیا ہے! تم جیسے سرفروشوں کے لیے میں ہر مصروفیت قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

اس کے بعد سیٹھ جی نے ہمیں کھانے کی دعوت دی۔ اس پر میں نے کہا "اس تکلف کی کوئی ضرورت نہیں۔ آج رات میں کلکتے کی سیر کرنا چاہتا ہوں پھر شاید فرصت نہ ملے۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے" سیٹھ جی نے کہا "تم لوگوں کی زندگی ہر وقت داؤ پر لگی رہتی ہے۔ اس پُر خطر زندگی میں فرصت کے جو لمحات مل جائیں' غنیمت ہیں۔ میرا خیال ہے شاہین صاحب کہ آپ کھانا کھا کر ہی جائیں۔ زیادہ سے زیادہ آپ کو کھانا کھانے میں آدھا گھنٹا لگے گا۔"

اس پُرخلوص اصرار پر انکار کرنا' بداخلاقی ہوتی' سو ہمیں دعوت قبول کرنا ہی پڑی۔

کھانے پر میں نے ہندوستان کے تقریباً تمام لیڈروں کو دیکھا جن کے نام کا شہرہ ان دنوں ہندوستان بھر میں تھا۔ ڈنر پر بھی سیاست کی باتیں ہونے لگیں مگر تمام گفتگو کا محور بدیسی کپڑوں کا بائیکاٹ تھا۔ گاندھی جی بہت خوش تھے۔ جب بھی گفتگو کا رخ بدلتا وہ پھر بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کے کسی نئے پہلو کو چھیڑ دیتے۔

"دیکھ رہے ہو' تم گاندھی جی کو؟" جوگیندر نے مجھ سے کہا "کتنی چالاکی سے بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ کو سب سے بڑا سیاسی مسئلہ بنائے ہوئے ہیں!"

کھانا کھانے کے بعد سیٹھ صدیق پھر ہمارے پاس آئے اور بولے "شاہین صاحب! میرا خیال ہے کہ کل صبح آپ سیدھے یہیں آجائیں پھر ہمارے ساتھ ہی دھرم تلہ گراؤنڈ چلیے گا" پھر وہ جوگیندر سے مخاطب ہوئے "کل دھرم تلہ تو

آرہے ہو نا!"

"جی ہاں ہم سیدھے دھرم تلہ ہی پہنچیں گے" جوگیندر نے جواب دیا۔

"بہرحال وہاں ضرور آنا" سیٹھ صدیق خاص طور پر مجھ سے مخاطب ہوئے "وہاں ایک خوش گوار تحیّر تمہارا منتظر ہوگا" پھر انہوں نے ایک نوجوان کو اشارے سے بلایا "یہ ہمارے ایک بہت ہی عزیز مہمان ہیں۔ شاہین نام ہے ان کا' علی گڑھ سے آئے ہیں۔ کل یہ دھرم تلے آئیں گے' ان کے ساتھ یہ دونوں بھی ہوں گے" انہوں نے جوگیندر اور فاطمہ کی طرف اشارہ کیا "تمہیں ان تینوں کو اسٹیج پر جگہ دینی ہے۔ یہ تمہاری ذمے داری ہے۔"

اس کے بعد ہم وہاں سے وکٹوریہ میموریل آئے تھے۔ سنگ مرمر سے بنی ہوئی وہ عمارت اس وقت بہت خوب صورت معلوم ہو رہی تھی۔ وہاں پر رات بہت حسین تھی یا شاید اس کا سبب یہ تھا کہ فاطمہ بھی ساتھ تھی۔ وہاں لوگوں کا اژدہام تھا۔ ہر مذہب و ملت کے لوگ اس چاندنی رات سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ دور دور پر سبز گھاس کے میدان میں لوگوں کے پرے کے پرے موجود تھے۔ حسین پر فضا مقامات کتنے مقدس ہوتے ہیں! میں نے سوچا تھا۔ ان کے حسن سے ہر شخص لطف اندوز ہوتا ہے۔ یہ انسان کو سکون سا بخشتے ہیں۔ یہ حسین مقامات فطرت کی تخلیق کی ہوئی وہ عبادت گاہیں ہیں' جہاں ہر انسان سکون اور خوشی حاصل کرنے جا سکتا ہے۔

تیز ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ ہم نے مڑی (مرمرے جن میں سرسوں کا کچا تیل اور نمک ملایا جاتا ہے اور ہری مرچوں سے کھائے جاتے ہیں' بنگال کی ایک چٹپٹی اور سستی غذا) کھائی اور ڈاب پیا۔ ڈاب کچے ناریل کو کہتے ہیں۔ اسے کاٹ کر منہ سے لگانے کے بعد ناریل کا پانی پیا جاتا ہے جو ہاضم اور صحت بخش ہوتا ہے۔ ہم گفتگو کرتے رہے اور سیر کرتے رہے۔ ایک جگہ جوگیندر کا ایک دوست آ ٹکرایا۔ جوگیندر اس سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے اور فاطمہ نے اس دوران میں وہ باتیں کیں جن میں ہم کسی کو بھی شریک نہیں کر سکتے تھے۔

پہل فاطمہ ہی نے کی تھی "شاہین! تمہیں وہ دن یاد ہے نا!" اس کے لہجے میں یادوں کا دھواں سا تھا۔

میں سمجھ گیا کہ فاطمہ اس دن کا ذکر کر رہی تھی جو ہم نے کراچی کے ایک فلیٹ میں ساتھ ساتھ گزارا تھا۔

"وہ دن میری زندگی کا حاصل ہے فاطمہ! اسے میں کیسے بھول سکتا ہوں!"

"اپنے وعدے بھی یاد ہیں؟" فاطمہ نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہا۔

"وہ وعدے اب میرا ایمان ہیں۔"

"تم کتنے اچھے ہو!" فاطمہ کے ہونٹوں سے پھول جھڑنے لگے "دیوتا تو ہوتے ہی اچھے ہیں!"

"ایک بات بتاؤں فاطمہ!" میں آہستگی سے بولا "میں تمہارا بہت شکر گزار ہوں۔ تم نے مجھے زندگی کی حسین خوشی سے ہمکنار کیا ہے۔"

"شاہ۔ میرے شاہین!" اس کے ہونٹوں پر ایک نغمہ تھا کہ پھوٹ بہا تھا "ہم تو اپنے دیوتا کے سیوک (خدمت گزار) ہیں۔ میں تمہاری لیے خوشی کا باعث ہوں' میرے لیے یہی بہت بڑی بات ہے۔"

"تم مجھے دیوتا نہ کہا کرو فاطمہ!" میں نے کہا تھا "میں یہیں زمین پر تمہارے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔"

"مجھ پر یہ پابندی نہ لگاؤ شاہین!" فاطمہ نے گلابوں کی خوشبو پھیلائی "تمہیں دیوتا کہہ کر بھی میری پیاس نہیں بجھتی۔ میں تم سے جو کچھ کہنا چاہتی ہوں۔۔۔ تمہیں جس طرح جن لفظوں سے پکارنا چاہتی ہوں' شاید انسان کی ایجاد کردہ کسی بھی زبان میں آج تک وہ الفاظ ہی تخلیق نہیں ہو سکے ہیں۔ پھر شاہین' تم ان دیوتاؤں میں سے نہیں جو آسمانوں میں رہتے ہیں۔ وہ جو نہ باتیں کرتے ہیں نہ تسلی دیتے ہیں اور نہ خوشی بخشتے ہیں۔ شاہین! تم تو میرے من میں رہتے ہو' تم تو میرے من سے باتیں کرتے ہو' اس سے بھی جب میرے سامنے نہیں ہوتے!"

"فاطمہ! تم مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان ہو گئی ہو" میں نے کہا "اور میں اتنا تہی دامن کہ تمہیں کچھ نہیں دے سکتا' تمہارے احسانات کو اتار بھی نہیں سکتا۔"

"دیکھو شاہین' ایسی باتیں نہ کرنا!" اس کے لہجے میں ناراضگی تھی "بھلا میں نے کیا احسانات کیے ہیں؟"

"کراچی کا وہ دن میں کیسے بھلادوں فاطمہ! اس دن تم نے مجھ پر احسانات اور کرم کے جتنے پھول نچھاور کیے تھے فاطمہ' میں انہیں کیا نام دوں؟" میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اپنا مطلب کیسے واضح کروں مگر فاطمہ میرا مقصد سمجھ گئی تھی۔

"میں نے اس دن اپنے دیوتا کے چرنوں میں عقیدت کے پھول رکھے تھے اور میرا دیوتا اتنا سخی ہے کہ اس نے اسی دن میرے گلے میں اپنے پیار کی مالا ڈال دی تھی۔" فاطمہ کی آواز بوجھل تھی "میں نے اس روز ایک خواب سا دیکھا تھا اور پھر فوراً ہی وہ خواب تعبیر میں ڈھل کر مجسم ہو گیا۔ کرم تو تم نے کیا ہے شاہین! تم نے مجھے مایوس نہیں کیا۔ اپنی بلندیوں سے اتر کر تم میری سطح پر آ گئے' جہاں تم تھے' جہاں تم ہو!"

"بلندیوں پر تم ہو فاطمہ!" میں بولا "میں نہیں' تم کچھ نیچے اتری ہو۔"

"ارے تمہیں کیا خبر شاہین کہ تم کتنی بلندیوں پر ہو! وہ بلندیاں میں نے رادھا کے حوالے سے جانی تھیں۔ وہی رادھا جو جلالی میں تم سے ملی تھی' لالہ منی دھر کی بڑی بیٹی! وہی جسے تم نے اغوا کیا تھا اور وہ تمہیں دل دے بیٹھی تھی۔ مجھے آج بھی یاد ہے کہ تم کتنے پشیمان ہو گئے تھے!"

"سنو فاطمہ! میں سوچ رہا ہوں' ہم جو دنیا کی بنائی ہوئی دیواروں میں قید ہیں' ہم جو اس دنیا کی تراشی ہوئی مصنوعی بھول بھلیوں میں پھنسے ہوئے ہیں' اچانک ہی ایک دوسرے سے آ ملے ہیں مگر یہ ملاپ محض ایک سراب ہے۔ جب ہم حقیقت کی دنیا میں لوٹیں گے تو الگ الگ ہوں گے اور۔۔۔ اور پھر شاید کبھی نہ مل سکیں گے۔"

اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا "کل کیا ہوگا شاہین' کسی کو معلوم نہیں۔ میں تو آج میں زندہ ہوں اور آج کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ تم میرے پاس ہو۔"

"اور آج کی سب سے بڑی حقیقت ایک اور بھی ہے" میں نے کہا "میری آج کی زندگی' طوفانی زندگی ہے۔ یوں سمجھو' آج میں ایک لق و دق صحرا میں بھاگ رہا ہوں۔ جنگلی کتے میرے تعاقب میں ہیں۔ آج ہی یا کل کسی وقت۔۔۔"

"بس شاہین!" فاطمہ نے میری بات کاٹ دی "آگے کچھ مت کہو! میں سمجھ گئی تم کیا کہنا چاہتے ہو! یہ بات مجھے اس وقت بھی معلوم تھی جب ہماری پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ یہ بات مجھے اس روز بھی معلوم تھی جب میرے ہونٹوں پر پیار کی سلگتی ہوئی گرمی اتری تھی۔ میں نے اس وقت تمہیں اپنا دیوتا بنایا تھا جب مجھے یقین بھی نہیں تھا کہ تم سے پھر ملاقات ہوگی۔"

"فاطمہ! میری فاطمہ! میری اچھی فاطمہ!" میرے دل میں اس وقت کیا کیا تھا جسے کہنے کے لیے الفاظ نہیں مل رہے تھے "میں تم سے بہت کچھ کہنا چاہتا ہوں مگر سمجھ میں نہیں آتا کیا کہوں! جی یہ چاہتا ہے کہ تمہیں دیکھے ہی جاؤں۔ تمہارا ہاتھ میرے ہاتھ میں ہو اور تم مجھ سے یونہی اسی طرح باتیں کرتی رہو۔ میں۔۔۔ بس۔۔۔ مجھے تم سے پیار ہے فاطمہ! پیار ہے۔ پیار ہے۔"

"بس۔ یہ تم نے کیا کہہ دیا ہے شاہین!" فاطمہ کی آواز بھرا گئی۔ اس کی آنکھوں کی نمی' میں نے شبنم کی طرح چمکتی دیکھی "کیسی خوشی دی ہے تم نے اس وقت! میں۔ میں تھک سی گئی ہوں۔"

فاطمہ نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ کوئی مسرت سی مسرت تھی! شراب کے نشے کی طرح وہ مسرت نس نس میں اترتی جا رہی تھی۔ جسم اور ذہن بوجھل سے ہو گئے تھے۔ بعض خوشیاں کتنی گراں بار ہوتی ہیں' اس کا اندازہ اس دن مجھے ہوا تھا۔

وہ رات فاطمہ کی انہی باتوں کی وجہ سے آج بھی میرے ذہن میں جاگتی رہتی ہے۔ میں نے اس رات وکٹوریہ میموریل کی سیر نہیں کی تھی' اس دنیا کی سیر کی تھی جو فاطمہ نے اپنی پھول باتوں سے سجائی تھی۔

آنے والے دن کی صبح بہت روشن اور چمکیلی تھی۔ ہم لوگ ناشتا کر رہے تھے کہ سیٹھ موہن لال تیار ہو کر ڈائننگ روم میں آ گئے۔ "اچھا بچو! میں چل رہا ہوں۔" انہوں نے کہا "گاڑی تو نہیں چاہیے؟ ضرورت ہو تو بھجوا دوں گا۔"

"نہیں پتا جی!" جوگیندر نے جواب دیا "آج گاڑی نہیں چاہیے۔"

"کیوں' کیا آج شاہین کو سیر نہیں کراؤ گے؟"

"سیر ہی تو کرانی ہے" جوگیندر مسکرا کر بولا "اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ ویسے بھی آج ہمارا ارادہ دھرم تلہ گراؤنڈ جانے کا ہے۔ ٹرام میں بیٹھ کر جائیں گے۔"

"اچھا تو پھر میں چلتا ہوں" یہ کہہ کر سیٹھ موہن لال وہاں سے چلے گئے۔

ناشتے کے بعد ہم تیار ہوئے اور کوٹھی سے نکل آئے۔

کلکتہ کتنا بڑا شہر ہے' اس کا احساس مجھے اسی دن ہوا تھا۔ ہم ٹرام میں بیٹھ کر دھرم تلہ پہنچ گئے۔ کلکتہ شہر میں اس کی حیثیت مرکزی ہے۔ یہاں سے شہر کے کسی بھی حصے کے لیے براہ راست ٹرام مل سکتی تھی اگر خدانخواستہ اس شہر میں کوئی راستہ بھول جائے تو کسی بھی جگہ سے اسے دھرم تلے کے لیے ٹرام مل سکتی ہے اور پھر وہاں سے وہ جہاں پہنچنا چاہتا ہے پہنچ سکتا ہے۔ کلکتہ شہر میں ٹرام کا جال بچھا ہوا ہے۔ ٹرام میں دو ڈبے ہوتے تھے' ایک فرسٹ کلاس' دوسرا سیکنڈ کلاس! فرسٹ کلاس کا ڈبا' ریل کے فرسٹ کلاس کمپارٹمنٹ سے کسی طرح کم نہیں تھا۔ اس میں ٹیوب لائٹس اور پنکھے لگے ہوئے تھے اور سیٹیں نرم' گداز اور آرام دہ تھیں۔ کرایہ بھی بہت کم تھا۔ ٹراموں کی وجہ سے کلکتے جیسے بڑے شہر میں آمد و رفت کے لیے بڑی آسانی تھی۔ دھرم تلے میں

اس کا مرکزی ڈپو بڑے رقبے میں پھیلا ہوا تھا۔

ہم دھرم تلہ پہنچے تو یوں لگا جیسے سارا شہر وہاں امنڈ آیا ہو۔ ہر جگہ لوگوں کے غول در غول' جتھے کے جتھے نظر آرہے تھے۔ لوگ دس دس' پانچ پانچ کی ٹکڑیوں میں ایک ہی سمت رواں تھے۔ وہ نعرے لگا رہے تھے۔ تمام دھرم تلہ میدان ایک صدا بن گیا تھا۔ جیسے جیسے ہم بڑھتے رہے' بھیڑ میں اضافہ ہوتا رہا۔ سڑک پر تو یہ عالم تھا کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ میٹرو سینما کے سامنے تل دھرنے کی جگہ نہیں تھی۔ فاطمہ میرے اور جوگیندر کے درمیان تھی۔

ہر شخص کھدر کا لباس پہنے ہوئے تھا۔ ایک جگہ کسی شخص کو لوگوں نے گھیر رکھا تھا۔ اس کی قمیص بدیسی کپڑے کی تھی البتہ پاجامہ کھدر کا تھا۔ لوگوں کا اصرار تھا کہ وہ قمیص اتار دے اور وہ کہہ رہا تھا "اے بھیا! میرے پاس اور قمیص نہیں ہے' پاجامہ تو کھدر کا پہنے ہوئے ہوں۔"

پھر کسی نے اس کے سر پر چپت ماری تھی۔ ایک آدمی نے اس کے گریبان پر ہاتھ ڈال کر قمیص جھیر جھیر کردی۔ ذرا سی دیر میں اس کی قمیص اس کے جسم سے الگ کردی گئی۔ کسی نے اس کی پھٹی ہوئی قمیص کو سوکھی ہوئی شاخ پر ٹانگ کر سروں سے بلند کیا۔

"انگریز حکومت!" ایک نعرہ ابھرا۔

"مردہ باد!" جواب دیا گیا۔

"انگریز کے پٹھو!"

"ہائے ہائے!"

"بول بجرنگ بلی کی!"

"جے!"

"نعرۂ تکبیر!"

"اللہ اکبر!"

"بے تایا گل پن!" جوگیندر بڑبڑایا۔

"آہستہ بولیں بھیا!" فاطمہ نے مصلحتِ وقت کے تحت کہا۔

اب میں' جوگیندر اور فاطمہ بڑے سے اس گیٹ میں داخل ہورہے تھے' جو بلیاں کھڑی کرکے بنایا گیا تھا۔ یہیں بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی جانے والی تھی۔ گیٹ کے اندر لوگوں کا اتنا اژدہام تھا کہ میدانِ حشر کا گمان ہونے لگا۔ گیٹ ہی پر ہمیں صابر مل گیا جسے سیٹھ صدیق نے ہمارے لیے ہدایات دی تھیں۔

"آیئے شاہین صاحب!" صابر نے ہمیں دیکھتے ہی کہا "آپ اچھے موقعے پر آگئے۔"

ہم صابر کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ایک اسٹیج تک پہنچ گئے۔ کلکتے کے کئی سرکردہ لیڈر اسٹیج کے پاس موجود تھے۔ صابر نے ہمیں اسٹیج پر لے جاکر بٹھادیا جہاں دو ایک آدمی پہلے ہی کرسیوں پر براجمان تھے۔ ایک بچہ اسٹیج پر مائک کے سامنے کھڑا ہوا ترانہ پڑھ رہا تھا۔

وسیع و عریض میدان میں ہر طرف سر ہی سر نظر آرہے تھے' حدِ نظر تک آدم ہی آدم تھا۔ اس میدان کے وسط میں بدیسی کپڑوں کا ڈھیر تھا۔ ڈھیر کیا' مینار تھا اور اس مینار کی بلندی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ کارکن اور رضاکار آتے تھے اور کپڑوں کے ڈھیر پر مزید کپڑے ڈال دیتے تھے۔ دو تین آدمی تو بس کپڑوں کے اس مینار کو درست کرنے میں مصروف تھے۔ جب بھی اس ڈھیر پر بدیسی کپڑوں کی کوئی پوٹلی پھینکی جاتی' فضا مردہ باد کے نعروں سے گونج اٹھتی۔

ذرا ہی دیر بعد لوگوں میں اضطراب اور بے چینی پھیل گئی "گاندھی جی آگئے' گاندھی جی آگئے" آواز کی ایک لہر' مختلف آوازوں کے سمندر میں جیسے لوٹ لگاتی ہوئی اس کنارے سے اس کنارے تک پھیل گئی۔ اسی گیٹ سے جہاں سے ہم داخل ہوئے تھے' گاندھی جی' سیٹھ صدیق اور مختلف لیڈروں کے جلو میں آگے بڑھے اور لوگوں کے درمیان سے ہوکر اسٹیج پر پہنچے۔ ہم تینوں اور وہ بھی جو پہلے سے اسٹیج پر موجود تھے' احتراماً کھڑے ہوگئے۔

فضا ایک مرتبہ پھر نعروں سے گونج اٹھی۔ جب گاندھی جی اپنی نشست پر بیٹھ گئے تو ان نعروں میں کمی آئی پھر سیٹھ صدیق مائک کے سامنے آئے۔ چند مختصر سے تعارفی جملے انہوں نے اس دن کی اہمیت اور بدیسی کپڑے کے مقاطعے کے بارے میں کہے اور پھر انہوں نے ایک دھماکا کیا۔

کم از کم میرے لیے تو یہ ایک دھماکا ہی تھا۔ سیٹھ صدیق نے مجھے دھرم تلہ آنے کی دعوت دیتے ہوئے گزشتہ روز کہا تھا "وہاں ایک خوش گوار تحیّر تمہارا منتظر ہوگا۔" اس جملے کے معنی مجھے اس وقت سمجھ میں آئے تھے۔ سیٹھ جی کہہ رہے تھے "اس سے پہلے کہ میں گاندھی جی سے درخواست کروں' میں ایک ایسے نوجوان کو تقریر کے لیے بلا رہا ہوں جس کی زندگی کو میں اپنے لیے مشعلِ راہ سمجھتا ہوں۔ یہ نوجوان اس قبیلے سے ہے جو کسی بھی قوم کا بازوئے شمشیرزن ہوتا ہے۔ یہ نوجوان علی گڑھ کا ایک طالب علم ہے۔ اس کی فطرت سیمابی ہے' آزادی کے لیے یہ پارے کی طرح تڑپتا رہتا ہے' دریا کے مانند محوِ سفر رہتا ہے۔ اس کا نام شاہین ہے۔ یہ ان نوجوانوں میں سے ہے جو اپنے خون سے قوموں

کی تاریخ رقم کرتے ہیں۔"

نہ جانے سیٹھ صدیق کے ان مختصر جملوں میں کیا تاثیر تھی کہ لوگوں نے پھر پُرجوش نعرے لگانا شروع کردیے۔ مجھے اس دوران میں یوں لگا جیسے میں ایک کھلے میدان میں ہوں اور شدید آندھی سن سن چل رہی ہے۔ ملتان کی مہم میں مجھے کئی بار تقریر کرنے کا تجربہ ہوچکا تھا لیکن کسی سیاسی جلسے میں' وہ بھی لاکھوں افراد کے سامنے تقریر کرنے کا یہ میرا پہلا موقع تھا۔ جو لوگ مجمع کا سامنا کرتے ہیں' اچھی طرح جانتے ہیں کہ مجمع کی اپنی ایک الگ دہشت ہوتی ہے۔ ہر شخص مجمع کا سامنا کرنے کا اہل نہیں ہوتا۔ میں نے سیٹھ صدیق سے معذرت چاہی مگر سیٹھ جی کے اصرار اور پھر لوگوں کے نعرے مجھے مائک تک لے ہی آئے۔

فاطمہ نے کہا "کیوں پریشان ہوتے ہو شاہین! تم تو من موہ لینے والی باتیں کرتے ہو' تقریر مت کرو' لوگوں سے باتیں کرو!"

میں نے تقریر کی اور خوب تقریر کی۔ بعد میں جوگیندر اور فاطمہ نے میری تقریر کی بہت تعریف کی لیکن اس وقت میرا عالم یہ تھا کہ سارا خون جیسے میرے چہرے پر سمٹ آیا تھا' دماغ میں گرمی کی لو سی دوڑ رہی تھی۔ ابتدا میں' میں ٹھہر ٹھہر کر اور سوچ سوچ کر بولتا رہا پھر میرا حجاب کھل گیا اور میں بولتا ہی چلا گیا۔

"مت سوچیے!" میں نے کہا تھا "کپڑوں کے اس بڑے سے ڈھیر کو جلانے سے پہلے آپ اس حکومت کو ہلادیں گے جس نے دو سو برس سے اس دیس کو' ہمارے پیارے ہندوستان کو الاؤ بنا رکھا ہے' جس نے ہماری جنم بھومی کو ہمارے لیے چتا' قبر' شمشان گھاٹ اور قبرستان بنادیا ہے۔ اب یہاں آزاد انسان نہیں غلام اور مزدور نسلیں اگا کرتی ہیں۔" میں نے اور بھی نہ معلوم کیا کہا تھا' ایسا بھیانک نقشہ کھینچا تھا کہ لوگ رو پڑے تھے اور پھر میں آزادی کی جدوجہد کی طرف آیا تھا۔ "آگ ہی لگانی ہے تو ملوں کو آگ لگاؤ' دفتروں کو آگ لگاؤ! کپڑوں کے اس ڈھیر کو علامت بنالو اس بات کی علامت کہ اس ڈھیر سے بلند ہونے والے شعلوں کو تم بجھنے نہیں دوگے جب تک سات سمندر پار سے آنے والے دشمن کو تہس نہس نہیں کردوگے جس نے تمہاری رگوں سے لہو نچوڑ لیا ہے' تمہیں غلامی کی زنجیریں پہنا کر انہیں زیور کا نام دیا ہے۔"

لوگوں نے پھر نعرے لگا کر گویا آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ میں نے دوبارہ تقریر شروع کی "ایسے ظالم دشمن سے' سفاک اور بے رحم قاتل سے تم اہنسا پر عمل کرکے جنگ نہیں جیت سکتے۔ اہنسا یا عدم تشدد شریفوں اور مہذب لوگوں کا اصول ہے۔ تم ایک کمین فطرت قوم کو اس اصول سے زیر نہیں کرسکتے۔ تم ایک پیشہ ور قاتل کے سامنے یہ اصول اپناؤ گے تو قتل ہوجاؤ گے' قتل ہوتے رہو گے اور وہ قتل کرتا رہے گا۔ تمہیں اس کا ہاتھ کاٹنے کی منصوبہ بندی کرنی چاہیے!"

لوگوں نے پھر نعرے لگائے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا' گاندھی جی نے سیٹھ صدیق کو ٹھوکا دے کر ان کے کان میں کچھ کہا تھا۔ میں نعروں کے ختم ہونے کے انتظار میں تھا۔ سیٹھ صدیق اپنی نشست سے اٹھ کر میرے پاس آئے اور چپکے سے تقریر ختم کرنے کے لیے کہا۔ میں واپس اپنی نشست پر آنے لگا تو مجمع بگڑ گیا "اور۔۔۔اور۔۔۔اور!"

"اب گاندھی جی۔۔۔" سیٹھ صدیق نے کچھ کہنا چاہا۔

میدان میں مگر وہ شور و غوغا تھا کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ سیٹھ صدیق نے پہلے میری طرف پھر گاندھی جی کی طرف بے بسی سے دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ اب اس بگڑے ہوئے مجمع کو آسانی سے نہیں سنبھالا جاسکے گا۔ سو میں بڑھا۔ میں نے پھر مائک سنبھال لیا۔ "دوستو! مجھے جو کچھ کہنا تھا' کہہ چکا۔ آخر میں صرف ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں' سو وہ بھی سن لو! آزادی اتنی آسانی سے حاصل نہیں ہوتی۔ کپڑوں کے اس ڈھیر میں آگ لگا کر تمہیں آزادی نہیں مل سکتی! آزادی حاصل کرنے کے لیے ہتھیار اٹھانے پڑتے ہیں' ظالم کے وہ ہاتھ کاٹنے پڑتے ہیں جن سے وہ ظلم کرتا ہے۔ تم نے کانگریس کے حالیہ ریزولیوشن پڑھے ہوں گے۔ ان ریزولیوشنوں میں ایک ریزولیوشن کی کمی ہے۔ آؤ آج ہم اس میدان میں اعلان کریں' آج سے ٹھیک اسی وقت سے جب کپڑوں کے اس ڈھیر میں پہلا شعلہ بھڑکے گا' ہم ہندوستان کے طول و عرض میں' چپے چپے میں فوج اور پولیس کی ملازمتوں کا بائیکاٹ کریں گے۔"

مجمع بڑی دیر تک نعرے لگاتا رہا۔ میں اپنی نشست پر آبیٹھا۔ اب گاندھی جی تقریر کررہے تھے۔ ان کی تقریر بڑی مختصر تھی لیکن ایسے پینترے سے کی گئی تھی کہ لوگوں کے ذہن سے میری تمام باتوں کا اثر شاید زائل ہوگیا تھا۔

گاندھی جی کہہ رہے تھے "ابھی تھوڑی دیر میں کپڑوں کے اس ڈھیر سے ایک شعلہ بھڑکے گا' دھواں اٹھے گا' آگ کی لپٹیں نکلیں گی اور اس شعلے کے ساتھ ہی ہماری غلامی کی بیڑیاں کٹ جائیں گی۔" اس کے بعد انہوں نے اسٹیج سے اتر کر

کپڑوں کے اس مینار کو آگ لگادی تھی۔

سو میں نے اس دن سب سے بڑی ہولی کو جلتے ہوئے دیکھا مگر اس وقت مجھے یہ احساس نہ تھا کہ اس دن تقریر کرکے میں نے اپنے لیے کیا کیا خطرات مول لے لیے تھے! اگر آج بھی اس ہولی میں شرکت کرنے والے کچھ لوگ زندہ ہیں تو انہیں یقیناً میری تقریر یاد ہوگی۔ وہ علی گڑھ کے اس طالب علم کو نہیں بھولے ہوں گے جس کی تقریر کے ہر ہر جملے پر انہوں نے فلک شگاف نعرے لگائے تھے اور جس کی زبان اس دن ان کے دل کی ترجمان بن گئی تھی اگرچہ میری تقریر کو اخبارات نے کوئی اہمیت نہیں دی تھی بلکہ بعض اخبارات نے تو سرے سے میری تقریر کا ذکر ہی نہیں کیا تھا البتہ کچھ اخبارات نے میرے بعض جملوں کو گاندھی جی سے منسوب کرکے رپورٹ کیا تھا۔ گاندھی جی نے تقریر شروع کرتے ہوئے کہا تھا "میں اس نوجوان کی بیشتر باتوں سے اتفاق کرتا ہوں" یہ بڑا محتاط جملہ تھا اگر وہ میری پوری تقریر سے اتفاق کرجاتے تو اخبارات میری تمام تقریر ان سے منسوب کردیتے حالانکہ یہ مس رپورٹنگ ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ بعض اخبارات نے میرے جو جملے گاندھی جی سے منسوب کیے تھے، وہ صرف اس دن کے واقعے، یعنی بدیسی کپڑوں کے بائیکاٹ سے متعلق تھے۔

اخبارات کے مقابلے میں سی آئی ڈی کے لوگوں نے میری تقریر کا ایک ایک لفظ نوٹ کیا تھا۔ اخبارات نے تو اس تقریر کو اس لیے اہمیت نہ دی کہ یہ تقریر ایک غیر معروف اور گمنام شخص نے کی تھی لیکن سرکاری مشنری میری اس تقریر کو ہضم نہ کرسکی۔ اس وقت مجھے اس بات کا قطعی احساس نہ تھا۔ بہرحال اس تقریر کا مجھے یہ فائدہ ہوا کہ میں ایک ہی دن میں کلکتے کے سیاسی حلقوں کا جانا پہچانا آدمی ہوگیا۔ سیاسی کارکنوں اور رضاکاروں میں میری دھوم مچ گئی۔ ایک تو سیٹھ صدیق کے تعارفی جملے پھر میری تقریر اور ایسا موقع کہ جب کلکتے اور ہندوستان کی تمام سیاست دھرم تلے کے میدان میں سمٹ آئی تھی، میں اسی لیے جانی پہچانی شخصیت بن گیا۔

جب گاندھی جی بدیسی کپڑوں کی ہولی پھونک رہے تھے اور تمام لیڈران کے گرد جمع تھے تو سیٹھ صدیق لپک کر میرے پاس آئے اور صرف اتنا کہا "آج شام کو مجھ سے ضرور ملنا! میں تمہارا انتظار کروں گا۔"

"مگر—" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

"آج شام ضرور ملنا!" سیٹھ جی نے تاکید کی "تم نے اپنے لیے پریشانیاں مول لے لی ہیں اگر مجھے معلوم ہوتا کہ تم میں اتنی آگ اور زہر بھرا ہوا ہے تو میں کبھی تمہیں تقریر کرنے کے لیے نہ بلاتا مگر اب کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ بہرحال آج شام ضرور ملنا، شام چار بجے کے بعد میں تمہارا منتظر رہوں گا۔ میں اپنے دوست سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا" ان کا اشارہ مجاہد اوّل کی طرف تھا پھر وہ وہیں چلے گئے جہاں گاندھی جی دوسرے لیڈروں کے ساتھ کھڑے تھے۔

بدیسی کپڑوں کا الاؤ خوب بھڑک اٹھا تھا اور گاندھی جی دوسرے لیڈروں کے ساتھ واپس جارہے تھے۔ میں، فاطمہ اور جوگیندر اس وقت سیاسی کارکنوں اور رضاکاروں کے درمیان گھرے کھڑے تھے۔ ہر شخص مجھ سے تعارف چاہتا تھا۔ میرے شانے ہاتھ ملاتے ملاتے تھک گئے۔ وہ مجھ سے مختلف نوعیت کے سوالات کررہے تھے۔ "آپ کیا کرتے ہیں؟ کیا علی گڑھ ہی کے رہنے والے ہیں یا صرف وہاں تعلیم حاصل کررہے ہیں؟ کس تحریک سے متعلق ہیں؟ کس قسم کی جدوجہد کے قائل ہیں؟"

میں انہیں گول مول جواب دے رہا تھا۔ سیٹھ صدیق کے اس جملے کے بعد کہ میں نے اپنے لیے بہت سی پریشانیاں مول لے لی ہیں، میں بہت محتاط اور چوکنا ہوگیا تھا۔ اس مرحلے پر صابر فرشتۂ رحمت بن کر آگیا۔ وہ مجھے ان لوگوں کے نرغے سے نکال لایا۔ ہم اس کے ساتھ باہر آئے اور ایک کار میں وہاں سے جوگیندر کی کوٹھی کے لیے روانہ ہوگئے۔ کار اور ڈرائیور کا بندوبست سیٹھ صدیق کے ایما پر صابر نے کیا تھا۔

راستے میں صابر نے مجھے بتایا تھا کہ اس وقت جب مجھے لوگوں کے نرغے سے نکال کر لایا تھا تو میرے گرد سی آئی ڈی کے کئی افراد موجود تھے۔ غنیمت یہ تھا کہ اس شہر کی سی آئی ڈی کے پاس میرا سابقہ ریکارڈ موجود نہیں تھا، نہ یہ علم تھا کہ میں ہندوستان کے صوبہ پنجاب میں پولیس کو مطلوب ہوں، نہ وہ لوگ میری حقیقت سے واقف تھے ورنہ مجھے فوراً گرفتار کرلیا جاتا۔

یہ بات تو میرے لیے پریشان کن نہیں تھی کہ پولیس یا خفیہ کے لوگ پنجاب کی طرح بنگال میں بھی میرے پیچھے لگ جائیں گے۔ میری پریشانی کی نوعیت بالکل مختلف تھی۔ ہماری تنظیم کی سخت ہدایت تھی کہ کارکنوں کو اپنی تمام زندگی میں کسی سیاسی پارٹی سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہیے کیوں کہ ہماری تنظیم کو آگے چل کر ہندوستان کی فوج آزادی کی شکل اختیار کرنا تھی اور میں نے کلکتے میں ایک سیاسی اسٹیج سے تقریر کی تھی جس پر تنظیم کے بڑے مجھ سے پوچھ گچھ بھی کرسکتے تھے۔ تنظیم کے چند ارکان کے سوا جو پہلے ہی خلافت تحریک کے رکن تھے، کسی رکن کا بھی سیاست سے براہِ راست تعلق نہیں تھا۔ یہ ارکان بھی تنظیم کے احکام کی پابندی پہلے کرتے تھے، ان کی سیاسی حیثیت تنظیم کی رکنیت کے بعد ثانوی رہ گئی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ مجھ سے نادانستگی میں جو غلطی ہوگئی ہے، تنظیم اس پر مجھے رکنیت سے معطل بھی کرسکتی ہے اور معطلی کا مطلب میں اچھی طرح سمجھ چکا تھا۔ اس کا صرف اور صرف مطلب بلیک وارنٹ تھا، یعنی موت! آج تک کبھی ایسا ہوا تو نہیں تھا کہ کسی رکن کو معطل کیا گیا ہو اس لیے کہ ہماری تنظیم ابھی نئی نئی تھی۔ اس کے ساتھ میں یہ بھی جانتا تھا کہ جب بھی اس قسم کی کوئی تنظیم بنتی ہے، کم از کم ابتدائی مراحل میں اس کے قوانین اور اصول و ضوابط کی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔

میں اسی پہلو پر غور کررہا تھا کہ جوگیندر کی کوٹھی آگئی۔ ہم ٹالی گنج پہنچ چکے تھے۔ صابر خود بھی ہمیں چھوڑنے ساتھ آیا تھا۔ وہ ہمیں کار سے اتار کر واپس چلا گیا۔

صابر کے جاتے ہی جوگیندر نے پوچھا "کیوں شاہین، تم چپ چپ سے کیوں ہو؟ کیا خفیہ والوں کے بارے میں جان کر پریشان ہوگئے؟"

"نہیں، یہ کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے" میں نے جواب دیا "ہماری جدوجہد کا جو رخ ہے، اس میں ہمارا مقابلہ فوج، پولیس اور خفیہ ہی سے ہوگا۔"

"پھر پریشانی کی کیا وجہ ہے؟" جوگیندر نے پوچھا "کوئی تو بات ہوگی نا!"

"پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ مجھ سے ایک حماقت ہوگئی ہے" میں نے کہا "سیاسی جلسے میں تقریر کرکے میں نے تنظیم کا ایک اصول توڑ دیا ہے۔ تنظیم کی طرف سے ہم پر پابندی ہے کہ کسی بھی سیاسی جماعت سے کوئی تعلق نہ رکھیں اور تنظیم کا رکن ہونے کی حیثیت سے تم بھی یہ بات جانتے ہو۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاہین! مگر اس کی ذمے داری تم پر عائد نہیں ہوتی۔ تمہیں تو تقریر کرنے پر مجبور کیا گیا تھا پھر وہ موقع بھی ایسا نہ تھا کہ تم انکار کرسکتے" جوگیندر نے گویا تاویل پیش کی "ویسے بھی تم نے کانگریس کے اسٹیج سے کانگریس ہی کی مخالفت کی ہے۔ تم نے کانگریس کی پالیسی سے تو اتفاق نہیں کیا۔"

"یہ سب کچھ درست سہی مگر مجھ سے حماقت تو ہوہی گئی ہے۔"

"پھر ہوگا کیا؟" فاطمہ بول اٹھی۔

"مجھے سزا دی جائے گی" میں نے جواب دیا۔

"سزا؟" فاطمہ نے حیرت سے کہا "کس قسم کی سزا؟"

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم، سزا کا فیصلہ تنظیم کے بڑے کریں گے" میں جواب میں بولا "خیر دیکھا جائے گا۔ آدمی کو اپنی حماقت کا نتیجہ تو بھگتنا ہی پڑتا ہے۔" میں نے ماحول کی سنجیدگی ختم کرنا چاہی تھی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ انہیں اپنی حماقت کی سزا اور نوعیت بتاؤں۔

"مگر شاہین!" فاطمہ نے کہا "تم نے بھی حد کردی تھی۔ اتنی سخت تقریر تو ہندوستان میں مولانا محمد علی جوہر کے سوا کوئی کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ مجھے تو یوں لگ رہا تھا جیسے تمہارے اندر مولانا جوہر کی روح حلول کرگئی ہے۔"

"ہاں یہ بات تو مجھے بھی محسوس ہوئی تھی" جوگیندر نے بھی اپنی بہن کے خیال سے اتفاق کیا "سیٹھ صدیق ٹھیک ہی کہہ رہے تھے، تمہاری تقریر بہت زہریلی تھی۔ عام گفتگو میں تو پتا نہیں چلتا کہ تم اتنے آتش نفس اور شعلہ بیاں مقرر بھی ہوسکتے ہو۔ تمہارے اندر واقعی بہت زہر بھرا ہوا ہے۔"

"یہی زہر اس غلام ملک کے لوگوں کی غلامی کا تریاق ہے میرے دوست!" میں نے کہا۔

میں اور جوگیندر اس روز ٹھیک چار بجے شام سیٹھ صدیق کی کوٹھی پر پہنچ گئے تھے۔ فاطمہ ہمارے ساتھ نہیں تھی۔ وہ اپنے والد سیٹھ سوہن لال کے ساتھ کہیں گئی ہوئی تھی۔

سیٹھ صدیق برآمدے ہی میں ہمارے منتظر تھے۔ پریشانی ان کے چہرے سے عیاں تھی "آؤ آؤ!" انہوں نے ہمیں دیکھتے ہی کہا "میں تمہارا ہی انتظار کررہا تھا" پھر وہ ہمیں اسی کمرے میں لے آئے جہاں گزشتہ روز ہماری ملاقات ہوئی تھی۔ انہوں نے ملازم کو ہدایت کردی تھی کہ اگر کوئی ملنے آئے تو اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر اس سے انتظار کرنے کے لیے کہہ دے۔ ملازم چلا گیا تو انہوں نے مجھے مخاطب کیا "تم نے مجھے پریشانیوں میں مبتلا کردیا ہے شاہین!"

"میں شرمندہ ہوں" میں بولا "مگر اس میں میرا قصور نہیں ہے۔"

"تمہیں شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں" سیٹھ جی نے کہا "غلطی میری ہی تھی کہ تمہیں تقریر کی دعوت دے بیٹھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ میں کلکتے میں تمہارے تحفظ کا انتظام کروں، تمہیں مدد فراہم کروں مگر میں نے تمہیں الٹا خطرات

میں ڈال دیا ہے اور اپنے لیے بھی پریشانیاں مول لے لی ہیں۔"

"پھر آپ کو مجھے یہاں نہیں بلانا چاہیے تھا۔ میں اپنی ذات کو اپنے کسی بہی خواہ کے لیے مصیبت کا باعث نہیں بنانا چاہتا" میں بولا۔

"احمقانہ باتیں مت کرو!" سیٹھ جی کہنے لگے "میری پریشانیوں کا تعلق دوسرے معاملے سے ہے۔ کانگریس کے بعض اہم لیڈر مجھ سے ناراض ہیں کہ میں نے کل کے ایک لونڈے سے بھرے جلسے میں ان کی کرکری کرادی ہے۔ گاندھی جی بہت برہم تھے۔ میں نے انہیں بہت سمجھایا ہے لیکن وہ میری بات سننے ہی کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میں نے جان بوجھ کر ایسا کیا ہے کیوں کہ کانگریس نے خلافت کانفرنس کے کراچی ریزولیوشن کی حمایت نہیں کی۔"

"اگر بات یہ بھی ہے تو بھی کیا غلط ہے؟" جوگیندر نے گفتگو میں حصہ لیا "کانگریس نے ایسا نہ کرکے بہت بددیانتی کی ہے۔"

"بہرحال شاہین!" سیٹھ جی بولے "تم بہت خطرات میں گھر چکے ہو۔ خفیہ والوں نے تمہاری تقریر کا ایک ایک لفظ نوٹ کیا ہے۔"

"مجھے بھی معلوم ہے جناب! اور میں اس صورتِ حال سے پریشان نہیں ہوں" میں نے جواب دیا۔

"مگر تمہیں ایک اور خطرہ بھی ہے" سیٹھ صدیق نے بتایا "اس کا تعلق پولیس یا حکومت کے کسی اور محکمے کی طرف سے نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے تمہیں سزا دینے کے احکام بھی جاری کردیے گئے ہوں۔ اب اسی لیے تمہیں دو طرف سے ہوشیار رہنا پڑے گا۔"

"یہ دوسرا دشمن کون ہے؟" میں نے پوچھا۔

"یہ مجھے بھی معلوم نہیں" سیٹھ صدیق نے کہا "اس کے بارے میں ابھی تھوڑی دیر پہلے تک مجھے کچھ علم نہیں تھا۔ تمہاری آمد سے کچھ دیر ہی قبل مجھے اطلاع ملی تھی۔ یہ دیکھو!"

سیٹھ صدیق نے وہ کاغذ میری طرف بڑھا دیا جو ان کے ہاتھ میں تھا۔ میں نے وہ کاغذ کھول کر پڑھا۔ یہ ایک خط تھا۔ خط لکھنے والے نے اپنا نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ پیغام صرف اتنا تھا "سیٹھ جی! اگر آپ علی گڑھ کے طالب علم شاہین صاحب کی قیام گاہ سے واقف ہیں تو انہیں بتادیں کہ ان کی جان خطرے میں ہے۔ بعض لوگ ان کی آج کی تقریر کے بعد انہیں ٹھکانے لگانے کی باتیں کررہے ہیں۔ ہوسکتا ہے اب تک ان کے قتل کا فیصلہ بھی کردیا گیا ہو۔"

"مگر یہ لوگ کون ہوسکتے ہیں جو میری تقریر سے اتنے برافروختہ ہوگئے ہیں" میں نے دریافت کیا۔

"یہ بات میرے لیے بھی پریشان کن ہے" سیٹھ جی بولے "یہ پہلا موقع ہے کہ مجھے اس قسم کی اطلاع ملی ہے۔ بہرحال میں نے صبح تم سے یہاں آنے کے لیے صرف اس بنا پر کہا تھا کہ تمہارے واسطے کسی ایسی جگہ کا بندوبست کردوں جہاں تم پولیس اور خفیہ کے چھاپے سے بے نیاز ہوکر ٹھہر سکو۔ میں نے اس کا انتظام کرلیا ہے۔"

"میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں جناب!" میں نے کہا "اب میں اپنے بچاؤ کا خود ہی انتظام کروں گا۔ میں اپنے اصولوں سے انحراف نہیں کرسکتا" میرے لیے سیٹھ جی کی پیش کش منظور کرنا ممکن نہیں تھا۔ تنظیم کی ہدایت تھی کہ خطرات میں بھی کسی سے مدد نہ لو۔ خطرات میں ہمارے بہترین محافظ ہمارے تنظیمی ساتھی ہی ہوسکتے ہیں لہٰذا اس وقت جب حالات خطرناک ہوں، کسی سے مدد یا تعاون حاصل نہیں کرنا چاہیے، خواہ وہ کوئی قریبی عزیز یا رشتے دار ہی کیوں نہ ہو۔

"میں تمہاری طرف سے بہت پریشان ہوں" سیٹھ جی واقعی فکرمند نظر آرہے تھے "میں اپنے دوست سے شرمندہ ہونا نہیں چاہتا" دوست سے مراد مجاہد اوّل ہی تھا۔

"آپ فکر نہ کریں جناب!" میں نے انہیں تسلی دی "یہ خطرات ہی تو ہماری زندگی ہیں۔ ہم ان سے نمٹنا جانتے ہیں۔ آپ کا یہی بہت کرم ہے کہ آپ نے مجھے دوسرے خطرے سے قبل از وقت ہی آگاہ کردیا۔ آپ نہ بتاتے تو میں اس کی طرف سے لاعلم ہی رہتا اور انجانے میں نقصان اٹھا سکتا تھا۔"

"ٹھیک ہے" سیٹھ صدیق نے طویل سانس لیا "اپنی حفاظت کرنا، تمہاری زندگی بہت قیمتی ہے" پھر انہوں نے اپنی جیب سے ایک لفافہ نکالا۔ لفافے میں نوٹ بھرے ہوئے تھے "یہ رکھو، شاید تمہیں اس کی ضرورت پڑے۔"

میں نے نہایت خوب صورتی کے ساتھ وہ لفافہ لینے سے انکار کردیا۔ مجھے رقم کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کے بعد ہم وہاں سے چلے آئے تھے۔

باہر آتے ہی جوگیندر نے پوچھا "اب کیا پروگرام ہے شاہین؟"

"میں آج ہی رات تمہارے گھر سے کہیں اور منتقل ہوجاؤں گا" میں نے جواب دیا "اب میرا وہاں رہنا مناسب نہیں۔"

"جاؤ گے کہاں؟" جوگیندر بولا "اس شہر میں تم بالکل نئے ہو، مناسب سمجھو تو مجھے بتادو۔"

"کیا بات کرتے ہو جوگیندر!" میں نے جواب دیا "میں تم پر اتنا ہی اعتماد کرتا ہوں جتنا اعتماد خود پر کرسکتا ہوں۔ میں تمہیں خود سے علیحدہ نہیں سمجھتا۔ آیندہ ایسی بات نہ کرنا۔ سنو! میں تمہارے گھر سے موسیٰ سیٹھ کے مسافر خانے جاؤں گا، رات کے وقت سب سے چھپ کر!"

"مگر میرے ذہن میں ایک اور ترکیب ہے" جوگیندر نے کہا "تمہیں ہمارے گھر سے چھپ کر نہیں جانا چاہیے۔ تمہیں دن دہاڑے جانا چاہیے اور آج نہیں کل جانا چاہیے تاکہ کسی کو شبہ بھی نہ ہو، تمہیں خطرے کا احساس ہوگیا ہے۔ میں تمہارے لیے ٹھہرنے کا ایسا انتظام کرسکتا ہوں کہ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوسکتا۔ وہ میرا دوست ہے۔ ایک نظریاتی شخص ہے وہ! کل دن میں تم ہماری کوٹھی سے اسی کے گھر چلے جانا پھر رات کو کسی وقت چھپ کر کوٹھی واپس آجانا۔ اس طرح تم ہماری کوٹھی سے چلے جانے کے باوجود بھی ہماری ہی کوٹھی میں رہو گے۔"

جوگیندر کی تجویز اچھی تھی۔ اس طرح دشمنوں کو دھوکے میں رکھا جاسکتا تھا۔ میں اس پر راضی ہوگیا۔ سیٹھ صدیق کی کوٹھی سے نکل کر میں نے اپنے اردگرد یوں دیکھا جیسے میں اس دنیا پر الوداعی نظر ڈال رہا ہوں اور مجھے اس دنیا کو دوبارہ دیکھنے کا موقع نہیں ملے گا۔

"گھر چلنا ہے یا گھومو گے؟" جوگیندر نے کار میں بیٹھنے کے بعد دریافت کیا۔

"ذرا گھوم ہی لیں" میں نے کہا "وکٹوریہ میموریل کی طرف چلو، وہ جگہ مجھے اچھی لگی تھی۔ ویسے بھی شام کا وقت ہے، وہاں رونق ہوگی۔"

جوگیندر نے کار اسٹارٹ کردی۔

اس رات جب ہم شہر کی سیر کرکے واپس کوٹھی پہنچے تو عجیب صورتِ حال ہماری منتظر تھی۔ سیٹھ موہن لال بڑی بے قراری سے لان میں ٹہل رہے تھے۔ جیسے ہی کار کوٹھی کے احاطے میں داخل ہوئی، لپک کر کار کی طرف آئے "جوگیندر۔ جوگیندر!" وہ اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکے اور بے قراری سے اپنے ہاتھ ملنے لگے۔ گھر کے دونوں ملازم برآمدے میں کھڑے ہوئے تھے۔

سیٹھ موہن لال کے لہجے میں ایسی ہی کوئی بات تھی کہ میں سمجھ گیا، کوئی بہت ہی پریشان کن واقعہ رونما ہوچکا ہے۔

جوگیندر تیزی سے باہر آیا اور میں بھی کار سے اتر گیا۔

"ادھر آؤ!" سیٹھ موہن لال کوٹھی کی طرف بڑھ گئے۔ جوگیندر اور میں ان کے پیچھے پیچھے تھے۔

مجھے احساس بھی نہیں تھا کہ وہ لوگ جو میری جان کے دشمن ہوگئے ہیں، اتنی جلدی حرکت میں آجائیں گے۔ انہوں نے فاطمہ کو اغوا کرلیا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ اگر میں خود کو ان کے حوالے کردوں تو وہ فاطمہ کو چھوڑ دیں گے۔

فاطمہ کے اغوا کا واقعہ بہت مختصر تھا۔ سیٹھ موہن لال، فاطمہ کے ساتھ رات آٹھ بجے کوٹھی واپس آئے تھے۔ ابھی ان کا دوست انہیں کار سے اتار کر گیا ہی تھا کہ ان کی کوٹھی کے پھاٹک سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی ہوئی کار کے پاس سے تین نوجوان ان کی طرف بڑھے۔ اس کار کے پاس دو افراد اور اس طرح کھڑے تھے جیسے وہ کار کی کوئی خرابی دور کررہے ہوں۔ ان کے پاس آنے والے نوجوانوں میں سے ایک کے ہاتھ میں پستول تھا۔

"ادھر آجایئے سیٹھ صاحب! اور دیوی جی آپ بھی!" پستول والے نوجوان نے اشارہ کیا اور پھر دو نوجوان ان کے دائیں بائیں آگئے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے فاطمہ کو کار میں بٹھایا تھا۔ پستول والا نوجوان اور اس کا ایک ساتھی وہیں رہ گیا۔ انہوں نے سیٹھ موہن لال سے کہا کہ اگر آج رات تک آپ نے علی گڑھ کے اس طالب علم شاہین کو جو آپ کے یہاں ٹھہرا ہے، ہمارے حوالے کردیا تو ہم آپ کی بیٹی کو رہا کردیں گے۔ یہ دھمکی دیتے ہوئے وہ دونوں چلے گئے تھے "سیٹھ جی! شور مچانے یا ہنگامہ کرنے کی ضرورت نہیں اگر آپ نے ایسا کیا تو ہمارے ساتھی آپ کی بیٹی کو گولی ماردیں گے۔ اب آپ اپنی کوٹھی میں جایئے اور اطمینان سے بیٹھیے۔ ہم رات کو دو بجے آئیں گے اگر آپ نے کسی چالاکی کے بغیر اپنا مہمان ہمارے حوالے کردیا تو پھر آپ کی بیٹی واپس مل جائے گی۔ پولیس کو خبر کرنے کی صورت میں بھی آپ کی بیٹی زندہ نہیں چھوڑی جائے گی اور اس کے قتل کی ذمے داری آپ پر ہوگی۔"

یوں میری زندگی، میری فاطمہ کو اغوا کرلیا گیا۔

"میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا جوگیندر!" سیٹھ موہن لال نے سارا واقعہ بیان کرنے کے بعد مضطرب لہجے میں کہا تھا "تم ہی بتاؤ میں کیا کروں؟"

"آپ مطمئن رہیں چاچا جی!" میں بول اٹھا "دو ہی گھنٹے کی تو بات ہے۔ دو گھنٹے کے بعد فاطمہ آپ کے پاس ہوگی" اس وقت رات کے بارہ بج کر دس منٹ ہوئے تھے۔

"میرا خیال ہے کہ ہمیں اس سلسلے میں پولیس کو اطلاع دے دینا چاہیے" جوگیندر نے رائے دی۔

"نہیں میرے دوست!" میں نے مداخلت کی "فاطمہ کو میری وجہ سے یرغمال بنایا گیا ہے۔ میں خود کو ان غنڈوں کے حوالے کروں گا۔"

"یہ بات میرے لیے ناقابلِ برداشت ہے" سیٹھ موہن لال نے کہا "ایسا نہیں ہو سکتا!"

"ایسا ضرور ہوگا" میں ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولا "یہ بات میرے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہے کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو کوئی تکلیف پہنچے۔"

ابھی جوگیندر کچھ کہنے والا تھا کہ ڈرائنگ روم کے دروازے پر ایک لمبا چوڑا، بڑی بڑی مونچھوں والا سیاہ فام شخص نمودار ہوا۔ اس کے چہرے سے بے رحمی اور سختی کا اظہار ہو رہا تھا۔

"تمہارے دونوں ملازم اس وقت ہمارے قبضے میں ہیں" اس خونخوار شخص نے بھاری آواز میں کہا پھر مجھ سے بولا "آیئے شاہین صاحب!"

"کون ہو تم؟" جوگیندر نے سخت لہجے میں اس شخص سے پوچھا۔

"یہ تو مجھے بھی نہیں معلوم" اس شخص نے دانت نکالتے ہوئے جواب دیا۔ سیاہ چہرے کی وجہ سے اس کے سفید دانت بڑے عجیب سے لگتے تھے "مجھے اتنا معلوم ہے کہ تمہاری بہن ہمارے قبضے میں ہے۔ بولو سودا کرتے ہو؟ اپنی بہن کے بدلے شاہین کو دے رہے ہو؟" وہ رکا "حیران ہو گئے تم کہ ہم اتنی جلدی اور وقت سے پہلے کس طرح آدھمکے! دراصل ہم یہاں سے گئے ہی نہیں تھے۔ ہم تو تمہاری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ دیر لگا کر ہم تمہیں کچھ سوچنے کا موقع کیوں دیتے!"

"میں تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہوں" میں بولا "سیتا دیوی کہاں ہیں؟" میں نے دانستہ فاطمہ کا سابق نام لیا تھا۔ وہ فاطمہ کو اسی حیثیت سے جانتے تھے اور انہیں یہ بتانا فضول ہی تھا کہ سیتا اب مسلمان ہو کر فاطمہ بن چکی ہے۔ مصلحت کے پیشِ نظر ابھی اس راز کو افشا نہیں کیا گیا تھا۔ جوگیندر اور سیٹھ موہن لال کے سوا گھر کے ملازمین بھی اس سے ناواقف ہی تھے۔

"بڑے جیالے ہو!" سیاہ فام شخص مسکرا کر بولا "تم میرے ساتھ چلے چلو! تمہارے اس کوٹھی سے نکلنے کے بعد [illegible] سیتا دیوی یہاں پہنچ جائیں گی۔"

میں صوفے سے اٹھا ہی تھا کہ جوگیندر نے بڑھ کر کہا "سنو شاہین! میری ایک بات سنو!"

"واپس آ کر سن لوں گا" میں اطمینان سے بولا۔ اسی وقت میں نے دروازے کے باہر ایک اور شخص کی جھلک دیکھی تھی۔

میں دروازے سے نکلا۔ وہاں ایک اور شخص پستول تانے کھڑا تھا۔ اس نے پستول کے اشارے سے مجھے آگے بڑھنے کے لیے کہا۔

"اگر تم میں سے کسی شخص نے شور مچایا یا اس گھر سے نکلنے کی کوشش کی تو ہم سیتا کو واپس نہیں کریں گے۔ تم کوٹھی سے باہر نہیں آؤ گے، البتہ دروازے پر کھڑے ہو کر سیتا کا انتظار کر سکتے ہو۔ گیٹ سے باہر قدم رکھا تو ہم پھر کہتے ہیں سیتا کو واپس نہیں کیا جائے گا۔ ہم اسے بھی اپنے ساتھ لے جائیں گے۔"

"فکر نہ کرو جوگیندر!" میں نے پلٹ کر کہا "زندہ رہا تو پھر ملاقات ہوگی۔"

سیٹھ موہن لال اور جوگیندر اب ڈرائنگ روم سے باہر برآمدے میں آ گئے تھے۔

"چلتے رہو!" پستول والے نے مجھے حکم دیا۔

جس وقت ہم گیٹ سے باہر آئے، میں نے جوگیندر اور موہن لال کو برآمدے سے اتر کر لان میں آتے دیکھا۔ گیٹ سے نکل کر ہم دائیں طرف بڑھے تھے۔ کوئی بیس قدم چلنے کے بعد ہم ایک درخت کے نیچے کھڑی کار کے پاس پہنچے۔ اسی وقت کار کا دروازہ کھلا۔ فاطمہ کار سے اتری۔ تاریکی کی وجہ سے اس کا چہرہ صاف نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور آدمی اترا تھا۔

اب پستول کا رخ فاطمہ کی طرف ہو گیا تھا "تمہاری ذرا سی غلط حرکت سے سیتا مر سکتی ہے" پستول والے نے سرد لہجے میں مجھے دھمکی دی۔

پھر فاطمہ کے ہاتھ کھول کر میرے ہاتھ باندھ دیے گئے۔ اس کے بعد فاطمہ کا منہ بھی کھول دیا گیا اور میرا منہ بند کر دیا گیا۔

"چلو اندر بیٹھو!" جس شخص نے میرے ہاتھ اور منہ باندھا تھا، اس نے مجھے کار کی طرف دھکا دیا۔ میں اس کے لیے تیار نہیں تھا، سو لڑکھڑا گیا پھر میں کار میں بیٹھ گیا۔

"جاؤ دیوی، جاؤ!" پستول والا فاطمہ سے بولا "جاؤ تمہارے پتا جی بہت پریشان ہیں۔"

"میں تمہارا انتظار کروں گی شاہین!" فاطمہ کی کپکپاتی

آواز میں جو کرب تھا، وہ میں نے اپنے دل کی گہرائی میں محسوس کیا۔

اسی دوران میں کار کا انجن جاگ اٹھا۔ پستول والا بھی میرے ساتھ کار میں آ بیٹھا۔ اب میں دو افراد کے درمیان بیٹھا تھا۔ اگلے لمحے کار حرکت میں آ چکی تھی۔

پھر میری آنکھوں پر بھی پٹی باندھ دی گئی تھی۔ کچھ پتا نہیں تھا کہ وہ لوگ مجھے کہاں لے جا رہے تھے۔ اس وقت میرے احساسات بہت عجیب تھے۔ مجھے ولسن کا اغوا یاد آ رہا تھا۔ آج مجھے خود اغوا کر لیا گیا تھا، یہ کیسی عجیب بات تھی! اگر فاطمہ کی زندگی کا سوال نہ ہوتا تو شاید میں اتنی آسانی سے قابو میں نہ آ گیا ہوتا۔

کار پندرہ بیس منٹ کے قریب چلتی رہی۔ راستے میں کسی نے کوئی بات نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں انہی لوگوں کے چکر میں پھنس چکا ہوں جن سے مجھے سیٹھ صدیق نے ہوشیار رہنے کی تاکید کی تھی مگر یہ بات میرے لیے پریشان کن تھی کہ آخر میرے دشمن کون ہیں؟ وہ کیوں میرے خون کے پیاسے ہو رہے تھے؟ جن دو افراد کو میں نے جوگیندر کی کوٹھی میں دیکھا تھا، وہ میرے لیے قطعی اجنبی تھے۔ زندگی کے کسی موڑ پر وہ میرے سامنے نہیں آئے تھے مگر مجھے خوشی تھی کہ میں نے خود کو ان لوگوں کے حوالے کر دیا تھا اور فاطمہ کو ان کے چنگل سے نجات دلا دی تھی۔ میں فاطمہ کو ہر مصیبت سے بچانے کے لیے ہر عذاب سے گزرنے کے لیے تیار تھا۔

کار رک گئی۔

"اترو!" کسی نے مجھ سے کہا۔ اس سے پہلے میرے دائیں جانب بیٹھا ہوا شخص کار سے اتر چکا تھا۔ یہ وہی تھا جس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

میں کار سے اتر آیا۔ اس کے بعد میرا ہاتھ پکڑ لیا گیا۔ ہم تقریباً تین منٹ تک چلتے رہے۔ اس دوران میں کئی جگہ مجھے مڑنا پڑا۔ وہ کوئی سنسان سا مقام لگتا تھا۔ ہم کسی سڑک یا پختہ فرش پر نہیں چل رہے تھے۔ ہمارے قدموں کے نیچے کچی اور ناہموار زمین تھی۔ چند موڑ سے گزرنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ میں کسی دروازے میں داخل ہو رہا ہوں۔ دروازے میں داخل ہو کر ہم شاید صحن سے گزرے تھے۔ یہ کچا صحن تھا پھر تین سیڑھیاں چڑھ کر پکا فرش آ گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد ہم شاید ایک کمرے میں آ گئے تھے۔ یہاں مجھے زور سے دھکا دیا گیا تھا۔

ذرا ہی دیر بعد مجھے ایک کرسی پر بٹھا کر میری ٹانگیں کرسی کے پیروں سے باندھ دی گئیں پھر میری کمر کے گرد بھی رسی باندھ دی گئی۔ اب میری کمر کرسی کی پشت سے بندھی ہوئی تھی۔ اس تمام کارروائی کے دوران میں کسی نے بھی کسی سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ سب کچھ نہایت خاموشی کے ساتھ میکانیکی انداز میں ہو رہا تھا۔

پھر میں نے کمرے سے واپس جاتے ہوئے قدموں کی آواز سنی۔ اس کے بعد دروازہ بھی بند کر دیا گیا۔

"چترجی!" میں نے ایک آواز سنی "تمہیں یہیں رہنا ہے۔ تم اس کی نگرانی کرو۔ استاد آتے ہی ہوں گے، ہمارا کام ختم ہو گیا ہے۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ میں حالات کی اس ستم ظریفی پر غور کر رہا تھا۔ اس کے باوجود کہ مجھے اس خطرے سے آگاہ کر دیا گیا تھا، میں بچ نہ سکا۔ یہ تمام اسکیم بہت تیزی اور نہایت ذہانت سے بنائی گئی تھی۔ وقت کا عنصر اس اسکیم کا سب سے اہم جزو تھا۔ پہلے انہوں نے سیٹھ موہن لال کو اس دھمکی کے ساتھ خاموش کر دیا تھا کہ اگر اس نے پولیس یا کسی اور کو اطلاع دی تو وہ فاطمہ کو ختم کر دیں گے پھر جب میں اور جوگیندر کوٹھی پہنچے تو انہوں نے اپنی اسکیم کے آخری اور فیصلہ کن مرحلے پر فوراً ہی عمل کیا تھا۔ انہوں نے دو بجے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔ یقیناً وہ اس عرصے میں کوٹھی کی نگرانی کرتے رہے ہوں گے۔

میں نے کرسی کی پشت سے سر ٹکایا اور دائیں کونے کی طرف جھکا پھر آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کو کرسی کے کونے سے ٹکا کر اوپر کی جانب جنبش دی۔ نتیجہ نہ قطعی مایوس کن تھا نہ قطعی حوصلہ افزا۔ آنکھوں کی پٹی ذرا سی سرکی تھی لیکن اب بھی میری آنکھیں بند تھیں۔ میں نے یہی عمل بار بار دہرایا اور میری یہ کوشش بار آور ثابت ہوئی۔ پٹی اب میری آنکھوں سے سرک چکی تھی مگر ناک کے بانسے پر آ کر رک گئی تھی مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔

وہ کمرا چھوٹا اور تاریک سا تھا۔ ایک کونے میں لمبی چمنی والا مٹی کے تیل سے جلنے والا لیمپ روشن تھا۔ لیمپ کی بتی کو اچھی طرح نہیں تراشا گیا تھا، اس لیے لو ایک طرف سے بڑھی ہوئی تھی اور لمبی چمنی اوپر تک کالی ہو گئی تھی۔ کمرے میں سامان بھی بہت مختصر تھا۔ چند ٹوٹی پھوٹی کرسیاں، ایک ست میز جس پر نہ معلوم کیا کیا الا بلا رکھا ہوا تھا۔ کمرے کے فرش پر سگریٹوں اور بیڑیوں کے ٹوٹے پڑے ہوئے تھے ہر چیز گرد آلود تھی۔

باہر سے کسی قسم کی کوئی آواز نہیں آ رہی تھی۔ کمرے

میں گھٹن تھی کیوں کہ اس میں کوئی روشندان یا کھڑکی نہیں تھی۔ میں نے جس طرح آنکھوں کی پٹی اتاری تھی اسی طرح منہ کی پٹی بھی اتارنے کی کوشش کی لیکن اس میں ناکام رہا۔

میں نے دو تین مرتبہ اپنے پیروں کو فرش پر جما کر کرسی کے پچھلے پیر اٹھائے اور انہیں زمین پر مارا۔ رات کے سناٹے میں یہ آواز بھی خاصی تھی۔

"اے بابو!" باہر سے آواز آئی "کیا گوزبوز (گڑبڑ) کرتا ہے" آواز قدرے نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

میں نے کرسی کے پچھلے پیر پھر فرش پر مارے۔ دوبارہ وہی آوازیں ہوئیں۔ اس مرتبہ ردِ عمل بھی مختلف تھا۔ دروازہ کھلا' ایک پستہ قد شخص اندر آیا اور دو قدم چل کر ہی رک گیا۔

"اے بابو!" وہ حیرت سے بولا "سالا لوگ' یہ کیا کیا توم (تم) نے! یہ پٹی کیسے اتارا آنکھوں سے؟"

میں نے زور سے سر ہلا کر اسے پاس آنے کا اشارہ کیا۔

"کھاموس! استاد آئیں گا اور تمہارا موئی نکالیں گا" یہ کہہ کر پستہ قد پھر باہر چلا گیا۔ دروازہ اس نے بند کردیا تھا۔ میں نے کنڈی لگانے کی آواز سنی تھی۔ گویا اس وقت مکان میں کوئی اور نہیں تھا مگر یہ بات معلوم ہوجانے سے بھی مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ میں قطعی بے بس تھا پھر میں نے تمام کوششیں ترک کردیں۔ پیروں پر اور سینے پر رسی کی بندشیں بہت سخت اور مضبوط تھیں۔

اب میں اس کرسی پر بے بسی کے عالم میں بیٹھا تھا۔ میری آنکھیں بند تھیں اور سر کرسی کی پشت سے ٹکا ہوا تھا۔ میں اپنی زندگی کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ ماضی کے واقعات تیزی سے یکے بعد دیگرے میرے ذہن میں آرہے تھے۔ مجھے بخت خاں کا خیال بھی آیا۔ خدا معلوم وہ ابھی اس شہر میں ٹھہرا ہوا تھا یا مہم کی منسوخی کے بعد مجاہدِ اوّل کے حکم پر اس شہر سے کہیں اور چلا گیا تھا پھر میرے خیالات اس نقطے پر مرتکز ہوگئے کہ مجھ سے دشمنی رکھنے والے یہ لوگ کون ہوسکتے ہیں؟ مگر اس وقت یہ سوچنا بھی بے سود تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھے' جلد ہی سامنے آنے والے تھے۔ اس کے بعد میرے خیالات کی رو فاطمہ کی طرف مڑگئی۔

میں اس وقت فاطمہ کے خیالوں میں گم تھا۔ نہ معلوم کیا وقت ہوا ہوگا کہ میں چونک اٹھا۔ کمرے کے باہر ایک دم کئی آوازیں ابھری تھیں۔ وہ کئی افراد تھے۔ دروازہ پُرشور آواز کے ساتھ کھلا۔ کمرے میں سب سے پہلے جو شخص داخل ہوا' وہ بہت لمبا سا تھا۔ اس کے بازوؤں کی مچھلیاں ابھری ہوئی تھیں' جسم کسرتی' سینہ چوڑا' بال چھوٹے چھوٹے گھنے اور گھنگریالے تھے۔ طویل قامتی کی وجہ سے وہ دبلا پتلا معلوم ہوتا تھا لیکن معاملہ اس کے برعکس تھا۔ اس کے چہرے پر کرختگی اور درشتی برس رہی تھی۔ اس کے پیچھے تین افراد اور تھے۔ یہ بھی شکل و صورت سے بدمعاش اور غنڈے معلوم ہوتے تھے مگر ان سب میں نمایاں شخصیت اسی لمبے تڑنگے شخص کی تھی۔ پستہ قد شخص اب بھی دروازے میں کھڑا تھا۔

"واہ بیٹا!" طویل قامت شخص نے کہا "آنکھوں کی پٹی کھول لی!"

میں نے حقارت سے اسے دیکھا اور دیکھتا رہا کہ اس کے سوا میرے بس میں اور تھا بھی کیا!

"تھوبڑا کھولو اس کا!" طویل قامت شخص نے مڑ کر حکم دیا۔

طویل قامت شخص ان کا گرو تھا' استاد تھا۔ ایک شخص یہ کہتا ہوا میری طرف بڑھا "ابھی لو استاد!"

ذرا ہی دیر میں میرے منہ کی پٹی کھل گئی۔ میں نے دو تین گہرے سانس لیے۔ اب میں ہر صورت سے گزرنے کے لیے ذہنی طور پر تیار تھا۔ ان کے ارادے خطرناک لگتے تھے۔

"کون ہے بے تو؟" استاد نے چھوٹتے ہی مجھ سے سوال کیا تھا۔ میرا منہ اسی لیے کھولا گیا تھا کہ میں اس کے سوالوں کے جواب دے سکوں۔

"شاہین" میں نے جواب دیا۔

"پورا نام بتا!" استاد نے غصے سے پوچھا' پھر وہ دو قدم اور آگے آگیا۔ اب وہ مجھ سے ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھا۔

"شاہین خان!" میں نے یوں ہی "خان" کا اضافہ کردیا۔ مقصد اسے مطمئن کرنا تھا ورنہ میرا تنظیمی نام صرف شاہین ہی تھا۔

"کہاں سے آیا ہے؟" استاد کا انداز وکیلوں کی جرح کا سا تھا۔ وہ اس وقت شاید خود کو عرشِ معلی پر تصور کررہا تھا۔

"علی گڑھ سے" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کل تو سیٹھ صدیق سے کیوں ملا تھا؟" وہ دائیں جوتے کی ایڑی پر گھوم گیا۔

تو کیا اس ڈرامے کا ہندوستان کی سیاست سے بھی کوئی تعلق ہے؟ میں نے سوچا' پھر بولا "ایک پیغام پہنچایا تھا انہیں۔"

"کیا پیغام تھا؟" استاد نے پھر سوال کیا۔

"مجھے نہیں معلوم۔"

"ابے کیوں جان کا لاگو ہوا ہے' بتا دے سیدھے سے" استاد کے ایک چمچے نے کہا "تو نے استاد کا غصہ نہیں دیکھا۔"

"میں سچ کہہ رہا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم۔"

ابھی میرا جملہ مکمل ہوا تھا کہ استاد کا زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ تھپڑ اچانک ہی مارا گیا تھا۔ میں اس کے لیے تیار نہ تھا۔ میری زبان دانتوں میں آکر کٹ گئی۔

"کنجر کی اولاد!" استاد نے مجھے تھپڑ مارنے کے بعد گالی دی۔

"میں سچ کہہ رہا ہوں" میں نے پھر کہا "مجھے سیٹھ جی کو ایک خط پہنچانا تھا۔ یہ خط لفافے میں بند تھا" جلدی جلدی میں نے پوری بات بتادی۔

"مہاتما جی کے خلاف کیوں بولا تھا آج؟" استاد نے اس بار خلافِ توقع ایک سوال کیا۔

"وہ میرے اپنے خیالات تھے" میں بولا۔

"ابھی دیکھے گا تمہارے خیالات!" استاد نے منہ بگاڑ کر کہا "بڑا آیا خیالات والا!" اس کا تھپڑ پہلے سے بھی زیادہ زوردار تھا۔ "کس نے بولا تھا ایسا کرنے کو؟"

میں نے اپنے منہ میں خون کا ذائقہ محسوس کیا۔ کم بخت کے ہاتھ بہت ہی سخت تھے۔ میں نے فرش پر خون تھوکتے ہوئے جواب دیا "کسی نے نہیں۔"

"پھر جھوٹ بولتا ہے!" اس مرتبہ اس کی ٹانگ گھومی تھی۔ جوتے کی نوک میری ٹھوڑی پر پڑی تھی۔ ضرب اتنی شدید تھی کہ کرسی الٹ گئی۔ میرا سر زور سے فرش سے ٹکرایا۔ "اسے اٹھاؤ!" استاد کی آواز ابھری۔ میری کھوپڑی میں بے شمار پھلجھڑیاں چٹ پٹ کرکے چھوٹ رہی تھیں۔

کرسی سیدھی کردی گئی۔ سر کے پچھلے حصے پر چوٹ کچھ شدید آئی تھی۔ کمرا مجھے ایک مرتبہ دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گھومتا محسوس ہوا۔ چند لمحے بعد ہر چیز اپنی جگہ ٹھہر گئی۔

"ابھی جلدی بول دے' سچ سچ! کیوں اپنی جان کا دشمن بنا ہے!" استاد کے اس چمچے نے کہا جس نے مجھے کرسی سمیت فرش سے اٹھایا تھا۔

"میں سچ بول رہا ہوں' اس میں ذرا بھی جھوٹ نہیں ہے" میں جلدی سے بولا "میں نے کسی کے کہنے پر گاندھی جی کے خلاف تقریر نہیں کی تھی۔"

"گاندھی جی مت بول!" استاد چیخا "مہاتما جی بول!" اس کے لہجے میں بلا کی سفاکی تھی۔

جو کچھ ہو رہا تھا میرے لیے غیر متوقع تھا۔ یہ سب کچھ سیاسی بنیادوں پر ہو رہا تھا۔ یہ ان لوگوں کا عقوبت خانہ تھا جنہیں مہاتما گاندھی اہنسا کی تلقین کررہے تھے مگر انسان کے اندر چھپا ہوا وحشی درندہ کبھی مرا ہے! اسے جب بھی موقع ملا ہے پوری قوت سے سامنے آیا ہے۔ کبھی اس درندے نے ہلاکو کا نام پایا ہے۔ کبھی چنگیز خاں کا' کبھی ہٹلر اور کبھی بے رحم آمروں کا اس نے روپ دھارا ہے۔

"تو نے سب کچھ سیٹھ صدیق کے کہنے پر کیا ہے" اس مرتبہ استاد نے سوال نہیں کیا تھا بلکہ اپنی طرف سے ایک مفروضہ بیان کیا تھا "ہم سب جانتا ہے بیٹا!"

"یہ غلط ہے' جھوٹ ہے!" میں نے زور سے کہا "مجھ سے کسی نے ایسا کرنے کے لیے نہیں کہا تھا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا' وہ میری سوچ ہے' میرے ساتھیوں کی سوچ ہے!" میں جلدی جلدی کہہ رہا تھا۔ میں اس تاثر کو مٹانا چاہتا تھا جو نہ معلوم کیسے ان کے ذہن میں پیدا ہوگیا تھا!

"پھر جھوٹ!" استاد نے پھر طمانچہ مارا۔

"ارے کیوں اڑی کرتا ہے!" ایک اور چمچے نے کہا "استاد کا مِجّ بہت کھراب ہے' ہاں۔"

"میں جھوٹ نہیں کہہ رہا" میں بولا "سیٹھ صدیق نے مجھ سے کچھ نہیں کہا تھا۔"

"یہ سمجھتا ہے' ابھی استاد کو کچھ پتا نہیں" استاد نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا "سیٹھ صدیق نے کل تیرے سے ملنے کے بعد تیری بڑی تعریف کی تھی پھر تو نے آج مہاتما جی کے خلاف بولا۔"

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہاں تقریر کرنا ہوگی" میں تیزی سے بولا "تم لوگوں کو کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔"

"تجھے تقریر نہیں کرنی تھی تو اوپر اسٹیج پر کیوں بیٹھا تھا؟ وہاں تجھے صدیق ہی نے بٹھوایا تھا۔ تجھے صدیق ہی نے بلوایا تھا" استاد اب اور بھی برہم تھا۔

"ہاں" میں نے جواب دیا "یہ سب ٹھیک ہے مگر سیٹھ صدیق نے مجھ سے یہ نہیں کہا تھا کہ مجھے تقریر کرنی ہے۔"

"جھوٹ مت بول!" استاد نے میری گردن پر اپنا چوڑا ہاتھ جمادیا۔ میرا سانس گھٹنے لگا۔ میری آنکھوں میں پانی آگیا پھر اس نے جھٹکے سے میری گردن چھوڑ دی۔ اسی وقت مکان کے بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔ استاد بولا "سیٹھ جی آگئے' اوئے ٹپّی! جا دروازہ کھول۔"

پستہ قد شخص جو کمرے کے دروازے میں کھڑا تھا' اچھلتا ہوا باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے لیے پوچھ گچھ کا سلسلہ

رک گیا۔ میری گردن بری طرح دکھنے لگی تھی۔

ذرا ہی دیر میں دو افراد کمرے کے اندر داخل ہوئے۔ وہ دونوں سیاہ رنگت کے ٹھگنے کھدر پوش تھے۔ وہ لمبے کرتے اور دھوتیاں پہنے ہوئے تھے۔ آگے آگے جو شخص تھا اس کا پیٹ بہت پھیلا ہوا تھا۔ پیروں میں سفید جوتے' سر پر سفید چونچ والی کھدر کی ٹوپی' موٹے موٹے ہونٹ' بھدی پھیلی ہوئی ناک کے نیچے بیسی کے کانٹوں کی طرح کھڑی مونچھیں' ہاتھ میں بیت اور آنکھوں پر گول شیشوں کا چشمہ! اس کے پیچھے اس کا "اختصاریہ" تھا' اس سے قدرے چھوٹا' کم موٹا' کم کالا اور آدھے شیشوں کا چشمہ لگائے ہوئے!

"آؤ آؤ سیٹھ جی!" استاد نے کہا "یہ ہے وہ جوان' شاہین خان۔"

"ہوں!" سیٹھ نے میرے قریب آتے ہوئے گہرا ہنکارا بھرا "تو یہ ہے وہ جوان؟ کچھ بتایا اس نے؟" سیٹھ نے میری کرسی کے گرد چکر لگا کر استاد سے پوچھا۔

"سیٹھ جی! اس کی بڑی موٹی کھال ہے" استاد نے جواب دیا "مگر دیکھوں گا کب تک زبان نہیں کھولے گا!"

"ٹھیک ہے' صبح تک کام ہو جانا چاہیے" سیٹھ نے کہا۔

"چنتا (فکر) ہی مت کرو مہاراج!" استاد پُر یقین آواز میں بولا۔

"ادھر آؤ" سیٹھ نے استاد کو اشارہ کیا اور دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ دونوں آگے پیچھے کمرے سے نکل گئے۔

تھوڑی دیر تک کمرے کے باہر سے کھسر پھسر کی آوازیں آتی رہیں پھر خاموشی کا وقفہ ہوا' اس کے بعد استاد نے کچھ کہا' کیا کہا' یہ میری سمجھ میں نہ آسکا۔

"تو پھر ٹھیک ہے' سمجھ گئے نا!" سیٹھ کی واضح آواز آئی "صبح تک سب کام ہو جانا چاہیے۔ اس وقت سوا دو بج رہے ہیں۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا" استاد کی آواز ابھری "اپن کا نام استاد ذیلی ہے سیٹھ!" وہ دیسی عیسائی معلوم ہوتا تھا۔ نام سے میں نے یہی اندازہ لگایا۔

"ساری باتیں معلوم ہونا چاہئیں" سیٹھ کی تاکیدی آواز سنائی دی۔

"ارے بول دیا نا سیٹھ تیرے کو! ابھی کیا اسٹامپ پر لکھ کر دے؟" اس مرتبہ استاد ذیلی کچھ گرم ہو گیا "لاؤ انعام نکالو!"

"انعام صبح ملے گا" سیٹھ بولا "کام کے بعد۔"

"اپن کچا سودا تو کیا ہی نہیں کبھی!" استاد نے کہا "ابھی ہم اتنا کام ہی' یہ دانش کے گھیر کیا ہے۔ بولو انعام دیتا ہے یا نہیں؟"

"میں کہہ رہا ہوں کہ صبح کام کے بعد لے لینا۔ آج بینک بند ہو گئے تھے" سیٹھ نے عذر پیش کیا۔

"ہم سے مسخری مت کرو سیٹھ جی!" استاد تیکھے لہجے میں بولا۔ "اپن بینک وینک نہیں جانتا ہے۔ رو کڑا نکال سیٹھ! نہیں نکالے گا تو ہم چھوڑ دے گا اس نوجوان کو۔ خدا کے بیٹے کا قسم' بولتا ہے چھوڑ دے گا اسے۔"

"منشی جی!" سیٹھ نے آواز لگائی اور سیٹھ کے ساتھ آنے والا لپک کر کمرے سے نکل گیا۔

"جی مالک!"

"اسے رقم دے دو" سیٹھ نے منشی کو حکم دیا پھر استاد سے بولا "اس وقت آدھی رقم ہے' باقی صبح لے لینا۔"

"ارے کیوں مغز خراب کرتا ہے سیٹھ!" استاد نے زور سے کہا "پورا رقم دو' ورنہ بھاگ جاؤ!" آخری الفاظ استاد نے اتنی زور سے کہے کہ منشی کو میں نے اچھلتے ہوئے دیکھا جو دروازے کے سامنے ہی کھڑا تھا۔

"ارے تو اتنی زور سے کاہے کو بولتا ہے!" منشی بولا۔

"دے دے منشی!" سیٹھ نے آخر کہہ ہی دیا۔

"پوری رقم چاہیے!" استاد نے اپنا مطالبہ دہرایا۔

"ارے ہاں ہاں' پوری رقم!" سیٹھ نے ناگواری سے کہا۔

پھر میں نے منشی کو تھیلے میں ہاتھ ڈال کر دروازے کی دائیں سمت بڑھتے دیکھا۔ اب وہ میری نظر سے اوجھل تھا۔

"کیوں جھوٹ بولتا تھا سیٹھ!" استاد کی آواز ابھری "بیکار لفڑا ڈال رہا تھا۔"

"کام ہو جانا چاہیے" سیٹھ سنی ان سنی کر کے بولا۔

"استاد حرام نہیں کھاتا سیٹھ!" استاد کی آواز آئی پھر سیٹھ اور منشی وہاں سے چلے گئے تھے "چل بے ٹنی! دروازہ بند کر" استاد نے پستہ قد شخص کو حکم دیا اس کے بعد وہ میرے سامنے آکھڑا ہوا "سن اوئے! مجھے سچ سچ بتا مہاتما جی کے خلاف کس کے کہنے پر بولا تھا تو؟"

میرا جواب وہی تھا "کسی کے کہنے پر نہیں۔"

"صدیق نے تجھ سے کیا بولا تھا؟" اس نے مجھے گھور کر دیکھا "اس نے تجھ کو بولا تھا نا کہ مہاتما کو برا کہنا؟"

"نہیں' مجھ سے کسی نے نہیں کہا تھا۔"

"تیرے ساتھی کون ہیں؟" استاد نے پوچھا۔

"میرا یہاں کوئی ساتھی نہیں ہے۔ میں پہلی بار یہاں آیا ہوں۔"

"میں یہاں کا نہیں پوچھتا۔" استاد بولا "ہم علی گڑھ کا پوچھتا ہے!"

"علی گڑھ میں میرے بہت سے ساتھی ہیں۔" میں نے جواب دیا "میں وہیں تعلیم حاصل کر رہا ہوں۔ میرے ساتھ بہت سے طالب علم پڑھتے ہیں' وہ سبھی میرے ساتھی ہیں۔"

"اوئے کنجر کی اولاد!" استاد پھر غصے میں آگیا "وہ ساتھی نہیں' وہ ساتھی کے بارے میں بول جن کے ساتھ تم کام کرتا ہے' ہنگامہ کرتا ہے' ڈاکا مارتا ہے!"

"میں ایسا کوئی کام نہیں کرتا۔" میں نے کہا۔

"کرتا ہے' کرتا ہے!" استاد نے جھلا کر پیر پٹخے "تم حکومت کے خلاف کام کرتا ہے۔ تم خود اپنی تقریر میں بولا تھا۔ صدیق سیٹھ بھی بولتا ہے۔"

"میں ایسے کام نہیں کرتا۔ سمجھے!" اس مرتبہ میں بھی چیخا تھا۔

"ٹھیک ہے' ٹھیک ہے۔" استاد بولا "ابھی سب اکڑی نکل جائے گا۔" اس نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا "ابھی ڈھائی بجا ہے۔ تین بجے ہم کو سب سوالوں کا ٹھیک ٹھیک جواب چاہیے۔ ابھی تم کو جواب دینا پڑے گا! گلو! ٹچو! ترکیب نمبر دو۔"

میں ترکیب نمبر دو کے مطابق ملنے والی سزا کے بارے میں سوچنے لگا۔ سوچنے کے لیے مجھے زیادہ مہلت نہ ملی۔ انھوں نے میرے دونوں ہاتھ دیوار میں لگی ہوئی ایک مضبوط سی کھونٹی میں باندھ دیئے۔ اب میں دیوار کے سہارے کھڑا تھا۔ میرے دونوں ہاتھ سر سے بلند تھے پھر میری ایک ٹانگ ایک طرف دیوار کے ساتھ پڑی ہوئی میز سے باندھ دی گئی۔ میں نے زور لگایا۔ میز پر اتنا وزن تھا کہ میرے لیے پیر کو جنبش دینا ناممکن تھا۔ اس کے بعد وہ باہر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد وہ بڑا سا کنستر لے آئے پھر اسے مٹی اور ریت سے بھر دیا گیا۔ اس کے بعد میری دوسری ٹانگ اس کنستر سے باندھ دی گئی۔ اب میری دونوں ٹانگیں اتنی چری ہوئی تھیں کہ میں تقریباً اپنی کلائیوں کے بل لٹکا ہوا تھا میرے جسم کا تمام زور کلائیوں پر تھا۔

"ٹنی! موم بتی جلاؤ۔"

پستہ قد شخص باہر سے ایک موٹی سی ادھ جلی موم بتی اٹھا لایا پھر اس نے ایک کنستر میری پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان رکھ کر اس پر جلتی ہوئی موم بتی ٹکا دی۔

"لاؤ تاش نکالو!" استاد نے کہا۔

پھر وہ سب ایک ایک کر کے کمرے سے چلے گئے۔

"ابھی ہم تاش کھیلتا ہے۔" باہر سے استاد کی آواز آئی "جب تم سچ بولنا چاہے آواز دے لینا" پھر وہ اندر آگیا "سچ بولنا ہے تو اب بھی بول دے۔"

"میں نے سب کچھ سچ بتایا ہے۔" میں نے کہا اور استاد باہر چلا گیا۔

استاد اپنے چمچوں کے ساتھ باہر تاش کھیل رہا تھا۔ میں نے پھونک مار کے موم بتی بجھا دی۔ میرے لیے یہ بات ناقابلِ فہم تھی کہ ان لوگوں کو اس بات پر تشویش اور برہمی کیوں ہے کہ میں نے گاندھی جی کے خیالات و نظریات کے خلاف تقریر کی تھی۔ میری تقریر کی نوعیت ایسی تھی جس پر انگریز حکومت کی برہمی تو بجا ہو سکتی تھی لیکن انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مصروف کسی شخص کے لیے اس پر اتنا برہم ہونا تعجب خیز تھا۔ میں نے جو کچھ کہا تھا' وہ اس دور کے ہندوستان میں کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس قسم کے خیالات کا اظہار انقلابی فکر رکھنے والے بہت سے نوجوان اکثر و بیشتر کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی میرے لیے ناقابلِ فہم تھی کہ آخر یہ لوگ کس بنیاد پر شبہ کر رہے ہیں' میں نے وہ تقریر سیٹھ صدیق کے اشارے پر کی تھی؟ تو کیا ایسا ہے کہ انگریزوں کے خلاف مختلف محاذوں پر جدوجہد کرنے والے ہندوستان کے سیاسی لیڈروں میں کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں؟ وہ آپس میں بے اعتمادی اور بدگمانی کا شکار ہو گئے ہیں؟ یہ وہ پریشان کن سوالات تھے جن کے جواب میرا ذہن اثبات ہی میں دے رہا تھا۔ اس کا سبب سیٹھ صدیق کی وہ باتیں تھیں جو انھوں نے گزشتہ شام مجھ سے کی تھیں اور مجھے خبردار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ہو سکتا ہے مجھے سزا دینے کے احکام جاری کر دیئے گئے ہوں' گویا سیٹھ صدیق کو یہ علم تھا کہ بعض حلقے میری تقریر سے بہت زیادہ برہم تھے۔

میں یہ بات بہ خوبی سمجھ چکا تھا کہ یہ لوگ مجھ سے صرف وہی بات سننا چاہتے ہیں جو ان کے مفروضے کو صحیح ثابت کر دے۔ اسی کے ساتھ یہ بھی میں جانتا تھا کہ اس کے بعد وہ پے در پے سوالات کریں گے جن کے بارے میں میرے فرشتوں کو بھی علم نہیں ہوگا پھر یہ بات بھی انتہائی اخلاقی گراوٹ کی تھی کہ میں سیٹھ صدیق جیسے شخص کے بارے میں ایسا جھوٹ بول دوں جس کا کوئی سر پیر ہی نہ تھا۔ میں نے اس لیے یہی فیصلہ کیا کہ خواہ میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے' میں ان لوگوں کو کچھ نہیں بتاؤں گا۔

چند منٹ گزرنے کے بعد استاد ڈیبی کی آواز آئی "ٹنی! جا دیکھ وہ ٹس تو نہیں ہوگیا۔"

ٹنی پھدکتا ہوا کمرے میں آیا اور وہیں سے ہانک لگا کر بتایا کہ موم بتی میں نے بجھا دی ہے۔

پھر استاد اپنے گرگوں کے ساتھ کمرے میں آگیا اور مجھ سے بولا "ابھی تم نے موم بتی بجھا کر اچھا نہیں کیا" پھر اس نے اپنے گرگوں کو حکم دیا "اس کی گردن میں رسی ڈال کر ہاتھ سے باندھ دو!" اس کے حکم کی فوراً ہی تعمیل ہوئی۔ اب میری گردن بالکل سیدھی تنی ہوئی تھی۔ موم بتی پھر روشن کردی گئی۔ اس مرتبہ اسے اینٹ پر رکھ کر تھوڑا اونچا بھی کردیا گیا تھا پھر وہ سب آگے پیچھے باہر چلے گئے۔

موم بتی کا شعلہ میری ران کے اب زیادہ قریب ہوگیا تھا۔ اس کی لو کی گرمی سے میری ران میں جیسے سوراخ ہونے لگا تھا۔ یہ جلن اتنی بڑھی کہ میرے تمام خیالات منتشر ہوکے رہ گئے۔ میں نے اپنے جسم کو ذرا سا موڑ کر ران کے اس حصے کو لو کی زد سے بچانا چاہا مگر اس کوشش میں میرا تمام بوجھ دیوار میں لگی میخوں سے بندھے ہوئے پنجوں پر آگیا۔ ساتھ ہی گردن میں بڑے زور کا جھٹکا لگا۔ میرا سر پیچھے ہوگیا اور رسی میری گردن کو جیسے کاٹنے لگی' رسی کی بندشیں میرے پنجوں میں اتر گئیں۔ میں نے بے قرار ہوکر پھر سابقہ پوزیشن میں آنا چاہا مگر میں اپنے پنجوں پر کھڑا نہ ہوسکا۔ ایک اور جھٹکا لگا۔ میرا جسم سامنے کی طرف جھک کر کمان بن گیا۔ میری آنکھوں میں تکلیف سے آنسو آگئے۔ بڑی مشکل سے میں پھر پنجوں کے بل کھڑا ہوسکا۔ شعلہ میری ران میں برے کی طرح اترنے لگا اور میرے جسم کا روم روم پسینے میں بھیگ گیا۔

اس تکلیف سے گزرتے ہوئے میرا ذہن اسی ادھیڑبن میں مصروف رہا کہ آخر وہ کون لوگ ہیں جنھوں نے میرے لیے اس ایذا رسانی کا بندوبست کیا ہے؟ پھر ایک راہ مجھے سوجھ ہی گئی۔ استاد ڈیبی اپنے گرگوں کے ساتھ اب بھی تاش کھیل رہا تھا۔

"استاد ڈیبی!" میں نے آواز دی۔

"کیا ہے بے؟" استاد کی آواز آئی۔

"ادھر آؤ!" میں نے کہا۔

استاد فوراً نہیں آیا۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بازی ختم ہونے کے بعد آئے گا۔ وہ شاید میری قوتِ برداشت کو بالکل ہی ختم کردینا چاہتا تھا۔ میں نے پھر استاد ڈیبی کو آواز دی تھی۔ اس نے پھر مضحکہ اڑاتے ہوئے کہا تھا "ابے جان کیوں نکل رہی ہے۔"

"مستک آگیا اپنی جگہ!" اس نے دانت نکالتے ہوئے کہا۔

"اسے ہٹاؤ! موم بتی کو۔" میں جلدی سے بولا "میں تم سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"ہو!۔۔ ہو بات کریں گا۔" استاد نے لطف لیتے ہوئے کہا "ٹنی! ہٹالے۔"

ٹنی نے استاد کے حکم کی تعمیل میں موم بتی ہٹالی۔ دہکتا ہوا انگارا جیسے اچانک میری ران سے ہٹ گیا۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ کمرے میں اس وقت میرے علاوہ پانچ افراد تھے۔ استاد' ٹنی' گلو' مچھو اور ایک شخص جس کے نام سے میں واقف نہیں تھا۔

"ہاں بیٹا!" استاد نے ترنگ میں آکر کہا "مہاتما کے خلاف کس کے بولنے پر اسپیچ کیا تھا؟" اب اس کا انداز گفتگو بھی کچھ شیخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"میں سب کچھ بتادوں گا' ان لوگوں کو باہر بھیج دو۔" میں نے کہا۔

"کیا بولا؟" استاد نے حیرانی سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا "ان کو باہر بھیج دوں! مجھ سے محبت بنائے گا کیا؟" یہ کہہ کر وہ ہنسا جیسے کوئی بڑی پُرلطف بات کہہ دی ہو۔ اس کے گرگے بھی ہنسنے لگے۔ مجھے ان کی یہ ہنسی بڑی زہر لگی۔ وہ مجھ سے چوہے بلی والا کھیل کھیل رہے تھے۔ میں نے اس مصیبت سے نجات حاصل کرنے کی ایک ترکیب سوچی تھی اور اس پر عمل کرنا چاہتا تھا۔ یہ ترکیب کامیاب ہوگی یا نہیں' ابھی تک مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔

"محبت کیسے بنائے گا استاد!" ایک گرگے نے ہنس کر کہا "یہ تو بندھا ہوا ہے۔"

"ابھی کیا معلوم؟" استاد لطف لیتے ہوئے بولا پھر وہ مجھ پر غرایا "بول جواب دیتا ہے یا نہیں؟"

استاد مجھ سے اب چند انچ کے فاصلے پر تھا۔ میں نے اس سے پھر کہا "میں سب کچھ بتادوں گا' ان لوگوں کو یہاں سے بھیج دو۔"

اس کے ساتھ ہی استاد اور اس کے گرگوں نے پھر قہقہے لگائے۔

میں نے ان قہقہوں کی آڑ میں سرگوشی کی "اس میں تمہارا بھی فائدہ ہے استاد!" مجھے یقین تھا کہ استاد ڈیبی کے سوا میرا یہ جملہ کسی نے نہیں سنا تھا۔

استاد کے چہرے پر تعجب کے آثار کچھ اور گہرے ہوگئے۔ میں نے معنی خیز انداز میں اسے آنکھ بھی ماری۔

"یہ سالا میرے سے پرائیویٹ بات کریں گا۔" استاد نے قہقہہ لگاتے ہوئے اپنے گرگوں سے کہا "اے تم سب باہر جاؤ!" اس کا لہجہ حاکمانہ تھا۔

تمام گرگے ہنستے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔

"اب بول کیا بات کریں گا؟" استاد بولا "جلدی بول! ابھی ہم ترا سرونٹ نہیں ہے۔"

"تم مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"او بابا' ابھی ہم پوچھے گا نئیں تو کیا کریں گا' سیٹھ نے بولا تھا۔ ابھی تم ٹھیک ٹھیک بولو' فائدے والی بات بولو!" استاد فائدے والی بات سننے کو بے چین تھا۔ یہ بات میرے لیے اطمینان بخش تھی۔

"استاد ڈیبی!" میں نے کہا "میں تمہیں سچ بتا رہا ہوں۔ میں علی گڑھ سے آیا ہوں اور یہاں کلکتے میں کسی کو نہیں جانتا۔ سیٹھ صدیق کے نام علی گڑھ کے ایک صاحب نے خط دیا تھا' وہ میں نے سیٹھ جی کو پہنچا دیا تھا پھر انہوں نے مجھے دھرم تلہ میدان میں 'الاؤ' کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے کہا۔ مجھ سے تقریر کے بارے میں قطعی کچھ نہیں کہا گیا تھا۔ مجھے واقعی نہیں معلوم تھا کہ مجھ سے وہاں تقریر کرنے کو کہا جائے گا۔ میں نے تقریر میں جو کچھ کہا' وہ میرے اپنے خیالات ہیں۔ بہت سے لوگ اسی طرح سوچ رہے ہیں۔ میں گاندھی جی کی عزت کرتا ہوں' لیکن میں اب بھی یہی کہتا ہوں کہ انگریز کو اس ملک سے ان طریقوں سے نہیں نکالا جاسکتا جو گاندھی جی اور کانگریس کے دوسرے بتاتے ہیں۔ ہمیں انگریز کے خلاف جنگ کرنی ہوگی۔ ہمیں انگریز سے نجات پانے کے لیے ہتھیار اٹھانے پڑیں گے۔ ہمیں۔۔۔"

"باس۔۔ باس!" استاد ڈیبی نے ہاتھ اٹھا کر مجھے روک دیا "اسپیچ مت کرو! اپن کو یہ باتیں سمجھ نئیں آتیں۔ کیا سمجھا! تو اپن سے فائدے کی بات بول!"

"سیٹھ سوہن لال کی بیٹی کو تم نے اٹھایا تھا؟" میں نے اس سے پھر سوال کیا۔

"اپن کی پارٹی کے لوگ نے اٹھایا تھا' پر تجھے اس سے کیا! تو بات بتا!"

"اس سیٹھ کا نام کیا تھا جو ابھی یہاں آیا تھا؟" میں نے پھر ایک سوال جڑ دیا۔

استاد ڈیبی بگڑ گیا "ابھی تو کائے کو اپن کو گھماتا ہے! فائدے کی بات بول نا۔"

"تم اسی سیٹھ کے لیے کام کر رہے ہو' نا! اسی کے کہنے پر تم نے سیٹھ موہن لال کی بیٹی کو اٹھایا تھا اور مجھے یہاں لائے تھے؟"

"ارے ہاں بابا!" استاد تنگ آکر بولا "مگر۔۔"

"اور اس کے لیے اس نے تمہیں پیسا بھی دیا ہے؟" میں نے استاد کی بات کاٹ دی۔

"دو کڑ بول دو کڑ!" استاد نے جھلا کر کہا جیسے میں نے اس کی توہین کردی ہو "چھوٹا کام تو اپن کرتا ہی نئیں۔"

"کتنا دو کڑ؟" میں نے پوچھا۔

"دو ہزار" استاد نے اپنی پھولی ہوئی جیب پر ہاتھ مارتے ہوئے بتایا۔ اس کا انداز ایسا تھا جیسے اس کی جیب میں کوہ نور ہیرا ہو۔

"بس' صرف دو ہزار!" میں نے حقارت اور تعجب سے کہا "صرف دو ہزار کے لیے تم مجھے جان سے مار دو گے؟"

"یہ کون بولا تجھ کو!" استاد حیرت سے بولا "اس سالا ٹنی نے تیرے کو بتایا ہوگا" پھر اس نے اعتراف کیا "ہاں جان سے ماریں گا۔ اپن چھوٹا کام نئیں کرتا۔ جانتا نئیں' نئیں جانتا تو! ابھی اپن ٹنی کو بھی دیکھیں گا۔ اس نے کیوں بتایا تیرے کو! ٹنی!" اس نے غصے میں زور سے آواز دی۔

"نہیں' ٹنی نے نہیں بتایا۔" میں نے زور سے کہا "سیٹھ نے تجھ سے جو باتیں کی تھیں' اس سے میں نے یہ اندازہ لگایا۔"

"ابے تیرا مستک تو اپنی گلو کے بلیڈ کی مافک تیز ہوتا رہے' وا!" استاد نے گویا میری ذہانت کی تعریف کر ڈالی۔

اس دوران میں ٹنی پھدکتا ہوا کمرے میں آگیا۔ اس کا نام پنٹری تھا مگر استاد اسے ٹنی ہی کہتا تھا۔ اس کی وجہ کوتاہ قامتی ہی رہی ہوگی۔

"میرے کو بلایا استاد؟" ٹنی نے آکر دریافت کیا۔

"جان لینے کا بات تو نے بولا اس کو؟" استاد نے غصے سے پوچھا۔

"نئیں استاد! رام کوسم (قسم) نئیں۔ یہ سالا لوگ جھوٹ بولتا۔" ٹنی کپکپاتے ہوئے بولا۔

"میں نے تم سے کہا تھا نا استاد کہ اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" میں نے پھر کہا "مجھے سیٹھ کی باتوں سے پتا چلا تھا۔"

"جا بھاگ یہاں سے!" استاد نے ٹنی کو حکم دیا پھر مجھ سے بولا "ابھی تم ٹیم پاس مت کرو' فائدے کی بات بولو!"

"سنو استاد!" میں نے رازدارانہ لہجے میں کہا "میں واقعی تمہیں فائدے کی بات بتا رہا ہوں۔ وعدہ کرو کہ پھر تم

مجھے چھوڑ دو گے!"

"چھوڑ دیں گا، چھوڑ دیں گا۔" استاد بے تابی سے بولا "تم آگے بولو!"

"مجھے چھوڑ دو، میں تمہیں چار ہزار روکڑ دلا سکتا ہوں۔" میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر یہ جملہ مکمل کیا۔

وہ احمقوں کی طرح آنکھیں پٹپٹانے لگا "کیا کیا بولا "تم کیا بولا؟" اسے شاید اپنی سماعت پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

میں نے اپنی پیشکش دہرا کر اس کی طرف متوقع نظروں سے دیکھا ہی تھا کہ استاد نے بڑھ کر اتنی زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا کہ مجھے ستارے ہی نظر آ گئے۔

"کیا بولا تم!" وہ چیخا "ابھی ہم بے ایمانی کریں گا۔ بے ایمانی کو بولتا۔" اس مرتبہ اس نے الٹا ہاتھ گھمایا تھا۔

استاد ڈیبی کا یہ ردِ عمل میرے لیے غیر متوقع تھا۔ فائدے کی بات پر اس نے جس بے چینی کا اظہار کیا تھا' اس کی بنا پر مجھے امید ہو گئی تھی کہ وہ میری پیشکش کو مسترد نہیں کر سکے گا مگر میں نے امید کا دامن اب بھی نہیں چھوڑا تھا۔

"ٹھیک ہے' تو پھر تم سیٹھ ہی سے اس کام کے لیے چار ہزار مانگو۔" میں نے کہا۔

"ابھی اپن سودا پکا کر لیا ہے۔ سمجھ آیا کہ نئیں!" استاد ڈیبی بولا "زبان دے چکا ہے۔"

"ٹھیک ہے تو پھر میں جو کچھ بتا سکتا ہوں' سیٹھ ہی کو بتاؤں گا۔" میں نے جی کڑا کر کے کہہ دیا "سیٹھ کو بلاؤ۔"

"ابھی وہ تم سے بگار نئیں لیتا ہے کہ ادھر آئے گا۔ سمجھا کیا سمجھا!" اس کے لہجے میں اطمینان تھا "ابھی تجھے یہاں کوئی بچانے نئیں آئیں گا۔"

"مگر میں نے کیا کیا ہے؟ میں نے اس سیٹھ کا کچھ نہیں بگاڑا۔ میں تو اسے جانتا بھی نہیں۔"

"اپن بتاتا ہے۔ تم نے مہاتما کو برا کہا۔" استاد ڈیبی بولا "تم ملیچھ مسلا!"

تو گویا یہ ہندو مسلم اختلافات تھے جن کی بنا پر میں اس صورتِ حال سے دوچار ہوا تھا "میں نے گاندھی جی کے خلاف کچھ نہیں کہا تھا۔" میں نے اپنی صفائی پیش کی۔

"بولا تھا' بولا تھا' بولا تھا!" اس نے بائیں ہتھیلی پر اپنا دایاں مکا مارتے ہوئے کہا "ابھی ہم سے چالاکی مت کرو! سیدھا سادا بتاؤ کس کے بولنے پر تم وہ باتیں بولا تھا؟"

"میں نے کسی کے بھی کہنے پر وہ باتیں نہیں کی تھیں۔" میں جھلا کر بولا "تمہیں یقین نہیں آتا تو بھاڑ میں جاؤ۔"

اس مرتبہ دو تین گھونسے میرے منہ پر پڑے "گالی نکالا ہے! ابھی گھونسے مار مار کر تھوتھو بگاڑ دیں گا۔ اپن استاد ڈیبی ہے' ڈیبی استاد! اپن سب جانتا ہے۔ تم کو صدیق سیٹھ بولا' سیٹھ کو انگریز بولا۔ تم مسلمان انگریز سے مل گیا ہے۔ اس سے مل کر ہندو کے خلاف کھیلا کرتا ہے۔ اپن سب جانتا ہے۔ مائی نیم از استاد ڈیبی!" وہ تکبر سے بولا۔

"یہ جھوٹ ہے۔" میں نے پھر چیخ کر کہا۔

"ابھی تم سب ٹریو ٹریو بولیں گا۔" استاد ڈیبی بولا "اپن سب جانتا ہے کیا رائٹ ہے کیا رانگ! مائی نیم از استاد ڈیبی! ابھی تیرا فادر بھی بتائیں گا۔" اس کا انداز شاہانہ ہو گیا تھا۔ وہ کمرے میں کسی وائسرائے کی طرح ٹہلنے لگا۔ انگریزی کی قابلیت بگھار کر وہ گویا اپنی سیاسی سوجھ بوجھ کو منوانا چاہتا تھا "گلو مچھو ٹنی!" اس نے اپنے گرگوں کو آواز دی۔

ایک مرتبہ پھر موم بتی روشن کر دی گئی۔

"ابھی تمہارا موئی باہر آئیں گا تو فر فر بولیں گا۔" یہ کہہ کر وہ اپنے گرگوں کے ساتھ پھر باہر چلا گیا۔

ٹنی ابھی کمرے ہی میں تھا۔ باہر ایک بار پھر تاش کی بازی جم گئی۔

موم بتی کے شعلے سے بھڑکتی ہوئی توانائی میری بائیں ران کے بالائی حصے پر مرکوز تھی۔

ٹنی میرے پاس آیا۔ اس کی آنکھوں میں تشویش تھی "ابھی کیوں مرنا مانگتا ہے' استاد کو بتا دے نا!"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔

"ابھی تیرے کو مرنا ہے' کیا؟" اس نے کہا "پھر کاہے کے لیے یہ لفڑا مول لیتا ہے۔ آرام سے مر جا۔"

میں نے پھر انکار میں سر ہلایا۔ میرے پاس بتانے کو تھا ہی کیا! میرا تمام جسم پسینے میں بھیگ گیا تھا۔ جسم کا تمام بوجھ اب میرے پنجوں پر تھا۔ مجھ میں اب اتنی بھی سکت نہیں رہی تھی کہ جسم کو جنبش دے کر پھر پنجوں کے بل کھڑا ہو جاتا۔ میری ران اب یوں لگ رہی تھی جیسے اسے کسی تنور میں لٹکا دیا گیا ہو۔ گردن میں پڑی ہوئی رسی پھانسی کا پھندا بن گئی تھی۔ میرا سانس گھٹنے لگتا۔ ایسی تکلیف تھی کہ اس کا بیان مشکل ہے۔

پھر میری ہمت' عزم' حوصلہ اور قوت برداشت جواب دے گئی۔ واقعی اگر مرنا ہی تھا تو پھر اتنی اذیت کس لیے؟ میں نے سوچا تھا پھر یہ بھی سوچا تھا کہ ان لوگوں نے صحیح یا غلط ایک مفروضہ قائم کر لیا تھا' اس کے خلاف یہ لوگ ایک لفظ سننے کے روادار نہیں تھے۔ جو بات جھوٹی تھی اسے یہ لوگ

حقیقت سمجھتے تھے اور مجھ سے اس کی تصدیق چاہتے تھے۔ میرے انکار سے وہ اپنا اندازِ فکر تبدیل نہیں کر سکتے تھے۔

"استاد!" میں زور سے چیخا "بتاتا ہوں' بتاتا ہوں۔"

"ابھی تھوڑا ویٹ کرنا!" استاد کی آواز جواب میں آئی "ابھی کاہے کو بتاتا ہے۔"

"استاد!" میں پھر چیخا۔

اس مرتبہ ٹنی نے دوڑ کر موم بتی ہٹا لی۔ وہ واقعی نرم دل ہی تھا۔ میں نے بھیگی آنکھوں سے اسے تشکرانہ انداز میں دیکھا۔ اسی وقت استاد اپنے گرگوں کے ساتھ کمرے میں آ گیا۔ موم بتی کی لو ہٹتے ہی میرے جسم میں جیسے ٹھنڈک سی آ گئی۔ تمام جلن' تمام درد اور آگ صرف ران میں محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ میں اپنی جگہ بے سدھ اور بے دم سا ہو کر رہ گیا۔ پنجوں میں دکھنے والی ٹیس اب ران کی تکلیف میں جذب ہو گئی تھی۔

"ارے چلو! اسے ہولی کراس سے اتارو۔" استاد ڈیبی نے اپنے گرگوں کو حکم دیا۔

گلو اور مچھو میرے دونوں ہاتھوں کی بندشیں کھولنے لگے۔ تیسرا گرگا میری گردن میں پڑی رسی کھول رہا تھا۔ اسی وقت بیرونی دروازے پر دستک ہوئی۔

"اس ٹیم کون اپنا مدر کا ہزبینڈ آ گیا۔ ٹنی' جا دیکھ!" استاد نے کہا اور میری طرف متوجہ ہو گیا "ابھی فر فر بولیں گا کیوں!"

اسی لمحے ٹنی کی چیخ سناٹے میں گونج اٹھی "استاد!" وہ بے اختیار چلایا تھا۔ اسی کے ساتھ کسی کے بھد سے گرنے کی آواز آئی۔ استاد اور اس کے گرگے چونک اٹھے۔ تکلیف سے ہلکان میرا ذہن بھی چوکنا ہو گیا۔ استاد اور اس کے گرگوں کے ردِ عمل سے ظاہر تھا کہ جو کچھ ہوا ہے ان کی توقع کے خلاف ہوا ہے۔ استاد اور اس کے گرگے باہر کی طرف لپکے ہی تھے کہ انہیں ٹھہر جانا پڑا۔

"ہینڈز اپ!" ایک گھمبیر آواز گونجی اور ایک نقاب پوش دروازے میں آ گیا "پیچھے ہٹو! الٹے قدموں دیوار سے لگ کر کھڑے ہو جاؤ' ہاتھ اٹھائے رکھو۔" اس نقاب پوش نے حکم دیا۔ اس کے ہاتھ میں پستول تھا۔

استاد ڈیبی اور اس کے ساتھی نقاب پوش کی ہدایت کے مطابق الٹے چلتے ہوئے دیوار سے لگ گئے۔ استاد کے چہرے سے سخت برہمی ظاہر تھی۔ اس نے درشت آواز میں کہا "ابھی میرے کو بتاؤ' تم کون ہے؟"

"تم خاموش رہو گے استاد ڈیبی!" نقاب پوش سخت لہجے میں بولا "ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔"

"تم مہاکال کا لوگ معلوم ہوتا ہے۔" استاد نے کہا۔

اسی وقت دروازے کی طرف سے ایک بڑا سا پتھر استاد ڈیبی کے پیٹ پر آ کر لگا۔ یقیناً نقاب پوش کے ساتھی باہر بھی موجود تھے جنہیں میں دیکھ نہیں سکتا تھا۔ استاد ڈیبی تکلیف سے دہرا ہو گیا۔

"اے ڈیبی! ہاتھ اوپر ہی رکھو ورنہ ایک اور پتھر پڑے گا۔" نقاب پوش نے اور بھی سرد لہجے میں کہا "تم خاموشی سے دیکھتے رہو جو ہو رہا ہے۔"

"ہولی گاڈ کا قسم' اپنا ٹیم آنے پر ہم تمہارا موئی نکالیں گا۔" استاد ڈیبی بولا۔ اس مرتبہ پتھر اس کے سینے پر آ کر لگا تھا۔

"اور اب اگر تم بولے استاد ڈیبی تو پستول کی گولی لگے گی۔" نقاب پوش نے دھمکی دی "میں کچھ سننے نہیں آیا' میں خاموشی چاہتا ہوں' سمجھے۔"

اس کے بعد جیسے استاد ڈیبی بولنا ہی بھول گیا۔ اس کے گرگوں کو تو پہلے ہی سانپ سونگھ گیا تھا۔ میں نے استاد ڈیبی کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوف اتر آیا تھا۔ اس کے بعد نقاب پوش نے اپنے ساتھیوں کو بھی اندر بلا لیا۔ وہ دو آدمی تھے اور دونوں ہی کے چہرے نقابوں میں چھپے ہوئے تھے۔

تو کیا یہ میرے تنظیمی ساتھی ہیں؟ میری تنظیم کے رکن ہیں؟ میں نے تکلیف کے سبب نڈھال ذہن سے سوچا۔ یقیناً ایسا ہی ہے۔ ان کے اندازِ گفتگو سے معلوم ہوتا تھا کہ ان کا تعلق یوپی سے ہے پھر انہوں نے آپس میں ابھی تک کسی کو نام سے بھی نہیں پکارا تھا۔ یہ ایک ایسی بات تھی جس نے مجھے اسی نتیجے پر پہنچایا کہ وہ میرے رفیق' میرے تنظیمی ساتھی ہیں مگر انہیں یہ کیسے پتا چلا کہ اس وقت میں یہاں ہوں؟ یہ ایک ایسا سوال تھا جس کا جواب فوری طور پر میرے ذہن میں نہ آ سکا۔ میں نے سوچا ممکن ہے انہوں نے جوگیندر کے ہاں مجھ سے رابطہ قائم کرنا چاہا ہو اور پھر وہاں سے انہیں میرے اغوا کا پتا چلا ہو۔ اس کے باوجود یہ سوال اپنی جگہ برقرار تھا کہ انہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ مجھے یہاں قید کیا گیا ہے؟

پستول تانے ہوئے نقاب پوش کی ہدایت پر اس کے دونوں ساتھیوں نے مجھے بقول استاد ڈیبی کے ہولی کراس سے اتار لیا اور میں بے سدھ ہو کر ٹانگوں کے درمیان سر رکھے ہوئے کنستر پر بیٹھ گیا۔ میری ٹانگوں میں اتنی جان نہیں تھی کہ میں کھڑا رہ سکتا' نہ جسم میں اتنی سکت تھی کہ دو قدم چل سکتا

میرے پنجے دکھ رہے تھے۔ میری گردن میں تکلیف تھی اور ران میں جو سوزش اور جلن تھی اس کا بیان تو الفاظ سے باہر ہے۔ میں کنستر پر بیٹھا ہوا لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

مجھے کھولنے کے بعد ان رسیوں کو جن سے مجھے باندھا گیا تھا، استاد ڈینی اور اس کے ساتھیوں کی طرف پھینک دیا گیا۔

"مچھو!" نقاب پوش نے کھرکھراتی آواز میں کہا "اس سے اپنے استاد کی مشکیں کس دو! اور گلو تم پینڈو کی مشکیں کس دو، جلدی کرو!"

گلو اور مچھو کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں دیکھتے رہے۔ نقاب پوش شاید یہ سمجھ گیا کہ وہ دونوں مشکیں کسنے کا مطلب نہیں سمجھ سکے تھے۔

"ڈینی اور پینڈو!" نقاب پوش پھر بولا "دیوار کی طرف منہ کرکے کھڑے ہوجاؤ!" وہ دونوں گھوم گئے تو نقاب پوش نے دوسرا حکم دیا "ڈینی اور پینڈو اب تم دونوں اپنے ہاتھ کمر کے پیچھے لے آؤ!" انہوں نے ایسا ہی کیا تو نقاب پوش نے کہا "ہاں مچھو اور گلو اب تم ان کے ہاتھ باندھ دو۔"

ذرا ہی دیر میں یہ مرحلہ طے ہوگیا پھر گلو کو حکم دیا گیا کہ وہ مچھو کے ہاتھ بھی اسی طرح باندھ دے۔ آخر میں نقاب پوش کے ساتھیوں نے گلو کے ہاتھ بھی باندھ دیئے۔ اس کے بعد انہوں نے ڈینی اور پینڈو کے بندھے ہوئے ہاتھوں کو دیوار میں لگی ہوئی انہی میخوں سے باندھ دیا جن سے تھوڑی دیر پہلے میں بندھا ہوا تھا۔ صورت حال ایسی تھی کہ وہ اپنی جگہ سے ذرا سا بھی ادھر ادھر جنبش نہیں کرسکتے تھے۔ اس کے بعد مچھو کو ڈینی کی ٹانگوں کے پاس پیٹ کے بل لٹا دیا گیا تھا اور ڈینی کی ایک ٹانگ سے ٹخنوں کے اوپر اس کے ہاتھوں کو کس کر باندھ دیا گیا۔ گلو کو اسی طرح پینڈو کی ٹانگ سے باندھ دیا گیا۔ یہ تمام کارروائی دس منٹ سے بھی کم وقفے میں ختم ہوگئی۔ اس کے بعد غنی کو اندر لاکر میز کے پائے سے باندھ دیا گیا۔

"شاہین!" اب نقاب پوش مجھ سے مخاطب تھا "تم کیسا محسوس کررہے ہو؟ چل سکتے ہو؟"

"شاید" میں نے جواب دیا۔ اس قید سے رہائی پر میرے اندر ایک توانائی سی عود کر آئی تھی۔ میں کھڑا ہوا مگر میری ایک ٹانگ پھوڑے کے مانند دکھ رہی تھی۔ میں نے لنگڑاتے ہوئے ایک دو قدم اٹھائے "شاید چل سکوں مگر زیادہ دور نہیں۔"

"تم مٹھا کا مین معلوم ہوتا ہے۔" استاد ڈینی نے پھر کہا۔

"تم پھر بولے!" نقاب پوش نے بڑھ کر اس کے منہ پر تھپڑ مارا پھر اس نے مجھ سے کہا "آؤ چلو!"

"مگر انہوں نے شور مچایا تو؟" میں نقاب پوش سے بولا۔

وہ زہریلی ہنسی ہنسا "ان کی فکر مت کرو! ہمارا ایک ساتھی پندرہ منٹ تک یہیں رہے گا۔ اسے ہدایت ہے کہ ان میں سے کوئی بھی بلند آواز سے بات کرے یا شور مچائے تو اسے گولی مار دے" پھر وہ ایک نقاب پوش کی طرف متوجہ ہوا "تم یہیں رہوگے اور باقی پروگرام پر عمل کروگے۔"

"اب ہمیں کہاں جانا ہے؟" میں نے دریافت کیا۔

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو۔" اس نے جواب دیا اور پھر اسی شخص سے مخاطب ہوا جسے یہاں ٹھہرنے کی ہدایت کی تھی "اچھا ہم چلتے ہیں۔"

یہ لوگ کون تھے؟ ابھی تک میں کسی حتمی نتیجے تک نہیں پہنچ سکا تھا اگر ان کا تعلق ہماری تنظیم سے ہوتا تو اب تک وہ شناختی الفاظ ادا کرکے مجھے اپنی شناخت کراچکے ہوتے۔ انہوں نے ایسا نہیں کیا تھا اس لیے میرا ذہن الجھا ہوا تھا۔ میں لنگڑاتا ہوا چل رہا تھا۔ میری ران میں اب تکلیف اور بڑھ گئی تھی۔ چھالے پر کپڑے کی رگڑ سے یہ تکلیف اور بھی بڑھتی جارہی تھی لیکن اس وقت میں اس تکلیف کی پروا نہیں کررہا تھا۔ میں تو اس ماحول سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا۔

"تم کون ہو؟" میں نے مکان سے باہر آکر اس نقاب پوش سے پوچھ ہی لیا۔

"تمہارا ایک ہمدرد۔" اس کا جواب تھا "اور اب ہم اپنی منزل پر پہنچنے تک کوئی بات نہیں کریں گے۔"

"جب تک مجھے یہ معلوم نہیں ہوگا کہ مجھے کہاں لے جایا جارہا ہے، میں آگے نہیں جاؤں گا۔" میں نے کہا۔ مجھے اب تک پیش آنے والے واقعات میں ایک عجیب سا غیر فطری پن محسوس ہورہا تھا۔ یہ ٹھیک تھا کہ اس نقاب پوش نے مجھے استاد ڈینی کے عقوبت خانے سے نجات دلائی تھی، اس کے باوجود اس پر اعتماد کرتے ہوئے میرا دل ہچکچا رہا تھا۔ میں ٹھہر گیا۔

"تمہارے لیے کوئی اور راستہ نہیں ہے۔" نقاب پوش بولا "تم وہی کرنے پر مجبور ہو جو میں کہہ رہا ہوں۔" خلاف توقع اس کے لہجے میں سختی آگئی۔

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔ میں اس وقت خود مختار نہیں تھا۔ میں اس نقاب پوش کے بس میں تھا جس نے مجھے استاد ڈینی سے رہائی دلائی تھی۔

یہ مکان جس سے ہم برآمد ہوئے تھے، ایک میدان میں تھا۔ آبادی اس سے تھوڑے فاصلے پر تھی جہاں مکانات کے ہیولے مجھے آسمان کے پس منظر میں نظر آرہے تھے۔ تب مجھے خیال آیا کہ وہ لوگ جو مجھے یہاں مکان میں لائے تھے، بلاوجہ ہی شاید میدان میں ادھر ادھر مڑ رہے تھے کیوں کہ کار سے اترنے کے بعد میں کئی موڑ مڑنے پر ہی اس عقوبت خانے تک پہنچا تھا۔ اس کا مقصد شاید یہ تھا کہ مجھے وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ میں کسی آبادی سے گزر رہا ہوں۔

تھوڑے ہی فاصلے پر مجھے ایک کار نظر آگئی۔ ہمارا رخ اسی کی طرف تھا۔

ابھی ہم کار میں بیٹھے ہی تھے کہ میں نے دو کاروں کو آگے پیچھے میدان میں بڑھتے دیکھا۔ میدان میں ان کی روشنیاں آڑی ترچھی لکیریں بنارہی تھیں۔ وہ کار جس میں ہم بیٹھے تھے۔ ایک چھوٹے سے ٹیلے کی آڑ میں اس طرح کھڑی تھی کہ ان کاروں میں موجود کوئی بھی شخص اس کار کو نہیں دیکھ سکتا تھا۔ ان کاروں کا رخ میدان میں اسی مکان کی طرف تھا جہاں سے مجھے لایا گیا تھا۔

"یہ کون ہیں؟" ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے شخص نے کہا۔

"شیام دت ہے شاید۔" اس نقاب پوش نے جواب دیا جو ان کا سربراہ تھا اور میرے برابر بیٹھا ہوا تھا "کار آگے بڑھاؤ، لائٹ مت جلانا!"

جس وقت ہماری کار نے حرکت کی، وہ دونوں کاریں میدان کے اس کونے پر پہنچ کر رک گئیں جہاں استاد ڈینی کا اڈا تھا۔ میں نے ادھر دیکھا۔ میرے ذہن میں اس وقت دو شخصیتوں کے بارے میں سوال ابھرے۔ مٹھا کون تھا؟ شیام کون ہے؟ مٹھا کا نام استاد ڈینی نے لیا تھا۔ اس نے نقاب پوش سے کہا تھا کہ وہ مٹھا کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ شیام دت کا حوالہ اس نقاب پوش نے چند لمحے پہلے دیا تھا۔

"تم مٹھا کے آدمی ہو؟" میں نے سوال کیا۔

"میں خود اپنا آدمی ہوں۔" نقاب پوش جواب میں بولا۔

"شیام دت کون ہے؟" میں نے پھر پوچھا۔

"میرا خیال ہے کہ وہ ایک آدمی ہے، ہندو ہے اور کلکتے میں پیدا ہوا ہے۔" نقاب پوش کی آواز میں چبھن تھی۔

میں گہرا سانس لے کر خاموش ہوگیا۔ نقاب پوش کچھ بتانے پر آمادہ نہ تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہورہا تھا، وہ بہت گہرا آدمی ہے اور باتیں کرنے کا ماہر بھی۔ کار پکی سڑک پر آکر تیز رفتاری سے دوڑنے لگی تھی۔

"تم مجھے وہاں سے نکال کر کیوں لائے ہو؟ کیوں بچایا ہے تم نے مجھے؟" میں بولا۔

نقاب پوش ہنسا "میں تمہیں اس سوال کا جواب ضرور دوں گا۔ اس کے بعد تم کوئی سوال نہیں کروگے، بالکل خاموش بیٹھو گے ورنہ مجھے مجبوراً سختی کرنا پڑے گی۔ میں بہت نرم دل بھی ہوں اور بہت بے رحم بھی۔ میری مرضی کے مطابق کام ہوتا رہے تو میں خاموش رہتا ہوں اور جب ایسا نہ ہو تو پھر اتنا ہی خطرناک بھی ہوں، سمجھے! اور اب سنو اپنے سوال کا جواب! مجھے تم سے محبت ہوگئی ہے۔ تمہاری تکلیف نہیں دیکھی جارہی تھی مجھ سے، اس لیے میں تمہیں بچالایا۔"

میں طویل سانس لے کر بولا "اس کا مطلب یہ ہے کہ تم کچھ بتانا نہیں چاہتے۔"

"بس اب خاموش ہوجاؤ۔"

"تمہیں اپنے اس آدمی کی بھی پروا نہیں ہے جسے تم استاد ڈینی کے اڈے پر چھوڑ آئے ہو؟" میں نے پھر سوال کردیا گو مجھے معلوم تھا نقاب پوش خاموشی چاہتا تھا۔

"تم چپ نہیں رہوگے!" نقاب پوش اس مرتبہ واقعی برہم ہوگیا پھر خود ہی ہنس پڑا۔ اس وقت مجھے اس کی ہنسی عجیب لگی "وہ اپنا کام جانتا ہے جسے میں وہاں چھوڑ کر آیا ہوں۔ ویسے تمہیں اس سے اچانک اتنی دلچسپی کیوں ہوگئی ہے؟ کیا اس سے محبت کرنے لگے ہو؟"

"بہرحال اس نے مجھے وہاں سے نکالنے میں ایک کردار ادا کیا ہے۔" میں نے جواب دیا "حیرت مجھے تمہارے اطمینان پر ہورہی ہے۔ تمہارا ساتھی وہاں پھنس بھی سکتا ہے۔ اسی لیے میں نے پوچھا تھا۔"

"اچھا اب زیادہ باتیں نہیں۔ بالکل خاموش ہوجاؤ! ایک لفظ بھی تمہاری زبان سے نہیں نکلنا چاہیے!" اس کا لہجہ سخت اور جھنجھلاہٹ بھرا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ اب اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہوچکا ہے، سو میں خاموش رہا۔ اس وقت میں اور کر بھی کیا سکتا تھا۔

کار دوڑتی رہی۔ مجھے کچھ علم نہ تھا کہ ہم کس راستے سے گزر رہے ہیں، کہاں جارہے ہیں۔ میرے لیے یہ تمام علاقہ اجنبی تھا۔ میں خاموشی سے فاطمہ کے اغوا سے اب تک پیش آنے والے واقعات پر غور کررہا تھا۔

پہلی بات تو میری سمجھ میں یہی نہیں آرہی تھی کہ آخر بعض لوگ میری تقرری پر اتنے برہم کیوں تھے جو میری جان کے دشمن ہوگئے تھے؟ پھر آخر وہ مجھے قتل کراکے کیا مقصد حاصل

لرنا چاہتے تھے؟ اور اب یہ بات میری فہم سے بالاتر تھی کہ آخر ان نقاب پوشوں کو مجھ سے کیا دلچسپی پیدا ہو گئی ہے؟ یہ مجھے استاد ڈبلی کے چنگل سے کیوں چھڑا لائے تھے؟ آخر وہ کیا اسباب تھے کہ یک بہ یک دو پارٹیاں مجھ میں دلچسپی لینے لگی تھیں؟ وہ کیا بات تھی کہ اچانک میں بعض لوگوں کے لیے اہمیت اختیار کر گیا تھا؟ بہرحال میں اس نتیجے پر پہنچ گیا تھا کہ اب میں جن لوگوں کے درمیان تھا اور جنہیں میں پہلے اپنا تنظیمی ساتھی سمجھا تھا، وہ ہماری تنظیم سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔

میں خیالات کی ذہنی بھول بھلیوں میں گم تھا کہ اچانک میری نظر سامنے کھڑی دوڑتی سڑک کے کنارے ایک گھڑ سوار پولیس پارٹی پر پڑی جیسے ہی کار ان پولیس والوں کے پاس سے گزری میں پوری قوت سے چیخا تھا "مدد! بچاؤ! ہیلپ"

اسی وقت میری کھوپڑی جھنجھنا اٹھی۔ کئی پھلجھڑیاں سی چھوٹیں، پھر نقاب پوش کے مضبوط ہاتھ میری گردن پر جم گئے اور آخرکار میرے ذہن پر تاریکی کی چادر پھیل گئی۔ اس سے قبل میں نے محسوس کیا تھا کہ کار کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔

○☆○

میں اس وقت بھی کار میں تھا جب اس بے ہوشی سے نکلا مگر اب میری آنکھوں پر پٹی بندھی ہوئی تھی، منہ میں کپڑا ٹھنسا ہوا تھا اور ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ میری ران، میرا سر اور پنجے بری طرح دکھ رہے تھے۔ کار رکی ہوئی تھی۔ میں اپنی جگہ کسمسایا، کچھ ہوں ہاں کی تو اسی وقت نقاب پوش نے مجھے آواز دی "مسٹر! بس چپ چاپ بیٹھے رہو۔ میں بلا کسی وجہ کے کسی کو مارنے پیٹنے سے بچتا ہوں لیکن جب مجھے مجبور کر دیا جاتا ہے تو انتہائی قدم سے بھی گریز نہیں کرتا۔"

میں خاموش ہو گیا بلکہ اپنی جگہ ساکت ہو گیا۔ اب مجھ میں اتنی سکت نہیں رہی تھی کہ مزید مارپیٹ کا متحمل ہو سکتا۔ شاید اسی کیفیت میں مجھے صدیاں گزر گئیں پھر میں نے کار کا دروازہ کھلنے اور نقاب پوش کے کھنکنے کی آواز سنی۔ اس نے ذرا سی دیر بعد کہا تھا کہ "ابھی آ گئے شیام دت، آگے کے پیچھے چلے گئے تھے مجھے دیدینے!"

اس کے جواب میں ذرا سی دیر بعد دبا دبا قہقہہ لگایا۔

"آ گئے ہو شیام دت!" نقاب پوش کی آواز سنائی دی۔

"تم۔ تم۔ کیوں بلایا ہے مجھے؟" تانا شیام دت ہی نے جواب دیا۔ یہ آواز پہلے بھی میں سن چکا تھا مگر مجھے یاد نہیں آیا کہاں سنی تھی۔ میں اس آواز کو کسی شخصیت سے وابستہ نہیں کر سکا تھا۔

"سیٹھ!" نقاب پوش کی آواز ابھری "ہاتھی سے گنے چھینے چلے تھے۔ ادھر آؤ، میں بتاتا ہوں کیوں بلایا ہے!"

اس وقت مجھے یاد آ گیا کہ یہ آواز اسی سیٹھ کی تھی جس نے استاد ڈبلی سے مجھے اغوا کرایا تھا۔ میں نے قدموں کے آگے بڑھنے کی آواز سنی۔ یہ آوازیں کار کے پاس آ کر رک گئیں پھر میں نے اپنی ناک کے بانسے کے نیچے پٹی کی جھری سے روشنی چکراتی دیکھی۔ روشنی یقیناً میرے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"یہ وہی علی گڑھ کا طالب علم شاہین ہے اور اب میرے قبضے میں ہے۔"

"مگر۔ کیا؟ یہ تو ڈبلی کے پاس تھا۔" سیٹھ کی آواز آئی۔

"ہاں آدھے گھنٹے پہلے تک!" میں نے نقاب پوش کی آواز سنی "اسے حاصل کرنا ہے تو سودا کر لو۔"

"ہم۔ مگر۔ مگر" سیٹھ شیام دت کچھ نہ کہہ سکا اور ہکلا کر رہ گیا۔

"سوچ لو! کل بارہ بجے مجھے جواب مل جانا چاہیے اگر اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو ٹھیک بارہ بجے اسی جگہ آ جانا تنہا! میں چھ ہزار میں اسے تمہارے حوالے کر سکتا ہوں۔"

"چھ ہزار!" سیٹھ شیام دت نے جیسے ہچکی لے کر کہا۔

"کم نہ زیادہ، چھ ہزار اور باقی کام بھی مجھی سے کرانا چاہتے ہو تو مزید دو ہزار روپے!"

"دو ہزار اور؟"

"ہاں دو ہزار اور!" نقاب پوش بولا "ویسے ڈبلی کو اب تک پولیس گرفتار کر چکی ہو گی۔"

"پولیس!" شیام دت کی کپکپاتی آواز سنائی دی۔

"ہاں" نقاب پوش نے کہا "اس لیے دوسرا کام بھی تمہیں مجھی سے کرانا ہو گا۔ آٹھ ہزار دے دیے تو دونوں کام ہو جائیں گے۔ چھ ہزار دو گے تو شاہین کو تمہارے حوالے کر دیا جائے گا نہیں دو گے تو ٹھیک بارہ بجے کے پندرہ منٹ بعد اسے چھوڑ دیا جائے گا۔ اسے تمہارا نام معلوم ہی ہے، پتا اور بتا دیا جائے گا پھر یہ اس کی مرضی ہو گی کہ یہ پولیس کے پاس جائے یا خود تم سے انتقام لے۔" نقاب پوش انسانی نفسیات خوب سمجھتا تھا۔

"تو کیا ڈبلی کو واقعی پولیس۔"

"ہاں" نقاب پوش بات پوری ہونے سے پہلے ہی بول اٹھا "جس وقت ہم اسے وہاں سے لے کر چلے تھے، پولیس وہاں پہنچ گئی تھی۔" وہ ٹھیک کہہ رہا تھا یا غلط، میں اس وقت کوئی اندازہ نہیں کر سکا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ دو کاریں جنہیں میں نے میدان میں بڑھتے دیکھا تھا، پولیس ہی کی ہوں۔

"ہائے رام! اگر اس نے بتا دیا تو؟" شیام دت کی گھبرائی ہوئی آواز آئی۔

"وہ اتنا بے وقوف نہیں ہے۔" نقاب پوش نے یقین دلایا "اچھا میں چلتا ہوں۔ دن کے بارہ بجے ملاقات ہو گی۔"

میں نے نقاب پوش کو اپنے برابر بیٹھتے محسوس کیا۔

"ارے ارے رکو!" شیام دت بے تابی سے بولا "آٹھ ہزار بہت زیادہ ہیں، چار ہزار میں دونوں کام کر دو۔ ڈبلی تو دو ہزار میں راضی ہو گیا تھا۔"

"تو پھر ڈبلی ہی سے کام کرا لینا۔" نقاب پوش نے کہا "چاہو تو بارہ بجے آ جانا ورنہ تمہاری مرضی! میں تمہیں بتا ہی چکا ہوں پھر کیا ہو گا!"

"ارے ارے ٹھہرو!" شیام دت کی آواز پھر سنائی دی "چھ ہزار لے لو۔"

"ٹھیک ہے۔ تو پھر بارہ بجے یہ تمہارے گھر پہنچا دیا جائے گا۔ رقم ابھی دے رہے ہو تو اسی وقت چھوڑ جاتے ہیں۔"

"نہیں نہیں۔" شیام دت کے لہجے سے پریشانی عیاں تھی۔ "چھ ہزار میں تمہیں سب کام کرنا ہو گا۔ میرے پاس اس سے زیادہ نہیں ہے۔"

"پھر بھی تمہارے پاس دو ہزار بچ جائیں گے۔" نقاب پوش کہنے لگا "یقین کرو میں دینش چودھری کو نہیں بتاؤں گا کہ تم نے دو ہزار کی رقم بچا لی ہے۔"

"کیا!" شیام دت تقریباً چیخ اٹھا "تمہیں کیا پتا دینش چودھری کا!"

"پتا نہ ہوتا تو میں یہاں ہوتا نہ تم! ہاں تو بولو آٹھ ہزار مجھے دے کر بھی دو ہزار کے فائدے میں رہو گے۔"

"میں دو ہزار ڈبلی کو بھی تو دے چکا ہوں۔"

"میں ان دو ہزار کی نہیں، اس دو ہزار کی بات کر رہا ہوں جو تمہیں اپنے پاس سے ملانے تھے۔ تم نے اس کام کے بارہ ہزار ہی بتائے تھے نا۔"

جواب میں شیام دت کی بڑبڑاہٹ سنائی دی "یہ۔ یہ" وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا "تم۔ تم بدذات ہو۔" اسے شاید کوئی گالی ہی نہیں سوجھ رہی تھی۔

"بدذات تو تم ہو شیام دت۔" نقاب پوش جواباً بولا "ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں۔"

"ارے رکو تو!" شیام دت کی آواز آئی "ٹھیک ہے آٹھ ہی لے لو مگر بارہ بجے تک مجھے سب کچھ معلوم ہو جانا چاہیے اور اسے ٹھکانے بھی لگانا!"

"ڈن!" نقاب پوش نے کہا۔

"آؤ میرے ساتھ!" شیام دت بولا۔

"یہیں لے آؤ! اور دیکھو زیادہ چالاک بننے کی کوشش نہ کرنا۔"

"مجھے اور کچھ بھی بتانا ہے تمہیں۔"

"میں سب جانتا ہوں۔" نقاب پوش کی آواز ابھری "تمہیں اس سے کیا کیا سوال کرنے ہیں، مجھے معلوم ہے تمہیں سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔"

شیام دت کی بڑبڑاہٹ کی آواز آئی پھر قدموں کی دور ہوتی آوازیں ابھریں۔

"جلدی شیام دت جی! میں دس منٹ سے زیادہ نہیں رکوں گا۔" نقاب پوش نے ہانک لگائی۔

شیام دت کے قدموں کی آواز رات کے سناٹے میں گم ہو گئی۔

اس وقت میری کیفیت وہی تھی کہ آسمان سے گرا کھجور میں اٹکا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اب میری زندگی اور موت کے درمیان صرف چند گھنٹوں کا فصل باقی رہ گیا ہے۔ میں اپنی جگہ ایک مرتبہ پھر کسمسایا، ہاتھوں کو ادھر ادھر جنبش دے کر بندشوں کو ڈھیلا کرنے کی کوشش کی مگر بندشیں بہت سخت تھیں۔ میری اس کوشش کو نقاب پوش نے بھی محسوس کر لیا تھا۔ اسی سبب اس نے میری دکھتی ہوئی ران پر زوردار دھپ ماری۔ تکلیف کی وجہ سے میں بے اختیار چیخنے لگا مگر یہ چیخیں اندر ہی اندر گھٹ کر رہ گئیں کیونکہ میرے منہ پر کپڑا بندھا ہوا تھا۔ شدید تکلیف سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"مسٹر!" نقاب پوش کی سرد آواز ابھری "میں نے تم سے کہا تھا کہ بلاوجہ خود کو تکلیف میں نہ ڈالو۔"

میں اپنی جگہ بے حس و حرکت ہو گیا۔ واقعی بلاوجہ اذیت مول لینے سے فائدہ بھی کیا تھا۔

کوئی پندرہ منٹ بعد کار حرکت میں آئی۔ میری موت کا سودا پکا ہو گیا تھا۔ شیام دت دس منٹ بعد وہاں پہنچ گیا تھا اس پر نقاب پوش نے فقرہ بھی چست کیا تھا پھر چند منٹ رقم کی گنتی میں لگے تھے۔ میں پھر اپنی جگہ کسمسایا، اس مرتبہ تشدد کے بجائے نقاب پوش نے مجھے دلاسا دیا "بے فکر رہو چند منٹ کی بات اور ہے۔"

میرے خیالات اس وقت قطعی بے ترتیب ہو گئے تھے۔ بچپن سے لے کر اب تک کے واقعات میرے ذہن میں بجلی

ے ونڈوں کی طرح چیخے اور … تھے رہے۔ میں بہت کوشش کر رہا تھا کہ اپنے خیالات کو اس وقت کے حالات پر مرکوز رکھوں لیکن زندگی کی طرف سے جب مایوسی ہو جائے تو ذہن شاید اسی طرح بے قابو ہو جاتا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ مجھے پُراسرار ہستی تک کا خیال نہیں آیا۔ معلوم نہیں' وہ کہاں تھی؟ مجھ پر جو گزر رہی تھی' اسے علم بھی تھا یا نہیں؟ اور اگر علم تھا تو وہ میری مدد کیوں نہیں کر رہی تھی؟ اب تو مجھے اس پر بھی شک ہو رہا تھا کہ جب میں موت کے دہانے پر پہنچ جاؤں گا تو میرے اندر جناتی صفات پیدا ہو جائیں گی اور میں بچ جاؤں گا۔

پھر ایک جگہ کار رک گئی۔ ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا ہوا شخص کار سے اترا' اس کے ساتھ نقاب پوش بھی جو میرے برابر بیٹھا تھا' کار سے نکل گیا۔ وہ یقیناً دوسرے شخص کو کوئی ہدایت دے رہا تھا۔ چند منٹ بعد وہ پھر میرے پاس آبیٹھا اور کار حرکت میں آگئی۔

اس مرتبہ یہ سفر چند منٹ سے زیادہ کا نہیں تھا۔ کار رک گئی تو مجھ سے اترنے کو کہا گیا پھر میں اتر گیا تو کار کے روانہ ہونے کی آواز آئی۔ کئی سیڑھیاں چڑھ کر ہم اوپر آئے پھر میں نے آواز سے اندازہ لگایا کہ تالا کھولا گیا ہے۔ اس کے بعد دروازہ کھلا اور نقاب پوش میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اندر لے گیا۔ چند قدم چلنے کے بعد مجھے ایک جگہ کھڑا کر دیا گیا اور میری آنکھوں پر بندھی ہوئی پٹی کھول دی گئی۔

میں اس وقت ایک بڑے سے آراستہ کمرے میں تھا۔ فرش پر دبیز قالین بچھا ہوا تھا۔ فرنیچر کے حساب سے وہ کمرا ڈرائنگ روم معلوم ہوتا تھا۔ کمرے کی آرائش صاحب خانہ کی خوش ذوقی اور نفاست کا مظہر تھی۔ سامنے دیوار پر کلاک آویزاں تھا۔ اس وقت پانچ بج کر چند منٹ اوپر ہوئے تھے گویا میری زندگی کے چند گھنٹے ابھی باقی تھے۔

"تشریف رکھیے مسٹر شاہین!" اس شخص نے نہایت شائستگی سے کہا جسے میں اب تک نقاب پوش لکھتا رہا ہوں۔ اب اس کے چہرے پر نقاب نہیں تھا۔ میں نے اسے اس کی آواز سے پہچانا تھا۔ وہ ایک وجیہہ نوجوان تھا' چہرے سے ذہانت کے ساتھ عیاری' شائستگی کے ساتھ سفاکی اور لہجے میں اعتماد کے ساتھ مکاری عیاں تھی۔ اس کا چہرہ تضادات کا نمونہ تھا۔ اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے مسکراہٹ کی لکیریں قوس بناتی تھیں تو ماتھے پر غصے کی شکنیں ابھر آتی تھیں۔ عجیب دوغلا' دورُخا اور دھوکے باز چہرہ تھا۔ وہ بڑے پیار سے پھر کہنے لگا "بیٹھو یار!" اسی کے ساتھ زور سے مجھے پیچھے دھکا دیا۔

میں لڑکھڑا کر صوفے پر گر گیا۔ میں اس بدتمیزی پر اس سے کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

"میں ہر کام چپ چپاتے اور نفاست سے کرنے کا عادی ہوں۔ ہڑبونگ اور شور و غوغا مجھے پسند نہیں۔ کسی کو جان سے مارنا ہو تو اسے بلاوجہ قتل کرنے سے پہلے اذیت دینا بھی میری فطرت نہیں۔ جو لوگ مجھ سے تعاون کرتے ہیں سکون سے مر جاتے ہیں اور جو تعاون نہیں کرتے' انہیں ایسی اذیتوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ ـــــ" وہ جھرجھری لے کر خاموش ہو گیا اور اپنے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے "مجھے خود بہت تکلیف ہوتی ہے۔ احمق بلاوجہ سکون و اطمینان کی موت کے بجائے غلط راہ اختیار کرتے ہیں۔" وہ خاموش ہو کر اس طرح ٹہلنے لگا جیسے کوئی پروفیسر کلاس لیتے ہوئے ادھر ادھر ٹہل کر لیکچر دیتا ہے "اوہ ہاں' تمہارا منہ بند ہے۔" یہ کہہ کر وہ آگے بڑھا اور میرے منہ پر بندھا ہوا کپڑا کھول دیا۔

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر تم لوگ چاہتے کیا ہو؟" زبان بندی ختم ہوتے ہی میں بول اٹھا۔

"ہاں میں بتاتا ہوں' آدمی کے لیے سکون سے مرنے کی خاطر یہ بہت ضروری ہے کہ اسے یہ بھی معلوم ہو کہ وہ مر کیوں رہا ہے!" اس نوجوان نے کہا "میں تمہاری بے چینی اچھی طرح سمجھتا ہوں۔ دراصل ہر آدمی مرنے سے پہلے اپنے مرنے کی وجہ جاننا چاہتا ہے۔ تو سنو!" وہ چند لمحے رکا پھر بولا "میرا خیال ہے اگر ڈیپی تمہیں وجہ بتا دیتا کہ تمہیں کیوں قتل کیا جا رہا ہے تو تم اسے ہر سوال کا جواب آسانی سے دے سکتے تھے۔"

"ڈیپی مجھ سے بے سروپا سوال کر رہا تھا۔" میں بولا۔

"میں جانتا ہوں" اس نے کہا "بہرحال میں نے اپنے ساتھی کو سائنائڈ لینے بھیجا ہے ممکن ہے تمہیں پتا نہ ہو کہ سائنائڈ بہت زود اثر زہر ہوتا ہے۔ زبان پر اس کا ایک قطرہ ٹپکتے ہی زندہ انسان لاش میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ نہ مارنے والے کے لیے کوئی مصیبت نہ مرنے والے کو کوئی تکلیف! تمام کام چٹ پٹ ہو جاتا ہے۔ آج تک کوئی شخص اس زہر کا ذائقہ نہیں بتا سکا۔ اس کے استعمال کے بعد اتنی مہلت ہی نہیں ملتی۔ میں' تمہیں بھی اسی زہر سے ماروں گا۔"

آنکھوں میں دنیا اندھیر ہو جائے تو آدمی کی قوت گویائی سلب ہونے لگتی ہے پھر بھی میں نے ہمت کی اور بولا "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا کہ آخر مجھے کیوں قتل کرنا چاہتے ہو؟ کوئی وجہ تو ہو گی اس کی!"

"ہاں تمہارے سوال کا جواب بھی دینا ضروری ہے۔" وہ بولا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی "تمہیں ذہنی طور پر مرنے کے لیے آمادہ تو کرنا ہی پڑے گا' مطمئن تو کرنا ہو گا نا نہیں! ورنہ آدمی بڑی مشکل سے مرنے پر تیار ہوتا ہے حالانکہ یہ کوئی ایسی بات نہیں۔ دیر ہی کتنی لگتی ہے مرنے میں۔ بہت سے لوگوں کو میں نے خود اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے۔ دراصل سارا ہنگامہ مرنے سے پہلے پہلے ہی کا ہے پھر تو سکون ہی سکون ہوتا ہے! بات دراصل یوں ہے کہ ـــ" وہ رکا "[…]میں تمہیں پہلے یہ بتا دوں کہ یہ سب کچھ کیوں بتا رہا ہوں! یہ اس وقت حکومت کا سب سے بڑا راز ہے۔ کم از کم میرے خیال کے مطابق اس کی تہ میں جو فلسفہ کار فرما ہے اسے ڈیوائڈ اینڈ رول کہا جا سکتا ہے۔ بات یہ ہے کہ جب سے مولانا جوہر اور ان کے ساتھی رہا ہوئے ہیں۔ ہندو مسلم اتحاد مضبوط ہوا ہے۔ حکومت ہندوستانیوں کے سیاسی اتحاد سے اس وقت بہت گھبرائی ہوئی ہے۔ گزشتہ سال جو ہندو مسلم فسادات ہوئے اور جن کی وجہ سے ہندو اور مسلمانوں کے درمیان دوری پیدا ہو گئی وہ دوری اب پھر قربت میں بدلتی جا رہی ہے۔ اس اتحاد کو کمزور کرنے کے لیے حکومت اب پھر وہی آزمودہ نسخہ آزمانا چاہتی ہے یعنی ہندو مسلم فساد! کچھ آیا سمجھ میں۔ ارے ہاں' میں تمہیں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ یہ سب تمہیں کیوں بتا رہا ہوں۔ اس لیے شاہین کہ تمہیں یہ راز بتانا ایسا ہی جیسے میں اس وقت خالی کمرے میں اپنے آپ سے گفتگو کر رہا ہوں' خود کلامی سے مراد ہے میری! تم میرے لیے ابھی سے مر چکے ہو۔ ایک مردہ آدمی کسی بھی راز کا سب سے بہتر امین ہوتا ہے' زندہ آدمی تو گراموفون کا ریکارڈ ہوتا ہے کہ چابی دی بجتا چلا' سوئی رکھی اور اس نے بولنا شروع کر دیا۔ خیر' ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" وہ خاموش ہو گیا۔

میں جانتا تھا' اس وقت وہ میری بے بسی سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ میں لقمہ دوں مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔

"ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔" اس نے اپنی گفتگو کا ٹوٹا ہوا سلسلہ جوڑا "حکومت مختلف علاقوں میں مختلف طریقوں سے ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ یہاں اس مقصد کے حصول کی خاطر تمہیں استعمال کرنے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ کل تمہاری لاش کلکتے کے کسی علاقے میں پائی جائے گی۔ لاش کے ساتھ ایک خط بھی ہو گا جو کسی انتہا پسند ہندو تنظیم کی طرف سے لکھا گیا ہو گا۔ اس خط میں مسلمانوں کو برا بھلا کہا جائے گا' ساتھ ہی یہ بھی کہا جائے گا کہ ہندوستان کا کوئی ہندو کسی مسلمان کو ہرگز یہ اجازت نہیں دے گا کہ وہ مہاتما گاندھی یا کسی بھی ہندو لیڈر کو برا بھلا کہے۔ اس سے کلکتے میں تو فساد ہو گا ہی' اس کے ساتھ علی گڑھ بھی فساد کی زد میں آ جائے گا کیوں کہ تم وہیں کے طالب علم ہو۔"

اس کی یہ باتیں سن کر میرے ہوش اڑ گئے۔ ملتان میں جو خوں ریزی ہوئی تھی اور جسے ہم نہیں روک سکے تھے' وہ مجھے یاد آ گئی۔ حکومت پھر وہی خونی کھیل کھیلنے کا منصوبہ بنا رہی تھی "مگر وہ شیام دت اور ڈیپی تو سیٹھ صدیق کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے۔" میں بولا۔

"یہ بھی اسی منصوبے کا حصہ ہے۔ ڈیپی اور اس کے ساتھیوں کے ذریعے یہ بات یقیناً کچھ اور لوگوں تک بھی پہنچے گی کہ سیٹھ صدیق نے گاندھی جی کے خلاف تقریر کرائی۔ ایسی باتیں پر لگا کر اڑتی ہیں اور جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی ہیں۔ اس منصوبے میں شیام دت کی حیثیت محض آلۂ کار کی ہے۔ کیا سمجھے مسٹر شاہین!"

"مگر میرا خیال ہے' حکومت کی اس سازش سے ہندو اور مسلمان لیڈر دونوں ہی آگاہ ہیں کیوں کہ یہ کھیل نیا نہیں رہا اب! شیام دت نے ڈیپی کو بتایا تھا کہ میرے قتل کے احکام جاری ہو چکے ہیں۔" میں نے اندھیرے میں تیر چلایا۔

"ضرور بتایا ہو گا! اس لیے کہ اس منصوبے سے مسلمان اور ہندو لیڈروں کو حکومت کے پٹھوؤں نے آگاہ کیا ہے۔" اس نے فاتحانہ انداز میں مجھے دیکھا۔

"کیا مطلب؟ خود حکومت نے؟" میری سمجھ سے یہ بات بالا تھی۔

"ہاں مگر ذرا مختلف انداز میں۔" اس نے جواب دیا "شاید تمہیں معلوم نہیں کہ ہندو اور مسلمان لیڈروں میں بہت سے ایسے بھی ہیں جو حکومت کے تنخواہ دار ہیں' زرخرید! یہ لوگ سیاسی پارٹیوں میں رہ کر حکومت کے لیے جاسوسی کرتے ہیں۔ ان جاسوسوں کے بڑے فائدے ہوتے ہیں۔ ایک تو ان کے ذریعے سیاسی پارٹیوں کے راز حکومت کو معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ انہی کے ذریعے پارٹیوں میں بے اعتمادی' بددلی اور مایوسی پھیلائی جاتی ہے۔ یہ لوگ تمام اہم مسائل پر ہونے والے مباحثوں کو الجھا دیتے ہیں اور فروعی مسئلوں کو نہایت اہم بنا کر انہیں پارٹی کی سطح پر

جذباتی انداز میں اس شدت سے اُبھارتے ہیں کہ وہی سب سے اہم مسئلہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اب یہی دیکھ لو کانگریس کی مجلس عاملہ تحریکِ خلافت کی قرارداد کی حمایت میں ایک قرار داد بھی آج تک منظور نہیں کر سکی۔ زور دیا گیا بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ پر! بدیسی کپڑے کے بائیکاٹ سے کیا ہوگا' صرف یہی کہ بدیسی کپڑے کی مانگ بڑھے گی کیوں کہ بائیکاٹ کی عملی صورت یہ بتائی گئی کہ بدیسی کپڑا جلا دیا جائے۔ پرانا کپڑا یا اسٹاک میں موجود کپڑا جلا دیا جائے گا تو اس کی جگہ نیا کپڑا آئے گا اور مانچسٹر کے کارخانے زیادہ مصروف ہو جائیں گے۔"

وہ خاموش ہو گیا تو میں نے پوچھا "مگر یہ سب باتیں تمھیں کیسے معلوم ہوئیں؟" مجھے اس کی باتوں میں وزن معلوم ہو رہا تھا۔

"میں بہت اہم آدمی ہوں!" وہ عجیب سے انداز میں مسکرایا "تمھیں تو خیر مرنا ہی ہے اس لیے تمھیں یہ بھی بتائے دیتا ہوں۔" اس نے گھڑی دیکھی "بس دس منٹ کے اندر اندر سائنائڈ آ ہی جائے گا۔ اس کے بعد تم ایک لاش میں تبدیل ہو جاؤ گے۔ ایسی صورت میں کوئی حرج نہیں کہ تمھیں سب کچھ بتا دیا جائے۔ بہتر یہی ہے کہ تم کوئی حسرت دل میں لے کر نہ مرو' تم اس اطمینان کے ساتھ مرو کہ تمھیں اس راز کی ہر تفصیل معلوم تھی۔ بہرحال سنو! میں صوبہ بنگال کے گورنر کے عملے کا آدمی ہوں۔ بنیادی طور پر میں سی آئی ڈی کا ملازم ہوں۔ سیاست سے متعلق گورنر صرف میری رپورٹ پر بھروسا کرتا ہے۔"

ایک مرتبہ پھر میری موت کا ذکر چھیڑ کر اس نے مجھے صورتِ حال کی سنگینی کا احساس دلایا تھا' جس سے میں دوچار تھا مگر میرے ہاتھ کی بندشیں بہت سخت تھیں۔ میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے ہاتھوں کو اِدھر اُدھر حرکت دی مگر کچھ حاصل نہ ہوا۔

وہ ہنس پڑا "اپنی انرجی کیوں ضائع کر رہے ہو۔ یہ وہ مخصوص گرہ ہے جو کسی بندھے ہوئے آدمی کے لیے کھولنا ناممکن ہے۔"

میں نے اپنی کوشش ترک کر دی اور بولا "ہو سکتا ہے تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر میں ذکی کو اس کے سوالوں کا کیا جواب دے سکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہا تھا اس میں سچائی نہیں تھی۔"

"ارے یار!" اس نے پھر اسی نرم اور تپا دینے والے لہجے میں کہا "تم سے سچ بات کون اگلوانا چاہتا تھا! شیام دت نے اسے چند سوالات بتائے تھے اور اس سے کہا تھا کہ تم سے یہ اعتراف کرانا ہے۔ تم نے شاید سوالوں کی نوعیت پر غور نہیں کیا۔ ہر سوال کے ساتھ اس کا جواب موجود تھا مثلاً کیا تمھیں گاندھی جی کے خلاف تقریر کرنے پر ... صدیق نے اکسایا تھا؟ تم مسلمان گاندھی جی کے خلاف سازش کر رہے ہو وغیرہ وغیرہ۔ شیام دت نے کہا تھا کہ تم سے ان باتوں کا اقرار کرا لے۔ تم انکار کرتے تو وہ تمھیں زیادہ تکلیف دیتا اگر تنگ آ کر اقرار کر لیتے تو وہ سمجھتا کہ تم تشدد سے گھبرا کر صحیح بات کا اقرار کر لیا ہے اگر تم انکار کرتے رہتے تو وہ تمھیں زیادہ سخت جان سمجھتا۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں یہی ہوتا کہ وہ تمھیں ٹھکانے لگا دیتا پھر کیا ہوتا یہ میں تمھیں بتا ہی چکا ہوں۔"

وہ خاموش ہو گیا۔ میں بھی خاموش تھا۔ ابھی میرے ذہن میں کئی اور بھی خیالات و سوالات تھے مگر اس وقت میں صرف اس بات پر سوچنا چاہتا تھا کہ اپنی متوقع موت کو کیسے ٹالا جائے؟ وہ شخص جس نے ابھی تک اپنا نام نہیں بتایا شاید ذہن پڑھنے کی بھی صلاحیت رکھتا تھا یا پھر بہترین چہرہ شناس و قیافہ شناس تھا۔

"اور بھی جو کچھ پوچھنا ہے پوچھ لو' اس کا خیال بھی دل میں نہ لاؤ کہ تم یہاں سے بچ کر جا سکتے ہو۔" وہ بولا۔

"تم نے میرے قتل کے لیے رقم کی بات کی تھی' بارہ ہزار روپے! یہ رقم کس کس نے دی تھی؟ دو ہزار تو اس میں سے شیام دت کے حصے میں آئے تھے۔" میں نے تھوڑی دیر خاموش رہ کر سوال کیا۔ میں اس کے سامنے خود کو خوف زدہ ظاہر کرنا نہیں چاہتا تھا۔ موت تو میرا مقدر بن ہی چکی تھی۔ میں نے سوچا پھر کیوں نہ اپنے دل کی بھڑاس نکال لی جائے۔

"یہ تمام رقم دراصل حکومت ہی کی ہے۔" اس نے جواب دیا "ویسے پانچ مختلف آدمیوں نے دو دو ہزار روپے دیئے تھے اور چھٹا آدمی شیام دت ہے جسے دو ہزار اپنی طرف سے ملانے تھے۔ یہ چھے آدمی حکومت کے تنخواہ دار ہیں۔ خصوصی اخراجات کے لیے حکومت نے انھیں ایک مخصوص فنڈ دے رکھا ہے تاکہ وقت بے وقت یہ لوگ نوٹا دو دو لاکھ روپے تک جمع کر سکیں۔ اس فنڈ سے یہ لوگ اخراجات کرتے ہیں وہ رقم انھیں پھر ادا کر دی جاتی ہے۔ ہر شخص کے پاس پچاس پچاس ہزار روپے اس فنڈ میں موجود ہیں۔ شیام دت کا خیال یہ ہے کہ اس کام کے لیے بارہ ہزار کی ادائیگی اسے کرنا تھی جس میں دو ہزار روپے اسے دینے تھے۔ اب وہ یہ رقم خرچ کیے بغیر حکومت سے دس ہزار روپے وصول کر سکے گا اگر ذکی یہ کام کر دیتا تو اسے مزید آٹھ ہزار کا فائدہ ہوتا۔"

بات میری سمجھ میں آگئی تھی۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے انگریز حکومت کے طریقۂ کار کا علم ہوا تھا۔ یہ لوگ معاشرے میں ایسی حیثیت رکھتے تھے کہ کوئی ان پر شبہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ وہ انگریز حکومت کے پٹھو یا زر خرید ہوں گے۔ انگریز نے دولت سے ان کے ضمیر خرید لیے تھے۔ وہ اپنے ہی ہم وطنوں کو آگ اور خون کی ہولی میں پھونک دینا چاہتے تھے۔

"پوچھو پوچھو یار!" اس نے پھر کہا "اور کوئی سوال بھی کرو! ابھی تو تمھاری موت میں پورے پانچ منٹ باقی ہیں۔ خاموشی میں مجھے نیند آنے لگتی ہے۔ آج تو تمام رات ہی کالی ہو گئی۔"

"یہ بتاؤ کہ اچانک میرے قتل کا فیصلہ کیوں کیا گیا؟ میں تو اس شہر میں بالکل نیا ہوں' یہاں کے لیے قطعی اجنبی ہوں۔ یہاں تو کوئی بھی مجھے نہیں جانتا۔ لگتا تو ایسا ہے کہ اس کی تیاریاں بہت پہلے سے تھیں۔" میں نے دریافت کیا۔

"پہلی بات تو یہ کہ تم اس شہر میں اجنبی تو ضرور ہو لیکن انجانے نہیں۔ تمھاری تقریر کی گونج پورے کلکتے میں ہے۔ ہر شخص کی زبان پر علی گڑھ کے طالب علم شاہین کا ذکر ہے۔ لوگ اس کی تقریر کے حوالے دے رہے ہیں۔ یہ میں تمھاری تعریف نہیں کر رہا' حقیقت بیانی سے کام لے رہا ہوں۔ حقیقتِ حال کی رپورٹ دینا میرے فرائض میں شامل ہے کیوں کہ غلط رپورٹ کی بنیاد پر کبھی صحیح یا موثر اسکیم نہیں بنائی جا سکتی۔ سمجھتے ہو نا! میں سی آئی ڈی میں ہوں۔" وہ چند لمحوں کے لیے رکا' آہستہ سے ہنسا اور کھنکار کر بولا "تم نہ ہوتے تو تمھاری جگہ کوئی اور مسلمان ہوتا۔ تمھارے بارے میں فوری فیصلہ اس لیے کیا گیا کہ تم آج کے ہیرو ہو۔ لوگوں کے جذبات تمھارے لیے بیدار ہیں۔ تمھاری موت سے جتنے موثر نتائج حاصل ہو سکتے ہیں' اس وقت کسی اور کی موت سے یہ نتیجہ حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ تمھارا سیاسی قتل حکومت کے مفاد میں ہے اور کچھ؟" اس نے سوالیہ انداز میں مجھے دیکھا۔

"کیا واقعی اس قسم کی اسکیم پورے ہندوستان کے لیے بنائی گئی ہے۔ کیا جگہ جگہ اسی نوعیت کے سیاسی قتل ہوں گے؟" میں نے یونہی پوچھ لیا حالانکہ مجھے اس کی بات پر یقین آ چکا تھا۔ اسے مجھ سے جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ایک مرتے ہوئے آدمی سے بھلا کون جھوٹ بولتا ہے۔

"بالکل میرے دوست!" اس نے تائید کی "کہیں مسلمان کا قتل تو کہیں کسی نمایاں مقامی ہندو لیڈر کا قتل! حکومت ہر صوبے میں فسادات کرانا چاہتی ہے۔ مقصد واضح ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کو ختم کر دیا جائے۔ ضروری نہیں کہ فسادات سارے ملک میں ایک ہی دن ہوں یا ایک ہی ہفتے میں ہوں۔ بس جیسے کوئی مناسب موقع ملے فسادات کے لیے زمین ہموار کر دی جائے۔ کیا سمجھے! میاں' یہ انگریز حکومت ہے' انگریز کا دماغ ہے!" اس نے پھر گھڑی دیکھی "یہ کمبخت ابھی تک نہیں آیا؟ اب تک اسے زہر لے کر آ جانا چاہیے تھا۔ آتا ہی ہوگا۔" اس نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی جواب دے دیا "اس عرصے میں تم کچھ اور پوچھنا چاہتے ہو پوچھ لو! چند سانسوں کو جو مہلت ملی ہے' اسے غنیمت جانو اس کے آتے ہی تمھیں قتل کر کے میں سو جاؤں گا' بڑی نیند آ رہی ہے۔" اس نے زور سے جماہی لی۔

"خوش قسمت ہو تم کہ آج ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سو جاؤ گے۔ مرنے والے بھی کتنے خوش قسمت ہوتے ہیں! مجھے بار بار شیام دت سے ... بھی پہنچتا ہے۔"

"تم ... سی آئی ڈی کے آدمی ہو پھر تمھیں یہ کام کرنے کی کیا ضرورت تھی؟" میں نے سوال کیا "یہ کام ذکی بھی کر لیتا۔ شیام دت کیا تمھیں نہیں پہچانتا؟"

"میں ایک بے چہرہ آدمی ہوں۔" اس نے خاص انداز اختیار کرتے ہوئے کہا "گورنر سے میری ملاقات ہفتے میں دو مرتبہ ہوتی ہے۔ اس رات گورنر ہاؤس کا ایک خاص دروازہ میرے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ میں اس دروازے سے گورنر ہاؤس میں داخل ہو جاتا ہوں پھر میں گورنر کو رپورٹ دیتا ہوں۔ یہ رپورٹ زبانی ہوتی ہے کیونکہ بہت سی ایسی باتیں ہوتی ہیں جنھیں ضبطِ تحریر میں لانا' مناسب نہیں ہوتا۔ مجھے آج تک کسی بھی شخص نے گورنر ہاؤس میں نہیں دیکھا ہوگا۔ میں بہ ظاہر ایک سیاسی پارٹی کا عام رکن ہوں۔ زور دار نعرے لگانے میں میرا جواب نہیں۔ میری ظاہری زندگی یہ ہے کہ میری ایک چھوٹی سی دکان کیننگ اسٹریٹ پر ہے جس میں میرا ایک ملازم بیٹھتا ہے۔ یہ گویا میری گزر بسر کا ظاہری ذریعہ ہے۔ یہ مکان جس میں تم اس وقت بیٹھے ہو' میری شب بسری کی جگہ ہے۔ یہاں دن کے وقت میرے محکمے کا ایک چپراسی رہتا ہے۔ وہی صفائی اور دیکھ بھال کرتا ہے مگر میں تمھیں یہ سب کچھ کیوں بتا رہا ہوں' مسٹر شاہین!" اس نے حیرانی سے میری طرف دیکھا۔ اس کی گفتگو اور اس کے جملوں سے' اس کے اندر کا شیطان پوری طرح نمایاں تھا۔

"پتا نہیں تم مجھے یہ ساری باتیں کیوں بتا رہے ہو!" میں نے یونہی کہہ دیا۔

"شاید اس لیے شاہین کہ میں تمہارے لیے اپنے دل میں گہری ہمدردی محسوس کر رہا ہوں۔ یقیناً تمہارے ماں باپ، بہن بھائی ہوں گے اور تم یہاں غریب الوطنی میں جام شہادت نوش کر جاؤ گے کیوں، ہے نا؟ تم اسے شہادت ہی کہو گے نا؟ خیر تو یہ بات ہو رہی تھی کہ شیام دت مجھے پہچانتا ہے یا نہیں؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شیام دت بے چارہ مجھے آج سے پہلے نہیں جانتا تھا، البتہ وہ میرے دستخطوں کو ضرور پہچانتا ہے اگر میں ایک کاغذ پر دو ہزار روپے کی رقم لکھ دوں اور اس کے نیچے اپنے دستخط کر دوں تو سمجھو کہ وہ نقد دو ہزار روپیا ہے۔ تم وہ پرزہ لے کر شیام دت کے پاس چلے جاؤ تو وہ دو ہزار کی رقم بے چون و چرا تمہیں دے دے گا مگر افسوس کہ تمہیں اس تجربے کا موقع نہیں ملے گا۔ خیر تو میں پانچ بڑ کروں سے رقم جمع کر کے اس کے پاس دس ہزار روپے لے کر گیا ور اس سے کہا کہ صاحب نے یہ رسید دی ہے 'دو ہزار روپے آپ بھی اس میں جمع کرا دیں۔ ساتھ ہی اسے یہ پیغام بھی بھیجا کہ شاہین کو آپ مجھ سے قتل کرائیں۔ سیٹھ نے مجھ سے سودا کیا۔ معاملہ پانچ ہزار پر پٹا مگر وہ کمبخت بہت لالچی نکلا۔ میرے آتے ہی اس نے ڈپٹی سے معاملہ کر لیا۔ اب یار، تم مانو اگر حکومت ان بھڑوؤں کو پچاس ہزار کا فنڈ دیتی ہے تو کیا ن کی نگرانی نہیں کراتی ہوگی! شیام دت کی نگرانی اس کا ایک لازم کرتا ہے۔ اس نے فوراً یہ خبر اپنے متعلقہ افسر کو دی جو آخر کار مجھ تک پہنچ گئی پھر مجھے جو کچھ کرنا تھا، کر گزرا۔ دولت ی کے ضرورت نہیں ہوتی! شیام دت جیسے آدمی کو بھی اس ی ضرورت ہوتی ہے اور میں تو ایک معمولی سا آدمی ہوں پھر س میں حرج بھی کیا ہے۔ تمہیں قتل ہی تو کرنا ہے اس کام کے بارہ ہزار حکومت دے رہی ہے حکومت کو تو کام چاہیے یہی کرے یا میں۔"

"تو گویا تم مجھے قتل کرنے کا فیصلہ کر چکے ہو؟" میں بولا

"نہیں، نہیں میرے دوست!" اس نے جواب میں کہا "میں نے نہیں حکومت نے یہ فیصلہ کیا ہے۔ میں بھلا فیصلہ کرنے والا کون ہوتا ہوں!" اس نے دونوں کانوں کو ہاتھ لگائے "تمہارے قتل کا حکم حکومت نے صادر کیا ہے۔ میں تو صرف جلاد کے فرائض انجام دے رہا ہوں۔"

"ایک ہندوستانی ہو کر تمہیں ایسا کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟" میں نے اپنی دانست میں آخری حربہ استعمال کیا "تم پڑھے لکھے سمجھدار آدمی ہو، تمہارا نام کیا ہے؟ گفتگو سے تم مجھے مسلمان معلوم ہوتے ہو۔ کیا تم مجھے ایک مسلمان کو س طرح قتل کر دو گے؟ کیا تم نہیں جانتے کہ ایک مسلمان پر دوسرے مسلمان کا خون حرام ہے؟"

"میں کون ہوں!" اس کے لہجے میں بڑی تلخی تھی۔ اس کا چہرا ایک دم سرخ ہو گیا اور جبڑوں کی ہڈیاں ابھر آئیں۔ آنکھوں میں جیسے وحشت ناچنے لگی۔

"میں بتاتا ہوں، میں کون ہوں!" اس نے زور سے صوفے کو ٹھوکر ماری اور اپنے سر کے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑ کر جھٹکے دے ڈالے "میرا نام عبداللہ ہے، بھگوان داس ہے، بھوپیندر سنگھ ہے اور میرا نام چارلس بھی ہے۔" اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ اس نے میز پر رکھی ہوئی ایش ٹرے کو اٹھا کر دیوار پر دے مارا۔ ایش ٹرے دیوار پر لگی ہوئی گھڑی سے ٹکرائی۔ گھڑی کا شیشہ جھنجھنا کر ٹوٹ گیا۔ میں نے گھڑی کو دیکھا۔ ساڑھے پانچ بجنے والے تھے۔ ایش ٹرے کی ضرب سے گھڑی رک گئی تھی "میں ہندوستان کی ایکتا ہوں۔ میں ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اتحاد کی علامت ہوں۔" لگ رہا تھا جسم کا سارا خون اس کے چہرے پر سمٹ آیا تھا "سنو! میں بتاتا ہوں، میں کون ہوں۔"

میں حیران تھا کہ آخر اسے غصہ کس بات پر آگیا تھا۔

وہ بے سدھ ہو کر فرش پر بیٹھ گیا پھر وہ پُرسکون ہوتا گیا۔

"میں اس لیے بتا رہا ہوں، کون ہوں کہ تم یہ بات کسی کو نہیں بتا سکو گے۔" وہ زہریلے انداز میں ہنسا "شملے میں ایک انگریز آفیسر تھا، بڑا رحم دل، نیک اور شریف النفس! ایک نوجوان ہندو عورت اس کے یہاں آیا تھی۔ وہ بیوہ تھی اور حسین بھی پھر ایسا ہوا کہ اس افسر کی کوٹھی کے مالی عبداللہ باورچی بھگوان داس اور ایک ملازم بھوپیندر سنگھ نے رات کے وقت اسے باغ میں پکڑ لیا۔ باری باری تینوں نے اسے پامال کیا پھر انگریز افسر جس کی بیوی ہندوستان ہی میں مری تھی اور جس کی بیٹی کی وہ آیا تھی، اُدھر آ نکلا تینوں ملازم اسے دیکھ کر ہی بھاگ نکلے مگر اس حالت میں ایک جوان و حسین عورت کو دیکھ کر اس انگریز کے اندر موجود مرد بھی جاگ اٹھا۔ سو اس رات وہ عورت اس انگریز کی ہوس کا بھی نشانہ بنی۔ اگلے دن انگریز نے اس سے بہت معذرت کی۔ بہت معافی مانگی مگر جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔ نو ماہ بعد اس عورت کے بچہ ہوا وہ بچہ میں ہوں۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی اتحاد کا مظہر! میری ماں بھی نہیں بتا سکتی تھی کہ میں ان چاروں میں سے کس کا بیٹا ہوں! وہ چاروں ہی میرے باپ تھے۔ میں کس کو اپنا باپ کہوں، کیا بتاؤں میں کون ہوں!" اس کی آنکھوں سے دو موٹے موٹے قطرے رخساروں پر ڈھلک آئے مگر اس کے ہونٹوں کے گوشوں سے پھیلنے والی مسکراہٹ کی لکیر بھی گہری ہو گئی۔

"مجھے ہمدردی ہے تم سے۔" میں نے کہا۔ مجھے اس وقت کوئی جملہ ہی نہ سوجھا۔ میں واقعی بہت افسردہ ہو گیا تھا۔

"شکریہ!" اس نے بڑے طربیہ انداز میں یہ لفظ ادا کیا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے اپنے غصے پر قابو پالیا تھا۔ وہ جو ایک خوابیدہ آتش فشاں تھا، ذرا دیر جاگ کر، اندر ہی اندر کھول کر پھر ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ اب وہ پھر وہی سرد مزاج شخص تھا۔

"تو کیا اس انگریز نے تمہاری ماں سے شادی کر لی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ انگریز اتنا شریف بھی نہیں تھا۔ اس نے صرف اتنا کیا کہ میری ماں کو بہت محبت سے پناہ دی بدلے میں میری ماں کی تنہائیاں آباد کرتا رہا پھر جب میں پیدا ہوا تو میری پرورش بھی اس نے کی۔ جب میں پانچ برس کا ہوا تو وہ انگریز مر گیا۔ اس نے اپنی وصیت میں میری ماں کے لیے بھی تھوڑی بہت رقم رکھی تھی۔ یہ رقم اتنی تھی کہ میری ماں نے مجھے میٹرک تک تعلیم دلائی۔" یہ کہہ کر وہ پھر ٹہلنے لگا "یہ کمبخت ابھی نہیں آیا۔" اس نے کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی "میرا خیال ہے کہ آتا ہی ہوگا" پھر جیسے اسے کچھ یاد آگیا "تم نے مجھ سے کہا تھا کہ مجھے ایک ہندوستانی کو قتل کرتے ہوئے شرم نہیں آتی؟ ہاں ہاں نہیں آتی۔ نہیں آئے گی شرم! میں۔ میں تمام ہندوستانیوں کا دشمن ہوں۔ مجھے ان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ یہ ہندوستان اور اس میں بسنے والے کروڑوں افراد مجھے ایک باپ تو نہیں دے سکے۔ تمہیں پتا ہے، میری ولدیت کا خانہ خالی ہے۔ میرے سرٹیفکیٹ میں میرا نام رحمان چارلس لکھا ہے، سن آف شانتی! میں نے لوگوں کو کیا کیا کہانیاں نہیں سنائیں! کبھی کہا میرا باپ میرے پیدا ہونے سے پہلے مر گیا تھا۔ میری پیدائش سڑک کے کنارے اس طرح ہوئی کہ میری ماں مر گئی۔ ادھر سے گزرنے والے ایک شخص چارلس نے مجھے اسپتال پہنچایا اور پھر اسی نے میری پرورش کی۔ میری ماں کسی کو یہ بھی نہ بتا سکی کہ میرے باپ کا نام کیا تھا مگر میری یہ کہانیاں، کہانیاں ہی رہیں۔ میں نے اپنے حرامی پن کو چھپانا چاہا، اس کے لیے جھوٹ بھی بولا مگر لوگوں کی زبان بند نہ ہو سکی۔ اب مجھے اس ملک سے، اس کے لوگوں سے کوئی دلچسپی نہیں۔ میرا دھرم، میرا دین، میرا ایمان صرف دولت ہے، وہ دولت جس کے سہارے میری ماں نے مجھے میٹرک کرایا۔ اس کی خاطر میں گاندھی جی کو بھی قتل کر سکتا ہوں اور محمد علی جوہر کو بھی! کیا سمجھے" وہ خاموش ہو گیا اور میز پوش گھسیٹ کر اس سے اپنا چہرہ صاف کرنے لگا۔

کمرے میں گمبھیر خاموشی چھائی تھی۔ اب میرے پاس کہنے کے لیے کچھ نہ تھا پھر بھی میں نے کہا "تمہارا انداز فکر غلط ہے رحمان! یہ حادثہ کسی بھی عورت کے ساتھ پیش آسکتا تھا، کوئی بھی عورت ایسے حالات کا شکار ہو سکتی تھی۔"

"مسٹر!" وہ بولا "بس اب اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں ہوگی۔ بہرحال تمہیں قتل کرنے کا مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا۔" اسی وقت زینے پر قدموں کی آواز آئی "لو بھئی وہ زہر لے کر آ ہی گیا! صرف ایک قطرہ تمہاری زبان پر پڑے گا اور تم تمام فکروں سے آزاد ہو جاؤ گے۔"

"مگر۔" میں نے کچھ کہنا چاہا۔

اس نے اٹھ کر زور سے میرے منہ پر تھپڑ مارا "کہہ دیا خاموش رہو! خاموشی ہزار بلائیں ٹالتی ہے۔"

میں حیرانی سے منہ پھاڑے رہ گیا۔ زینے پر قدموں کی آوازیں واضح ہوتی چلی گئیں۔

"بے جلدی آ! کیا ہو گیا آج تجھے۔" رحمان نے آواز لگائی پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ میں نے بے چین ہو کر پہلو بدلا۔ میں مرنا نہیں چاہتا تھا۔

عین اسی لمحے میرے گرد پراسرار اسنی کی مخصوص مانوس خوشبو چکرائی اور پھر اسنی کی آشنا آواز میں نے سنی "طارنوش! آزمائش کا وقت ختم ہونے والا ہے کہ یہی خدا کی مصلحت تھی۔ تم بہت جلد اس عذاب سے نجات پانے والے ہو۔"

مگر کیسے اسنی؟ میری ذہن میں سوال ابھرا۔

"ابھی چند لمحوں میں معلوم ہو جائے گا۔" اسنی کا جواب سنائی دیا اور پھر اس سے پہلے کہ میں اس سے پوچھ سکتا "اب تک وہ کہاں تھی" اس کی خوشبو معدوم ہو گئی۔ وہ چلی گئی۔

میں جب زندگی سے قطعی مایوس ہو چکا تھا تو اسنی نے زندگی کی خوش خبری دی تھی۔ اس سے میں نے اپنے اندر ایک نیا حوصلہ محسوس کیا۔

"رحمان!" دروازے کی طرف سے آواز آئی۔ اس آواز میں عجیب سی لرزش تھی۔ مجھے اس آواز میں خوف کا تاثر محسوس ہوا۔

"کیا ہے بے؟" اپنی کہانی سنانے کے بعد رحمان اپنا رکھ رکھاؤ بھول گیا تھا۔ اب اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی، شائستگی دم توڑ چکی تھی۔

"ذرا ادھر آؤ! بہت اہم بات ہے۔"

"کیا مصیبت ہے!" رحمان کچھ جھلایا ہوا اٹھا "ایک تو اتنی دیر کر دی" وہ تیز تیز قدموں چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

میں جلدی سے ... میں نے سوچا تھا کہ کھڑکی کے ٹوٹے ہوئے شیشے کی دھار سے رسی کاٹنے کی کوشش کی جائے۔ اسی وقت مجھے کمرے کے باہر ہاتھا پائی کی آواز سنائی دی پھر ذرا سی دیر میں یہ آوازیں ختم ہو گئیں۔ اگلے ہی لمحے میں خوش گوار ترین حیرت سے دوچار تھا۔ وہ آواز ہی ایسی تھی۔ اسی کی پیش گوئی غلط نہیں تھی۔

"شاہین!" فاطمہ کی آواز گونجی "کہاں ہو تم؟"

"فاطمہ!" میں نے جواب میں آواز دی۔

پھر چند ہی لمحے بعد فاطمہ میرے سامنے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور میرے سینے سے اپنا سر لگا دیا "شاہین! میرے شاہین!" وہ اس کے سوا کچھ اور نہ کہہ سکی۔ شاید کچھ اور کہنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔

"کیسی ہو گیا؟" میں نے اس کے ماتھے پر ہونٹ رکھتے ہوئے کہا "میرے ہاتھ کھولو!"

"جوگیندر بھیا اور بخت خاں بھی ساتھ ہیں۔" فاطمہ نے بتایا "وہ رحمان کا بندوبست کر رہے ہیں۔"

میں حیرت سے بولا "بخت خاں، جوگیندر سے کب ملا؟"

"آج ہی چند گھنٹے پہلے!" فاطمہ نے جواب دیا "بخت خاں کو تم سے رابطے کا حکم ملا تھا۔ پہلے اس نے تمہیں موتی سیٹھ کے مسافر خانے میں دیکھا پھر وہ کوٹھی پہنچ گیا۔ اسے کسی گڑبڑ کا احساس ہو گیا تھا ورنہ رات ہی کے وقت تالی جی نہ پہنچ جاتا! تمہارے اغوا کے چند ہی منٹ بعد وہ کوٹھی پر پہنچ گیا تھا پھر بھیا نے اسے نہیں جانے دیا۔"

ذرا سی دیر میں میرے ہاتھ کھل چکے تھے۔ میں فاطمہ کے چہرے کو ہاتھوں میں لے کر صرف اتنا کہہ سکا "میری جان، میری اچھی سی فاطمہ۔"

"ہائے شاہین! میں تو جیسے جیتی جی مر گئی تھی۔" فاطمہ نے میرے ہاتھوں کو زور سے دبایا۔

"شاہین تو ٹھیک ہے فاطمہ؟" جوگیندر کی آواز آئی۔

"ٹھیک ہوں دوست!" اس وقت میری مسرت کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ میں نے موت کو چند لمحوں کے فرق سے شکست دے دی تھی مگر یہ شکست میں نے دی تھی یا جوگیندر اور فاطمہ نے؟

"ٹانگ کا کیا حال ہے؟" جوگیندر کی آواز ابھری۔

"لنگڑا کر چل سکتا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ فاطمہ بار بار میرے ہاتھوں کو چوم رہی تھی۔

"تم وہیں بیٹھو، میں ابھی آیا۔" جوگیندر کی آواز سنائی دی۔

بیٹھا تو شاہین ... کرنے لگا۔

میں قالین پر بیٹھ گیا اور فاطمہ صوفے کے ساتھ قالین پر بیٹھنے لگی تو میں نے اسے بازوؤں سے پکڑ لیا "صوفے پر بیٹھو، یہ کیا کر رہی ہو؟"

"میری جگہ تمہارے قدموں ہی میں ہے شاہین!" اس نے بڑی بڑی آنکھیں پھیلا کر کہا۔ ان آنکھوں میں اس وقت وہی بھیگی بھیگی چمک تھی جو گلاب کی کنواری پتی پر اوس کے لمس سے پیدا ہوتی ہے۔ عجیب انداز تھا۔ میں کتنے ہی الفاظ لکھ ڈالوں مگر اس تاثر کو الفاظ کی گرفت میں نہیں لا سکتا۔ انسان شاید ابھی تک اس اندازِ نظر کو بیان کرنے کے لیے کوئی لفظ، کوئی ترکیب تخلیق نہیں کر سکا۔ میں اگر مصور ہوتا تو اس انداز کو پینٹ کرتا اور لیونارڈو کی مونالیزا کی مسکراہٹ خفیف سی ہو کر رہ جاتی "لاؤ تمہارے ہاتھ دبا دوں۔" اس نے واقعی میرے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر ہولے ہولے دبانا شروع کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں جوگیندر اور بخت خاں اس کمرے میں آ گئے۔ جوگیندر کا اصرار تھا کہ ہمیں فوراً وہاں سے چل دینا چاہیے مگر میں اس دوران میں انگریزی اسکیم کو کم از کم گلگتے کی حد تک ناکام بنانے کا لائحہ عمل مرتب کر چکا تھا۔ اس مکان میں کم از کم ایک دن میں رہ سکتا تھا۔ رحمان جس شعبے سے متعلق رہا، اس میں کسی کارکن کے دو ایک روز کی غیر حاضری کوئی غیر معمولی بات نہ تھی۔ وہ خود مجھے بتا چکا تھا کہ اس مکان میں تنہا رہتا ہے۔ مکان کی صفائی اور دیکھ بھال کے لیے اس کے محکمے ہی کا ایک چپراسی روزانہ صبح وہاں آ جاتا تھا۔ میرا پروگرام یہ تھا کہ میں وہیں ٹھہر کر چپراسی کو بھی اس طرح بے بس کر لوں جس طرح رحمان اور اس کے دوسرے ساتھی کو بے بس کر لیا تھا اور پھر اپنی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے تک یہیں مقیم رہوں۔ یہ اسکیم دوسرے روز تک یقینی طور پر مکمل ہو جاتی۔ اس کے بعد یہاں سے میرے کہیں اور منتقل ہونے میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

جوگیندر اور بخت خاں کو جب میں نے اپنی اسکیم سے آگاہ کیا تو ان دونوں نے بھی میری رائے سے اتفاق کیا۔

"اس منصوبے میں بخت خاں کو اہم کردار ادا کرنا ہے۔" میں نے جوگیندر سے کہا "بات یہ ہے کہ میں شیام دت کے سامنے نہیں جا سکتا، نہ تم جا سکتے ہو کیوں کہ جب بلسکا کپڑوں کی ہولی جلائی جا رہی تھی تم بھی اسٹیج پر موجود تھے پھر یہاں کے سیاسی حلقوں کے لیے بھی تم اجنبی نہیں ہو۔ شیام دت کے پاس کسی ایسے آدمی کو جانا چاہیے جو اس کے لیے اجنبی ہو۔"

جوگیندر نے میری تائید کی۔ بخت خان نے بھی اس پر اپنی آمادگی کا اظہار کر دیا تھا۔

"تو پھر یہ طے ہوا کہ میں اور بخت خاں یہیں رکیں گے۔ رحمان کے چپراسی کو ہم قابو میں کر لیں گے۔ اس وقت ضروری یہ ہے کہ رحمان اور اس کے ساتھ رات کو کام کرنے والے افراد کسی سے رابطہ قائم نہ کر سکیں پھر اس کے ملازم کو بھی یہیں روکنا ضروری ہے۔ ہو سکتا ہے اس کا ڈرائیور بھی آ جائے۔ ہم یہاں رہ کر اسے بھی آسانی سے بے بس کر سکتے ہیں۔ اس کے بعد ہمارے لیے کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ بس ضرورت اس بات کی ہے کہ کسی کو رحمان اور اس کے ساتھیوں کے غائب ہونے کا احساس نہ ہو۔"

پھر ہم تینوں ڈرائنگ روم ہی میں ٹھہر گئے۔ یہ معاملہ طے ہونے کے بعد جوگیندر کو میری ٹانگ کی فکر ہوئی۔ تھوڑی دیر کی تلاش کے بعد اسے ایک الماری میں فرسٹ ایڈ بکس مل ہی گیا۔ اس کا اندازہ درست تھا کہ رحمان جیسے آدمی کے گھر میں ضروری اور فوری نوعیت کی دوائیاں ہونا لازمی امر ہے۔

جوگیندر میری مرہم پٹی کر کے فارغ ہوا۔ میری ٹانگ پر چاندی کے روپے کے برابر آبلہ پڑا ہوا تھا اور تمام ران سرخ ہو رہی تھی۔

اس دوران میں جب جوگیندر میری مرہم پٹی میں مصروف تھا، میں نے ان لوگوں کو جوگیندر کی کوٹھی سے اغوا ہونے سے لے کر رحمان چارلس کے گھر آنے تک کے تمام واقعات تفصیل کے ساتھ بتا دیے۔ فاطمہ درمیان میں سوال کر کے مجھ سے ایک ایک بات پوچھ رہی تھی۔

اپنی بپتا سنانے کے بعد میں نے جوگیندر سے کہا "تو یہ واقعات مجھے پیش آئے۔ یہ بتاؤ کہ تم عین اس وقت جب کہ میری موت کا سامان آ گیا تھا اچانک کیسے یہاں پہنچ گئے؟"

جوگیندر مسکرایا اور پھر مجھے ان باتوں سے آگاہ کرنے لگا جو میرے علم میں نہیں تھیں۔

جوگیندر نے جو کچھ بتایا، وہ مختصراً یہ تھا کہ جب ذہنی کے آدمی مجھے وہاں سے اغوا کر کے روانہ ہوئے اور بخت خاں وہاں پہنچ گیا تو ان دونوں نے فوراً ہی تعاقب کا فیصلہ کیا۔ وہ بھی کار میں بیٹھ گئے۔ اس وقت فاطمہ بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔ وہ بھی ضد پر اڑ گئی کہ جوگیندر اور بخت خاں کے ساتھ جائے گی۔ وقت کیوں کہ بہت کم تھا اس لیے جوگیندر کو اس کی بات ماننا پڑی۔ سیٹھ موہن لال نے بھی فاطمہ کو روکنے کی کوشش کی مگر اس نے جواب میں صرف اتنا ہی کہا کہ میں جوگیندر بھیا کے ساتھ جا رہی ہوں، اب خطرے کی کیا بات ہے! جوگیندر تعاقب کرتا ہوا اس مکان تک پہنچ گیا جہاں مجھے اذیت دی گئی تھی۔ مکان کا پتا چلانے کے بعد وہ فوراً اپنے چند دوستوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا۔ بخت خاں نے اختلاف کیا تھا مگر جوگیندر کا کہنا تھا کہ مجھے اغوا کرنے والوں کی تعداد زیادہ ہے صرف دو افراد قابو نہیں پا سکیں گے۔ جوگیندر اس سلسلے میں پولیس سے بھی رابطہ کرنے کے حق میں تھا لیکن بخت خاں نے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ بخت خاں کا خیال تھا کہ یہ معاملہ پولیس میں لے جانے سے میرے لیے پریشانیاں بڑھ جائیں گی پھر میں ایک بڑے اور بااختیار دشمن کے چنگل میں پھنس جاؤں گا۔ جوگیندر نے بخت خاں کی رائے سے اتفاق کیا اور وہ اپنے ہم خیال دوستوں کی

تلاش میں نکل گیا جو اس کے نظریات کے حامی تھے جو انسانیت کو سب سے بڑا مذہب سمجھتے تھے اور قطعی طور پر غیر متعصب تھے۔ ان لوگوں کی تلاش میں اسے خاصا وقت لگ گیا اور پھر وہ دو گاڑیوں میں بھر کر وہاں پہنچے۔ یہ وہی وقت تھا جب رحمان نے مجھے ذیی سے چھڑایا تھا اور ہم میدان سے گزر کر ایک کار میں آبیٹھے تھے۔ اسی وقت دو کاریں آگے پیچھے میدان میں داخل ہوئی تھیں۔ جوگیندر اور بخت خاں نے ذیی اور اس کے بندھے ہوئے ساتھیوں سے چند سوالات کیے جن کے جواب ان لوگوں نے صحیح نہیں دیے۔

جوگیندر نے بتایا کہ مجھے وہاں نہ پاکر ہم مایوس ہوگئے پھر بخت خاں ان میں سے ایک کی زبان کھلوانے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ یہ ٹِنی تھا جو تعاون پر آمادہ ہوگیا تھا۔ ٹِنی کو ساتھ لے کر وہ وہاں سے چلے آئے۔ باہر آکر ٹِنی نے جوگیندر کو بتایا کہ مجھ پر کیا گزری تھی! پھر کہا تھا کہ میں اس شخص کو پہچان گیا ہوں جو شاہین کو اغوا کرکے لے گیا ہے۔ اس کا نام ٹِنی نے رحمان چارلس بتایا تھا اور کہا تھا کہ جہاں رحمان رہتا ہے اسی محلے میں اس کی ایک دکان ہے۔ رحمان کہاں رہتا ہے؟ اس کا علم ٹِنی کو نہیں تھا البتہ رحمان کی دکان پر بیٹھنے والے ملازم کو رحمان کے گھر کا پتا تھا۔

یہ تمام معلومات حاصل کرنے کے بعد جوگیندر نے ایک ساتھی کے سوا سب کو رخصت کردیا۔ اس کا خیال تھا کہ پوری برات کی برات ساتھ رکھنے سے معاملہ بگڑ سکتا ہے۔ وہاں سے وہ لوگ رحمان کے ملازم کے گھر پہنچے۔ وہ اس وقت گھر پر نہیں تھا۔ ٹِنی کو یاد آیا کہ وہ جوا کھیلنے کا عادی ہے چنانچہ ٹِنی جوئے کے اڈّے پر پہنچا۔ وہاں سے وہ رحمان کے ملازم کو چند منٹ کے لیے اٹھانے میں کامیاب ہوگیا۔ اس نے ٹِنی کو بڑی ردوکد کے بعد رحمان کے مکان کا پتا بتایا۔ رحمان نے اسے بتا رکھا تھا کہ یہ مکان اس کے کسی دوست کا ہے جو تجارت کے سلسلے میں عموماً ہندوستان کے مختلف شہروں میں آتا جاتا رہتا ہے اور مہینے دو مہینے بعد لوٹتا ہے۔ ایک دو دن رہ کر وہ پھر کاروباری دورے پر نکل جاتا ہے۔

پتا اچھی طرح ذہن نشیں کرنے کے بعد وہ رحمان کے مکان کی طرف آئے تھے۔ انہوں نے رحمان کے ملازم سے بہت کہا کہ وہ بھی ان کے ساتھ چلے مگر وہ جوا چھوڑ کر جانے کے لیے تیار نہ ہوا۔ انہیں صرف بتائے ہوئے پتے کے سہارے اس علاقے میں رحمان کا مکان تلاش کرنا پڑا۔ جب انہوں نے مکان تلاش کرلیا تو جوگیندر کا ساتھی ننگے پیر دبے پاؤں زینے چڑھ کر اوپر گیا۔ اس نے آہٹ لی اور پھر مکان کے اندر چلا گیا۔ اس وقت رحمان مجھے پُرسکون موت کا فلسفہ سمجھا رہا تھا۔ اس موقع پر اس نے اپنے ایک ساتھی کا تذکرہ کیا جسے اس نے سائنائڈ لینے کے لیے بھیجا تھا اور جو کسی بھی وقت آسکتا تھا۔ وہ یہ سنتے ہی الٹے قدموں واپس ہوا پھر انہوں نے ایک منصوبہ بنایا۔ انہیں اس بات کا اطمینان ہوگیا تھا کہ جب تک سائنائڈ نہیں آجاتا' میری زندگی کو کوئی خطرہ نہیں۔ وہ سب نیچے ہی دبک گئے اور رحمان کے ساتھی کا انتظار کرنے لگے۔ رحمان کا ساتھی تھوڑی ہی دیر بعد آگیا تو انہوں نے اسے چھاپ لیا۔ اس کے بعد کے حالات مجھے معلوم ہی تھے۔

"اچھا بھئی شاہین! اب ہم چلتے ہیں۔" جوگیندر بولا "پتا جی بہت پریشان ہوں گے۔ میں ٹھیک نو بجے پہنچ جاؤں گا۔"

پھر جوگیندر اور فاطمہ دونوں بھائی بہن وہاں سے چلے گئے۔

○☆○

صبح کا ملگجا اندھیرا پھیل گیا تھا۔ رات کی تاریکیاں سمٹتی جارہی تھیں۔ رات بھر جاگنے کی وجہ سے میری آنکھیں جل رہی تھیں اور ذہن بوجھل ہوتا جارہا تھا۔ میں نے بخت خاں سے کہا کہ وہ جاکر رحمان کے کپڑوں کی تلاشی لے۔ اس کے پاس یقیناً گھر کی چابیاں ہوں گی۔ وہ چابیاں نکال کر لے آئے۔ وہ ادھر گیا اور میں لنگڑاتا ہوا غسل خانے میں گھس گیا۔ میں نے خوب منہ دھویا سر کو بھگویا اور تولیے سے سر پونچھتا ہوا باہر آگیا۔ اس سے میرے ذہن کا بوجھل پن ختم ہوگیا اور آنکھوں کی جلن بھی ٹھنڈی پڑگئی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ رحمان کے پاس چابیوں کا ایک گچھا موجود تھا۔ اس کے علاوہ اس کا شناختی کارڈ بھی تھا جس سے تصدیق ہوتی تھی کہ رحمان سی آئی ڈی کے محکمے سے وابستہ تھا۔ میں نے ان چابیوں سے وہ کمرا بند کردیا۔ جس میں رحمان اور اس کا ایک ساتھی بندھا پڑا تھا۔

یہ پورا مکان رحمان کے پاس ہے۔" میں نے بخت خاں سے کہا "اس کے چپراسی پر قابو پانے کے بعد ہم اس مکان کا جائزہ لیں گے۔ ہم ان لوگوں کو ایک ہی کمرے میں بند کرنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

"تم ٹھیک کہتے ہو۔" بخت خاں نے تائید کی "یہی سوچتے ہوئے جوگیندر نے دونوں کو سینے کے بل ملا کر باندھا تھا تاکہ ان کے ہاتھ ایک دوسرے کی بندشوں تک نہ پہنچ سکیں اور وہ کسی طرح آزاد نہ ہوجائیں!"

"پتا نہیں کمبخت چپراسی کب تک آئے گا!" میں بولا

"اس وقت تک ہمیں چوکنا رہنا ہوگا۔"

"تم آرام کرلو' میں جاگ رہا ہوں۔" بخت خاں نے مجھ سے کہا۔

"نہیں" میں نے انکار کردیا "پہلے کام پھر آرام!"

چپراسی کا انتظار ٹھیک آٹھ بجے ختم ہوا۔ دروازہ بخت خاں نے کھولا تھا۔ چپراسی شاید اس گھر میں روز نئے نئے چہرے دیکھنے کا عادی تھا۔ اس نے اس لیے بخت خاں کی وہاں موجودگی پر اظہار حیرت نہیں کیا اور اندر آتے ہی پوچھا "صاحب کہاں ہیں؟ کیا وہ ہیں؟"

"ہاں" بخت خاں نے دروازہ بند کرتے ہوئے جواب دیا اور پھر اسے آڑے ہاتھوں چھاپ لیا۔ وہ پست قد کا دبلا پتلا شخص تھا۔ ذرا سی دیر میں بے بس ہوگیا۔ میں نے اس کے ہاتھ پیر اور منہ پر کپڑا باندھنے میں بخت خاں کی مدد کی پھر اسے ایک کمرے میں گٹھری بنا کر ڈال دیا۔

اب ہم مطمئن تھے۔ چپراسی کے بعد اب ہمیں کسی طرف سے کوئی خدشہ نہیں رہا تھا۔

"اب تم ایسا کرو بخت خاں کہ اس پورے مکان کا جائزہ لے ڈالو۔" میں نے چابیاں اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا "میری ٹانگ میں تکلیف ہے اس لیے چلا نہیں جارہا۔"

"ٹھیک ہے۔" بخت خاں بولا اور چلا گیا "تم آرام کرو!"

میں صوفے پر لیٹ گیا۔ تقریباً بیس منٹ بعد ہی بخت خاں تمام مکان کا جائزہ لے کر واپس آگیا۔

"اس دو منزلہ مکان کے زینے کا ایک دروازہ گراؤنڈ فلور پر بھی کھلتا ہے۔ نیچے بھی اسی طرح چار کمرے بنے ہوئے ہیں۔ تمام کمروں میں مختلف قسم کا فرنیچر ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا رحمان نے اس مکان کو اتنا بنا سنوار کر کیوں رکھا ہے۔ اس کے لیے تو یہی بالائی منزل کافی تھی۔"

"اس قسم کے لوگ عموماً ایسی ہی پرتعیش زندگی گزارتے ہیں۔" میں نے جواب دیا "تمام کمروں کی چابیاں موجود ہیں؟"

"ہاں۔ تمام کمروں میں تالے پڑے ہیں۔ سب کی چابیاں اسی گچھے میں موجود ہیں۔" بخت خاں نے بتایا "دو اسٹور بھی ہیں جو خالی پڑے ہیں۔ میرا خیال ہے دونوں اسٹورز میں انہیں بند کیا جاسکتا ہے۔"

اب جوگیندر کا انتظار کرنے کے سوا ہمارے لیے کوئی کام نہیں تھا۔ وعدے کے مطابق وہ ٹھیک نو بجے پہنچ گیا۔ اس کے آتے ہی ہم اپنے کام میں مصروف ہوگئے۔ چپراسی

اور سائنائڈ لانے والے کو ہم نے مکان کی زیریں منزل کے اسٹور میں بند کردیا۔ اس کام سے فارغ ہوکر ہم نے رحمان پر "طبع آزمائی" شروع کردی۔ اس کے مکان سے ہمیں بہت سی معلومات حاصل ہوئی تھیں۔ سب سے زیادہ معلومات اس کی ڈائری سے ملی تھی جس میں اس نے چھے ہندو اور مسلمان رہنماؤں کو بدکردار یعنی دلال ہی لکھا تھا جو ہندو مسلم فسادات کرانے کے لیے انگریز کی اسکیم کو عملی جامہ پہنانے کے ذمّے دار تھے۔ رحمان نے ناموں کے پہلے حروف لکھے تھے۔ اس ڈائری میں اپنے طور پر اس نے یہ حساب بھی رکھا ہوا تھا کہ سرکار کے خفیہ خصوصی فنڈ کی کتنی رقم ان کے پاس موجود تھی۔ اس کے علاوہ ڈائری سے ہمیں یہ بھی پتا چلا کہ اکثر ان بدکروں کے اجلاس اسی گھر میں ہوتے تھے لیکن ایسے موقعوں پر رحمان کبھی بہ ذاتِ خود شریک نہیں ہوتا تھا۔ ان اجلاسوں کے موقعوں پر اس کا چپراسی ان لوگوں کو زبانی یا تحریری حکم دیا کرتا تھا کہ انہیں آیندہ کیا کرنا ہے پھر وہ وہیں اس کے حکم کی تعمیل کے لیے حکمتِ عملی وضع کرتے' اس حکم پر تبادلۂ خیال کرتے اور یہ طے کرتے کہ ان کے ذمّے کیا کیا فرائض ہوں گے۔ اس ڈائری سے یہ بھی پتا چلا کہ ان اجلاسوں کے موقعوں پر رحمان وہیں کسی قریبی کمرے میں چھپا رہتا تھا۔ اس کمرے کے باہر تالا پڑا ہوتا تھا تاکہ اجلاس میں شریک کوئی بدکردار وہاں نہ آسکے۔ وہ یہ اہتمام اس لیے کرتا تھا کہ اسے لوگوں کی گفتگو سے ان کے اندازِ فکر کا پتا چلتا رہے۔ اس نے ان چھے بدکروں کے بارے میں' اپنے مخصوص انداز میں تبصرے بھی کیے تھے جو بہت دلچسپ تھے۔

ش۔ س۔ انتہائی حریف لالچی' بزدل شخص' اپنے آپ کو بھی دھوکا دینے سے دریغ نہ کرنے والا! اگر میں اسے دس ہزار روپے کی پیشکش کردوں اور یہ بھی بتادوں کہ میں حرامی ہوں تو بھی اپنی حسین و نوجوان بیٹی کو ایک رات کے لیے میرے حوالے کردے گا۔

ق۔ م۔ بدطینت' بدخو' ظالم اور سفاک مگر ایمان دار!

پیسے پیسے پر جان دینے والا مگر دوسرے کی ایک پائی بھی اپنے پاس رکھنے کو حرام سمجھنے والا۔ اردو شاعری میں محبوب کو ذکر باندھتے ہیں مگر یہ عملی زندگی میں اردو شاعری کرتا ہے۔ خوب صورت اور حسین ترین لڑکی بھی اس سے کوئی راز نہیں اگلوا سکتی۔

ل۔ م۔ چار سو بیس' چرب زبان' کینہ پرور' انتہائی کنجوس' چمڑی جائے دمڑی نہ جائے کی زندہ تصویر! اندھے فقیر کو جعلی نوٹ دے کر اصلی سکے لینے کا قائل۔ اکلوتی بیٹی میعادی بخار سے مرگئی مگر علاج کے لیے اس کی جیب سے رقم نہ نکلی دھن اس کا دھرم!

م۔ل۔ وسیع القلب' خوش گفتار' رحم دل مگر اس صورت میں کہ اپنا کوئی نقصان نہ ہو۔ گھاٹے کی صورت ہو تو پھر خود غرض' رکھ رکھاؤ کا آدمی! بے چارہ پھنسا اس لیے کہ خوب صورت عورت اس کی کمزوری ہے۔ ایک ہندو لڑکی کو داشتہ بنا رکھا ہے۔ اس راز کو راز رکھنے کے لیے بدکر بن گیا۔

ط۔ ج۔ مسلمان بنیا' مایا کا سانپ' شکل پر ہروقت مسکینی کی پھٹکار' بہ ظاہر منکسر المزاج! اصولوں کا زبردست حامی مگر صرف ان اصولوں کا جو اس کی ذات کو فائدہ پہنچا سکیں۔ عیاش بیوی کا وفادار شوہر کہ دولت کی شکل بیوی کے ذریعے دیکھی۔ ڈرپوک اتنا کہ اسے قتل کی دھمکی دے کر کسی کو بھی قتل کروالو' صرف تحفظ کی ضمانت پر۔

چ۔ل۔ بڑا انقلابی' بڑا فسادی' بڑا خبیث' مجھ سے بھی بڑا! دولت کو سونے میں تبدیل کرنے کا رسیا' لاکھوں کا آدمی' بروقت پکڑا! بڑی کوٹھی میں جھونپڑی جتنا سامان' لان کو کھیت میں اس لیے تبدیل کردیا کہ بارہ مہینے مفت کی سبزیاں ملتی رہیں۔ کنجوسی کو کفایت اور کفایت کو اسراف بے جا سمجھنے والا۔ شادی اس لیے نہیں کی کہ جوانی کی توانائی صرف ہوجاتی۔

۔۔۔ یہ تھے وہ چھ بدکر جن کے چہرے رحمان نے اپنی ڈائری میں لکھے تھے۔ کلکتہ شہر میں میری مصروفیات کی یادگار یہی ایک ڈائری ہے جو آج بھی میرے پاس ہے۔ اس ڈائری کی وجہ سے مجھے اپنی اسکیم کے دوسرے حصے پر عمل کرنے میں زیادہ آسانی ہوئی ورنہ شاید ذرا لمبا چکر پڑجاتا۔ اس ڈائری کی وجہ سے نہ ہلدی لگی نہ پھٹکری رنگ چوکھا آگیا۔

رحمان بہت بودا اور بودا آدمی ثابت ہوا۔ میں سمجھا تھا کہ سی آئی ڈی کا آدمی ہے' سخت جان ہوگا اور آسانی سے [illegible] قبول کرنے [illegible] واقعی [illegible] طبع مخصوص تھا۔

تکلیف تو وہ برداشت ہی نہیں کرسکتا تھا۔ تیسرا منٹ بھی نہیں گزر پایا تھا کہ وہ ٹپ گیا اور ہم سے مکمل تعاون پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے ہمیں ان چھے دلالوں کے اصل نام اور پتے بھی بتادیے جن کے چہرے ابھی آپ پڑھ چکے ہیں۔ ان کے اصل نام علی الترتیب یہ تھے' شیام دت' قادر منشا' لالہ مول چند' ماوا لنگر' طیب جی اور چونی لال! یہ نام میرے لیے تو نہیں البتہ جوگیندر اور بخت خاں کے لیے چونکا دینے والے تھے۔ ان کے بارے میں رحمان نے اپنی ڈائری میں جو کچھ لکھا تھا' وہ بھی بیشتر ان دونوں کے لیے انکشافات ہی تھے۔ یہ سبھی سیاسی حلقوں میں جانی پہچانی شخصیتیں تھیں۔ قومی سطح پر اگرچہ ان کی کوئی اہمیت نہیں تھی مگر مقامی سیاست میں وہ ستون کی حیثیت رکھتے تھے۔

ان تمام معلومات کے بعد ہم نے رحمان سے ان تمام بدکروں کے نام وہ پرچیاں بھی لے لیں جو بہ قول رحمان کے ہنڈیاں تھیں۔ ہر ہنڈی تیس تیس ہزار روپے کی تھی۔ پرچی پر سب سے اوپر کی سطر میں بدکر کا نام لکھا تھا' یعنی شیام دت کے لیے لکھا' بدکر نمبر ایک! دوسری سطر میں رقم لکھی تھی' تیس ہزار! تیس ہزار کے ہندسوں کے دائیں بائیں رحمان نے اپنے مختصر دستخط کیے تھے۔ جنہیں انگریزی میں "انیشل" کہتے ہیں۔ آخر یعنی تیسری سطر میں اس نے اپنے پورے دستخط کیے تھے۔ ان پرچیوں کو اس نے مخصوص رنگ کے لفافوں میں رکھوایا تھا۔ ہر بدکر کے الگ الگ رنگ کا لفافہ تھا۔ یہ لفافے اسی الماری میں رکھے ہوئے تھے جہاں سے ڈائری ملی تھی۔ اس وقت میں نے اس سے کہا تھا کہ رحمان! اگر تم نے ذرا بھی دھوکا دیا تو تمہارا کام تمام کر دیا جائے گا۔ اس پر اس نے مجھ سے اسی ڈائری کا وہ صفحہ دیکھنے کے لیے کہا جس پر چھے بدکروں کے چہرے لکھے تھے پھر اس نے ان چہروں کے اختتام پر لکھے ہوئے حروف کی طرف توجہ دلائی۔ ان پر علی الترتیب ل' ن' پ' ہ' س' خ کے حروف لکھے ہوئے تھے۔ اس نے بتایا کہ یہ حروف لال' نیلے' پیلے' ہرے' سفید اور خاکی رنگوں کے مخفف کے طور پر لکھے ہیں۔ ان لوگوں کو ہمیشہ اسی رنگ کے لفافوں میں ہنڈیاں بھیجی جاتی ہیں جو ان کے لیے مخصوص ہیں۔ اگر غلط رنگ کا لفافہ کسی کے پاس بھی پہنچ جائے تو لفافہ لے جانے والا خطرے میں پڑ سکتا ہے۔

"سوچ لو رحمان!" میں نے کہا "ہم میں سے ایک تمہارے پاس یہاں رہے گا اگر ان لوگوں کے پاس جانے والے دونوں آدمیوں میں سے کوئی بھی خطرے میں پڑا تو تمہاری موت بڑی اذیت ناک ہوگی! میں تمہیں سائنائڈ سے نہیں ماروں گا بلکہ

چھری سے تمہارے جسم کی ایک ایک بوٹی اتاروں گا اور اس وقت تک اتارتا رہوں گا جب تک تم ہلاک نہیں ہوجاؤ گے۔ ہوسکتا ہے کہ ہر مرتبہ بوٹی کاٹنے کے بعد میں زخم پر نمک اور مرچ بھی چھڑکتا رہوں۔ تم نے دیکھا مرچ کیسی ظالم چیز ہوتی ہے' ابھی ایک چٹکی مرچ ہی پھونک مار کر تمہارے چہرے کی طرف اڑائی گئی تھی اور تمہاری آنکھیں اب تک پانی بہا رہی ہیں۔ جب مرچیں زخم میں لگتی ہیں تو تکلیف اور زیادہ ہوتی۔ آنکھیں زیادہ پانی بہانے لگتی ہیں۔"

اس نے زور سے جھرجھری لی۔ شاید وہ زخموں پر مرچیں چھڑکے جانے کے تصور ہی سے کپکپا کر رہ گیا تھا۔ وہ وحشت زدہ انداز میں مجھے دیکھتا رہا پھر چیخ اٹھا "نہیں' نہیں میں سچ کہہ رہا ہوں۔" اس کے لہجے کا وہ اعتماد اور کینہ پن ختم ہوگیا تھا جو رات کو اس کے انداز گفتگو کا حصہ بنا ہوا تھا۔

"تم ان چھے بدکروں کو یہاں جمع بھی کرتے ہو؟" میں نے اس سے سوال کیا۔

"ہاں جب بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان کی میٹنگ بلالیتا ہوں۔" رحمان نے جواب دیا۔

"کیا وہ اپنی مرضی سے بھی یہاں آسکتے ہیں؟"

"نہیں۔ انہیں سخت ہدایت ہے کہ جب تک انہیں یہاں نہ بلایا جائے وہ ادھر کا رخ بھی نہ کریں۔ وہ یہاں صرف اس وقت آتے ہیں جب انہیں بلایا جاتا ہے۔"

"اجلاس کس طرح بلایا جاتا ہے؟ میرا مطلب ہے انہیں میٹنگ کی اطلاع کس طرح دی جاتی ہے؟" میں نے پھر سوال کیا۔

"ایک کاغذ کی پیشانی پر میٹنگ کی تاریخ اور وقت لکھ کر میں اس کے نیچے اپنے دستخط کردیتا ہوں پھر اس کے نیچے ایک سے چھے تک نمبر ترتیب وار لکھ دیئے جاتے ہیں۔ دعوت نامہ ایک لیٹر ہیڈ پر لکھا جاتا ہے جس پر "بدکرز ایسوسی ایشن" چھپا ہوا ہے پھر محلے کے کسی کارندے سے کہا جاتا ہے کہ وہ بدکروں سے اس کاغذ پر دستخط کرالائے۔ ہر بدکر اپنے نمبر کے آگے دستخط کردیتا ہے اور پھر وہ سبھی مقررہ تاریخ کو معینہ وقت پر یہاں پہنچ جاتے ہیں۔" اس نے ایک ایک بات مجھے بتادی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے ایک الماری میں رکھے ہوئے فائل میں اس قسم کے کاغذ دیکھے تھے۔ اس وقت جب میں وہ فائل دیکھ رہا تھا' میری سمجھ میں اس کا مقصد اور مطلب نہیں آیا تھا۔

"مقام کا نام کیوں نہیں لکھتے؟" میں نے پوچھا۔

"مقام انہیں معلوم ہے۔" رحمان نے بتایا "ان

بدکروں کو بتادیا گیا ہے کہ تا اطلاع ثانی اجلاس یہیں ہوا کریں گے۔"

"یہاں تمہارے ذاتی دوست وغیرہ آتے ہیں؟" میں نے معلوم کیا۔ یہ سوال بہت دیر سے میرے ذہن میں تھا۔

"نہیں" رحمان بولا "یہاں میرے بنگلے کے صرف تین آدمی آتے ہیں۔ ایک چپراسی' ایک مخبر مجید! ان دونوں کو تم نے پکڑ رکھا ہے۔ تیسرا وہ ڈرائیور ہے جو رات کو ہمارے ساتھ تھا۔"

"آج وہ آئے گا؟" میں نے دریافت کیا "ٹھیک ٹھیک جواب دینا!" میرا لہجہ سرد تھا "ورنہ اس سے قبل کہ کوئی تمہاری مدد کو آسکے میں تمہارا کام تمام کردوں گا۔ ہوسکتا ہے' وہ یہاں سے ہماری لاشیں ہی اٹھائیں مگر تم یہ منظر دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہوگے۔"

"اسے نہیں آنا چاہیے۔" رحمان نے کہا "ویسے رات بارہ بجے مجھے اس سے ڈلہوزی اسکوائر میں بڑے ڈاک خانے کے سامنے ملنا تھا۔"

"اگر تم اس سے ملنے نہیں گئے تو پھر وہ یہیں آئے گا؟" میں نے معلوم کیا۔

"ہوسکتا ہے بلکہ۔۔۔ وہ یقیناً آئے گا۔"

"کیوں؟"

"اس لیے کہ ہمیں آج رات تمہاری لاش ٹھکانے لگانا تھی۔"

میں ہنس پڑا "میری لاش ٹھکانے لگانا تھی مگر وہ سیدھا یہاں بھی آسکتا تھا' تمہیں وہاں جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

"یہ پروگرام میں نے ہی بنایا تھا۔ دراصل میں اس وقت اسی علاقے میں ہوتا۔" اس نے جواب دیا۔

"تو ان تین افراد کے سوا کوئی اور یہاں نہیں آتا؟"

"نہیں"

پھر میں نے رحمان سے اس کار اور اس کے ڈرائیور کی شناخت معلوم کی۔ اس نے مجھے یہ بھی بتادیا تو میں نے اس سے کہا۔ "ہاں تو مسٹر رحمان چارلس! تم آج رات ان چھے بدکروں کا اجلاس طلب کررہے ہو!"

"مم۔ مگ۔ مگر کیوں؟" وہ ہکلانے لگا۔ "آج۔ آج تو ایسی کوئی بات نہیں ہے کہ اجلاس۔"

"یہ میں جانتا ہوں کہ کوئی بات ہے یا نہیں!" میں نے سرد لہجے میں اس کی بات کاٹ دی۔ "ویسے کیا یہ بات اہم نہیں ہے کہ تم آج رات ہمارے قبضے میں ہو؟" میں نے اس کا مضحکہ اڑایا۔ "کیوں' بتاؤ نا یہ بات اہم ہے یا نہیں؟"

رحمان بے چارہ کیا جواب دیتا! اس کا حلق خشک ہو گیا تھا۔ "وہ۔ وہ تو ٹھیک ہے مگر تم۔ تم انہیں یہاں کیوں بلا رہے ہو؟"

"اچار ڈالنے کے لیے! ہم ان کا اچار ڈالیں گے مسٹر رحمان چارلس!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ویسے ہم وطن دشمن اور قوم فروشوں کو ایسا سبق دینا چاہتے ہیں کہ وہ عمر بھر یاد رکھیں کہ قوم سے غداری کی سزا کیا ہوتی ہے تاکہ انہیں پتا چل جائے کہ دولت ہی سب کچھ نہیں ہوتی۔"

رحمان نے پوری طرح ہتھیار ڈال دیے تھے۔ اس کی مدافعتی حس ختم ہو چکی تھی۔ اب وہ موم کا ایسا پتلا تھا کہ اسے جس طرح چاہے موڑا جا سکتا تھا۔ میں نے اس سے اجلاس بلانے کا دعوت نامہ لکھوا لیا۔ اس میں مجھے کوئی مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اس کے بعد میں نے اس کے منہ پر کپڑا باندھ دیا' اس کے ہاتھوں اور پیروں کی بندشوں کا جائزہ لیا اور اسے اسٹور میں بند کر دیا۔ میری اسکیم کی تمام تیاریاں مکمل ہو چکی تھیں۔ اب صرف عمل درآمد کی ضرورت تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ اس میں بھی کوئی دقت نہیں ہو گی۔

اس دوران میں جب کہ میں رحمان سے پوچھ گچھ کر رہا تھا' بخت خاں اور جوگیندر باہر گئے ہوئے تھے۔ یہ چھے بروکر کیوں کہ ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پر رہتے تھے لہٰذا جوگیندر نے یہ سوچا تھا کہ اپنے ڈیڈی کے دفتر جا کر کار لے آئے تاکہ کام جلد نمٹ سکے۔

تھوڑی دیر میں وہ دونوں بھی آ گئے۔ میں نے رحمان سے اپنے سوال جواب کی تفصیل سے انہیں آگاہ کیا اور پھر اس پروگرام پر گفتگو ہوئی جس پر ہم عمل کرنے والے تھے۔ طے یہ ہوا کہ ہنڈیاں اور دعوت نامہ لے کر بروکرز کے پاس بخت خاں ہی جائے گا۔ ہم اس مرحلے پر کوئی خطرہ مول لینا نہیں چاہتے تھے۔ یہ سب بروکرز سیاسی آدمی تھے اور یہ بات خارج از امکان نہیں تھی کہ یہ سب حضرات گزشتہ روز دھرم تلہ گراؤنڈ میں بدیسی کپڑے کے الاؤ کی تقریب میں شریک رہے ہوں۔ ویسے بھی وہاں ان کی شرکت یقینی تھی کیوں کہ وہ سب حکومت کے مخبر تھے اور سیاسی مواقع پر ان کی موجودگی لازمی ہوتی۔ میں اور جوگیندر کیوں کہ اسٹیج پر بیٹھے تھے پھر میں تو ویسے ہی اپنی تقریر کی وجہ سے لوگوں کی نظروں میں آ گیا تھا۔ طے یہ ہوا کہ اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے جوگیندر اور بخت خاں جائیں اور میں وہیں مکان میں رہوں۔ اس طرح ایک تو مکان کی حفاظت بھی رہتی' دوسرے اس بات کا بھی کوئی امکان نہیں تھا کہ میں کسی ایسے شخص کی نظر میں آ جاؤں گا جسے میری تلاش ہو گی یا یہ معلوم ہو گا کہ کچھ لوگ میری تلاش میں ہیں۔ اگرچہ رحمان نے بتایا تھا کہ اب کسی کے وہاں آنے کا امکان نہیں تھا لیکن اس پر کس حد تک یقین کیا جا سکتا تھا! خود اس کا ملازم جو اس کی دکان پر کام سنبھالتا تھا' اس مکان سے واقف تھا۔ رحمان نے جان کر یہ نہیں بتایا تھا یا وہ بھول گیا تھا' میں کہہ نہیں سکتا تھا اس کے بعد یہ طے ہوا کہ ڈرائنگ روم کی کھڑکی کے ایک شیشے پر سبز کپڑا لگا دیا جائے تاکہ جوگیندر اور بخت خاں واپس آئیں تو وہ اس کپڑے کو دیکھ کر سمجھ جائیں کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ رات کے وقت شیشے کے پیچھے موم بتی جلانے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ بھی طے ہوا کہ جب جوگیندر اور بخت خاں واپس آئیں گے تو دروازے پر مخصوص انداز میں دستک دیں گے تاکہ مجھے معلوم ہو جائے کہ وہی آئے ہیں۔ یہ بھی طے ہوا کہ ان کی عدم موجودگی میں جب بھی دروازے پر دستک ہو یا میں خطرہ محسوس کروں تو سب سے پہلے کھڑکی کے نچلے حصے پر پڑا ہوا سبز کپڑا اتار دوں۔ سبز کپڑے کا خیال ہمیں اس لیے آیا تھا کہ ایک طرف میز پر سبز سا رومال پڑا ہوا تھا۔ اس مقصد کے لیے ہم اس رومال کو آسانی سے استعمال کر سکتے تھے۔ یہ رومال کیلوں کی مدد سے جوگیندر اور بخت خاں کی روانگی سے پہلے ہی کھڑکی کے شیشے پر لٹکا دیا گیا تھا۔

بخت خاں اور جوگیندر جا چکے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ پھر اس مکان کا جائزہ لیا۔ میرے نقطۂ نظر سے اس مکان میں زیادہ اہم وہ الماری تھی جس میں رحمان کے کاغذات رکھے تھے۔ اس مرتبہ بھی جائزے کے بعد مجھے کہیں کوئی اور چیز نہ مل سکی۔ میں نے ان تمام کاغذات کو جو الماری میں تھے ایک جگہ سمیٹ کر ایک میز پوش میں باندھ لیا تھا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ ہمیں اپنی اسکیم کے دوسرے مرحلے کی تکمیل کے بعد اس مکان کو چھوڑ دینا تھا۔ ان تمام کاغذات کو ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر میں نے ایک مرتبہ پھر تمام حالات کا جائزہ لیا۔ ابھی مجھے کم از کم پانچ دن تو کلکتے میں قیام کرنا ہی تھا پھر مجھے وکٹوریہ میموریل کے صدر دروازے کے سامنے سے حسب ہدایت گزرنا تھا۔ شاید اس دن مجھے آئندہ کا کوئی پروگرام بتایا جانا تھا یا کوئی اور مہم مجھے سونپی جانے والی تھی۔ میرا قیاس تھا کہ شاید کلکتے میں مجھے کچھ زیادہ ہی عرصے قیام کرنا پڑے گا۔

پھر میں نے موجودہ حالات پر غور شروع کر دیا۔ اب میرے ذہن میں ایک اور پروگرام ابھرنا شروع ہو گیا تھا۔ میں اس ہندو لڑکی کے بارے میں سوچ رہا تھا جسے ماوا لنگر نے اپنی داشتہ بنایا ہوا تھا۔ میں چونی لال کی اس دولت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو اس نے سونے میں تبدیل کی تھی۔ اسی کے ساتھ میرے ذہن میں مجاہد اوّل کی تصویر بھی ابھر رہی تھی جو اصولوں پر سختی سے کاربند تھا۔ میں اس عہد کے بارے میں سوچ رہا تھا جو میں نے جلالی کے اس چھوٹے سے کمرے میں اٹھایا تھا' تنظیم سے وفاداری کا عہد! اس کے فوراً بعد قاسم تانگے والے کو لاش میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا کیوں کہ مجاہد اوّل اس کی غداری سے واقف ہو گیا تھا۔ کیا میں تنظیم سے غداری کا مرتکب ہو رہا تھا؟ کیا میں نے تنظیم کی ہدایات سے انحراف کیا تھا؟ کیا اب جو کچھ میں کر رہا تھا' وہ تنظیم کے متعینہ اصولوں کے خلاف تھا؟ کیا میں جو کچھ سوچ رہا تھا' اس سے تنظیم کو نقصان پہنچ سکتا تھا؟ پھر میں اسی نتیجے پر پہنچا کہ میں جن حالات کا شکار ہو اتھا اور جن کی وجہ سے یہ صورتحال بنی تھی' اس میں دانستہ میرا کوئی قصور نہیں تھا۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی تھی کہ تنظیم بنیادی طور پر انگریز حکومت کے خلاف ہی کام کر رہی تھی۔ میں اس وقت جو کچھ بھی کر رہا تھا' وہ اسی حکومت کے ایک گھناؤنے منصوبے کو ناکام بنانے کے لیے کر رہا تھا۔ میرا ضمیر مطمئن تھا۔

تین گھنٹے کے بعد جوگیندر اور بخت خاں واپس آ گئے۔ رحمان نے ہم سے واقعی بھرپور تعاون کیا تھا۔ جوگیندر اور بخت خاں نہ صرف ان چھے دلالوں سے وہ ہنڈیاں بھنا لائے تھے جو رحمان نے دی تھیں بلکہ رات آٹھ بجے ہونے والی میٹنگ کے دعوت نامے پر ان چھے دلالوں کے دستخط بھی لے آئے تھے۔ شیام دت نے رقم دینے کے علاوہ ایک خط بھی دیا تھا۔ یہ خط وہ تھا جو رحمان اور شیام دت کے پروگرام کے مطابق میری لاش کے ساتھ ہی پولیس کو ملتا پھر حکومت اس خط کو خوب خوب اچھالتی۔ ہندو مسلم منافرت کو خوب ہوا ملتی۔ اس خط میں کوٹ کوٹ کر زہر بھرا ہوا تھا۔ میں نے احتیاط سے وہ خط اپنے پاس رکھ لیا۔

پہلا مرحلہ نہایت کامیابی سے طے ہو گیا تھا۔ اب اسکیم کا دوسرا مرحلہ شروع ہونا تھا۔ اس کے لیے ہمیں سورج ڈھلنے کا انتظار کرنا تھا۔ ہم تینوں نے فرصت کو غنیمت جانا اور سونے کا پروگرام بنایا' اس طرح کہ باری باری ایک شخص جاگتا رہے۔

❀❀❀ ** ❀❀❀

سورج کا جلتا دیا کبھی کا بجھ چکا تھا۔ رات جوان ہو کر انگڑائیاں لیتے ہوئے بہت دیر پہلے دنیا کو اپنی بانہوں میں سمیٹ چکی تھی۔

ہم نے آٹھ بجے ہی اپنے دو اسیروں کو چائے اور توس کے ساتھ خواب آور دوا دے دی تھی۔ صرف رحمان کے ساتھ ایسا نہیں کیا گیا تھا۔ ہم چھے دلالوں کے اجلاس کی کارروائی مکمل کر چکے تھے اور اپنے مہمانوں کے استقبال کے لیے تیار تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ مخصوص دستک بخت خاں نے دی تھی۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ ہمارا پہلا مہمان آنے والا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ مہمان آ گیا۔ یہ کمبخت شیام دت ہی تھا۔ وہ اطمینان سے مکان میں داخل ہوا' دروازے کو آہستگی سے بھیڑا اور کانفرنس روم میں آ گیا۔ ابھی وہ دو قدم ہی اندر آیا ہو گا کہ بغلی کمرے کی طرف اس کی نظر پڑی۔ وہاں جوگیندر چہرے پر نقاب ڈالے اور ہاتھ میں پستول لیے کھڑا تھا۔

"تم نے ذرا بھی آواز نکالی تو میں گولی مار دوں گا!" جوگیندر نے سختی سے کہا۔ گفتگو کرتے ہوئے اس کے ہونٹوں کی جنبش اور سانسوں کی آمد و رفت سے اس کے چہرے پر پڑے نقاب میں حرکت پیدا ہوئی۔

شیام دت جیسے پتھر کا ہو گیا۔

"ہاتھ پیچھے کرو شیام دت!" میں نے دروازے کی آڑ سے اس کے پیچھے آ کر کہا۔

شیام دت مڑنا چاہتا تھا کہ جوگیندر نے اسے مخاطب کیا۔ "تم اپنی جگہ سے ہلو گے بھی نہیں!"

ذرا سی دیر میں ہم اسے بے بس کر کے باندھ چکے تھے اور پھر بغلی کمرے میں لے جا کر اس کے پیر بھی باندھ دیے تھے۔

نو بجے تک ہم چھے دلالوں کا اسی طرح "استقبال" کر چکے تھے۔ ایک مرتبہ ذرا سی پریشانی ہوئی تھی کیوں کہ ماوا لنگر اور چونی لال خلاف توقع ایک ساتھ ہی آئے تھے مگر وہ پریشانی اس وجہ سے ہوئی تھی کہ ہم نے اس امکان پر غور ہی نہیں کیا تھا کہ دو مہمان ایک ساتھ بھی آ سکتے ہیں۔ بہرحال' ان دونوں کو بھی ہم نے سنبھال لیا۔ دراصل نقاب

اور پستول کے ساتھ ایک آدمی کھڑا ہو اور اس کے مقابلے میں ایک ایسا شخص ہو جس کا ضمیر بھی مجرم ہو تو اس کی آدھی جان تو ویسے ہی نکل جاتی ہے۔ وہ یہ سمجھ لیتا ہے کہ جب وہ دوسروں کے ساتھ زیادتی کر رہا ہوتا ہے تو دوسرا اس سے رحم کا سلوک کیوں کرنے لگا!

آج بھی اس رات کے بارے میں سوچتا ہوں تو ایک ٹھنڈی سی لہر میرے جسم میں دوڑ جاتی ہے۔ ہم تینوں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ ہماری واپسی کسی بھی صورت اب ممکن نہیں رہی تھی۔

اگر ہم اس رات ان تمام اسیروں میں سے ایک کو بھی زندہ چھوڑ دیتے تو اپنے لیے نت نئی مصیبتیں مول لے لیتے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ان لوگوں کو زندہ چھوڑنا خود اپنی موت کو دعوت دینا تھا۔ سو ہم نے ان کے لیے سرسری عدالت قائم کی۔ جوگیندر اس عدالت کا صدر تھا۔ آج میں سوچتا ہوں تو یہ حرکت بچوں کی سی معلوم ہوتی ہے مگر اس وقت شاید ہم نے اپنے ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے یہ ڈراما کیا تھا۔

آدمی بھی کیا شے ہے! خود کو مطمئن کرنے کے لیے کیسے کیسے سوانگ رچاتا ہے مگر وہ جو ضمیر ہوتا ہے، اس میں ایک پھانس سی گھس جاتی ہے اور کھٹکتی رہتی ہے۔ اس لیے کہ وہ جانتا ہے، اس نے جو کچھ کیا وہ محض اداکاری تھی، ایک جھوٹ تھا۔ جھوٹ نے انسان کو کبھی اطمینان بخشا ہے! وہ خلش جو آج بھی میرے دل میں ہے، یہ ہے کہ اس وقت اپنے اقدام کو درست ثابت کرنے کے لیے ہم نے عدالت اور انصاف کا مذاق اڑایا تھا۔ ہم اس کے بغیر بھی وہی سب کچھ کر سکتے تھے۔ وہ چھے بدکر، رحمان اور اس کے ساتھی سب اس قوم کے مجرم اور غدار تھے جو غلامی کے جوئے کو اپنی گردن سے اتارنے کے لیے مصروفِ جدوجہد تھے۔ ان کے اعمال نامے ہمارے سامنے تھے۔ انہیں موت کے گھاٹ اتارنا اس لیے ضروری تھا کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو سیکڑوں بے گناہ افراد مارے جاتے۔ یہ موذی اور آدم خور درندے تھے۔ انہیں ہم عدالت کا سوانگ رچائے بغیر بھی اسی انجام کو پہنچا سکتے تھے جو ہم نے ان کے لیے طے کر لیا تھا۔

بہرحال عدالت لگی۔ ان کے خلاف ثبوت کے طور پر وہ کالی ڈائری پیش کی گئی جو رحمان لکھا کرتا تھا۔ وہ کاغذات پیش کیے گئے جو رحمان کے گھر سے ملے تھے۔ خصوصی اخراجات کے فنڈ کے وہ گوشوارے پیش کیے گئے جو ایک فائل میں موجود تھے۔ آخری اور ٹھوس ثبوت کے طور پر اس اجلاس کا دعوت نامہ پیش کیا گیا جس میں شرکت کے لیے [illegible] جمع ہوئے تھے پھر شیام دت کا وہ خط پیش کیا گیا جو میری لاش کے ساتھ پایا جاتا تھا۔

وہ چھے تھے اور عدالت کے کمرے کی دیوار کے ساتھ لگے کھڑے تھے۔ ان کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ان کے دونوں پیروں کو ٹخنوں کے پاس باندھ دیا گیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ وہ حرکت نہ کر سکیں۔ ان کے منہ پٹیوں سے باندھے گئے تھے کہ بول نہ سکیں۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے، التجا تھی کہ ہم انہیں چھوڑ دیں مگر اب ان کا چھوڑنا ہمارے لیے ممکن نہ تھا۔

جوگیندر نے ان سب کو سزائے موت سنا دی۔ جونی [illegible] اور ماوا لنگر کے سوا باقی کو اسی وقت موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا پھر اس نے رحمان کی موت کا حکم بھی سنا [illegible] رحمان اور اس کے ساتھیوں پر علیحدہ مقدمہ چلایا گیا تھا۔ جس وقت رحمان پر مقدمہ چلا، اسے بھی عدالت کے کمرے میں لایا گیا۔ اسے بھی دوسروں کی طرح دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا گیا۔ رحمان کے چوتھے ساتھی یعنی ڈرائیور پر اس کی عدم موجودگی میں مقدمہ چلا اور اس کی گرفتاری کا حکم دیا گیا۔ رحمان کے دونوں ساتھیوں کو بھی عدالت برخاست ہونے کے بعد ایک گھنٹے کے اندر موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دیا گیا۔ رحمان کی موت چھے دن کی لیے موخر کر دی گئی کہ سزائے موت پانے والے مجرموں کو موت کے گھاٹ اتارنے کا فرض بھی انجام دیتا تھا۔

وقت کی یہ کیسی ستم ظریفی تھی! یہ سب لوگ اسی کمرے میں بیٹھ کر مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑانے کے منصوبوں کے تارو پود تیار کرتے تھے، یہاں بیٹھ کر انسانوں کو انسانوں سے لڑوانے کی ترکیبیں سوچا کرتے تھے۔ آج کا کمرا ان کے لیے عدالت کا کمرا بن گیا تھا۔

عدالت برخاست ہوئی تو وہ ساتوں گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے۔ وہ بار بار زمین پر اپنا سر رکھ رہے تھے مگر ہمیں ان سے کوئی ہمدردی نہ تھی۔ قاتلوں سے کیسی ہمدردی! فیصلہ سنانے کے بعد میں نے جوگیندر کا چہرہ دیکھا جو زرد پڑا ہوا تھا۔ اس پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے۔ خود میری قمیص کے کالر کے نیچے بھی پسینے کی لکیریں سرسرا رہی تھیں۔ میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی پہلی انگلی سے پسینے کو صاف کیا تھا۔ بخت خان کی آنکھوں سے زندگی کی ساری چمک جیسے ختم ہو گئی تھی۔ ہم تینوں ایک دوسرے کے قریب کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جو جج صاحبان، مجرموں کو سزائے موت سناتے ہوں گے کتنے باحوصلہ ہوتے ہوں گے! انہیں کس قدر کرب سے گزرنا پڑتا ہو گا۔ اپنے ہی جیسے کسی دوسرے انسان کو موت کی سزا سنانا بہت ہمت کی بات ہے۔

بڑی دیر تک موت کا سا سناٹا طاری رہا۔ ہم میں سے کسی میں اتنی ہمت بھی نہ تھی کہ بات کرتا۔ بات کرنے کو دل ہی نہیں چاہ رہا تھا۔ وہ ساتوں ہمارے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ان کے بندھے ہوئے منہ سے گھٹی گھٹی آوازیں نکل رہی تھیں۔ وہ شاید برخاست ہو جانے والی عدالت کے طریقۂ کار پر احتجاج کر رہے تھے۔ رحم کی اپیل کر رہے تھے مگر اس وقت ہم انصاف کے کرتا دھرتا بنے رہے۔ ہم نے اپنے کان ہر فریاد کے لیے بند کر لیے تھے، شاید اس خوف سے کہ ہم انہیں چھوڑ دیتے تو ہماری زندگی خطرے میں پڑ جاتی۔

"اب کیا کیا جائے؟" کافی دیر کے بعد جوگیندر نے میری طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

"اب سزائے موت پر عمل درآمد کیا جائے اور کیا!" میں بولا۔ "بخت خان اوپر سے سائنائڈ زہر کی شیشی اور ڈراپر لے آؤ!"

بخت خان منہ سے کچھ کہے بغیر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ یوں جیسے وہ اس اعصاب شکن ماحول سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا ہو۔

"تم کچھ خاموش ہو جوگیندر!" میں نے اپنے دوست کو مخاطب کیا۔ "کیوں؟"

"تم بھی تو خاموش ہو شاہین!" جوگیندر کھوئے کھوئے سے لہجے میں بولا۔ اس کے چہرے کی تازگی اور لہجے کی شگفتگی دم توڑ گئی تھی۔

"ہاں میں بھی خاموش ہوں۔" میں نے کہا۔ "شاید تمہاری طرح میں بھی اس ماحول کی سنگینی سے متاثر ہوں۔ کیسی عجیب بات ہے جوگیندر کہ کل جب میں زیبی کے عقوبت خانے میں اذیت سے گزر رہا تھا تو میرے وہم و گمان میں بھی یہ نہ تھا، صرف بیس بائیس گھنٹے بعد بازی اس طرح پلٹ جائے گی۔ کل میں نے ان میں سے کسی کو جو میری زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کر چکے تھے، اس طرح پریشان و افسردہ نہیں دیکھا تھا کیوں جوگیندر، آخر انسان اس قدر بے حس ہو جاتا ہے؟" میں نے اس سے پوچھا تھا مگر وہ کوئی جواب نہیں دے سکا تھا۔ "ذرا سوچو جوگیندر! یہی لوگ کتنے ٹھنڈے دل سے انسانوں کو مروانے کے منصوبے بناتے ہیں یا یوں کہہ لو کہ بناتے تھے۔ کبھی ان کے دل میں انسانوں سے ہمدردی کا جذبہ نہیں جاگا میرے دوست! یہ لوگ وہ موذی جانور ہیں کہ اگر تم ان پر اس وقت ذرا سی گرفت ڈھیلی کر دو گے تو یہ پلٹ کر تمہیں ہلاک کر دیں گے۔ یہ لوگ کسی رحم کے مستحق نہیں۔ یہ لوگ اس قابل نہیں کہ ان کی موت پر افسردہ ہوا جائے۔ ان کی موت ہمارے لیے باعث تاسف نہیں ہونا چاہیے۔

"دلائل اور منطق کے اعتبار سے تم ٹھیک کہہ رہے ہو شاہین!" جوگیندر بولا۔ "حقائق کا تقاضا بھی یہی ہے مگر میں نے انسان کو ہمیشہ انسان سمجھا ہے۔" وہ خاموش ہو گیا۔ شاید اسے یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ کوئی ٹھوس دلیل پیش نہیں کر سکتا تھا۔ "تم ٹھیک ہی کہتے ہو۔ یہ لوگ ننگ انسانیت ہیں۔ ان پر رحم کرنا، ان کی موت پر افسردہ ہونا انسان اور انسانیت سے دشمنی ہے۔" وہ جھرجھری لے کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جیسے اپنے ان تمام خیالات کو ذہن سے جھٹک دیا ہو جو اسے افسردہ کیے ہوئے تھے۔ "ہمیں جلدی کرنا چاہیے، ابھی بہت کام ہے۔"

بخت خان سائنائڈ کی شیشی اور ڈراپر لے کر آنے کے بعد احتیاط سے میز پر رکھ چکا تھا۔ میں نے ڈراپر میں سائنائڈ بھرا۔ ڈراپر میں تقریباً پچاس قطرے آ چکے تھے۔ یہ زہری قطرے کے حساب سے پچاس آدمیوں کے لیے ہلاکت کا پیغام بن سکتا تھا اور ہمیں صرف سات افراد کو موت کی سزا دینا تھی۔

سب سے پہلے شیام دت کو اٹھایا گیا۔ یہ وہی تھا جس نے میری موت کا سودا زیبی اور پھر رحمان سے کیا تھا۔ وہ بری طرح مچلا مگر اس کی ہر کوشش بے سود تھی۔ میں اور بخت خان اسے سزائے موت پانے والے دوسرے مجرموں سے علیحدہ لے آئے۔ وہ فرش پر پڑا بری طرح مچل رہا تھا۔ باقی چھے مجرم سمٹ سمٹا کر ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ سخت ابتلا اور خوف کے وقت انسان اسی طرح ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔

میں نے رحمان سے کہا۔ "رحمان! تم نے رات کو مجھ سے کہا تھا کہ تم صرف جلاد کے فرائض انجام دے رہے ہو۔ تمہیں میری جان لینے سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اب بھی تمہیں یہ کام کرنا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ مجرم بدل گئے ہیں۔ کل تمہیں صرف ایک مجرم کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا، آج چھے مجرموں کو موت کے گھاٹ اتارو گے۔ کل تم انگریز کی خواہش پر مجھے قتل کرنے کے لیے تیار تھے، آج تمہیں ہماری عدالت کے فیصلے پر عمل کرنا ہے۔ تمہارے لیے اس وقت ہمارا حکم ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ تمہیں یاد رکھنا

چاہیے کہ چھے دن کی مہلت تمہیں صرف اس لیے دی گئی ہے کہ ان مجرموں کو موت کے گھاٹ اتارنا ہے اگر تم نے اس فرض کی ادائیگی میں ذرا سی بھی کوتاہی کی تو یاد رکھو تمہیں ایسی ہولناک سزا دی جائے گی کہ تمہارے بزرگوں کی روحیں بھی تڑپ اٹھیں گی۔ ان چھے دنوں میں تمہیں ایسی اذیت سے گزرنا پڑے گا کہ تم موت کی خواہش کرتے رہو گے مگر موت تم سے دور کھڑی مسکراتی رہے گی۔ تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ اپنا کام نفاست اور مہارت سے کرو۔ یہ رہا ڈراپر!" میں نے میز پر رکھے ہوئے ڈراپر کی طرف اشارہ کیا۔ "ہر ایک کے نتھنوں میں ایک ایک قطرہ ٹپکا دو۔ تم ہر کام سکون سے کرنا چاہتے ہو اور میں بھی یہی چاہتا ہوں۔ ان کے منہ اسی طرح بندھے رہنے دو ورنہ منہ کھولا تو یہ اسی طرح ممیائیں گے جیسے بکرا قصاب کی چھری کو دیکھ کر ممیاتا ہے۔"

باقی چھے مجرم پھر کسمسائے تھے۔ شیام دت بری طرح مچلے جا رہا تھا۔

"میں تمہارے ہاتھ کھول رہا ہوں۔" میں نے رحمان کو گھسیٹ کر ایک طرف کیا۔ "تمہارے لیے بہتر یہی ہے کہ وہی کرو جو کہا گیا ہے۔" ڈراپر میز سے اٹھا کر میں' رحمان کی طرف پلٹا تو وہ ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ "مجھے غصہ مت دلاؤ رحمان!" میں نے جھلا کر کہا۔ "یہ تھامو!" یہ کہہ کر میں نے سائنائڈ سے بھرا ہوا ڈراپر اسے دے دیا۔

اس دن مجھے ایسا محسوس ہوا کہ ہر طرف سے مایوس ہو کر جب انسان زندگی کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو اس میں کتنی قوت آجاتی ہے! کہتے ہیں کہ دیوانے آدمی میں سمجھدار انسان کے مقابلے میں دس گنا قوت ہوتی ہے۔ مایوسی کے عالم میں جب انسان جدوجہد کرتا ہے تو وہ بھی عالم دیوانگی میں ہوتا ہے۔ بہرحال میں نے اور بخت خاں نے مل کر شیام دت کو بے بس کر لیا۔ بخت خاں نے اسے ٹانگوں کی طرف سے پکڑا تھا اور میں اس کے سینے پر سوار ہو کر اس کا چہرہ سیدھا کیے ہوئے تھا پھر رحمان نے اس کے نتھنوں میں سائنائڈ کا ایک ایک قطرہ ٹپکا دیا۔

چند لمحوں میں وہ ساکت ہو گیا۔ میں اس کے سینے سے اتر آیا۔ اس وقت میرے جسم کے تمام مساموں سے جیسے پسینا پھوٹ بہا تھا۔ بخت خاں ایک کرسی پر ڈھیر ہو گیا تھا۔ رحمان زمین پر ایک طرف بیٹھا کپکپا رہا تھا اور ڈراپر اس نے ایک طرف ڈال دیا تھا۔

میں نے پلٹ کر باقی مجرموں کی طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں وحشت ناچ رہی تھی اور چہرے پیلے پڑ گئے تھے۔ خوف کی وجہ سے شاید ان کے حلق بھی بند ہو کر رہ گئے تھے۔ جوگیندر مجھے اس وقت انسان نہیں' سومیائی ہوئی لاش معلوم ہو رہا تھا۔ خود میری حالت اس وقت عجیب ہو رہی تھی' دل تھا کہ بری طرح دھڑک رہا تھا' جسم میں جیسے جان نہیں رہی تھی۔ رحمان' شیام دت کی لاش کے پاس منجمد سا بیٹھا تھا۔

"اب باقی کام بھی جلدی کرو!" جوگیندر کے ہونٹ ہلے۔ اس کی آواز کہیں دور سے آتی معلوم ہوئی "پھر اور بھی بہت سا کام ہے۔"

مجرموں میں پھر بے چینی دوڑ گئی۔ "آؤ بخت خاں!" میں نے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ شیام دت کو مارنے کے بعد اب ہمارے لیے کوئی اور راہ ہی نہیں رہ گئی تھی۔ کاش میں ایسا نہ کرتا! میں سوچ رہا تھا۔

اس کے بعد قادر مٹھا' لالہ موتی چند اور طیب جی بھی اپنے انجام کو پہنچ گئے۔

یہ وہ کمرا تھا جہاں ہندوستان کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو آپس میں لڑانے' بڑے پیمانے پر انسانوں کو ہلاک کرنے کے منصوبے بنائے جاتے تھے' اجلاس ہوتے تھے۔ آج یہی کمرا ان لوگوں کے لیے قتل گاہ میں تبدیل ہو گیا تھا۔

اس کام سے فارغ ہو کر ہم اوپر چلے گئے۔ اوپر کی منزل پر روشنی نہیں تھی' ٹارچ کی روشنی سے کام چلایا پھر رحمان کے ذریعے اس کے چپراسی اور دوسرے کارندے کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا اور ہم ان کی لاشوں کو بھی نیچے لے آئے تھے۔

اب ان لاشوں کو کلکتے کے مختلف علاقوں میں پھینکنے کا مرحلہ تھا مگر جوگیندر نے اس پروگرام کی مخالفت کی تھی۔ جوگیندر نے اس دوران میں جب کہ بالائی منزل پر دو مجرموں کو سزائے موت دی جا رہی تھی' چاروں لاشیں اسٹور میں بند کر دی تھیں۔ اس کا کہنا تھا کہ لاشیں شہر کے ایک مقام سے ملیں یا مختلف مقامات سے اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا بلکہ اگر یہ لاشیں اسی مکان سے برآمد ہوں تو زیادہ بہتر ہے کیوں رحمان غائب ہو گا تو پولیس اسی نتیجے پر پہنچے گی کہ رحمان ہی ان کا قاتل ہے یا پھر ان لوگوں کے قتل سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ ہم نے اسی لیے باقی دو لاشیں بھی اسی اسٹور میں ڈال کر باہر سے تالا لگا دیا۔

ہمیں اب اس مکان کو چھوڑ دینا تھا۔ جوگیندر نے اپنی کار مکان کے عقبی حصے کے نکڑ سے قریب کھڑی کی تھی۔ میں نے مکان کا پچھلا دروازہ کھول کر گلی کا جائزہ لیا۔ گلی تاریک اور سنسان پڑی تھی۔ اسی وقت جوگیندر میرے پاس آیا اور

اس نے کہا کہ ان لوگوں کو گلی سے نہیں بلکہ اس کمرے سے کار میں منتقل کیا جائے جس کا دروازہ پہلو کی سڑک پر کھلتا تھا۔ تجویز معقول تھی ہم لوگ واپس آ گئے۔

جوگیندر نے کچھ سوچ کر ہی کار اس دروازے کے سامنے کھڑی کی تھی اور اس سے ان تینوں یعنی ماوا لنگر' چونی لال اور رحمان کو کار میں منتقل کرنا آسان تھا۔ میں نے سب سے پہلے وہ گٹھری کار میں رکھی جس میں رحمان کے مکان سے ملنے والے کاغذات اور ہنڈیوں کے عوض ملنے والی رقم موجود تھی۔ اس کے بعد ماوا لنگر اور رحمان کو کار میں منتقل کر دیا گیا۔ جوگیندر کار میں بیٹھا تھا۔ میں اور بخت خاں اسی وقت چونی لال کو لے کر کمرے میں پہنچے تھے کہ مکان کے باہر ہمیں سرگرمی محسوس ہوئی۔ لگتا تھا' تین چار آدمی دوسری منزل کے زینے پر موجود ہیں۔

میں نے چونی لال کو کندھے سے اتار کر بخت خاں سے کہا۔ "تم اسے لے کر کار میں جاؤ' میں دیکھتا ہوں کیا معاملہ ہے!"

میں تیزی سے دبے پاؤں باہر آیا اور باہر کی آوازوں پر کان لگا دیے۔

"یہ دیکھو استاد' تالا لگا ہے۔" یہ آشنا آواز استاد ڈبی کے ایک گرگے مچھو کی تھی۔

ابھی یہ اپنی مدر کا ہزبینڈ کہاں گیا ہے۔ استاد ڈبی کی آواز ابھری۔ "ابھی ہم کار میں بیٹھتا ہے۔ تم لوگ نیچے کے لوگوں سے پتا کرو' رحمان کب آئیں گا؟ کہاں گیا ہے؟ ابھی ہم دیکھیں گا' بچ کے کہاں جائیں گا! اس کا تو ماں کا..." استاد ڈبی نے موٹی سی گالی دی۔

اسی وقت دروازے پر دستک ہوئی۔ یہ دستک نچلی منزل کے دروازے پر ہوئی تھی۔ بخت خاں میرے پاس آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ میں نے چپکے سے کہا۔ "دروازہ کھولو اور پوچھو کہ کون ہے؟ رحمان کے بارے میں پوچھا جائے تو کہنا۔ وہ صبح آئے گا' بیلگچھیا گیا ہے۔"

میں پستول لے کر کھڑا ہو گیا تھا۔ نہ معلوم کیا حادثہ پیش آنے والا تھا۔ بخت خاں نے دروازہ کھولا۔ "کہیے!"

"یہ رحمان صاحب اوپر رہتا ہے۔"

"ہاں اوپر رہتا ہے۔"

"معلوم ہے کب آئیں گا؟ تالا لگا پڑا ہے۔"

"رحمان صاحب' آج شام بیلگچھیا گئے ہیں۔ کہہ گئے ہیں کل صبح آئیں گے۔ کسی کے انتقال میں گئے ہیں۔" بخت خاں نے جواب دیا۔

"رام رام۔" مچھو بولا۔ "بڑا سوری ہوا سن کر۔"

"آپ کا نام؟" بخت خاں نے پوچھا۔ "میں انھیں بتا دوں گا۔ کوئی پیغام؟"

"نہیں ٹھیک ہے' ہم صبح مل لیں گا۔" مچھو نے کہا۔

"ویسے رات کو تو نہیں آئیں گا؟"

"پتا نہیں' مجھ سے تو صبح ہی آنے کو بول گئے تھے۔"

"اچھا شکریہ! آپ کو تکلیف دیا۔"

"کوئی بات نہیں۔" بخت خاں نے کہا۔

پھر مچھو کے دور ہوتے قدموں کی آواز ابھری۔ بخت خاں نے دروازہ بند کر دیا۔ اس کے بعد ہم دونوں وہاں سے تیزی کے ساتھ چلتے ہوئے جوگیندر کی کار میں آ بیٹھے۔

"کیا ہو گیا تھا؟ اتنی دیر کیسے ہو گئی تھی؟" جوگیندر نے کار اسٹارٹ کرتے ہوئے دریافت کیا۔

"استاد ڈبی اپنے گرگوں کے ساتھ رحمان کی تلاش میں آیا تھا۔" میں نے بتایا۔

کار چل پڑی۔ جوگیندر خاموش ہو گیا تھا۔ شاید وہ یہ سوچ رہا تھا کہ آخر استاد ڈبی کو رحمان سے کیا کام پڑ گیا؟ مگر میں یہ سوچ رہا تھا کہ استاد ڈبی کو رحمان کا کیسے پتا چلا؟ رحمان نے بتایا تھا کہ اس کی قیام گاہ سے صرف اس کے گینگ کے تین افراد واقف ہیں' ایک چپراسی' ایک ڈرائیور اور ایک وہ کارندہ جو سائنائڈ لایا تھا۔ اس وقت ان میں سے دو' لاشوں میں تبدیل ہو چکے تھے۔ ڈرائیور رات بارہ بجے ڈلہوزی اسکوائر میں ہو گا۔ میرا خیال تھا کہ استاد ڈبی اس ڈرائیور کے ذریعے یقیناً اس مکان تک نہیں پہنچا ہو گا کیوں کہ ڈرائیور تو ڈبی کے عقوبت خانے میں گیا ہی نہیں تھا۔ اس وقت مجھے رحمان کے اس ساتھی کا خیال آیا جسے اس نے ڈبی کے اڈے ہی پر چھوڑ دیا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ وہی استاد ڈبی کے ہتھے چڑھ گیا ہو۔ رحمان کے گھر پہنچنے کا دوسرا ذریعہ شیام دت تھا مگر میں نے یہ خیال بھی مسترد کر دیا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ شیام دت سے مل بھی لیتا تو شیام دت اسے یہ کیسے بتا سکتا تھا کہ رحمان یہاں رہتا ہے۔ رحمان کا بیان تھا کہ اس کے چھے بدکروں میں سے ایک بھی اس کی قیام گاہ سے واقف نہیں پھر استاد ڈبی کس طرح یہاں پہنچا؟ کس نے اسے رحمان کے گھر کا پتا بتایا؟ میں سوچتا رہا۔

کار تیزی سے اپنی منزل کی طرف رواں تھی۔ تینوں مجرم پچھلی اور اگلی نشستوں کے درمیان پڑے ہوئے تھے۔ بخت خاں پچھلی نشست پر بیٹھا تھا۔

"سنو جوگیندر!" میں نے کہا۔ "کل رات جب تم

استاس ڈپی کے ٹھکانے پر میری تلاش میں پہنچے تھے تو وہاں تمہیں کوئی اور آدمی بھی ملا تھا؟"

"اور کون آدمی؟ وہاں چار آدمی تھے اور چاروں ہی بندھے ہوئے تھے۔ کیا سوچ رہے ہو تم؟" جوگیندر نے کہا۔

"سوچ رہا ہوں۔ استاد ڈپی' رحمان کے گھر کس ذریعے سے پہنچا ہوگا؟"

"ڈپی؟" جوگیندر بولا۔ "شاید ٹپی کے ذریعے۔ ہم بھی اسی کی وجہ سے یہاں پہنچے تھے۔ شاید ڈپی نے ٹپی کو کہیں پکڑ لیا ہوگا۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ وہ دو چار دن تک اپنے گھر نہ جائے۔"

"یقیناً وہ ٹپی ہی کے ذریعے وہاں پہنچا ہوگا۔ میرا دل جوگیندر کی بات پر ٹھٹک رہا تھا۔

اسی وقت جوگیندر نے بتایا۔ "ایک کار بڑی دیر سے ہمارے پیچھے آ رہی ہے۔" اس کی نظریں عقبی آئینے پر جمی ہوئی تھیں۔

یہ سن کر میں چونک اٹھا اور مڑ کر سڑک کا جائزہ لیا۔ کافی فاصلے پر ایک کار کی ہیڈلائٹس نظر آ رہی تھیں پھر بخت خاں نے بھی کار کے تعاقب کی تصدیق کر دی۔ وہ بھی اس کار کو خاصی دیر سے پیچھے آتے دیکھ رہا تھا۔

"کون ہو سکتے ہیں یہ لوگ؟" جوگیندر بڑبڑایا۔

"اب کیا کرو گے؟" میں نے جوگیندر سے پوچھا۔

"دیکھتے جاؤ۔" جوگیندر نے یہ کہتے ہوئے کار کی رفتار بڑھا دی پھر تین چار موڑ تیزی سے کاٹے۔ دو موڑ تک وہ کار پیچھے لگی رہی۔ تیسرے موڑ پر کار موڑتے ہی جوگیندر نے کار کی رفتار انتہائی تیز کر دی پھر جب اس نے اگلا موڑ کاٹا تو تعاقب کرنے والی کار کی روشنیاں عقب میں نہیں تھیں مگر جوگیندر نے کار کی رفتار کم نہیں کی۔ وہ اب ہر قیمت پر تعاقب میں آنے والی کار سے پیچھا چھڑا لینا چاہتا تھا۔

اس وقت ہم شیام بازار جا رہے تھے۔ شیام بازار میں بھی سیٹھ موہن لال کی ایک کوٹھی تھی۔ یہ کوٹھی آراستہ و پیراستہ حالت میں ان دنوں کرائے کے لیے خالی تھی۔ اسے وہ صرف انگریز افسروں کو کرائے پر دیتے تھے کیوں کہ ان سے ایک تو کرایہ اچھا ملتا تھا' دوسرے انگریز کوٹھی کو بھی اچھی حالت میں رکھتے تھے۔ کوٹھی ہمارے پروگرام کے لیے بہت مفید رہے گی۔ کوٹھی میں ایک لمبا چوڑا تہ خانہ بھی تھا جہاں دو کمرے بھی بنے ہوئے تھے۔ اس کوٹھی میں ایک گونگا چوکیدار بھی رہتا تھا جو کوٹھی کی نگہداشت کرتا تھا۔

"یار جوگیندر!" میں پھر بولا "اگر استاد ڈپی' ٹپی ہی کے ذریعے رحمان کے گھر پہنچا تھا تو شاید اس نے ٹپی سے یہ بھی معلوم کر لیا ہو کہ تم بھی رحمان کی تلاش میں تھے۔"

"ہو سکتا ہے۔" جوگیندر نے جواب دیا۔

"اگر ایسا ہے تو استاد ڈپی دوبارہ تمہاری کوٹھی پر حملہ کر سکتا ہے۔" میں نے اپنے اندیشے کا اظہار کیا۔

جوگیندر بے چین ہو گیا۔ "ہاں یہ ممکن ہے میں تمہیں چھوڑ کر سیدھا ٹالی گنج جاؤں گا۔" اس نے کار کی رفتار اور تیز کر دی۔

دس منٹ بعد ہم شیام بازار میں جوگیندر کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ بوڑھے چوکیدار نے گیٹ کھولا اور نمستے کے انداز میں ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جوگیندر نے چوکیدار کے قریب پہنچ کر اسے مخاطب کیا۔ "یہ میرے دوست ہیں۔ یہ یہیں رہیں گے۔ ان کا خیال رکھنا!"

بوڑھے بابا نے جھک کر ہاتھوں سے اس طرح اشارے کیے جیسے جوگیندر کی بات سمجھ گیا ہو۔

"اچھا جاؤ' اب جا کر سو جاؤ!" جوگیندر' چوکیدار سے بولا۔ بوڑھا ہاتھوں سے کچھ اشارے کرنے لگا۔ "نہیں' نہیں اب تم جا کر سو جاؤ۔ ان لوگوں کو میں خود اندر لے جاؤں گا۔ اب کوئی کام نہیں ہے۔" جوگیندر نے جیب سے ایک روپے کا سکہ نکال کر بابا کو دیا اور اس کا بازو پکڑ کر اسے دو چار قدم اس کی کوٹھری کی طرف لے گیا۔ "جاؤ اب تم سو جاؤ!"

بابا چلا گیا تو جوگیندر نے کوٹھی کا صدر دروازہ کھولا' سوئچ دبا کر لائٹ آن کی پھر ان تینوں مجرموں کو ہم نے یکے بعد دیگرے تہ خانے میں پہنچا دیا اور باہر آنے سے قبل ایک مرتبہ پھر ان کی بندشیں دیکھیں۔

"میرا خیال ہے شاہین کہ بخت خاں کو اب اس شہر میں نہیں رہنا چاہیے۔" جوگیندر نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔ "مجاہد اول کا نائب ہونے کی حیثیت سے تمہیں اس سلسلے میں کوئی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ میرے خیال میں بخت خاں کو کل صبح تک اس شہر سے نکل جانا چاہیے۔"

"وہ کیوں؟" بخت خاں نے وضاحت چاہی۔

"بات یہ ہے بخت خاں کہ اتنے اہم آدمیوں کی ہلاکت سے حکومت پاگل ہو جائے گی۔ بڑے پیمانے پر تفتیش ہو گی۔ اس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آنا لازمی ہے کہ مجھے بمو کروں کے پاس ایک ہی حلیے کا شخص پہنچا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ ان جیسے جگھوں پر کوئی ایسا آدمی بھی رہا ہو جو تمہیں شکل سے پہچان لے پھر پولیس کو تم تک پہنچنے میں دیر نہیں ہو گی۔" جوگیندر نے تفصیل کے ساتھ بخت خاں کو خطرے سے آگاہ کیا۔

"میں پولیس سے نہیں ڈرتا۔" بخت خاں حسب توقع بولا۔

"جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں بخت خاں!" میں نے مداخلت کی۔ "جوگیندر ٹھیک کہتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم یہاں سے دہلی چلے جاؤ! میں مجاہد اول کو اس سے آگاہ کر دوں گا۔ میں اور جوگیندر' ٹالی گنج جا رہے ہیں۔ راستے میں ہم تمہیں کولوٹولہ اتار دیں گے جہاں تم ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہیں تمہارا سامان بھی ہے اور سنو! اخراجات کے لیے بمو کروں سے حاصل شدہ مالِ غنیمت میں سے پانچ ہزار روپے تم لے جاؤ!"

بخت خاں کچھ نہ بولا۔ ہم تینوں کار میں بیٹھ کر وہاں سے روانہ ہو گئے۔ ہم نے بخت خاں کو کولوٹولہ میں اتار دیا۔ اگلے روز صبح اسے دہلی روانہ ہو جانا تھا۔ جوگیندر نے جو کچھ سوچا تھا میری دانست میں درست ہی تھا۔ واقعی اس بات کا امکان تھا کہ پولیس سراغ لگاتی ہوئی اس تک پہنچ جاتی۔

اب کار کا رخ ٹالی گنج کی طرف تھا۔ اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ یہ رات ہمارے لیے بہت اہم تھی۔ ہمیں آج رات ابھی دو اور کام نمٹانے تھے کہ ان سے پہلے جوگیندر کے گھر جا کر سیٹھ موہن لال کو خطرے سے آگاہ کرنا تھا۔ یہ بات بعید از امکان نہیں تھی کہ ڈپی دوبارہ فاطمہ کو اغوا کر لیتا یا سیٹھ موہن لال اور جوگیندر میں سے کسی کو بھی اغوا کر کے لے جاتا۔

اس سڑک پر مڑتے ہی جو سیٹھ موہن لال کی کوٹھی کو جاتی تھی' جوگیندر نے کار کی روشنیاں بجھا دیں اور اسے ایک گلی میں موڑ لیا۔

"یہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"ہو سکتا ہے اس کار میں جو ہمارے تعاقب میں تھی' ڈپی یا اس کے ساتھی رہے ہوں۔" جوگیندر نے جواب دیا "اگر ایسا ہی تھا تو وہ لوگ سیدھے کوٹھی ہی آئے ہوں گے اور آس پاس ہی یا تو منڈلا رہے ہوں گے یا پھر۔" اس نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

سڑک کے کنارے کنارے درختوں اور دیواروں کے سائے سائے ہم دونوں' سیٹھ موہن لال کی کوٹھی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر چلنے کے بعد ہمیں ایک کار نظر آئی۔ وہ اسی جگہ کھڑی تھی جہاں وہ کار لا کر کھڑی کی گئی تھی جس میں مجھے اغوا کیا گیا تھا۔

اس کار کا ہیولا میں نے ہی دیکھا تھا۔ میں نے جوگیندر کا ہاتھ دبایا اور ہم دونوں وہیں ٹھٹک کر رہ گئے۔

پھر ہم دونوں تیزی سے پہلو والی سڑک پر مڑ گئے اور چکر کاٹ کر عقبی راستے سے گزرتے ہوئے اس کار کے پیچھے آ نکلے جسے دیکھ کر ہم دونوں ٹھٹکے تھے۔ میں اور جوگیندر دونوں ہی خاموش تھے۔ جوگیندر بھی میری طرح اندازہ لگا رہا ہو گا کہ وہ کار کس کی تھی۔ ہم دونوں پوری طرح چوکنا تھے اور نہایت آہستگی سے کار کی طرف بڑھ رہے تھے کہ عقب سے ایک آواز گونجی۔ "شاہین!"

یہ آواز میرے لیے غیر متوقع تھی۔ غالباً ہم دونوں ہی نے ایک ساتھ پلٹنا چاہا تھا۔

عین اسی لمحے پھر کہا گیا۔ "نا' نا! سیدھے چلتے رہو اور کار میں بیٹھ جاؤ!" یہ آواز مجاہد اول کی تھی۔

"جناب! آپ یہاں کیسے؟" میں نے سوال کیا پھر ہم دونوں کار میں بیٹھ گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک ہیولا ہمارے پاس سے گزر کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ چکا تھا۔ اس کے سر پر بھاری سی پگڑی تھی اور شانوں پر موٹی سی چادر پڑی تھی جس کی وجہ سے ہم اس کا چہرہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔

"تمہارے ساتھ غالباً جوگیندر ہے؟" مجاہد اول کی آواز ابھری۔

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا "مگر میں حیران ہوں کہ آپ اچانک یہاں کیسے آ پہنچے! آپ تو....."

"بعض تشویشناک اطلاعات کے سبب اور تمہاری حماقتوں کی وجہ سے۔" مجاہد اول نے جواب دیا۔

"مگر جناب' شاہین نے تو کوئی غلطی نہیں کی۔" اس مرتبہ جوگیندر میری حمایت میں بول اٹھا۔

"لاعلمی' بے عمل زندگی میں باعثِ رحمت ہو سکتی ہے لیکن عملی زندگی میں موت کے فرمان کے سوا کچھ نہیں! شاید تمہیں یہ جان کر خوشی ہو گی جوگیندر کہ تمہارے دوست کا نام' ہندوستان بھر کی پولیس میں خطرناک اور مطلوبہ شخص کی حیثیت سے گشت کرانے کی تجویز ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ شاہین کے لیے ایسے خطرات پیدا نہیں ہو سکتے تھے لیکن نادانی کی بنا پر ایسے خطرات پیدا کرنا دانش مندی نہیں ہے۔ بہرحال شاہین! میں بڑی دیر سے تمہارا منتظر تھا' اب مجھے رپورٹ دو' مکمل رپورٹ!" کار چلتی رہی۔

کلکتہ شہر میں قدم رکھنے کے بعد مجھے جو واقعات پیش آئے تھے میں تفصیل کے ساتھ مجاہد اول کو بتانے لگا۔ خاص طور پر میں نے رحمان چارلس سے حاصل ہونے والی معلومات نہایت تفصیل کے ساتھ بیان کیں۔ اس دوران

مجاہدِ اوّل نے چند سوالات بھی کیے اور وضاحتیں بھی طلب کیں۔

جب میں سب کچھ بتا چکا تو کار میں چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر مجاہدِ اوّل نے مجھ سے دریافت کیا۔ "اب تم اپنے تینوں قیدیوں کا کیا کرو گے؟"

"رحمان چارلس ایک ایسا شخص ہے جس سے ابھی بہت کچھ معلوم کیا جا سکتا ہے۔" میں بولا۔ "ماوا لنگر کو اس لیے زندہ رکھا گیا ہے کہ اس کے قبضے سے اس ہندو لڑکی کو رہا کرایا جا سکے جسے اس نے اپنی داشتہ بنا کر رکھا ہوا ہے۔ چونی لال اس لیے زندہ ہے کہ اس سے تنظیم کے لیے وہ سونا حاصل کیا جا سکے جو اس نے جمع کر رکھا ہے۔"

"ہوں" مجاہدِ اوّل نے ہنکارا بھرا پھر مجاہدِ اوّل نے ہدایت دی کہ اب ان تینوں مجرموں کو ہمیں اس کے حوالے کر دینا ہو گا۔ ان سے متعلق باقی کام کی ذمّے داری اب مجاہدِ اوّل نے خود اپنے ذمّے لے لی تھی۔ جب اس کے استفسار پر میں نے بخت خاں کے بارے میں بتایا تو اس نے میرے فیصلے سے اتفاق نہیں کیا۔ اس نے ہمیں ہدایت کی کہ ہم بخت خاں کو کوتوٹلہ سے شیام بازار والی کوٹھی میں صبح ہونے سے پہلے منتقل کر دیں، اسی کوٹھی میں جہاں تینوں مجرموں کو رکھا گیا ہے۔

ان ہدایات کے بعد گفتگو کا موضوع ہندو مسلم آویزش کو ہوا دینے کے لیے انگریز کی سازش پر آ گیا۔ مجاہدِ اوّل نے بتایا تھا کہ انگریز کی یہ پالیسی ہمیشہ سے رہی ہے لیکن اب سیاسی سطح پر کانگریس، خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ میں جو اتحاد پیدا ہو گیا ہے، وہ واقعی انگریز کے لیے خطرہ ہے۔ اس کا توڑا سے کرنا ہی ہے۔ ہندوستان جیسی بڑی منڈی کو انگریز آسانی سے تو ہاتھ سے نہیں جانے دے گا، سو اس مرتبہ اس نے ہندو مسلم منافرت کو ہوا دینے کے لیے دوسرے طریقے بھی اختیار کرنے کی ٹھانی ہے۔ انگریز کی یہ سازش زیادہ خطرناک ہے۔

"کیا یہ ممکن نہیں کہ انگریز اپنے ایجنٹوں کے ذریعے ہندوستان کے اہم لیڈروں کو قتل کرا دے اور پھر۔۔۔"

"نہیں۔" مجاہدِ اوّل نے میری بات کاٹ دی۔ "اس وقت ایسا براہِ راست اقدام انگریز مناسب نہیں سمجھے گا۔ اس وقت مولانا جوہر کی کوششوں سے اتحاد کی جو نوعیت بنی ہے، اس میں ایسے اقدامات سے تمام ہندوستان، انگریزوں کے خلاف اور بھی متحد ہو جائے گا۔ وہ پہلے اس اتحاد کو شکوک و شبہات پیدا کر کے کمزور کرنا چاہتا ہے۔ ایک مرتبہ یہ اتحاد ختم ہوا تو ہندو، مسلم ایک دوسرے سے بہت دور اور ایک دوسرے کے حریف بن کر کھڑے ہوں گے پھر انگریز ان دونوں کو آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو منتشر کر دے گا۔"

اس وقت کار ڈلہوزی اسکوائر کے قریب پہنچ چکی تھی۔ مجاہدِ اوّل نے کار کی رفتار کم کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "شاہین! آس پاس دیکھو۔ رحمان کا ڈرائیور یہیں کہیں کار لیے کھڑا ہو گا۔ پونے بارہ ہو رہے ہیں۔"

مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ مجاہدِ اوّل حالات و واقعات کے ہر پہلو پر کتنی کڑی نظر رکھتا ہے۔

"رحمان کے مکان پر ہونے والے واقعات سے لے کر اب تک میں رحمان کے ڈرائیور کو بھولا ہوا تھا۔ رحمان نے بتایا تھا کہ ڈرائیور کو کار لیے ہوئے رات بارہ بجے یہیں ملنا ہے۔ اگر رحمان اسے وہاں نہ ملتا تو وہ اس کے گھر پہنچتا اور ہماری کارگزاری وقت سے پہلے ہی طشت از بام ہو جاتی۔ شاید ہم وہ دونوں کام بھی نہ کر پاتے جن کے لیے ہم نے چونی لال اور ماوا لنگر کو زندہ رکھا تھا۔ یہی دو کام تھے جو ہمیں سب سے پہلے نمٹانا تھے۔

"آپ کو بہت یاد رہا جناب!" جوگیندر بولا۔ "ڈرائیور کو تو ہم بھول ہی گئے تھے۔"

"اس میں تم لوگوں کی عمر اور جذباتیت کو زیادہ دخل ہے۔ تم لوگ ذرا سی کامیابی پر خوشی سے دیوانے ہو جاتے ہو اور ذرا سی ناکامی پر مایوس۔ دونوں ہی صورتوں میں تم بعض اہم باتوں کو بھول جاتے ہو۔ ناتجربہ کاری اسی کو کہتے ہیں۔" مجاہدِ اوّل نے کہا۔

ڈاک خانے کی عمارت کے صدر دروازے کے قریب مجھے رحمان چارلس کی کار اور اس کے پاس کھڑا ہوا ڈرائیور نظر آ گیا۔ میں نے جب مجاہدِ اوّل کو بتایا تو اس نے کار روک دی پھر ہم دونوں سے گھر واپس جانے کو کہا۔

"آپ سے ایک درخواست ہے جناب!" جوگیندر بولا۔

"کہو!"

"پہلے آپ وعدہ کیجیے کہ میری درخواست کو ٹھکرائیں گے نہیں۔"

مجاہدِ اوّل ہنسا۔ یہ ہنسی عجیب سی تھی۔ "چلو تمہاری کارکردگی کے انعام کی خوشی میں وعدہ!"

"جناب! میری درخواست ہے کہ آپ مجھے میزبانی کا شرف بخشیں۔ پتاجی آپ سے مل کر بہت خوش ہوں گے۔"

"ایسی ملاقات کا کیا فائدہ کہ میزبان اپنے مہمان کا چہرہ ہی نہ دیکھ سکے۔"

اس وقت مجھے جوگیندر کی شخصیت پر رشک آیا۔ وہ واقعی گفتگو کرنے کا ماہر تھا پھر جرأت مند بھی۔ میرا خیال تھا کہ تنظیم کے کسی فرد نے مجاہدِ اوّل سے اس نوعیت کی درخواست کبھی نہ کی ہو گی۔ خود مجاہدِ اوّل کی گفتگو سے بھی یہ بات عیاں تھی مگر وہ کیوں کہ وعدہ کر چکا تھا اس لیے اب اس سے پھرنے کا سوال ہی نہیں تھا۔

"ٹھیک ہے جوگیندر!" مجاہدِ اوّل نے چند جملوں کے تبادلے کے بعد کہا۔ "میں کسی بھی رات ایک اور دو بجے کے درمیان تمہاری کوٹھی کے عقبی حصّے سے خاموشی کے ساتھ داخل ہو کر تمہاری میزبانی سے لطف اندوز ہوں گا۔"

اور اسی رات پونے دو بجے مجاہدِ اوّل، جوگیندر کے گھر موجود تھا۔ ہم اس وقت ڈرائنگ روم میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ ملازمین سونے کے لیے جا چکے تھے اچانک کھڑکی پر ہلکی سی دستک ہوئی، ساتھ سرگوشی ابھری۔ مجاہدِ اوّل نے جوگیندر کا نام لیا تھا۔

اس وقت مجاہدِ اوّل کی آمد غیر متوقع تھی۔ ہمارے خواب و خیال میں نہیں تھا کہ مجاہدِ اوّل اپنا وعدہ پورا کرنے اسی رات پہنچ جائے گا۔

ڈرائنگ روم کی تمام بتیاں بجھا دی گئیں۔ صرف ایک ٹیبل لیمپ روشن تھا جس کی ہلکی سی روشنی ڈرائنگ روم میں آ رہی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اندھیرا ہونے کے بعد مجاہدِ اوّل ایک سایہ بنا ہوا وہاں آیا۔ اس کا تمام جسم ایک سیاہ چغے میں چھپا ہوا تھا، چہرے پر حسبِ معمول نقاب تھی۔ وہ اندر آتے ہی دروازے کے ساتھ پڑے ہوئے صوفے پر بیٹھ گیا۔

"آداب موہن لال!" مجاہدِ اوّل نے کہا۔

"آداب!" سیٹھ موہن لال نے جواب دیا۔ اس کے ساتھ ہی فاطمہ نے مجاہدِ اوّل کو سلام کیا۔

سیٹھ موہن لال کے کہنے پر مجاہدِ اوّل نے آزادی، جدوجہد آزادی اور ہندوستان میں قومی اتحاد پر اپنا نقطہ نظر واضح کر دیا۔

"مگر آپ نے اپنے لیے جو راہ منتخب کی ہے، اسے دیکھتے ہوئے آپ کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔" فاطمہ نے مجاہدِ اوّل سے کہا۔

"میں اپنے دوستوں میں آیا ہوں۔" مجاہدِ اوّل بولا۔ "میں تم سب سے اچھی طرح واقف ہوں جس طرح گوشت ناخن سے پھر سیٹھ موہن لال تو وہ شخص ہے جس کی حب الوطنی کا گواہ سیٹھ صدیق جیسا شخص ہے۔ سیٹھ صدیق کے توسط سے تمہارے پتاجی نے ہماری تنظیم کی کتنی مدد کی ہے، مجھی کو معلوم ہے۔ تنظیم کے مالی اخراجات جو چند صاحب

حیثیت لوگ اٹھاتے ہیں ان میں تمہارے پتا کا بھی نام شامل ہے۔"

"سیٹھ صدیق مجھ سے زیادہ عظیم اور دیالو (سخی) شخص ہے۔ وہ دیوتا ہے دیوتا! جو اس سے مانگو' اس کے پاس ہو تو ضرور مل جاتا ہے۔ انکار کرنا اس نے سیکھا ہی نہیں ہے۔"

"اور سیٹھ صدیق تمہارے پتا جی کی دریا دلی کا معترف ہے۔ ایسے لوگوں کے گھر آنا میں اپنے لیے سعادت سمجھتا ہوں۔" مجاہد اوّل کہنے لگا۔ ہاں سیٹھ موہن لال! میں یہاں ایک اور مقصد سے بھی آیا ہوں کہ تمہارے بیٹے اور بیٹی کے سلسلے میں تمہیں مبارکباد دے سکوں کہ یہ دونوں تنظیم کے رکن بن چکے ہیں۔ میرا اپنا بیٹا بھی اس تنظیم کا رکن ہے۔ وہ بھی اس وقت اپنے گھر سے دور اپنا فرض ادا کر رہا ہے اور میں مطمئن ہوں۔"

"مجھے اپنی بیٹی اور بیٹے کے بارے میں معلوم ہو چکا ہے۔ ان دونوں نے مجھے خود ہی بتا دیا تھا اور میں نے اس پر انتہائی خوشی کا اظہار کیا تھا۔" سیٹھ موہن لال نے بتایا۔ "میرا دھن دولت اور اولاد' سب کچھ ہندوستان کی آزادی کے لیے وقف ہے۔ جوگیندر اور فاطمہ بھی میرا دھن دولت ہیں' میرا سب سے قیمتی سرمایہ ہیں۔ میں انہیں بھی اپنی طرف سے وقف کرتا ہوں۔"

"تم واقعی عظیم ہو سیٹھ موہن لال!" مجاہد اوّل کی آواز میں ارتعاش تھا۔ اب تنظیم نے جوگیندر اور فاطمہ کے ماں باپ کی جگہ لے لی ہے۔ تنظیم کے احکام اب ان دونوں کے لیے تمہارے احکام سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔"

"آپ یقین رکھیں مجاہد اوّل! میں بھی اس معاملے میں اپنی اولاد کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنوں گا۔" سیٹھ موہن لال کا چہرہ جوش سے سرخ ہو رہا تھا۔

"سیٹھ موہن لال! تمہارے گھرانے کو دو اعزاز حاصل ہیں۔ پہلا اعزاز یہ کہ تمہاری بیٹی آزادی ہند کے لیے جدّوجہد کرنے والی اس تنظیم کی پہلی مجاہدہ ہے۔ دوسرا اعزاز یہ کہ تمہارا گھرانا ہندوستان کا پہلا گھرانا ہے' جس کا ہر فرد اس تنظیم میں کسی نہ کسی طرح شامل ہے۔ میں اس گھرانے کو تنظیم کی طرف سے سلام کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر مجاہد اوّل نے تنظیمی انداز میں ہاتھ اٹھایا۔

"آپ مجھے شرمندہ کر رہے ہیں۔" سیٹھ موہن لال نے اظہارِ لجاجت کیا۔

"سیٹھ موہن لال! ہو سکتا ہے تم ڈپٹی کی طرف سے خطرہ محسوس کر رہے ہو۔ آج صبح تک اس کا بھی انتظام ہو جائے گا۔ تنظیم ایسے لوگوں سے نمٹنا خوب جانتی ہے۔ ہاں جوگیندر' ایک بات اور یاد آئی۔" مجاہد اوّل بولا۔ "احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ تمہارے تنظیمی ساتھی بھی تمہاری اصل شخصیت اور نام سے واقف نہ ہوں۔ فاطمہ کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ لوگ اسے بیتا کی حیثیت ہی سے اب تک جانتے پہچانتے ہیں۔ اس کا تنظیمی نام بھی یہی بہتر ہے۔ ہاں تمہارا تنظیمی نام آج سے منصور ہے۔ شاہین! آج کے بعد تم بھی جوگیندر کو منصور ہی کہو گے۔"

اس کے بعد فاطمہ چائے بنا لائی۔ چائے پینے کے بعد دو تین منٹ تک اور گفتگو رہی پھر مجاہد اوّل جس طرح آیا تھا اسی طرح چلا گیا۔ ابھی ہمیں ایک اور کام کرنا تھا۔ مجاہد اوّل کے حکم کے مطابق بخت خاں کو کولوٹولہ سے شیام بازار والی کوٹھی میں پہنچانا تھا اور مجاہد اوّل کا یہ پیغام دینا تھا کہ ابھی وہ اسی شہر میں رہے گا۔ غالباً مجاہد اوّل اس سے کوئی کام لینا چاہتا تھا۔ کوٹھی کی چابیاں جوگیندر پہلے ہی ڈلہوزی اسکوائر میں مجاہد اوّل کے حوالے کر چکا تھا۔ مجاہد اوّل نے کہا تھا کہ جب ہم بخت خاں کو وہاں لے کر پہنچیں گے تو چابیاں ہمیں تالے ہی میں مل جائیں گی۔

مجاہد اوّل چلا گیا تو میں اور جوگیندر اس کام کی تکمیل کے لیے نکلے اور جب واپس تالی گنج پہنچے تو صبح کے چار بج رہے تھے۔

میں جب بستر پر دراز ہوا تو خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کیا۔

صبح ہم ناشتے سے فارغ ہوئے تھے کہ سیٹھ صدیق کا ایک ملازم آگیا۔ وہ میرے اور جوگیندر کے لیے پیغام لایا تھا۔ سیٹھ صدیق نے ہمیں اپنی کوٹھی پر بلایا تھا۔ کام کی نوعیت کیا تھی' اس سلسلے میں ملازم کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ البتہ ملازم نے مجھ سے اتنا ضرور کہا تھا۔ "آپ جو خط لائے تھے' اس کا جواب لکھ لیا ہے۔ صاحب وہ جواب آپ کو دینا چاہتے ہیں۔"

میں اشارہ سمجھ گیا' معاملہ تنظیم ہی سے متعلق تھا۔ ہم دونوں فوراً پارک سرکس روانہ ہو گئے جہاں سیٹھ صدیق کی کوٹھی تھی۔

ہندو مسلم اتحاد کو ختم کرنے کے لیے جس سازش کا علم ہمیں رحمان چارلس کے توسط سے ہوا تھا' تنظیم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس سازش کو پھلنے پھولنے اور پنپنے سے پہلے ہی کچل دیا جائے۔ یہ سازش ایک ایسی بھڑکتی ہوئی آگ کے مانند تھی کہ شروع ہو جاتی تو پورا ہندوستان اس میں بھسم ہو جاتا۔

اس آگ کو جو انگریز بھڑکانا چاہتا تھا' ہندو اور مسلمان لیڈر ہی اپنی فہم و فراست سے روک سکتے تھے۔ کانگریس' خلافت کمیٹی اور مسلم لیگ اس وقت کسی نہ کسی طور پر ایک مشترکہ پلیٹ فارم پر جمع تھیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ اس اتحاد کو زیادہ مستحکم کیا جاتا' اس کے خلاف ہونے والی سازش سے ہندوستان کے سرکردہ لیڈروں کو آگاہ کر دیا جاتا اور اس کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ کلکتے میں اس وقت ہندوستان کے دو بڑے لیڈر موجود تھے' گاندھی جی اور قائداعظم محمد علی جناح! دو روز کے بعد کلکتے میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ قائداعظمؒ اسی سلسلے میں آئے ہوئے تھے۔ ان کا قیام ایسٹرن ہوٹل میں تھا۔ سیٹھ صدیق نے قائداعظمؒ سے ہمارے لیے ملاقات کا وقت لے لیا تھا۔ جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی تو میرا دل خوشی سے دھڑک اٹھا۔ میں اس شخصیت سے ملنے جا رہا تھا جس کا احترام پہلے ہی سے میرے دل میں تھا۔ علی گڑھ کے دوران قیام ہی میں قائداعظمؒ کی شخصیت سے میں متاثر ہو چکا تھا۔ گاندھی جی ابھی تک کلکتے سے واپس نہیں گئے تھے۔ ان کا ارادہ مسلم لیگ کے اجلاس کے بعد شہر سے جانے کا تھا۔ سیٹھ صدیق نے مجھ سے کہا تھا کہ پہلے تم لوگ محمد علی جناح سے مل لو پھر گاندھی جی سے تمہاری ملاقات کا بندوبست کروں گا۔

اس روز ہم اسی مہم کے پہلے مرحلے کے طور پر ایسٹرن ہوٹل کے اس کمرے میں موجود تھے جہاں محمد علی جناح ٹھہرے ہوئے تھے۔ ان دنوں قائداعظمؒ ہندو مسلم اتحاد کو عملی شکل دینے کے لیے سب سے زیادہ فعال نظر آتے تھے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر انہوں نے ایسی مثبت کوششیں کی تھیں کہ انہیں ہندو مسلم اتحاد کا سفیر کہا جانے لگا تھا۔

قائداعظمؒ ہم سے نہایت شفقت اور محبت سے ملے۔ اس کا سبب مجھے کچھ ہی دیر میں معلوم ہو گیا۔ جب میں نے اپنا تعارف کرایا تو انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا "تو وہ آپ ہیں' شعلہ نفس نوجوان جس نے بدیسی کپڑوں کی ہولی کے موقعے پر گاندھی جی کی بے معنی سیاست پر نکتہ چینی کی تھی' خوب!"

قائداعظمؒ اس وقت گہرے رنگ کے سوٹ میں ملبوس' عزم و استقلال کا پیکر نظر آ رہے تھے۔ ابتدائی چند ہی لمحوں میں ان کی دل آویز شخصیت کا سحر مجھ پر طاری ہو گیا تھا۔ میں خود کو خوش نصیب تصور کر رہا تھا کہ مجھے ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ یہی احساسات تقریباً اس وقت تھے جب میں پہلی مرتبہ لاہور میں علامہ اقبالؒ سے ملا تھا۔

اس کے بعد میں نے اور جوگیندر نے مل جل کر انگریزوں کی سازش کے بارے میں قائداعظمؒ کو آگاہ کیا' انہیں بتایا کہ کس طرح ہندوستان کے باشندوں کو انگریز نے آپس میں لڑانے کا منصوبہ بنایا ہے۔ یہ سب کچھ بتانے کے لیے میں نے قائداعظمؒ کو دھرم تلہ گراؤنڈ میں اپنی تقریر کے بعد فاطمہ کے اغوا پھر اپنے اوپر بیتی داستان اور رہائی معمولی ردوبدل کے ساتھ سنائی اور ان سے درخواست کی کہ وہ انگریز کی اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے جو کچھ ہو سکتا ہے کریں۔

قائداعظمؒ یہ باتیں سن کر کچھ دیر سوچتے رہے پھر انہوں نے اپنی تیز نگاہ میرے چہرے پر گاڑتے ہوئے کہا "نوجوان! تم نے جو کہانی سنائی ہے' اس میں بہت سے جھول ہیں۔ تمہاری یہ کہانی جھوٹ اور سچ کی آمیزش سے تیار کی گئی ہے لیکن اس کے باوجود تمہارا لہجہ تمہارے جذبات کی صداقت کا مظہر ہے۔ تم نے جو کچھ کہا ہے' خلوص اور نیک نیتی سے کہا ہے۔ تمہارا مقصد بھی وہی ہے جو تم نے بیان کیا ہے' یعنی تم بس یہی چاہتے ہو کہ ہندوستان کے سرکردہ لیڈر کسی طرح انگریز کی اس سازش کا سدّباب کریں مگر تم ایسا کیوں چاہتے ہو؟"

"اس لیے جناب کہ اگر اس وقت یہ اتحاد ختم ہو گیا تو یہ ملک برادر کشی کے ایک بہت بڑے مقتل میں تبدیل ہو جائے گا پھر اس ملک کی آزادی اور بھی دور ہو جائے گی۔"

"تم بہت جذباتی بھی ہو اور جوشیلے بھی!" قائداعظمؒ بولے "سیاست اجتماعی نفسیات کا کھیل ہے۔ اس وقت جو ہندو مسلم اتحاد قائم ہے' اس سے پہلے بھی قائم تھا مگر وہ اتحاد بھی مصنوعی اور عارضی تھا جیسا کہ ثابت ہو چکا ہے اور موجودہ اتحاد کی صورت بھی یہی ہے۔ یہ تمام تر مصلحتوں کے تحت وجود میں آیا ہے۔ ہندو اور مسلمان دونوں اپنی اپنی جگہ یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ اپنے مقصد کے لیے دوسرے کو احمق بنا کر استعمال کر رہے ہیں۔ یہ اتحاد بھی پہلے اتحاد کی طرح جلد یا بدیر ختم ہو جائے گا' خواہ اسے ختم کرنے کے لیے انگریز سازش کرے نہ کرے۔ یقین مانو نوجوان! آزادی کی منزل اب بھی اتنی ہی دور ہے جتنی سن چودہ یا سن اٹھارہ میں تھی۔"

"گویا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے کچھ نہیں کریں گے؟"

"یہ تم نے کیسے سمجھ لیا نوجوان! اس سلسلے میں مجھ سے جو کچھ ہو سکے گا' ضرور کروں گا' یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ سب

کچھ بے سود ہوگی۔"

"بے سود!" جوگیندر حیرانی سے بولا۔

"ہاں بے سود" قائداعظم ؒ نے کہا "ہندوستان کے لیڈروں کے ساتھ ایک مصیبت یہ ہے کہ وہ تانگے میں جتے ہوئے اس گھوڑے کے مانند ہیں جو سواریوں کو ان کی مرضی کے مطابق لے کر جاتا ہے۔ یہاں بوجھ کھینچنے والے کو لیڈر کہا جاتا ہے۔ یہ لیڈر کسی بھی جذباتی مسئلے کو اٹھا کر عوام کو مشتعل کر سکتے ہیں مگر ان کی توانائیوں کو صحیح سمت پر موڑنے کی ہمت اور جرات نہیں رکھتے پھر مشتعل عوام کی مرضی کے مطابق یہ لوگ اپنی سیاست کرتے ہیں' وقت کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے۔"

قائداعظم ؒ نے جو کچھ کہا تھا' صحیح کہا تھا۔ جوگیندر اس مرحلے پر کہنے لگا "مگر جناب' اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ اس صورت حال کو بدلنے کی کوشش نہ کی جائے۔"

"میں یہ کوشش کر رہا ہوں۔ اس سے پہلے کانگریس کے سابق صدر گوکھلے بھی کوشش کرتے ہوئے ختم ہو گئے۔ بہرحال نوجوان!" قائداعظم ؒ پھر مجھ سے مخاطب تھے "میں نے تمہارے بارے میں کچھ معلومات حاصل کرنا چاہی تھیں۔ دھرم تلہ میدان میں بھڑکائے جانے والے الاؤ کے موقعے پر تم نے جو تقریر کی تھی' اس کی اکا دکا باتیں مجھ تک پہنچی ہیں۔ مجھے بتاؤ کہ آخر تم کس سمت میں جدوجہد کر رہے ہو؟"

"جناب! میں ایک ایسی تنظیم کا رکن ہوں جو انگریز حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد پر یقین رکھتی ہے۔ جو سیاست کے ذریعے نہیں' اسی طاقت کے ذریعے انگریز کو ہندوستان سے نکالنا چاہتی ہے جس کے بل بوتے اس نے ہندوستان کو غلام بنایا ہے۔ ہم خود کو ہندوستان کی سیاست کا بازوئے شمشیر زن قرار دیتے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ جب ہماری سرگرمیاں پورے عروج پر ہوں گی تو آپ کی سیاسی جدوجہد تیزی سے اپنی منزل کی طرف بڑھے گی۔ اس وقت ہمارے سیاسی لیڈر اصلاحات اور ہوم رول کی بھیک نہیں مانگ رہے ہوں گے' مکمل آزادی کا مطالبہ کر رہے ہوں گے۔"

جذبات کی شدت سے قائداعظم ؒ کا چہرہ سرخ ہو گیا "کاش ایسا ہو سکے۔ کاش ہندو مسلم اتحاد' خلوص اور دیانت کے ساتھ صرف ہندوستان کی آزادی کے لیے قائم ہوتا مگر ایسا نہیں ہے۔ ہندو اس دیس کے مسلمانوں کو غلام بنائے رکھنا چاہتا ہے۔ وہ انگریز سے صرف اپنے لیے مراعات چاہتا ہے' مسلمان کو مراعات دینا نہیں چاہتا۔ تقسیم بنگال کی تنسیخ اسی لیے ہوئی' ہندو نے اس پر اسی لیے شور مچایا تھا کہ تقسیم بنگال سے مسلمانوں کو کچھ فائدہ پہنچا تھا۔ اس طرز عمل سے ہندوؤں نے مسلمانوں کو خود سے بہت دور دھکیل دیا' وہ مسلمان ہندوستان میں رہتے ہوئے اپنے قومی تشخص کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ اب ہندوستان ایک قوم کا نہیں' دو قوموں کا وطن ہے اور دوسری قوم جو عددی اعتبار سے کم سہی' اپنے لیے وہی مراعات طلب کر رہی ہے جو اکثریتی قوم اپنے لیے طلب کر رہی ہے۔"

"تو آپ ایک پائیدار ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہیں؟"

"مایوسی کا لفظ میری لغت میں نہیں ہے مگر فی الحال یہ دونوں قومیں ایک دوسرے سے متصادم ہونے کی راہ پر چل رہی ہیں۔ موجودہ اتحاد محض ریت کی دیوار ہے' محض عقل کا التباس ہے۔" قائداعظم ؒ بڑی خوب صورت اور رواں انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے "یہ دونوں قومیں کسی مشترکہ مقصد کے لیے متحد نہیں ہوئیں۔ تحریک خلافت سے ہندوؤں کو کوئی سروکار نہیں۔ ان کے درمیان مستحکم اتحاد کے لیے کوئی ایک قومی مقصد نہیں" قائداعظم ؒ ایک لمحے کے لیے رکے۔ ان کی تیز آنکھیں خالی دیوار کو گھورتی رہیں "شاید تمہیں یاد ہو' میں نے آج سے کئی برس پہلے بمبئی میں انگریز حکومت سے مطالبہ کیا تھا کہ ہم ہندوستان کے لیے نیشنل آرمی کے خواہش مند ہیں' اس کے لیے کرائے کے تنخواہ دار فوجی فراہم کرنا نہیں چاہتے۔ یہ ایک عظیم مطالبہ تھا' ایک عظیم مقصد تھا' ایک مشترکہ اور متحدہ مقصد تھا مگر میرے اس مطالبے کی حمایت میں کسی ہندو لیڈر نے ایک لفظ نہیں کہا حالانکہ میں نے مسلم آرمی کے قیام کا مطالبہ نہیں کیا تھا' نیشنل آرمی کے قیام کا مطالبہ کیا تھا اگر اس مطالبے کو پورے ہندوستان کا مطالبہ بنا دیا جاتا تو مجھے یقین ہے کہ نیشنل آرمی قائم ہو چکی ہوتی۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز جنگ میں مصروف تھا۔ اسے ایسا کرنا ہی پڑتا اور پھر ہم مسلح جدوجہد کی طرف تیزی سے قدم بڑھا چکے ہوتے' آزادی کے قریب پہنچ گئے ہوتے۔ اب پھر ہم بیس پچیس برس پیچھے چلے گئے ہیں۔"

قائداعظم ؒ خاموش ہو گئے۔ کمرے میں سناٹا پھیل گیا۔ نیشنل آرمی کے مطالبے کی اہمیت اس دن میری سمجھ میں آئی۔ اس روز پہلی مرتبہ مجھے احساس ہوا کہ قائداعظم ؒ وہ سیاست داں ہیں جو اپنی سیاست کی حکمت عملی مستقبل سے مربوط کر کے بناتے ہیں۔

"کچھ بھی ہو جناب!" میں بولا "ہم نے بہت چھوٹے پیمانے پر مسلح جدوجہد کا پروگرام بنایا ہے۔ کامیابی اور ناکامی کا خیال کیے بغیر ہم اس راہ پر آگے بڑھنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری جدوجہد رائیگاں ہرگز نہیں جائے گی۔"

"میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔ میں ہر طرح تم سے تعاون کے لیے تیار ہوں مگر اتنا سوچ لو کہ تم نے ایک غلط وقت پر اور غلط ملک میں اس راہ پر چلنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہاں تمہیں اتاترک شاید ہی ملے اور اگر اتاترک مل گیا تو شاید ہی کوئی عصمت انونویا انور جمال پاشا مل سکے۔"

قائداعظم ؒ سے مل کر ہم واپس آئے تو دونوں ہی خاموش تھے۔

"کیا ہم غلط سمت میں سفر کر رہے ہیں؟" کافی دیر بعد جوگیندر نے کہا۔

"ہم ایک مقصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد ہمارے سامنے واضح ہے۔ ہمارا سفر اسی سمت ہے۔ ضروری نہیں کہ منزل پر پہنچنے والے ہم ہی ہوں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم راہ میں مر کھپ جائیں اور ہمارے پیچھے آنے والے منزل پر پہنچیں۔ فتح حاصل کرنے والی فوج کا ہر سپاہی تو زندہ نہیں بچتا۔ زندہ رہنے والے اس لیے فتح مند ہوتے ہیں کہ وہ جنہوں نے ان کی طرف بڑھنے والے وار کو اپنے اوپر روک لیا تھا" میں نے جواب میں کہا تھا۔

بہرحال قائداعظم ؒ نے ہم سے وعدہ کیا تھا کہ وہ سرکردہ لیڈروں سے رابطہ قائم کر کے انہیں اس نئی انگریزی سازش سے آگاہ کریں گے اور ایک مرتبہ پھر ہندو مسلم اتحاد کو مثبت اور مشترکہ بنیادوں پر استوار کرنے کی سرتوڑ کوشش کریں گے۔

اس دن شام کو میں اور جوگیندر ایک بار پھر پارک سرکس میں سیٹھ صدیق کی کوٹھی پر موجود تھے۔ سیٹھ صدیق نے گاندھی جی اور چند لیڈروں کو رات کے کھانے پر مدعو کر رکھا تھا اور صبح ہی ہمیں بتا دیا تھا کہ وہ گاندھی جی کو شام کے وقت ہی اپنی کوٹھی پر لے آئیں گے' وہ اسی وقت ہماری ان سے ملاقات کرا دیں گے۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے' گاندھی جی ایک اور ہندو رہنما کے ساتھ وہاں موجود تھے۔ برسوں گزر جانے کے بعد کافی سوچنے پر بھی مجھے یاد نہیں آ رہا کہ گاندھی جی کے ساتھ وہ ہندو لیڈر کون تھا مگر قیاس کہتا ہے کہ وہ جمنا داس دوارکا داس ہی تھے۔

گاندھی جی مجھ سے بڑی نرمی کے ساتھ پیش آئے۔ انہوں نے مجھے دیکھتے ہی گلے لگایا "بڑے جیالے اور نڈر

نوجوان ہو" انہوں نے کہا "مجھے تمہاری وہ تقریر پسند آئی تھی مگر ابھی وہ راہ اختیار کرنے کا وقت نہیں آیا جس کے تم خواہش مند ہو۔"

اس کے بعد میں نے اور جوگیندر نے گاندھی جی کو اپنی ملاقات کا مقصد بتایا اور انہیں انگریزی سازش سے آگاہ کیا۔ گاندھی جی نے ہماری باتیں سنیں اور پھر آنکھیں بند کیے دھیان گیان میں مصروف ہو گئے۔ کمرے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ میں' جوگیندر' سیٹھ صدیق اور جمنا داس سبھی منتظر تھے کہ دیکھیں اس مسئلے میں گاندھی جی کی طرف سے کیا ارشاد ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد گاندھی جی کی تیز اور باریک سی آواز ابھری "جمنا داس! سنا تم نے! بتاؤ تمہاری کیا رائے ہے؟"

"بات یہ ہے مہاتما جی!" جمنا داس نے کہا "ہندو مسلم ایکتا کی ضرورت سبھی محسوس کرتے ہیں۔ اس کے خلاف انگریزی سازش بھی کوئی نئی بات نہیں مگر سیٹھ صدیق نے ہم تک یہ بات پہنچانے کے لیے اس وقت دو گواہوں کی ضرورت محسوس کی' یہ نئی بات ہے۔ لگتا ہے سیٹھ صدیق کو یا تو اس بات پر یقین نہیں آیا یا اسے ہم پر بھروسا نہیں کہ ہم اس کی بات پر یقین کر لیں گے۔"

جمنا داس نے بڑی چالاکی سے یہ باور کرانا چاہا تھا کہ یہ سیٹھ صدیق کا مسئلہ ہے۔ اس میں جو زہر پنہاں تھا' وہ محسوس کیا جا سکتا تھا۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں جمنا داس جی!" جوگیندر فوراً ہی بول اٹھا "ضرورت سیٹھ جی نے نہیں' ہم نے محسوس کی تھی۔ یہ بات تو سیٹھ جی کو ابھی اور اسی وقت معلوم ہوئی ہے۔ ہم نے تو ان سے بس اتنی درخواست کی تھی کہ ہماری ملاقات گاندھی جی سے کرا دیں' ہم انہیں ایک اہم اطلاع دینا چاہتے ہیں' ایسی اطلاع جو ہندوستان کے قومی اتحاد کے لیے بہت ضروری ہے۔ ہم سیٹھ جی کے شکر گزار ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست کو ٹھکرایا نہیں۔"

"ویری گڈ' بالکل ویری گڈ!" جمنا داس نے کہا "زیادہ اپیل نہ دکھاؤ' سیدھے سیدھے بتاؤ' چاہتے کیا ہو؟"

"ہم صرف اتنا چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے سرکردہ لیڈر' انگریز کی اس سازش کو ناکام بنانے کی کوشش کریں۔ ہندوستان بہت بڑا ملک ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ کس وقت کہاں سے یہ آگ بھڑک اٹھے۔ آپ اس آگ کو پھیلنے سے روکیں۔ ہندو مسلم ایکتا کو ہر صورت میں قائم رکھیں۔"

"یہ بات تم ہم سے کہہ رہے ہو؟" جمنا داس نے کہا

مہاتما جی نے کہا ہے کہ سوراج کا قیام عدم تشدد ہی سے ہو سکتا ہے مگر خلافت کے لیڈر محمد علی اور شوکت علی عدم تشدد کو اہمیت نہیں دیتے۔ وہ تشدد کا پرچار کر رہے ہیں' حکومت سے ٹکر لینے کی باتیں کر رہے ہیں پھر بھی ہم ان کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہ بات تم مسلمانوں کو سمجھاؤ۔"

"محمد علی اور شوکت علی کے بارے میں ایسا مت کہو جمنا داس!" گاندھی جی گیان دھیان سے برآمد ہوئے اور انہوں نے چھت پر آنکھیں گاڑتے ہوئے کہا "یہ دونوں ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ تم انہیں نہیں سمجھ سکتے" گاندھی جی رکے پھر انہوں نے مجھ سے کہا "سنو نوجوان! میری زندگی' ہندو مسلم ایکتا اور بھائی چارے کے لیے وقف ہے۔ عدم تشدد کا پرچار اسی لیے ہے کہ میں نہیں چاہتا کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی ہتیا کرتے رہیں۔ میں اس کے لیے کوشش کر رہا ہوں اور کرتا رہوں گا اور کیا چاہتے ہو تم لوگ؟" انہوں نے ہم سے سوال کیا۔

"ہم چاہتے ہیں جناب کہ آپ اس معاملے کو کانگریس کی سطح پر اٹھائیں۔ سیٹھ صدیق اس سازش کو ناکام بنانے کے لیے خلافت کمیٹی کے پلیٹ فارم سے انگریز کی اس سازش کو عوام تک پہنچائیں۔ مولانا محمد علی اور شوکت علی یہ کام مسلم لیگ سے بھی کرا سکتے ہیں۔ ہم اس سلسلے میں محمد علی جناح سے بھی مل چکے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کی اہم سیاسی جماعتوں کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر دیا ہے۔ ہم نے اپنا وہ فرض پورا کر دیا ہے جو اس دیس کی طرف سے ہم پر عائد ہے۔"

"اور اب تم کیا کرو گے؟" جمنا داس نے سوال کیا۔

"ہم وہی کریں گے جو ان حالات میں وطن پرستوں کو کرنا چاہیے" جوگیندر نے جواب دیا "یہ وقت صرف بدیسی کپڑوں کو آگ لگانے کا نہیں' نہ چرخا کاتنے اور نہ عدم تشدد کی تبلیغ کرنے کا وقت ہے۔ یہ وقت میدان عمل میں کود پڑنے کا ہے۔ ہم آپ کو جلد ہی بتا دیں گے کہ ہم کیا کر سکتے ہیں!"

"تم لوگ ہندوستان کو جہنم بنا دو گے" جمنا داس نے منہ بنایا۔

"جہنم تو یہ دیس اس وقت بھی ہے" جوگیندر نے پرجوش آواز میں بولا "ہم سب غلامی کے جہنم کا ایندھن ہیں۔"

"تم لوگ انقلابی بنتے ہو" گاندھی جی نے کہا "مگر شاید انقلابی کی روح سے آشنا نہیں ہو۔ انقلابی وہ ہوتا ہے جو انقلاب کے لیے کام کرنے سے قبل اپنی حفاظت کا فن سیکھ لے پھر بغیر کوئی جان لیے مر جانے کا حوصلہ پیدا کرے۔"

"ہم نے مرنے اور مارنے کے گر سیکھ لیے ہیں مہاتما جی!" میری آواز میں چبھن تھی "میں اور میرے ساتھی ہر وقت جان ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں۔ ہم اس دیس کی آزادی اور آن پر کٹ مرنے کے لیے تیار ہیں اور اس کے ہر دشمن کو جان سے مارنے کے لیے مستعد و چوکنا ہیں۔ ہم نے جو راہ اختیار کی ہے' وہ پھانسی کے پھندے کی طرف جاتی ہے۔ اس کے باوجود ہم ہراساں نہیں ہیں۔ ہمارے حوصلے بلند ہیں۔"

"ٹھیک ہے بالک!" جمنا داس کا لہجہ ٹھنڈا' ٹھہرا ہوا مگر تپا دینے والا تھا "تم نے اپنی بات مہاتما جی سے کہہ دی' انہوں نے تمہیں جواب بھی دے دیا' اب اور کیا چاہتے ہو؟"

پھر ہم وہاں سے چلے آئے تھے۔ سیٹھ صدیق نے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس معاملے سے آگاہ کرنے کے لیے مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی کے پاس اپنا پیامبر روانہ کریں گے۔ انہوں نے اس سلسلے میں اپنی بھرپور کوشش کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

وہاں سے واپسی پر ہم افسردہ سے تھے۔ قائداعظم کا تجزیہ درست ہی معلوم ہو رہا تھا۔ ہندو اور مسلمان اس وقت اتحاد کا راگ تو الاپ رہے تھے لیکن اس اتحاد میں خلوص کا فقدان تھا۔ دونوں فریق اس اتحاد کے لیے اپنے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان کے سامنے کوئی مشترکہ مقصد نہیں تھا۔ ہم دونوں ہی اپنی اپنی جگہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ انگریز نے جو سازش تیار کی ہے' اس کا توڑ کرنا ان لیڈروں کے لیے ممکن نہیں ہو گا مگر مولانا جوہر کی تقریروں نے فضا بدل دی۔ ہندو اور مسلم باہم دست و گریباں ہونے کے بجائے اپنے اصل دشمن کی طرف متوجہ ہو گئے۔ قائداعظم نے بھی عملاً اس کے لیے بہت [illegible] لیا [illegible] اس نتیجے میں سارا ہندوستان "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے نعروں سے گونج اٹھا۔ کانگریس کے لیے اب کوئی اور راستہ نہیں رہا' سو اس نے بھی عدم تشدد کے ساتھ ساتھ مولانا جوہر کی آواز میں آواز ملانا شروع کر دی۔ ان دنوں تنظیم کے اجتماعات ہر دوسرے دن کلکتے میں ہو رہے تھے۔ شیام بازار میں سیٹھ موہن لال جی کی کوٹھی عارضی طور پر تنظیم کا مرکز بن گئی تھی۔ رحمان چارلس سے حاصل ہونے والی اطلاعات کے پیش نظر مجاہد اول نے مختلف صوبوں میں تنظیم کے کارکنوں کو چوکنا کر دیا تھا۔ انہیں ہدایت تھی کہ وہ ہر قیمت پر ہندو مسلم اتحاد کو قائم رکھنے کی کوشش کریں اور جیسے ہی انہیں اپنے صوبے میں اس قسم کی سازش کی اطلاع ملے' وہ فوراً اس سے آگاہ کریں۔ یہ خبریں خفیہ الفاظ میں تار کے ذریعے مجاہد اول کو سارے ہندوستان سے موصول ہو رہی تھیں۔ تار کس پتے پر آ رہے تھے' یہ ہمیں معلوم نہ تھا۔ اسی دوران میں ماوا لنگر رحمان چارلس اور چونی لال کو ٹھکانے لگا دیا گیا تھا۔ ماوا لنگر نے زبردستی جس ہندو لڑکی کو اپنی داشتہ بنا رکھا تھا' اس کے قبضے سے چھڑا لی گئی تھی۔ چونی لال نے جو دولت سونے میں تبدیل کی تھی' وہ بھی اب تنظیم کے قبضے میں آ چکی تھی۔ میں نے جتھے بو کروں سے جو رقم وصول کی تھی' وہ بھی مجاہد اول کے حوالے کر دی تھی۔ اس میں صرف پانچ ہزار روپے کم تھے جو میں نے بخت خاں کو دیے تھے۔ بخت خاں نے بھی وہ پانچ ہزار مجاہد اول کو دے دیے تھے۔

سیاسی سطح پر کوششوں سے اور وطن پرست تنظیم کی عملی جدوجہد سے ایک بڑا طوفان احتیاطی تدابیر کے سبب ٹل گیا تھا اور یہ ہماری بڑی کامیابی تھی۔ اسی دوران میں جوگیندر کے توسط سے مجاہد اول کی ملاقات بنگال کے ایک انقلابی لیڈر سے بھی ہو چکی تھی۔ یہ ہندو انقلابی لیڈر اے کے گھوش ایک خفیہ دہشت پسند تنظیم کا سربراہ تھا۔ مجاہد اول چاہتا تھا کہ اس دہشت پسند تنظیم کے کارکنوں سے وطن پرست تنظیم کے ارکان بعض آتشیں اسلحے اور بارودی دھماکوں کی تربیت حاصل کریں۔ گھوش نے اس پر آمادگی ظاہر کر دی۔ مجاہد اول میرے' جوگیندر اور بخت خاں کے علاوہ ٹیپو کو بھی یہ تربیت دلوانا چاہتا تھا۔ اسی غرض سے اس نے پنجاب سے ٹیپو کو بنگال بلوا لیا تھا۔ نوجوان اے کے گھوش اس شخص کی اولاد میں سے تھا جسے انگریزوں نے اپنے خلاف تنظیم قائم کرنے پر پھانسی کی سزا دی تھی۔ گھوش کے چچا کو کالا پانی کی سزا ہوئی تھی۔ اب گھوش اپنے اسلاف کی روایات کا امین تھا۔ اس کا بھائی' فوج اور پولیس سے مقابلے کے دوران میں ہلاک ہوا تھا۔ اس کی بہن سوشیلا اس کی دست راست تھی۔

اے کے گھوش سے ہماری پہلی ملاقات ذکریا اسٹریٹ میں واقع ایک اوسط درجے کے ہوٹل میں ہوئی۔ مجاہد اول کے حکم پر ہم نے وہاں ایک کمرا کرائے پر لے لیا تھا۔ اسی ہوٹل کی پہلی منزل پر خلافت کمیٹی کا دفتر تھا۔ سامنے ہی کچھ فاصلے پر کلکتے کی مشہور ناخدا مسجد تھی۔ وہ خود ہم سے ملنے آیا تھا۔ اس سے ایک روز قبل مجاہد اول کلکتے سے دہلی جا چکا تھا۔ گھوش سے ہماری یہ ملاقات بڑی پرجوش رہی۔ وہ واقعی انقلابی تھا' ویسا انقلابی نہیں جس کا تصور گاندھی جی کے ذہن میں تھا۔ بغاوت کا جذبہ اور آزادی حاصل کرنے کی امنگ اس کے روم روم میں سمائی ہوئی تھی۔ وہ ایک مضطرب اور چوکنا شخصیت کا مالک تھا۔

گھوش ہم سے یوں ملا جیسے ہم برسوں کے دیرینہ دوست ہوں۔ ابتدائی تعارف کے بعد وہ فوراً بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس کی اردو اچھی تھی مگر وہ ہم سے اردو اور انگریزی دونوں ہی میں گفتگو کر رہا تھا۔ عام بنگالیوں کی طرح وہ بڑی روانی سے انگریزی بولتا تھا۔ پہلے اس نے ہم سے ہماری سرگرمیوں کے بارے میں پوچھا تھا۔ مجاہد اول کی ہدایت تھی کہ گھوش سے کچھ بھی نہ چھپایا جائے۔ ہم نے مختصراً اسے تمام تفصیلات بتا دیں۔ وہ بڑی توجہ اور انہماک سے ہماری باتیں سنتا رہا۔

جب ہم سب کچھ بتا چکے تو وہ مسکرا کر بولا "یارو! اس پر مجھے بڑی خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ اب ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ انقلابی فکر پیدا ہو رہی ہے ورنہ ہم تو سوچتے تھے کہ اٹھارہ سو ستاون کے بعد ان علاقوں کی ماؤں نے شہید اور سرفروش بیٹوں کو جنم دینا ہی بند کر دیا ہے" لفظ "یارو" اس کے منہ سے بڑا بھلا لگتا تھا۔ اس موقعے پر میں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ گھوش نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے کہا "نا' نا! میں زوردار تقریر کرنے والے سیاسی لیڈروں کی بات نہیں کر رہا ہوں' نہ خواب دیکھنے والے ان لوگوں کی جنہیں تم مجاہدین کہتے ہو اور جو ہندوستان کی آزادی کے لیے ترکی اور افغانستان کی طرف دیکھتے ہیں' ریشمی رومالوں پر خط و کتابت کرتے ہیں۔ میں تو ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو اپنے زور بازو پر بھروسا کرتے ہیں۔"

"یہ اندازِ فکر کا فرق ہے" میں نے کہا "ورنہ باقی ہندوستان میں بھی آزادی کے حوالے ملتے ہیں۔"

"نہیں یارو' یہ اندازِ فکر کا نہیں طریقہ کار کا فرق ہے" گھوش زور دے کر بولا "تم لوگ صرف سیاسی جنگ کے قائل ہو مگر یہ بھول جاتے ہو کہ سیاسی جنگ ایک آزاد ملک میں دو پارٹیوں کے درمیان تحریر' تقریر' اجتماع اور صحافت کی آزادیوں کے ساتھ لڑی جاتی ہے۔ سیاست کی جنگ کسی غلام ملک میں لڑی ہی نہیں جا سکتی! ایسے ممالک میں صرف دو پارٹیاں ہوتی ہیں' ایک حاکموں کی دوسری غلاموں کی" گھوش نے روانی سے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

اسی روز ہم ہوٹل سے اے کے گھوش کے گھر منتقل ہو گئے۔ وہ کلکتے کے مضافات میں اپنے کسی دوست کے گھر ٹھہرا ہوا تھا۔ یہاں ہماری ملاقات اس کی انقلابی بہن سوشیلا

سے بھی ہوگی۔ وہ سانولی سلونی، دبلی پتلی، نازک اندام بنگالی حسینہ تھی۔ اس کے نقوش سیدھے سادے مگر پرکشش تھے۔ اس کے بال اتنے لمبے تھے کہ کمر سے بھی چار پانچ بالشت نیچے تک جاتے تھے۔ اسے دیکھ کر کوئی بھی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک انقلابی لڑکی بھی ہو سکتی ہے۔

ہماری تربیت تین ماہ جاری رہی۔ اس کے لیے ہمیں پہلے سندربن اور کلکتہ کے علاقے میں جانا پڑا اور پھر چاٹگام کے پہاڑی علاقوں میں۔ اس تربیت کے لیے سوشیلا ہماری نگراں تھی اور مزید دو افراد ہمارے ساتھ تھے۔ اس تربیت کے نتیجے میں ہم مشین گن اور رائفل چلانا نہ صرف سیکھ گئے تھے بلکہ ہمارا نشانہ بھی بہت صاف ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ ہم نے مختلف قسم کے ڈائنامائٹ اڑانے، بم بنانے اور بارود سے چھوٹے موٹے دستی بم بنانے کی تربیت بھی حاصل کی تھی۔ جوگیندر اور سوشیلا بڑی تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے تھے۔ وہ جب بھی قریب ہوتے اور میں ان کی طرف اٹھتا تو انہیں اکثر متفکر انداز میں بس خلا کو گھورتا ہوا پاتا۔ شاید وہ بھی مستقبل کے بارے میں میری اور فاطمہ ہی کی طرح سوچتے تھے۔

ہم نے اپنی تمام صلاحیتیں اس تربیت پر صرف کر دیں۔ ہم جانتے تھے کہ ہماری یہ تربیت کسی اہم مہم کے سلسلے میں ہے۔ کسی بڑی مہم کے سلسلے میں! ہمیں اس تربیت کے لیے منتخب کرتے ہوئے مجلسِ اوّل نے کہا تھا "میں چاہتا ہوں کہ تم لوگ پوری دل جمعی سے یہ تربیت حاصل کرو کیوں کہ یہ تربیت بعد میں ہماری تنظیم کی مہموں میں بہت کام آئے گی۔ اس تربیت کے خاتمے کے فوراً بعد تمہیں ایک نہایت اہم مہم درپیش ہوگی۔ وہ ایسی مہم ہوگی کہ انگریز حکومت ایک مرتبہ تو لرز کر رہ جائے گی۔ یہ حکومت اس بات کی توقع کر ہی نہیں سکتی کہ ہم ہندوستانی اس انداز میں بھی ان کے خلاف کارروائیاں کر سکتے ہیں۔"

اے کے گھوش ہماری تربیت سے مطمئن تھا۔ جتنی تیزی سے ہم مختلف آتشیں اسلحے کے استعمال میں مہارت حاصل کرتے جا رہے تھے، اس پر وہ خوش تھا۔ مہینے میں ایک دو بار وہ ہم سے ملنے آتا یا پھر ہم ہی کسی جگہ اس سے مل لیا کرتے۔ وہ بہرحال ہمارے تربیتی کیمپ سے رابطہ ضرور قائم رکھتا تھا۔

جون کا مہینہ شروع ہو چکا تھا جب ہم اپنی تربیت مکمل کر کے کلکتے واپس پہنچے۔ گھوش نے بڑی مسرت سے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ ہمیں دو دن بعد ہی نینی تال روانہ ہونا ہے۔

"نینی تال!" میں حیرانی سے بولا اور پوچھا "مگر کیوں؟"

"مجلسِ اوّل کی طرف سے مجھے یہی ہدایت ملی ہے۔ سوشیلا بھی تمہارے ساتھ ہوگی۔" اس نے بتایا۔ میں نے پھر حیرت کا اظہار کیا۔ "اس کے لیے خود تمہارے مجلسِ اوّل نے مجھ سے کہا تھا۔ سوشیلا بہت اچھی نرس ہے۔"

دو روز کے بعد اے کے گھوش ہمیں ہاوڑہ ریلوے اسٹیشن پر الوداع کہہ رہا تھا۔

ہدایت کے مطابق اور احتیاط کے تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم ٹرینیں تبدیل کرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف بڑھتے رہے۔ اس سفر کے ساتھ ہی سوشیلا، جوگیندر کے لیے اپنے من مندر میں کئی دیپ جلا چکی تھی۔ میں نے محسوس کیا تھا کہ سوشیلا کے جذبات یک طرفہ نہیں تھے۔ جوگیندر بھی سوشیلا کے لیے وہی جذبات رکھتا تھا جو میرے دل میں فاطمہ کے لیے تھے۔ سوشیلا جب جوگیندر کی طرف دیکھتی تو اس کی آنکھوں کی جوت کچھ زیادہ ہی بڑھ جاتی اور جوگیندر سے گفتگو کرتے ہوئے اس کے لہجے کی گنگناہٹ میں ارتعاش سا پیدا ہو جاتا۔ اس کے گالوں پر جیسے انگارے دہکنے لگتے۔ اس کی خیالی رنگت میں جیسے کسی ڈھلتی ہوئی شام میں پھوٹنے والی شفق گھل جاتی۔

یہ خواب کتنے حسین ہوتے ہیں! یہ تصور بھی کتنے شاداب ہوتے ہیں! انقلابی کی تپتی دوپہر میں سفر کرنے والوں کی زندگی میں خواب ناک، شاداب اور محبت سے شرابور لمحے بہت ہی کم آتے ہیں اور پھر زندگی بھر کا عذاب بن جاتے ہیں۔ مجھے جوگیندر اور سوشیلا پر بے حد پیار آنے لگا۔ ساتھ ہی میرا دل غیر یقینی مستقبل کے اندیشوں سے دہل کر رہ جاتا تھا۔ تب فاطمہ کا چہرہ میرے تصور میں اتر آتا۔ کلکتے سے رخصت ہوتے وقت اس نے کہا تھا "میں انتظار کروں گی۔" اس کے ان الفاظ کی خنکی مجھے بھی بوجھل اور شرابور کر ڈالتی۔

پیلی بھیت ریلوے اسٹیشن پر ہمارا تنظیمی ساتھی حیدر علی منتظر تھا۔ وہ مجلسِ اوّل کے پیغام کے ساتھ وہاں پہنچا تھا۔ نینی تال میں جو مہم ہمیں سپرد کی جانے والی تھی، عارضی طور پر ملتوی کر دی گئی تھی لہٰذا ہم سب کا نینی تال جانا ضروری نہیں رہا تھا۔ اب صرف مجھے اور نیپو کو نینی تال پہنچنا تھا۔ بخت خاں، جوگیندر اور سوشیلا کو شملہ پہنچنے کی ہدایت تھی۔ فاطمہ کے بارے میں بھی معلوم ہوا کہ اسے بھی کلکتے سے شملے پہنچنے کا حکم ملا تھا۔ یہ خبر میرے لیے دل خوش کن تھی۔ میرے اور اس کے درمیان فاصلہ بڑھ جانے کے بعد پھر کم ہونے والا

تھا۔ کلکتے کی نسبت شملہ بہت قریب تھا۔ میں سوچ رہا تھا، کاش مجھے بھی نینی تال کے بجائے شملے پہنچنے کا حکم ملتا۔ مجلسِ اوّل کا پیغام سننے کے بعد میرے اور نیپو کے سوا باقی تینوں ساتھی پیلی بھیت اسٹیشن پر ہی اتر گئے۔ ہمیں ابھی کاٹھ گودام جانا تھا جو اس لائن پر آخری اسٹیشن تھا۔ وہاں سے لاری کے ذریعے ہم نینی تال پہنچ سکتے تھے۔

نینی تال قدرت کی صناعی کا حسین شاہکار! پہاڑوں کے درمیان پُرسکون اور شفاف جھیل، انگشتری میں نگینے کے مانند تھی۔ دکھوں اور آلام سے بھری ہوئی اس دنیا میں یہ خطہ گوشۂ عافیت معلوم ہوتا تھا۔ جھیل کے چاروں طرف پہاڑوں پر مکانات بنے ہوئے تھے۔ جھیل کے کنارے کے ساتھ ساتھ سڑک کا حلقہ تھا۔ رات کو جب آسمان کے ستارے اور مکانوں کی روشنیاں جھیل کی پُرسکون سطح پر اتر آتیں تو یوں لگتا کہ سیاہ چادر پر کسی نے منقش کے تاروں سے ستارے ٹانک دیے ہوں۔

ہمیں نینی تال پہنچے ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ ہم وہاں ایک چھوٹے سے مکان میں مقیم تھے۔ یہ مکان ہم نے کرائے پر لیا تھا۔ ان تین دنوں میں تنظیم کے کسی رکن نے ہم سے رابطہ قائم نہیں کیا تھا۔ سو ہمارے لیے سیر و تفریح کے سوا کوئی کام نہیں تھا۔

ہم دن بھر پہاڑوں اور وادیوں کی سیر کرتے، خودرو خوش رنگ پھولوں کی خوشبو سے بوجھل فضا میں سانس لیتے۔ یہ عجیب بات تھی کہ قدرت نے انسان کے لیے تازگی اور خوشبو بکھیری تھی لیکن انسان ہی نے قدرت کے ان انعامات کو بعض کمزور انسانوں کے لیے شجرِ ممنوعہ بنا دیا تھا۔ قدرت نے ہندوستان کے پہاڑوں، وادیوں، میدانوں، دریاؤں اور صحراؤں میں تازگی اور فرحت گھول رکھی تھی لیکن غاصب غیر ملکیوں نے ہر جگہ ہندوستانیوں کے لیے قبرستان اور شمشان گھاٹ سجا دیے تھے۔ نینی تال سے تازگی اور فرحت ابھرتی تھی اور ہندوستان ایک متعفن جوہڑ بنا ہوا تھا۔

نینی تال میں یہ ہمارا چوتھا دن تھا۔ میں اور نیپو جھیل کے ساتھ ساتھ سڑک پر چہل قدمی میں مصروف تھے۔ شام کے سرمئی سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ اچانک ایک شناسا چہرہ میرے سامنے آ گیا۔ بھاری بھرکم جسم، دراز قد اور گھنی مونچھیں! میں ایک لمحے کو اسے دیکھ کر ٹھٹک گیا۔ اس کی آنکھوں میں بھی مجھے حیرانی اور تعجب کے سائے نظر آئے۔ یہ وہی شخص تھا جس سے لاہور میں میرا پالا پڑ چکا تھا۔ اسی کی وجہ سے سی آئی ڈی والے مجھ پر ہاتھ ڈالنے میں کامیاب ہوئے تھے۔ یہ علی حسن تھا، میرے ڈیڈی کا ماتحت!

میرے جسم میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میں نے تیزی سے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیرا اور تیز قدم اٹھاتا ہوا نیپو کے ساتھ ہو لیا۔ مجھے یقین تھا کہ علی حسن نے مجھے پہچان لیا تھا۔ میں جلد از جلد اس کی نظروں سے اوجھل ہو جانا چاہتا تھا اس لیے میری رفتار از خود تیز ہو گئی تھی۔

"کیا بات ہے؟" نیپو نے مجھ سے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں" میں بولا "جلدی چلو!"

"ہوا کیا؟" نیپو نے سوال کیا۔

"خطرہ!" میں نے جواب دیا۔ اسی کے ساتھ میرے قدموں کی رفتار اور تیز ہو گئی۔

اب ہم تقریباً دوڑ رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ علی حسن اپنی جگہ کھڑا ہماری ہی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس وقت ہم اس پتھریلی سڑک کے موڑ پر موجود تھے جو دائیں جانب ایک مکان کے ساتھ تھا۔ وہ سڑک اوپر کی طرف چلی جاتی تھی۔ میں تیزی سے لپک کر اسی سڑک کی طرف مڑ گیا۔ موڑ پر میں نے پلٹ کر دیکھا۔ علی حسن اب بھی وہیں کھڑا تھا اور اس کا رخ ہماری ہی طرف تھا پھر مجھے یوں لگا تھا جیسے اس نے ہمارے تعاقب کے لیے دوڑنا شروع کر دیا ہو۔

"بھاگ لو نیپو!" میں نے کہا۔

رات نے نینی تال کو اپنی باہوں میں سمیٹ لیا تھا۔ ہم وہاں سے فرار ہو کر اپنے مکان کی طرف ہو لیے تھے لیکن اس وقت مجھے ہر طرف سے خطرات بڑھتے محسوس ہو رہے تھے۔ ہمارا یہ مکان آبادی سے ذرا الگ تھلگ تھا۔ اس وقت مجھے اس مکان سے خوف محسوس ہوا۔ ایسا لگا جیسے خطرہ وہاں ہماری گھات میں ہو۔ علی حسن کو نینی تال میں دیکھ کر میرا ماتھا ٹھنکا تھا۔ اب گویا نینی تال ہمارے لیے محفوظ نہیں تھا۔

میں نے اپنے خدشات کا اظہار نیپو سے کر ہی دیا "میرا خیال ہے ہمیں وہاں جاتے ہوئے محتاط رہنا چاہیے" علی حسن سے متعلق تفصیلات میں اسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔

"کیوں نہ آج رات کسی ہوٹل میں گزاری جائے!" نیپو نے تجویز پیش کی۔

"ہوٹل ہمارے لیے محفوظ نہیں ہے۔ نینی تال میں ہوٹل ہی کتنے ہیں؟" میں نے اس کی رائے سے اتفاق نہیں کیا۔

"پھر؟" نیپو کے لہجے میں سوال بھی تھا اور تشویش بھی۔

"آؤ! میرے ذہن میں ایک تجویز آئی ہے۔"

اس وقت اچانک مجھے سوجتی نائیڈو کا خیال آ گیا تھا۔

میں نے ایک بنگلے پر ان کے نام کی تختی لگی دیکھی تھی۔ اس کے علاوہ دو ایک مرتبہ انھیں سیر کرتے بھی دیکھا تھا لیکن ہر مرتبہ ان سے کتی کترا گیا تھا۔ سروجنی نائیڈو میرے خالو جان خان بہادر نواب ثناء اللہ خاں کی اچھی دوست تھیں۔ وہ مرتبہ وہ علی گڑھ آئی تھیں۔ اسی موقع پر خالو جان کے ساتھ ان سے مجھے ملاقات کا موقع ملا تھا۔ وہ ایک پُرجوش خاتون تھیں۔ قدرت نے ان کی زبان میں جادو گھول دیا تھا اور ان کی شخصیت میں جاذبیت و عظمت کے رنگ بھرے تھے۔ ان کا وجود آزادی کی چنگاریوں سے عبارت تھا۔ وہ ہندوستان کو آزاد دیکھنا چاہتی تھیں۔ ہندوستان کے باشندوں کے لیے ان کے دل میں صرف محبت ہی محبت تھی۔ وہ ہندوستان میں آباد افراد کو صوبوں، قوموں یا نسل، فرقوں اور زبانوں کے خانوں میں تقسیم نہیں کرتی تھیں۔ انھیں بلا تفریق رنگ و مذہب، ہر ہندوستانی عزیز تھا، خواہ وہ کسی صوبے، کسی مذہب کا ہو۔

پھر ہم دونوں وہاں سے واپس ہوئے۔ میرا یہ فیصلہ صحیح تھا یا غلط، اس وقت مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی، نہ مجھے اس بات کا ہوش تھا کہ اس مکان کو چھوڑ کر میں تنظیم کے لیے رکاوٹیں پیدا کر سکتا ہوں۔

میرا خیال تھا کہ تنظیم کا کوئی نہ کوئی فرد یقیناً نینی تال میں ہماری نگرانی کر رہا ہوگا۔ اسے معلوم ہوگا کہ ہم کہاں مقیم ہیں اور وہ تنظیم کی طرف سے ان احکام کا انتظار کر رہا ہوگا، جو اسے ہم تک پہنچانے تھے۔ اب اس مکان سے فرار ہونے کے بعد یقیناً تنظیم کو ہم سے رابطہ قائم کرنے میں مشکل درپیش آسکتی ہے۔ سروجنی نائیڈو کے گھر تک کے سفر میں یہ تمام باتیں میرے ذہن میں آئی تھیں اور میں نے سوچا تھا کہ اس کے لیے نیپو کو کام میں لاؤں گا۔ اب وہ اکیلا ہی نینی تال میں سیر کرے گا اور تنظیم کے کسی کارکن کو اس سے رابطہ قائم کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

سروجنی نائیڈو نے نہایت پُرجوش انداز میں ہمارا استقبال کیا "اوہ! مائی گرینڈ فری ڈم فائٹر!" ان الفاظ کے ساتھ انھوں نے میرا استقبال کیا۔ فری ڈم فائٹر، مجاہد آزادی! یہ الفاظ میرے لیے دھماکے سے کم نہیں تھے "کیسے آئے؟" انھوں نے انگریزی میں سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ میرے دوست ہیں نیپو" میں نے ان کے سوال کو نظرانداز کرتے ہوئے نیپو کا تعارف کرایا۔

"گلیڈ ٹو میٹ یو!" وہ نیپو سے مخاطب ہو گئیں پھر انھوں نے مجھ سے کہا "فری ڈم فائٹر کا دوست بھی فری ڈم فائٹر ہونا چاہیے۔"

"یہ آپ مجھے بار بار فری ڈم فائٹر کیوں کہہ رہی ہیں؟" میں بولا "آپ۔ آپ تو مجھے جانتی ہیں" میں ڈر رہا تھا کہ وہ کہیں میرا اصل نام نہ لے دیں!

"کچھ غلط کہہ رہی ہوں؟" سروجنی نائیڈو بولیں۔ ان کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔

میں نے پریشان سا ہو کر نیپو کی طرف دیکھا۔

سروجنی نائیڈو کی آواز پھر ابھری "خان بہادر نواب ثناء اللہ خان کا بھانجا ہم لوگوں کی نظر میں فری ڈم فائٹر ہی ہے، چاہے انگریز حکومت اسے دہشت پسند ہی کیوں نہ سمجھے۔ مجھے تم جیسے نوجوانوں سے محبت ہے" انھوں نے میرا نام نہیں لیا مگر یہ انکشاف ضرور کر دیا کہ میرے خالو جان کا نام کیا ہے!

"آپ نے مجھے حیران ہی کر دیا تھا" میں نے بات ٹالنے کی غرض سے کہہ دیا۔

"ابھی میں تمھیں اور حیران کروں گی" انھوں نے کہا "ویسے یہ بتاؤ نینی تال کب آئے؟ کہاں ٹھہرے ہو؟"

اس کے بعد جھوٹ کی چاشنی کے ساتھ میں نے انھیں اپنا مسئلہ بتا ہی دیا۔

سروجنی نائیڈو نے میری داستان سن کر گہرا سانس لیا اور کہا "اچھا، یہ بات ہے!" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں "گویا تم بچ کر آئے ہو؟" وہ سوچ میں پڑ گئیں۔

"اگر آپ مناسب سمجھیں تو!" میں بولا "ورنہ ہم کہیں اور انتظام کر لیں گے۔"

"وہ نہیں" وہ کہنے لگیں "میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔ میرے لیے اس سے بڑا اور کوئی اعزاز نہیں کہ اس ملک کے فری ڈم فائٹرز مجھے اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ ویسے خان بہادر تمہاری طرف سے خاصے پریشان ہیں۔"

"میں جانتا ہوں کہ انھیں میری روش پسند نہیں" میں بولا۔

"انھیں کیا پسند ہے، کیا نہیں اس کا اندازہ تم شاید نہ کر سکو۔ ان کی پریشانیاں اس لیے ہیں کہ ان سے تمہارا ایک قریبی رشتہ ہے۔"

"ویسے آپ کا میری روش کے بارے میں کیا خیال ہے؟" میں نے پوچھا۔

"میں اپنے بچے کو تمہارے نقش قدم پر چلتے دیکھنا چاہتی ہوں مگر نہیں جانتی کہ اگر اس نے ایسا فیصلہ کیا تو میرا کیا ردِعمل ہوگا! میرے جذبات کیا ہوں گے!"

اس کے بعد ہم مختلف مسائل پر گفتگو کرتے رہے۔

سروجنی نائیڈو بھی کئی قوم پرست لیڈروں کی طرح ہندوستان کی اس فضا پر تشویش میں مبتلا تھیں جو انگریز نے ہندوستان میں قائم کر دی تھی۔ کئی انتہا پسند ہندو لیڈر ان دنوں کھلم کھلا مسلمانوں کے خلاف زہر اگل رہے تھے اور ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے میں مصروف تھے۔ ان کے سرخیل پنڈت مدن موہن مالویہ تھے جنھوں نے کلکتے میں گاندھی جی کی اجازت سے وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے ساتھ مذاکرات کیے تھے لیکن ساتھ ہی وہ اس یہودی وائسرائے سے یہ اجازت بھی لے آئے تھے کہ وہ مسلمانوں کے خلاف اعلان جنگ کر دیں گے۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب برطانیہ کا شہزادہ ہندوستان کے دورے پر تھا۔ وائسرائے سے ملاقات کے بعد ہی انھوں نے ہندوستان کی سیاست میں جو یہ زہر بیج ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد پر آزادی کی راہ متعین کرنے کی کوشش میں تھی، وہ گند پھیلایا کہ یہ اتحاد جو پہلے مصنوعی تھا اور جسے مضبوط سہاروں سے مضبوط کرنے کی کوشش کی گئی تھی، زمیں بوس ہو گیا۔

ہندوستان کی سیاست پر گفتگو کرتے ہوئے ہمیں تین گھنٹے گزر گئے۔ اس دوران میں ہم نے تین مرتبہ چائے پی، ساتھ ہی ہمیں وہ کمرا بھی دکھا دیا گیا جس میں رات بسر کرنا تھی۔ اول تو یہ موضوع ہی ہماری دلچسپی کا تھا پھر طرزِ کلام ہندوستانی نائٹ اینگل سروجنی نائیڈو کا، وقت کا کچھ پتا ہی نہ چلا کہ کب چپکے سے پر لگا کر اڑ گیا۔

رات کافی بھیگ چکی تھی اور سروجنی نائیڈو کی باتیں جاری تھیں۔ ایک مرتبہ انھیں جماہی آئی تو وقت گزرنے کا احساس ہوا۔ انھوں نے فوراً ہی کہا "تم سوچتے ہوگے، میں بھی کتنی بد اخلاق ہوں کہ کھانے کو نہیں پوچھا۔ دراصل میں اپنے ایک مہمان کا انتظار کر رہی ہوں۔ اس نے کہا تھا کہ ایک گھنٹے میں آجائے گا مگر اب تو تین گھنٹے گزر چکے ہیں۔ تم چاہو تو کھانا لگوا دوں؟"

"تو کیا آپ نہیں کھائیں گی؟" میں نے سوال کیا۔

"میں اپنے مہمان کا انتظار کروں گی" انھوں نے جواب دیا "وہ مہمان مجھے بہت عزیز ہے۔ ویسے تم لوگوں کو بھوک لگ رہی تھی تو کہا کیوں نہیں؟"

"میں آپ کی خوب صورت باتیں سن رہا تھا۔ ویسے آپ کے وہ مہمان ہیں کون؟"

"تم دیکھو گے تو حیران رہ جاؤ گے۔ میں نے کہا تھا نا تم سے کہ ابھی میں تمھیں اور حیران کروں گی۔ میں چاہتی تھی کہ ہم سب ساتھ کھانا کھائیں۔ تم میرے مہمان سے مل کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ بہت حیران بھی ہو گے۔"

اور واقعی ایسا ہی ہوا۔ سروجنی نائیڈو کے مہمان کو دیکھ کر میں چونک ہی تو گیا۔ حیرانی اور خوشی اپنی جگہ مگر اس سے زیادہ مجھے پریشانیوں نے گھیر لیا۔

سروجنی نائیڈو کے وہ عزیز مہمان تھے خان بہادر نواب ثناء اللہ خان، میرے خالو جان!

مجھے دیکھ کر ان کی آنکھوں میں چمک سی عود کر آئی۔ ایک مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پر مچل کر رہ گئی اور پھر ان کی بزرگانہ شفقت پر خان بہادری غالب آگئی۔ اب ان کی آنکھیں شعلے برسا رہی تھیں۔ ان کے ہونٹوں نے بھنچ کر نودمیدہ مسکراہٹ کو قتل کر دیا تھا۔

"آؤ خان بہادر!" سروجنی نائیڈو نے ان سے کہا تھا "بیٹھو!"

انھیں دیکھ کر میں بھونچکا رہ گیا تھا۔ وہ میرے خالو جان تھے اور مجھے بالکل اپنی اولاد کی طرح سمجھتے تھے۔ وہ یقیناً مجھ سے بہت قریب تھے اور قریب ہو کر بھی بہت دور تھے۔ ہم دونوں عملی دنیا میں دو مخالف راستوں کے مسافر تھے، ایک دوسرے کے حریف تھے۔ وہ انگریز بہادر کے خطاب یافتہ تھے۔ انگریزوں کی خدمات کے صلے میں انھیں خان بہادری ملی تھی۔ دوسری طرف میں انگریز حکومت کا دشمن تھا، اس غاصب تاجر کا دشمن جو سات سمندر پار سے اس ملک میں تجارت کے نام پر لوٹ مار کرنے آیا تھا۔ وہ جس نے اپنی تجارتی کوٹھیوں کو اسلحہ کے گوداموں اور فوجی قلعوں میں تبدیل کر دیا تھا، جس نے تجارت کے بہانے ہندوستان ہی سے حاصل کی ہوئی دولت کے بل بوتے پر سازشوں کے تار و پود پھیلائے تھے۔ اس نے انھی سازشوں کے بل پر بنگال کے قاسم، دکن کے صادق سے لے کر علی گڑھ کے خان بہادر تک مختلف وطن فروشوں اور قوم کے فروشندوں کو خرید کر ان کے ضمیر پر مہر لگا دی تھی۔

خان بہادر ثناء اللہ خاں قہر آلود انداز میں مجھے اور نیپو کو گھورتے ہوئے آگے بڑھے پھر سروجنی نائیڈو کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئے۔

"یہ یہاں کس لیے آیا ہے؟" خان بہادر نے میری طرف اشارہ کرتے ہوئے سروجنی نائیڈو سے پوچھا۔

"یہ تمہارا عظیم بھانجا ہے، فری ڈم فائٹر! یہ کسی کام سے یہاں آیا تھا کہ ــــ" پھر انھوں نے وہی جھوٹی کہانی جس میں سچ کی بھی کچھ آمیزش تھی، مختصر الفاظ میں سنا دی۔ یہ وہی کہانی

تھی جو میں انہیں سنا چکا تھا۔ انہوں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے مزید کہا "اسے خطرہ ہے کہ خفیہ کے لوگ اس کے تعاقب میں ہیں۔ یہ اسی لیے پناہ لینے یہاں آیا ہے۔"

"اور ہم نے انہیں پناہ دے دی!" خان بہادر کا لہجہ ایسا تھا جیسے سروجنی نائیڈو نے کوئی قصور کیا ہو۔

"ان جیسے نوجوانوں کو پناہ دینا بڑے فخر کی بات ہے خان بہادر!" سروجنی نائیڈو بے جھجک بولیں۔

"اور اس میں بڑے خطرات بھی پوشیدہ ہیں" خان بہادر ثناء اللہ خاں نے کہا "اگر یہ تمہارے مہمان نہ ہوتے تو انہیں گرفتار کرا کے خود مجھے خوشی ہوتی" انہوں نے گویا اپنا فیصلہ سنادیا۔

"یہ کیا کہہ رہے ہو تم!" سروجنی نائیڈو نے اظہارِ حیرت کیا۔

"میں ٹھیک کہہ رہا ہوں" خان بہادر اپنے مخصوص لہجے میں بولے "میں ابھی مرکزی انٹیلی جنس کے چیف ڈی سوزا سے مل کر آرہا ہوں۔ وہ یہیں نینی تال میں موجود ہے۔ وہ آج ہی یہاں پہنچا ہے۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ یہ۔۔۔" انہوں نے میری طرف اشارہ کیا "اپنے ساتھیوں سمیت نینی تال آیا ہوا ہے۔ وہ یہ معلوم کرنے آیا ہے کہ یہ لوگ یہاں کس چکر میں آئے ہیں!"

یہ خبر میرے لیے کسی دھماکے سے کم نہیں تھی کہ ڈیڈی بھی نینی تال آچکے تھے۔ اب علی حسن کی نینی تال میں موجودگی کا مطلب میری سمجھ میں آگیا تھا۔

"ہم یہاں صرف سیر و تفریح کے لیے آئے ہیں" میں نے گویا اپنی صفائی پیش کی۔

"خاموش رہو!" خان بہادر نے مجھے ڈانٹ دیا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ ڈیسوزا یہاں آیا ہوا ہے؟" سروجنی نائیڈو نے خان بہادر سے معلوم کیا۔

"خود اس کے ایک پیغامبر کے ذریعے۔ نینی تال پہنچتے ہی اس نے مجھے پیغام بھجوایا تھا اور آج رات ملنے کو کہا تھا" خان بہادر بتانے لگے "اس کی وجہ سے خود میری حیثیت مشتبہ ہو کر رہ گئی ہے۔ میں نے حالانکہ اس سے ہر تعلق ختم کر لینے کا اعلان کر دیا ہے مگر حکومت کو میرے خلوص پر یقین نہیں رہا۔ وہ میری نقل و حرکت کی نگرانی کر رہے ہیں۔ جب ڈیسوزا نے مجھے یہ اطلاع دی کہ یہ بھی یہاں موجود ہے تو میں حیران رہ گیا۔ معلوم ہے ڈیسوزا کیا سوچ رہا ہوگا؟"

"یہی کہ شاید تم اپنے بھانجے سے ملنے ہی کے لیے یہاں آئے ہو" سروجنی نائیڈو نے اپنے خیال کا اظہار کیا۔

"ہاں" خان بہادر نے تائید کی "ڈیسوزا کو بڑی مشکل سے یقین دلاسکا ہوں کہ یہ محض اتفاق ہے۔ بہرحال میں نے ڈیسوزا سے وعدہ کرلیا ہے کہ اس کی گرفتاری کے لیے بھرپور تعاون کروں گا۔ خود ڈیسوزا کی پوزیشن اس کی وجہ سے خراب ہو رہی ہے۔ یہ گرفتار ہو تو اس کی جان میں جان آئے۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے!" سروجنی نائیڈو نے پُرزور آواز میں کہا "یہ میرا مہمان ہے، میری پناہ میں ہے! تمہیں وعدہ کرنا ہوگا کہ تم ایسا نہیں کرو گے!"

"صرف اس حد تک وعدہ کر سکتا ہوں کہ جب تک یہ اس گھر میں مقیم ہے، میں اس کی مخبری نہیں کروں گا۔" خان بہادر نے فیصلہ سنادیا "لیکن اس گھر سے اگر اس نے قدم نکالا تو میں خود۔۔۔" انہوں نے جملہ نامکمل چھوڑ دیا پھر کہنے لگے "مجھے امید ہے کہ ابھی اس میں اتنی شرافت باقی ہے کہ یہ پولیس کو نہیں بتائے گا کہ اس نے تمہارے گھر میں پناہ لی تھی۔"

"مگر۔۔۔" سروجنی نائیڈو نے کچھ کہنا چاہا۔

میں نے ان کی بات کاٹ دی "مجھے خوشی ہے خان بہادر صاحب کہ آپ نے میری شرافت کے بارے میں یہ رائے قائم کی۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا۔ ویسے اگر آپ چاہیں تو اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں کہ اپنے سگے بھانجے کو گرفتار کرادیں۔ میں ابھی باہر چلتا ہوں اور آپ سے یہ وعدہ بھی کرتا ہوں کہ باہر جا کر فرار ہونے کی کوشش نہیں کروں گا۔ آپ مجھے جہاں بھی ساتھ چلنے کو کہیں گے، چلوں گا۔"

"بدتمیزی نہیں! خاموش بیٹھو اور یقین رکھو کہ میں نے جو کچھ کہا ہے اس پر عمل بھی کروں گا۔"

مجھے یقین تھا کہ خان بہادر جو کچھ کہہ رہے تھے لفظ لفظ سچ تھا۔ وہ مجھے گرفتار کرا سکتے تھے کیوں کہ انہیں اپنی خان بہادری اتنی ہی عزیز تھی۔ بہرحال اس وقت سروجنی نائیڈو آڑے آئیں۔ انہوں نے خان بہادر کا غصہ ٹھنڈا کردیا۔ کھانے پر بھی فضا بوجھل سی رہی۔

شب خوابی کے کمرے میں پہنچنے کے بعد ٹیپو نے جو اب تک خاموش رہا تھا، مجھ سے کہا کہ ہمیں رات ہی کو یہاں سے فرار ہو جانا چاہیے مگر میں نے اس کی یہ تجویز مسترد کردی۔ میرا اب بھی وہی پروگرام تھا کہ تنظیم سے رابطے تک ہم یہیں مقیم رہیں۔ تنظیم سے رابطے کی صورت اب یہی رہ گئی تھی کہ ٹیپو دن میں اس مکان کی طرف جائے جہاں ہمارا قیام تھا اور یہ دیکھے کہ وہاں کیا حالات ہیں! میرا وہاں جانا اب خطرے سے خالی نہیں تھا۔ طارنوش کی حیثیت سے مجھے

[...]نے والے اب نینی تال پہنچ چکے تھے۔ امکان یہ بھی تھا کہ [...] محض وہم ہوا ہو۔ خان بہادر کی گفتگو سے تو یہی پتا چلتا تھا [کہ] ابھی انتظامیہ کو ہمارے ٹھکانے کا علم نہیں ہوا تھا۔

ڈیڈی کی نینی تال میں موجودگی بھی میرے لیے حیرت [انگیز] تھی۔ ساتھ ہی اس سے خطرات کی سنگینی کا بھی احساس [ہوگیا] تھا۔ میں اور ٹیپو انہی باتوں پر بہت دیر تک دبے دبے لہجے [میں] گفتگو کرتے رہے۔

"[ا]رے یار، جو ہوگا دیکھا جائے گا" ٹیپو بولا "فی الحال تو [سو ج]اؤ۔"

ابھی میری آنکھ نہیں لگی تھی۔ میرے ذہن پر غنودگی سی [طاری] تھی کہ کھڑکی پر ہلکی سی دستک کی آواز سن کر میں چونک [اٹھا]۔ میں نے کمبل ایک طرف پھینک دیا اور تیزی کے ساتھ [بستر] سے اتر گیا۔ میں نے دھیمی دھیمی روشنی میں دیکھا کہ ٹیپو [بھی] اپنے پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

"شاہین!" اس دفعہ دستک کی آواز کے ساتھ وہ آواز [ابھ]ری جو میرے دل سے تمام خوف زائل کردیتی تھی، مجھے [حو]صلوں اور امنگوں سے سرشار کر جاتی تھی۔ یہ آواز [میرے] رہنما مجاہدِ اوّل کی تھی۔ ٹیپو نے بھی یقیناً اس آواز کو [پہچان ل]یا ہوگا۔ ہم دونوں ایک ساتھ ہی کھڑکی کی طرف بڑھے [...]

"جی مجاہدِ اوّل!" میں نے کہا تھا۔ کھڑکی کی دائیں [طرف] باہر کی سمت دیوار سے ایک ہیولا چپکا ہوا تھا۔

[...] فوراً اپنے ٹھکانے پر پہنچو!

[...] مگر اے مجاہدِ اوّل وہاں خطرہ ہو سکتا ہے" میں نے کہا۔

"[م]یں وہیں سے آرہا ہوں" مجاہدِ اوّل نے بتایا "وہاں [خط]رہ نہیں ہے۔ فوراً وہاں پہنچو! تمہیں آج صبح تک نینی [تال س]ے نکل جانا ہے۔"

"بہتر ہے" میں بولا۔ اس کے ساتھ ہی مجاہدِ اوّل کا ہیولا [کھڑکی س]ے ہٹ گیا۔ میں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ مجاہد [کا ہی]ولا دیوار کے ساتھ ساتھ بڑھتا چلا جا رہا تھا۔

[پھر] ہم دونوں جلدی جلدی تیار ہوئے اور اسی کھڑکی کے [راستے کم]رے سے باہر آگئے۔ تھوڑی دیر بعد ہم اس بنگلے [سے نکل] کر اپنے مکان کی طرف بڑھ رہے تھے تو گویا اب کچھ [...] ہی تھا۔ میں نے خوش دلی سے سوچا اور خود کو [ہلکا] محسوس کیا۔

[تقری]باً بیس منٹ بعد ہم اس مکان میں تھے۔ دروازہ [...] ہم نشست گاہ میں داخل ہوئے۔ اب ہمیں سالار کا [انتظار] تھا۔ ہم دونوں کرسیوں پر بیٹھے ہی تھے کہ ہمیں

ایک مرتبہ پھر حیرت سے دوچار ہونا پڑا۔ ٹیپو سے زیادہ میں حیرت زدہ تھا۔ دروازے میں "شکرا" کھڑا تھا۔

"خوش آمدید دوستو!" اس نے کھرکھراتے لہجے میں کہا "میں بڑی دیر سے تمہارا انتظار کر رہا تھا" اس کی آنکھیں سکڑ گئی تھیں، بھویں سکڑ کر آپس میں ملنے کے بعد ماتھے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ایک لکیر بنا گئی تھیں۔ اس کے پتلے پتلے سرخ ہونٹوں سے باریک باریک دانت جھانک رہے تھے، مسکراہٹ کی دو لکیریں ہونٹوں کے گوشوں سے پھیل کر نیچے ٹھوڑی تک چلی گئی تھیں۔

ٹیپو اسے نہیں پہچانتا تھا مگر میں اچھی طرح اس سے واقف تھا۔ یہ وہی تھا جس سے میری ملاقات کراچی میں ہوئی تھی، وہی جس نے میرا امتحان لیا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ وہ مجاہدِ اوّل کے نائبین میں سے تھا۔ وہ عجیب شخصیت کا مالک تھا۔

اس سے پہلے کہ میں ٹیپو کو اس کے متعلق کچھ بتا سکتا، ٹیپو انتہائی تیزی کے ساتھ اس پر جھپٹا تھا۔ "شاہین! تم بھاگ لو" میں نے ٹیپو کی آواز سنی تھی۔

اس نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا ایک ہاتھ آگے بڑھایا۔ اس کے بائیں ہاتھ کی ضرب بڑی زور سے ٹیپو کے سینے پر پڑی تھی اور وہ دوہرا ہو گیا تھا۔

"شاہین! ٹیپو! خالد!" ایک سرد آواز ابھری "یہ کیا ہو رہا ہے؟" یہ آواز مجاہدِ اوّل کی تھی پھر مجاہدِ اوّل نپے تلے قدم رکھتا ہوا اندر آگیا۔ شکرے کا نام آج مجھے پہلی مرتبہ معلوم ہوا تھا "یہ کیا ہو رہا تھا؟"

"یہ۔۔۔ میں دراصل ٹیپو کو بتا نہیں سکا تھا کہ۔۔۔" میں وضاحت کرنے لگا۔

میری وضاحت کے بعد ٹیپو اور خالد نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملائے۔

—— مجاہد اوّل نے مجھے اور ٹیپو کو اگلے آٹھ ماہ کا پروگرام دیا۔ یہ پروگرام ایک کاغذ پر مختصر الفاظ میں تحریر تھا اور ہر نکتے کی وضاحت مجاہدِ اوّل زبانی کرتا جا رہا تھا۔ پروگرام کا پہلا حصہ نینی تال کی اطراف کے علاقے کی سیاحت تھی۔ یہ سیاحت اس بڑے اور اہم منصوبے کی تیاری کا پہلا مرحلہ تھی جو ہمیں ایک مناسب وقت پر سونپا جانا تھا۔ وضاحت کرتے ہوئے مجاہدِ اوّل نے کہا تھا "تمہیں اس علاقے میں سفر کرتے ہوئے اس راستے کو بھی ذہن نشین کرنا ہے جس سے تم گزرو گے" اس کے ساتھ ہی مجاہدِ اوّل نے ہمیں اس علاقے کا ایک نقشہ بھی دیا تھا۔ یہ نقشہ ٹریسنگ پیپر پر بنا ہوا تھا جس پر

مختلف مقامات کے نام اور نشانات موجود تھے۔ مجاہدِ اوّل نے بتایا تھا "یہ نقشہ سروے آف انڈیا کے ایک سروئیر رینڈال کی سروے رپورٹ کا حصّہ ہے۔ وہ اس راستے سے گزرا ہے۔ اب یہ تمہارا کام ہے کہ تم کس طرح اپنا راستہ تلاش کرتے ہو۔ تمہیں اپنا ذہن اور اپنی آنکھیں کھلی رکھنا ہیں۔ تمہیں یہ راستہ نہ صرف یاد رکھنا ہے بلکہ مختلف مقامات پر ایسی جگہیں بھی تلاش کرنا ہیں جہاں اس عظیم مہم کے دوران میں پناہ لے سکو جو مہم تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کے سپرد کی جائے گی۔ ہاں یہ بھی یاد رکھو کہ تم وہ مہم سردیوں میں سر کرو گے۔ تمہارے ساتھیوں کو اسی لیے اس موسم سے آشنا کرنے کی خاطر پہاڑی مقامات پر متعین کردیا گیا ہے۔ سردیوں میں یہ تمام علاقہ برف سے ڈھکا ہوگا لہٰذا تمہاری کوشش یہ ہونا چاہیے کہ اس علاقے میں کچھ نشانیاں بھی ذہن نشین کرتے رہو' ایسی نشانیاں جو برف باری کے موسم میں بھی تمہیں نظر آتی رہیں۔ اس طرح تم راستہ نہیں بھولو گے۔"

اس پروگرام کا دوسرا مرحلہ برما کا سفر تھا۔ نینی تال کے علاقے میں ہمیں دو ہفتے تک سیاحت کرنا تھی۔ اس کام سے فارغ ہو کر ہمیں رانی کھیت اور پھر وہاں سے آسام کے شہر گوہاٹی پہنچنا تھا۔ گوہاٹی میں اے کے گھوش کو ہمارے ساتھ شامل ہونا تھا اور پھر ہمیں گھوش کے ساتھ ناگا ہلز کے پار برما پہنچنا تھا۔

"مگر جناب' برما کے سفر کا مقصد کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"ہمیں برما سے اسلحہ لانا ہے' ایسا اسلحہ جو اس مہم کے لیے ضروری ہوگا جو تمہیں سردیوں میں درپیش ہوگی اور ایسا اسلحہ بھی جو ہمیں ہندوستان میں آسانی سے نہیں مل سکتا۔" مجاہد اول نے جواب دیا "اے کے گھوش' برما میں مقیم حریت پسند ہندوستانیوں کی ایک جماعت سے رابطہ رکھتا ہے۔ وہ ایک ماہ بعد برما جانے والا ہے۔ تمہیں اس لیے بھیجا جارہا ہے کہ تم اپنی تنظیم کی ضروریات کا اسلحہ لے کر بہ حفاظت بریلی پہنچ جاؤ۔"

"بریلی میں ہمارا ٹھکانا کہاں ہوگا؟" میں نے دریافت کیا۔

"اسلحہ لے کر جب تم واپس ہندوستان کی سرحد میں داخل ہوگے تو تار کے ذریعے تم صفدر (جوگیندر کا تنظیمی نام) اس کے کلکتے کے پتے پر اپنی آمد کی اطلاع دو گے" مجاہدِ اوّل [illegible] پہنچو گے۔

وہاں تمہیں سب کچھ بتادیا جائے گا۔"

"ٹھیک ہے جناب!" میں نے اطمینان کا اظہار کیا۔

"میں اور خالد بھی اسلحے کے لیے یاغستان جارہے [illegible] اس لیے اب تم اپنے اقدامات کے خود ذمے دار ہو گے۔ یاد رکھو کہ اس مہم پر ہماری بڑی اور اہم کامیابیوں کا [illegible] ہے۔ اس وقت تنظیم کے تمام اراکین غیر ملکی حا[illegible] فیصلہ کن ضرب لگانے کی تیاریاں کررہے ہیں۔ [illegible] ہندوستان میں سرگرمِ عمل خفیہ حریت پسند تنظیموں [illegible] رابطہ پیدا ہوچکا ہے۔ موجودہ مہم کے بعد تمام شمالی [illegible] میں پے درپے دھماکے ہوں گے۔ انگریز حکومت [illegible] جائے گی" مجاہدِ اوّل کی آواز آخری الفاظ ادا کرتے [illegible] پُرجوش ہوگئی۔

"ہمیں کب یہاں سے روانہ ہونا ہے؟" [illegible] پوچھا۔

"آج ہی سورج طلوع ہونے سے قبل تمہیں [illegible] سے نکل جانا ہے" مجاہدِ اوّل نے جواب دیا "ہاں [illegible] بعض مقامات کے گرد سرخ حاشیے بنادیے گئے ہیں [illegible] میں تمہیں خاص طور پر ان مقامات کا جائزہ لینا [illegible] معلوم کرنا ہے کہ وہاں کچھ خاص قسم کی سرگرمیاں ہو [illegible] اگر تم وہاں کچھ خاص سرگرمیاں دیکھو تو یہ بھی معل[illegible] ان کی نوعیت کیا ہے لیکن اس سلسلے میں زیادہ کھو[illegible] کی ضرورت نہیں۔"

اس کے بعد گفتگو کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ میں اور [illegible] کی تیاریاں کرنے لگے۔ اس سفر کے لیے ضروری سا[illegible] بھرے ہوئے دو بھاری تھیلے خالد نے ہمارے [illegible] کردیے۔

ہم سفر کے لیے تیار ہوگئے تو خالد نے ہمیں [illegible] اخراجات کے لیے پانچ ہزار روپے دیے۔ اس [illegible] اسلحے کی خریداری کے لیے رقم کا خیال آیا اور میں [illegible] خیالات کا اظہار بھی کردیا۔ اس پر مجاہدِ اوّل نے [illegible] اسلحے کی خریداری کے لیے رقم اے کے گھوش کی [illegible] لوگوں تک پہنچ چکی ہے جو برما میں ہمارے لیے اسلحہ [illegible] کریں گے۔"

جب ہم مجاہدِ اوّل اور خالد سے رخصت ہو[illegible] مجاہدِ اوّل نے کہا "اس سفر میں تم دونوں ایک دو[illegible] محافظ اور رفیق ہو اگرچہ مجھے توقع نہیں کہ اس سفر [illegible] میں تمہارا مقابلہ کہیں کسی پولیس پارٹی یا سرکاری [illegible] ہوگا پھر بھی احتیاط۔" یہ کہہ کر مجاہدِ اوّل نے دو دو

دونوں کو دیں "یہ زہر کی گولیاں ہیں" مجاہدِ اوّل کی آواز کپکپا رہی تھی "بالفرض محال اگر تم پھنس ہی جاؤ اور تمہارے لیے کوئی راہ نہ ہو تو گرفتاری سے قبل ہی یہ گولیاں حلق سے اتار لینا پھر تم ان کی اذیت اور تشدد سے بچ جاؤ گے۔ وہ تم سے کچھ بھی نہ اگلوا سکیں گے" یہ کہہ کر مجاہدِ اوّل نے ہم سے زہر کی گولیاں لے کر دو چھوٹی چھوٹی موی تھیلیوں میں ڈال دیں "تو' خدا حافظ!" یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے مجاہدِ اوّل کے لہجے میں لرزش محسوس کی تھی۔ وہ ہمیں کتنا عزیز رکھتا تھا! یہ بھی پہلا ہی موقع تھا کہ ہمیں زہر کی گولیاں دی گئی تھیں۔ اس سے میں نے اس مہم کی خطرناک نوعیت کا اندازہ لگالیا تھا۔

اس مکان سے نکل کر ابھی ہم نے کچھ ہی فاصلہ طے کیا ہوگا کہ اچانک ہمارے راستے میں ایک شعلہ حائل ہوگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے وہ شعلہ کسی صحرائی بگولے کی طرح گردش میں ہو۔ میں نے نگاہ اٹھائی تو اس شعلے کو کافی بلندی تک محیط و رقصاں دیکھا۔

"یہ۔ یہ کیا۔ کیا ہے شاہین؟" نیچو کی خوف زدہ آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔

ابھی میں نیچو کو کوئی جواب نہیں دے پایا تھا کہ میری آنکھوں نے ایک اور حیرت ناک منظر دیکھا۔ وہ شعلہ رقصاں سمٹنے لگا اور پھر اس سے ایک نسوانی پیکر کے نقوش ابھرنا شروع ہوگئے۔ شعلوں کا وہ نسوانی پیکر اس قدر حسین' اتنا دل فریب اور پُرکشش تھا کہ میں ایک بے خودی کے سے عالم میں اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ اس طرح پھیلا دیے تھے جیسے مجھے اپنی آغوش میں سمیٹ لینا چاہتی ہو۔

"آؤ۔ آجاؤ طارنوش!" نسوانی پیکر کے آتشی لب حرکت میں آگئے "آؤ۔ آؤ میرے بچے' میری آغوش میں آجاؤ کہ میں تمہاری ماں طرطبہ ہوں۔"

اس آواز میں ایسی کشش' ایسا بلاوا تھا کہ میں کسی سحرزدہ کی طرح اس آتشی پیکر کی طرف بڑھتا ہی چلا گیا۔

عین اسی لمحے جیسے کہیں بہت دور سے ایک آواز مجھے سنائی دی "رک جاؤ طارنوش! رک جاؤ ورنہ یہ تمہیں جلا کر خاک کردے گی۔"

میں پُراسرار اسی کی آواز پہچان گیا مگر میرے قدم نہیں رک سکے۔ میں جیسے اپنے بس میں نہیں تھا اور اس آتشی پیکر کی طرف بڑھتا جارہا تھا۔

○☆○

✱

آتشی پیکر اور میرے درمیان فاصلہ کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگیا۔ وہ طرطبہ تھی' میرے باپ پاموس کی دوسری بیوی' میری سوتیلی ماں! اسے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس قدر حسین ہوگی۔

"میرے بچے!" طرطبہ کی سحر انگیز آواز ایک بار پھر میری سماعت سے ٹکرائی۔

میں دوسرے ہی لمحے اس کے پھیلے ہوئے بازوؤں میں سماچکا تھا۔ خلافِ توقع مجھے انتہائی ٹھنڈک کا احساس ہوا پھر جیسے ہی اس کے ہونٹوں نے میری پیشانی کو چھوا' میرے سارے وجود میں آگ سی لگ گئی اور میں چیخ اٹھا۔ عین اسی لمحے مجھے طرطبہ کی چیخ سنائی دی اور پھر پھنکار کی آواز آئی۔ میں ایک جھٹکے سے دور جاگرا۔ اس کے بعد میری آنکھوں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا۔ طرطبہ کا وجود سمٹتے سمٹتے پھنکاریں مارتی ہوئی ایک ناگن کے پیکر میں تبدیل ہوگیا۔ یہ منظر میرے لیے ناقابلِ یقین اور حیرت انگیز تھا۔ وہ ناگن

اسمٰی سے یہ سن کر میرے سارے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ میرے لیے یہ بہت بڑی بات تھی کہ میں نے اپنے باپ کے قتل کا انتقام لے لیا تھا۔

"اس بدنصیب کی موت اسے خود ہی تم تک کھینچ لائی۔" اسمٰی مجھے بتارہی تھی۔ "وہ تمہارے باپ کی طرح تمہیں بھی ختم کرنا چاہتی تھی مگر عین وقت پر مجھے مفتی علیا لیش کی زبانی اس سازش کا علم ہوگیا پھر اس سے پہلے کہ طرطبہ زہریلی ناگن بن کر تمہیں ڈس لیتی میں اس کی راہ میں حائل ہوگئی۔ طارنوش! میری حالت اس وقت ایسی نہیں کہ میں زیادہ دیر تمہارے پاس رک سکوں اس لیے مجھے اپنا ناگوار فرض ادا کرنے دو!"

"کیسا ناگوار فرض اسمٰی؟" میں نے دریافت کیا۔

"میرے قبیلے کے سردار نے یہ ناگوار فرض میرے ہی سپرد کیا ہے کہ میں تمہارے اندر موجود جناتی صفات سلب کرلوں۔ کیا تم اس پر آمادہ ہو میرے بچے؟"

"اے اسمٰی! اگر تجھے یہ حکم ہے تو پھر مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ اب میرے دل میں بھی کوئی حسرت نہیں رہی کہ میں نے اپنے باپ ہاموس کا انتقام لے لیا۔ مجھے تو اس پر خوشی ہے کہ اب میں بھی دوسرے عام انسانوں کی طرح ہوجاؤں گا۔ ہاں اگر کوئی ملال رہے گا تو بس یہ کہ تجھ سے نہ مل سکوں گا۔"

ادھر میرے الفاظ ختم ہوئے ادھر میں نے اپنے ماتھے پر اس خوشبو کا بوسہ محسوس کیا اور پھر میرا ذہن تاریکیوں میں ڈوبتا چلا گیا۔ مجھے کچھ یاد نہیں کہ پھر مجھ پر کیا گزری۔ معلوم نہیں مجھے کتنی دیر کے بعد ہوش آیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں تو نیپو مجھے جھنجوڑ کر دکار رہا تھا۔

○☆○

ہم اسی نقشے کے مطابق سفر کررہے تھے جو ہمیں سالار نے فراہم کیا تھا۔ چیپل کوٹی میں ہمیں قیام کیے دوسرا دن تھا کہ ایک قافلہ نظر پڑا۔ یہ قافلہ کوئی پچاس ساٹھ نچروں پر مشتمل تھا اور اس میں شامل تمام افراد غیر ملکی تھے۔ ان میں سے صرف پانچ انگریز مسلح تھے' باقی سب زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ زنجیر کا ایک سلسلہ تھا جو ہر ایک کی کمر کے گرد بندھا ہوا تھا۔ ان کے ہاتھ بھی بندھے ہوئے تھے۔ وہ قافلہ ہمارے سامنے سے گزرتا ہوا گلاب کوٹی کی طرف بڑھ گیا۔

تیسرے روز رات کے وقت جب ہم ایک غار میں مقیم تھے تو ہمیں اپنی تک ودو کا ثمر مل گیا۔ دور نشیب میں ہمیں ذرا دیر کو روشنی نظر آئی۔ ہم اپنی کمین گاہ سے نکلے اور اسی طرف بڑھتے چلے گئے جدھر روشنی دیکھی تھی۔

بیس پچیس منٹ بعد ہم اس جگہ پہنچ گئے۔ یہاں ایک پہاڑ کے دامن میں ایک چھوٹی پہاڑی تھی۔ ان دونوں کے درمیان تنگ سی وادی بن گئی تھی۔ یہ دونوں پہاڑیاں تھوڑے فاصلے پر جاکر مل جاتی تھیں۔ اسی سنگم پر کئی چھوٹی چھوٹی روشنیاں جھلملارہی تھیں ہم سینے کے بل گھسٹتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔

وہاں جو کچھ نظر آیا' اس سے ہم نے یہی اندازہ لگایا کہ کچھ تعمیراتی کام ہورہا ہے۔ اس کام کی نوعیت کا ہمیں علم تھا۔ دونوں پہاڑیوں کے درمیان ایک سمت سے دوسری طرف تک ایک موٹی اور مضبوط دیوار زیر تکمیل تھی۔ دیوار کا ایک کونا ایک پہاڑ میں اور دوسرا سرا دوسرے پہاڑ میں پیوست تھا۔ دیوار کے باہر خاردار تاروں سے ایک لمبا چوڑا احاطہ کھینچا گیا تھا۔ احاطے کے وسط میں لمبی سی ایک بیرک بنی ہوئی تھی جو تاریک تھی۔ احاطے کے چاروں کونوں پر نگرانی کے لیے مچان بنے ہوئے تھے۔

"یہ بندر آخر یہاں کیا کررہے ہیں؟" نیپو نے سرگوشی کی۔

"اس کی اہمیت اسی سے ظاہر ہے کہ یہ سب کام نہایت رازداری سے کیا جارہا ہے" میں نے جواب دیا "آؤ واپس چلیں!"

ہم اسی رات گلاب کوٹی واپس پہنچ گئے۔ ہمیں جو کچھ معلوم کرنا تھا' معلوم کرچکے تھے۔ وہاں سے اگلے روز ہم جوشی مٹھ پہنچے جہاں ہماری ملاقات طارق بیگ سے ہوئی۔ اس سے دوستی کا سبب یہ تھا کہ وہ شستہ اردو بولتا تھا' وہ ہم سے گھل مل گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ علی گڑھ کے صادق بیگ کا پوتا ہے۔ صادق بیگ' آخری مغل تاجدار بہادر شاہ ظفر کے سپہ سالار جنرل بخت خاں کا ایک ساتھی تھا۔ بخت خاں جنگ آزادی میں ناکامی کے بعد جن ساتھیوں کے ہمراہ نیپال کی طرف نکل گیا تھا' ان میں صادق بیگ بھی تھا پھر صادق بیگ نیپال سے گزرتا ہوا تبت پہنچ گیا تھا اور ایک بستی دابا کو اپنا مسکن بنالیا تھا۔ وہیں اس نے ایک تبتی عورت سے شادی کرلی۔ طارق کی دادی اور والدین اب بھی دابا میں رہتے تھے۔ طارق بیگ قلی کا کام کرتا تھا۔

طارق بیگ ہی سے ہمیں معلوم ہوا کہ اس علاقے میں فرنگی ایک مقام پر کوئی قلعہ بنارہے تھے۔ ہم نے طارق کو بہ طور قلی اپنے ساتھ رکھ لیا۔ اسے جب یہ معلوم ہوا کہ ہم انگریزوں کے خلاف مصروف عمل ہیں تو اس کا جوش قابل

تیزی سے میری طرف بڑھی ہی تھی کہ میں نے ایک اور ناگن کو اس کی راہ میں حائل دیکھا۔ معلوم نہیں وہ کدھر سے لپک کر سامنے آگئی تھی۔ اس وقت نے میں نے اسمٰی کی خوشبو محسوس کی تھی۔ مجھے شاید طرطبہ کے حملے سے بچانے کے لیے اسمٰی نے بھی ناگن کا پیکر اپنالیا تھا۔ طرطبہ کو خود میں نے ناگن بنتے دیکھا تھا۔

وہ دونوں اپنے پھن پھیلائے ایک دوسرے پر حملے کررہی تھیں پھر ان دونوں کے جسم ایک دوسرے سے لپٹ گئے۔ یقیناً وہ دونوں ایک دوسرے کو ختم کرنے کے درپے تھیں۔ اس چھوٹے سے میدان میں وہ حیران کن جنگ جاری تھی۔ نیپو مجھ سے کچھ فاصلے پر بے ہوش پڑا تھا۔ میں ہوش میں تھا مگر جیسے میرے جسم میں جان نہیں تھی۔ میں اٹھ کر بیٹھنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ نیپو کی بے ہوشی کا سبب یقیناً وہ حیران کن مناظر ہی تھے جو شاید اس نے زندگی میں پہلی بار دیکھے تھے۔

اسمٰی اور طرطبہ کے درمیان معرکہ آرائی جاری ہی تھی کہ سانپوں کا ایک گروہ میں نے تیزی سے ان دونوں کی طرف بڑھتے دیکھا پھر تو اس میدان میں ہر طرف سانپ ہی سانپ نظر آنے لگے جن کے رنگ نمایاں طور پر جدا تھے۔ ایک گروہ سیاہ سانپوں کا تھا اور دوسرے گروہ کا رنگ گہرا سبز تھا۔ ذرا ہی دیر میں وہ میدان' میدان جنگ میں تبدیل ہوگیا۔ بیک وقت اتنے سارے سانپ میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔

طرطبہ کا رنگ سیاہ تھا اور اسمٰی نے گہرا سبز رنگ اختیار کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اسمٰی کے مددگار اہل ایمان جنات ہوں گے اور طرطبہ کی مدد کرنے کے لیے آنے والے کافر جنات ہی ہوسکتے تھے۔

کفر و ایمان کی جنگ جاری رہی اور لحہ بہ لحہ اس میں شدت آتی گئی۔ کبھی سیاہ رنگ والے گروہ کا غلبہ ہوجاتا اور کبھی سبز رنگ گروہ غالب آنے لگتا۔ میدان میں مردہ سانپوں کا اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ ان میں سیاہ و سبز دونوں ہی رنگ کے سانپ تھے۔

وہ معرکہ جانے کتنی دیر جاری رہا اور میدان میں پھنکاریں گونجتی رہیں۔ میری نظریں طرطبہ اور اسمٰی پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ دونوں مجھ سے قریب ہی تھیں۔

دفعتاً میں نے اپنے جسم میں عجیب سی قوت محسوس کی اور پھر تیزی سے میرا ہاتھ اپنی جیب میں چلا گیا۔ میرے ہاتھ میں کراری دار چاقو تھا۔ میں اچھل کر بیٹھ گیا اور چاقو کھول لیا۔ عین اس وقت جب طرطبہ پھن کاڑھ کر اسمٰی کو ڈسنے والی تھی' میرا ہاتھ تیزی سے آگے بڑھا اور پھر میں نے اس کا پھن تیز دھار چاقو سے کاٹ دیا۔ طرطبہ کے بل کھل گئے اور اس کا جسم اسمٰی سے الگ ہوکر تڑپنے لگا۔ اسی کے ساتھ سیاہ رنگ سانپوں کا گروہ راہ فرار اختیار کرنے لگا۔ ان میں سے بہت کم ہی فرار ہونے میں کامیاب ہوسکے۔ سبز رنگ سانپوں کے گروہ نے انہیں گھیر کر مارنا شروع کردیا تھا۔ سیاہ سانپوں کو شاید یہ علم ہوچکا تھا کہ طرطبہ ماری جاچکی ہے۔ میں نے اسمٰی کی طرف دیکھا تو وہ نڈھال سی سر ڈالے ایک طرف پڑی تھی پھر اچانک ہی وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئی۔

کچھ ہی دیر میں اس میدان میں سے جنات غائب ہوچکے تھے۔ سبز رنگ سانپوں کے مردہ جسم بھی اب وہاں نہیں رہے تھے البتہ سیاہ رنگ سانپوں کے مردہ جسم ہر طرف بکھرے نظر آرہے تھے۔

میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ نیپو کو ہوش میں لانے کی کوشش کروں کہ مجھے اسمٰی کی مخصوص خوشبو اپنے گرد اگرد چکراتی محسوس ہوئی۔

"اسمٰی!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا "تم۔۔۔ تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہاں طارنوش! ٹھیک ہوں میں" اسمٰی کی نڈھال سی آواز سنائی دی۔ "بہت زخمی ہوں لیکن جلد ہی صحت یاب [illegible] کے باوجود میں تم سے اس لیے ملنے آئی ہوں میرے بچے کہ عالم جنات میں ایک اندوہناک فیصلہ ہوا ہے" اسمٰی کی آواز سے دکھ کا اظہار ہورہا تھا۔

"کیسا فیصلہ؟" میں نے بے چین ہوکر پوچھا۔

"یہ کہ میں اب تم سے کبھی نہیں ملوں گی۔ مجھے صرف آخری بار تم سے ملنے کی اجازت ملی ہے۔"

"مگر کیوں؟" میں نے سوال کیا۔

"اس لیے طارنوش کہ طرطبہ تمہارے ہاتھوں قتل ہوچکی ہے اور اس کا تعلق بہرحال قوم جنات سے تھا۔ کافر قبیلوں اور جنات کے اہل ایمان قبیلوں کے درمیان اس بنیاد پر صلح ہوئی ہے کہ تمہیں میرے بھائی ہاموس کی طرف سے ورثے میں جو جناتی صفات ملی ہیں' وہ سلب کرلی جائیں اور تم سے عالم جنات کا ہر رشتہ توڑلیا جائے مگر اب مجھے اس کا کوئی رنج نہیں کیونکہ میری زندگی کا مقصد پورا ہوچکا ہے۔ ہاں اگر دکھ ہے تو صرف یہ کہ اس ملاقات کے بعد تم سے پھر کبھی میری ملاقات نہیں ہوسکے گی۔ مبارک ہو تمہیں طارنوش کہ تم نے اپنے باپ اور میرے بھائی ہاموس کے قتل کا بدلہ لے لیا۔ تمہارے باپ ہاموس کو قتل کرنے والی طرطبہ ہی تھی جو آج تمہارے ہاتھوں انجام کو پہنچ گئی۔"

دیکھا۔ انگریزوں نے حریت اسے ورثے میں دی تھی۔ وہ اب بھی خود کو علی گڑھ کا کہتا تھا اور صرف اتنا جانتا تھا کہ اگر اس کے دادا کو انگریزوں کی وجہ سے ہندوستان نہ چھوڑنا پڑتا تو وہ علی گڑھ ہی میں پلا بڑھا ہوتا پھر ہم نے اسی کی معیت میں ان تمام جگہوں کی سیر کی جن کی نشان دہی نقشے میں کی گئی تھی۔ دو ہفتے کے بعد ہم رانی کھیت پہنچ گئے۔ اسی دن پہلی ٹرین سے ہم بریلی پہنچے جہاں ہم نے ٹرین تبدیل کرنے کے لیے بھاگلپور کا ٹکٹ لیا۔ بھاگلپور سے پھر چھوٹی لائن کی ٹرین کے ذریعے ہمیں گوہاٹی پہنچنا تھا۔

گوہاٹی میں اے کے گھوش اپنے دو ساتھیوں کے ہمراہ ہمارا منتظر تھا۔ یہ علی احمد اور مولانا قاسم تھے۔ اگلے ہی روز ہم پانچوں برما روانہ ہوگئے۔ اس سفر میں ایک برمی نوجوان کھن ہمارا رہبر تھا۔ اس کا تعلق کاچین قبیلے سے تھا۔ اس نے مجھے منہ بولا بھائی بنالیا۔ دو ماہ سفر کے بعد ہم ایک بلند سطح میدان میں پہنچے جس کے نیچے وادی پھیلی ہوئی تھی۔ وادی میں چھوٹی چھوٹی جھونپڑیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ سپرابوم گاؤں تھا اور یہاں کاچین قبیلہ بستا تھا۔ اس قبیلے کا سردار کھن کا باپ تھا' اس نے ہماری مدارات کی۔ یہاں سے ہم ہاتھیوں کے ذریعے پندرہ دن میں میکینا پہنچے اور پھر وہاں رکے بغیر ایک اور چھوٹی سی بستی راڈی کیانا میں قیام کیا۔ ایک ہفتے کے اندر اندر ہمارے ان دوستوں نے جو برما میں ہندوستان کی آزادی کے لیے جنگ لڑ رہے تھے' وہ تمام مطلوبہ اسلحہ ہمیں فراہم کردیا جس کی رقم ہم پہلے ہی ادا کر چکے تھے۔ اسی رات ہم نے راڈی کیانا سے واپسی کا سفر اختیار کیا۔ اس سے قبل گھوش نے برما میں مقیم ان ہندوستانی دوستوں سے ہمارا تعارف نہایت تفصیل سے کرایا جو مستقبل میں بھی ہمارے لیے اسلحہ کی مستقل فراہمی کا وسیلہ بن سکتے تھے۔ اب ہم ان سے براہِ راست رابطہ قائم کرسکتے تھے۔

جس وقت ہم برما سے روانہ ہوئے تھے گرمیوں کا موسم تھا اور اب گزرتے جاڑے تھے۔ اس سفر میں برما میں وہ رابطے پیدا ہوئے جو بعد میں سبھاش چندر بوس اور جنرل شاہنواز کے کام آئے۔

○☆○

فاطمہ سے میری وہ ملاقات دہلی میں ہوئی تھی۔ مجھے احساس تھا کہ بخت خاں اور جوگیندر نے یقیناً ہمارے لیے دانستہ تنہائی میں ملاقات کا وہ موقع فراہم کیا تھا۔ جوگیندر نے کچھ خریداری کا بہانہ کیا تھا اور بخت خاں بھی اس کے ساتھ یہ کہہ کر چل دیا تھا کہ مجھے بھی کچھ خریدنا ہے۔ ترکمان گیٹ کے اس مکان میں فاطمہ اور میں ہی رہ گئے تھے۔ اگلے روز تنظیم ہی کے ایک کام سے فاطمہ اور بخت خاں کو لکھنؤ روانہ ہونا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس روز فاطمہ بہت بے چین تھی۔ میں اس میں گم تھا اور وہ نہ جانے کہاں گم تھی۔

"فاطمہ!" میں نے اسے پکارا۔

"ہوں!" اس نے ہنکارا بھرا اور میرے سینے کے بالوں میں اپنا منہ چھپالیا۔

"کیا سوچ رہی ہو تم؟"

"معلوم نہیں شاہین کہ مجھے نہ جانے کیوں ایسا لگ رہا ہے جیسے یہ ہماری آخری ملاقات ہے اور۔۔۔ اور پھر ہم۔۔۔ ہم کبھی نہ مل سکیں گے" اس کی آواز بھرا گئی۔

"یہ سب تمہارا وہم ہے فاطمہ!" میں نے اسے اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر خود سے اور قریب کرلیا۔

"کیسی عجیب بات ہے شاہین کہ تم میرے بارے میں سب کچھ جانتے ہو اور۔۔۔ اور میں تمہارے متعلق کچھ بھی نہیں جانتی" وہ بڑی حسرت سے بولی۔

"تو سنو فاطمہ! تنظیم کے اصول کچھ بھی ہوں مگر میں آج تمہیں سب کچھ بتادوں گا کہ میرا اصل نام خارنوش ہے اور۔۔۔" پھر میں نے اس سے کچھ بھی نہیں چھپایا۔

اس نے سب کچھ بڑی حیرت سے سنا' میری آپ بیتی تھی بھی حیرت انگیز! آج اس کے اور میرے درمیان کوئی پردہ نہیں رہا تھا پھر ہم اس وقت تک ایک دوسرے میں گم رہے جب تک جوگیندر اور بخت خاں نہ لوٹ آئے۔

دوسرے دن صبح فاطمہ' بخت خاں کے ساتھ لکھنؤ روانہ ہوگئی۔ میں اور جوگیندر دہلی میں مجاہدِ اوّل کے حکم کا انتظار کر رہے تھے۔

بخت خاں اور فاطمہ کو لکھنؤ گئے تیسرا دن تھا کہ وہ ہولناک اطلاع ہمیں مل گئی۔ فاطمہ کو گرفتار کرلیا گیا تھا اور مقابلے کے دوران میں بخت خاں شدید زخمی ہونے کے باوجود فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ لکھنؤ میں وہ دونوں حضرت گنج کے علاقے میں ٹھہرے تھے۔ وطن پرست تنظیم کے اس ٹھکانے پر پولیس نے زبردست چھاپا مارا تھا۔ وطن پرستوں میں سے دو شہید ہوگئے تھے اور پانچ پولیس والے مارے گئے تھے۔ میرے لیے یہ خبر بھی انتہائی سنسنی خیز تھی کہ انٹیلی جنس کی ڈپٹی ڈائریکٹر کیتھی بھی ان دنوں لکھنؤ میں تھی اور یہ "کارنامہ" اسی کا تھا۔ لاہور میں اس سے میرا زبردست معرکہ ہوچکا تھا۔

"کیتھی اب تیری زندگی کے دن پورے ہوچکے ہیں۔ میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا!" میں آپ ہی آپ بڑبڑایا۔

اسی روز جوگیندر اور میں لکھنؤ روانہ ہوگئے۔ مقامی وطن پرست اراکین اب تک یہ سراغ نہیں لگا سکے تھے کہ فاطمہ کو کہاں رکھا گیا ہے۔ ان سے البتہ مزید دیگر باتوں کا علم ضرور ہوا۔ راجا صاحب محمود آباد کے ذریعے یہ معلوم ہوا تھا کہ انہوں نے یوپی کے گورنر بٹلر کے ہاں فاطمہ کی فائل دیکھی تھی۔ خود بٹلر نے انہیں یہ کہتے ہوئے فائل دی تھی کہ اب ہندوستان کو شاید آزادی سے کوئی نہیں روک سکتا۔ ہندوستان میں جتنی حریت پسند خواتین ہیں' ان میں فاطمہ سب سے کم عمر اور سب سے نڈر ہونے کے ساتھ ساتھ انتہائی خطرناک ہے۔

یہ سب سن کر میں نے کہا تھا "وہ ایک محبِ وطن لڑکی ہے اور محبت انسان کو نڈر بنادیتی ہے۔"

جب تک ہمیں یہ معلوم نہ ہوجاتا کہ فاطمہ کو کہاں رکھا گیا ہے' ہم اس کی رہائی کے لیے کچھ بھی نہیں کرسکتے تھے۔ مقامی وطن پرست ارکان اسی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ ہمیں لکھنؤ پہنچے تیسرا دن گزر چکا تھا اور اب رات ہوچکی تھی۔ اسی رات ہمیں وہ اطلاع مل گئی جس کا ہم بے چینی سے انتظار کر رہے تھے۔

کیتھی نے فاطمہ پر تشدد کی انتہا کردی تھی مگر فاطمہ نے زبان نہیں کھولی تھی۔ فاطمہ سے وہ میرے اور مجاہدِ اوّل کے بارے میں معلوم کر رہی تھی۔ فاطمہ کا بس یہی جواب تھا "میں نہیں جانتی' مجھے نہیں معلوم۔"

جن افراد نے فاطمہ کے متعلق معلومات فراہم کی تھیں' ان کا کہنا تھا کہ انہوں نے فاطمہ جیسی کم عمر لڑکی نہیں دیکھی۔ اس کے ناخنوں میں سوئیاں پیوست کی گئیں' پیر کے تلووں پر ڈنڈے برسائے گئے' اس کے ماتھے پر رسی باندھ کر ڈنڈے سے بل دیے گئے مگر اس کے پائے استقامت میں لرزش نہیں آئی۔

یہ تفصیلات سن کر میں کانپ گیا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ میری فاطمہ میری نازک سی کومل فاطمہ سے وہ درندے کتنا سفاکانہ سلوک کر رہے تھے۔ میرا دل ان کے خلاف نفرت سے بھر گیا۔

اس کے علاوہ مقامی ساتھیوں نے جو کچھ معلوم کیا' یہ تھا کہ فاطمہ کو بٹلر ہاؤس کے ایک حصے میں رکھا گیا ہے۔ بٹلر یوپی کا گورنر تھا اور راجا صاحب محمود آباد سے اس کی دوستی تھی۔ بٹلر ہاؤس' لکھنؤ میں عہدِ غلامی کی بدترین یادگاروں میں سے
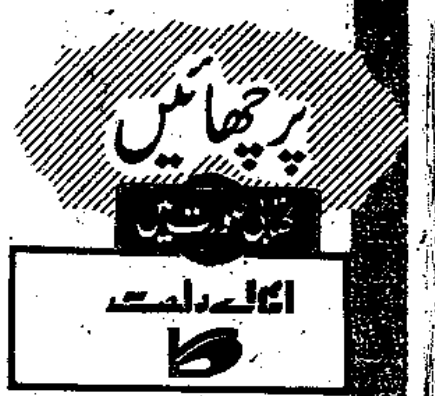
ایک تھا۔ ان دنوں بٹلر ہاؤس کا ایک حصہ مکمل طور پر کیتھی کے تصرف میں تھا۔ گورنر بٹلر نے اس مکان میں سجنے والی شراب و شباب کی محفلوں کو چند روز کے لیے ملتوی کردیا تھا۔ فاطمہ' بٹلر ہاؤس کے اسی حصے میں تھی جو کیتھی کے تصرف میں تھا۔ کیتھی کا حکم تھا کہ فاطمہ کو اذیتیں دی جائیں لیکن اس حد تک کہ وہ مرنے نہ پائے۔ اس کے حکم کے مطابق فاطمہ کو اس وقت تک زندہ رہنا تھا جب تک وہ زبان نہ کھول دیتی۔

آخری خبر یہ تھی کہ کیتھی انگریز اہل کاروں پر سخت برہم تھی جو ابھی تک فاطمہ کی زبان نہ کھلوا سکے تھے۔ اس نے فیصلہ کیا تھا کہ اب وہ خود فاطمہ سے نمٹے گی۔

یہ وہی رات تھی۔ میں اور جوگیندر' بٹلر ہاؤس کے اسی حصے کی چھت پر موجود تھے۔ ہم نے زیادہ بھیڑ بھاڑ سے گریز کیا تھا ورنہ وہاں تک نہ پہنچ سکتے۔

نیچے قبرستان کا سا سناٹا تھا اور اس سناٹے میں عجیب سی ہلچل مچی ہوئی تھی۔ وہ سب انگریز تھے اور تیزی سے اِدھر اُدھر آجا رہے تھے۔ ان کے انداز سے گھبراہٹ اور تشویش عیاں تھی۔ اس عمارت کے اس حصے میں بہت سخت پہرا تھا۔ پہرے پر صرف انگریز فوجی متعین تھے۔ ان میں کوئی بھی ہندوستانی نہ تھا۔ واقعی میری فاطمہ بہت عظیم تھی' بہت نڈر تھی۔

ہم نے چھت سے جھانک کر نیچے پھیلے ہوئے ماحول کا جائزہ لیا۔ تب ہمیں پتا چلا کہ ان غیر معمولی سرگرمیوں کا سبب کیا ہے! ایک طرف سے گورنر بٹلر اور کیتھی بڑی تیزی سے اسی حصے کی طرف آ رہے تھے۔ ان کی رفتار سے عجلت کے ساتھ ساتھ گھبراہٹ بھی عیاں تھی گویا انہیں کوئی بہت ہی بری خبر ملی ہو۔

ہم اس وقت طویل چھت کے ایک کونے پر تھے۔ صرف چار روشن دان اس حصے میں ایسے تھے جن سے روشنی پھوٹ رہی تھی۔ برآمدے کی چھت سے چپکے ہوئے ہم ذرا روشن دانوں کی طرف بڑھ گئے۔

پہلے دو روشن دان جس کمرے میں کھلتے تھے' وہ خالی تھے۔ ہم وہاں سے آگے رینگ آئے۔

دوسرے کمرے میں گورنر بٹلر' کیتھی اور دو انگریز افسر موجود تھے۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ لوہے کا اسپرنگ والا پلنگ تھا۔ اس پر کوئی بستر نہ تھا۔ اس پلنگ پر فاطمہ پڑی تھی۔ اس کا چہرہ دیوار کی طرف تھا۔ اس کی ساری بے ترتیب تھی۔ بدن کے کھلے ہوئے حصوں پر تشدد کیے جانے کے نشانات تھے۔

"یہ سب کیا ہوا؟" کیتھی نے ایک انگریز افسر سے سوال کیا تھا "اسے زہر کس نے فراہم کیا تھا؟"

"کچھ پتا نہیں مس!" انگریز افسر نے جواب دیا "آپ چلی گئیں تو آپ ہی کی ہدایت کے مطابق میں آدھے گھنٹے بعد اس سے پوچھ گچھ کے لیے آیا تھا۔ اس وقت اس کی حالت بہت خراب تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی بتایا تھا کہ اس نے زہر کھالیا ہے۔"

فاطمہ مرچکی ہے۔ اس خیال سے میرے ذہن میں جیسے گرم گرم ریت کے بگولے اڑنے لگے۔ میں تنہا رہ گیا تھا۔ میرا سب سے حسین خواب بکھر کر رہ گیا تھا۔

"اس کی لاش کو چھیڑا گیا ہے؟" کیتھی نے پوچھا۔

"جی نہیں۔"

پھر کیتھی پلنگ پر جھکی اور اس نے فاطمہ کی لاش کو سیدھا کردیا۔ فاطمہ کی گردن اس طرح مڑ گئی تھی کہ اس کا چہرہ روشن دان سے صاف نظر آرہا تھا۔ اس کے رخساروں پر خراشوں کے نشان تھے' ماتھے پر سیاہی مائل لکیریں ابھری ہوئی تھیں۔ اس کے بازوؤں پر جگہ جگہ سے خون رس کر جم گیا تھا۔ اس کی انگلیاں خون میں لتھڑی ہوئی تھیں۔ اس کے ہونٹوں کی باچھوں سے لعاب سا بہہ گیا تھا۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں۔

کیتھی نے جھک کر ایک مٹھی کو کھولا۔ اس میں سے سفید رنگ کا زردی مائل چھوٹا سا مڑا ہوا لفافہ نکل کر فرش پر گر گیا۔ کیتھی نے وہ لفافہ اٹھالیا جسے میں خوب پہچانتا تھا۔ ایسا ہی ایک لفافہ خود میرے پاس بھی تو تھا جس میں زہر کی گولیاں تھیں۔ مجاہد اوّل نے یقیناً کسی ایسے ہی موقعے کے لیے فاطمہ کو بھی زہر کی گولیاں دی تھیں۔

میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ میں چیخنا چاہتا تھا' فاطمہ کی لاش سے لپٹنا چاہتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ فاطمہ کے بھائی جوگیندر کی کیفیت بھی مجھ سے مختلف نہیں رہی ہوگی۔

گورنر بٹلر' کیتھی کی یہ کارروائی دیکھتا رہا۔

"پھر کیا ہوا تھا؟"

"میں نے ایک آدمی فوراً آپ کی طرف دوڑایا تھا جناب" اسی انگریز افسر نے جواب دیا "پھر میرے دیکھتے ہی دیکھتے یہ مرگئی۔"

"کچھ بتایا؟" کیتھی نے دریافت کیا۔

"کچھ نہیں" انگریز افسر نے کہا "اس نے صرف یہ درخواست کی تھی کہ میں ہندو نہیں مسلمان ہوں' میری لاش کو جلایا نہ جائے' دفن کیا جائے" انگریز افسر کا لہجہ بھی کچھ متاسفانہ تھا "آخری لمحات میں یہ میرے دیوتا' طارنوش میرے دیوتا کہتے کہتے خاموش ہوگئی تھی۔ مرتے وقت اس کی زبان پر طارنوش کا نام تھا۔"

"طارنوش!" کیتھی دانت پیستے ہوئے غرائی۔

"یہ واقعی ایک عظیم اور بہادر لڑکی تھی" گورنر بٹلر بولا "جس قوم میں ایسی لڑکیاں ہوں کیتھی' اسے زیادہ دن غلام نہیں رکھا جاسکتا۔ میں اس عظیم لڑکی کو سلام کرتا ہوں" اور واقعی بٹلر نے فوجی انداز میں فاطمہ کو سلامی دی۔

یہ منظر دیکھ کر کمرے میں موجود دوسرے انگریز افسروں نے بھی فاطمہ کی لاش کو سلامی دی تھی اگر سلامی کے لیے ہاتھ نہیں اٹھے تھے تو صرف کیتھی کے۔

"اس مجاہدہ کی آخری خواہش پوری کی جائے۔ اس کو دفن کیا جائے!" گورنر بٹلر نے حکم دیا پھر فاطمہ کی لاش کے احترام میں وہ دو تین قدم پیچھے ہٹا اور باہر جانے کے لیے مڑ گیا۔

اسی وقت ایک فائر کی آواز گونجی تھی۔ یہ فائر میں نے کیا تھا مگر اس سے ذرا پہلے ہی جوگیندر نے میرے شانے پر ہاتھ مار کر مجھے فائر کرنے کے ارادے سے باز رکھنا چاہا تھا۔ میرا ہاتھ ہل گیا' نشانہ خطا ہوگیا اور کیتھی بچ گئی۔

اس کے بعد ایک ہنگامہ برپا ہوگیا جوگیندر بولا "یہ کیا کیا تم نے! بھاگو!"

جوگیندر کے ساتھ میں امین آباد پارک کے علاقے میں واپس آگیا۔ بٹلر ہاؤس سے بچ کر نکل آنا کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔ میں شکستہ اور نڈھال تھا۔ میرا سینہ انتقام کی آگ سے دہک رہا تھا۔ کاش جوگیندر نے اس وقت میرا ہاتھ نہ پکڑا ہوتا تو فاطمہ کی قاتل کیتھی زندہ نہ ہوتی۔ غم کی شدت کے باوجود میں دل ہی دل میں شرمندہ تھا کہ اپنی فاطمہ کا انتقام نہ لے سکا۔

جہاں ہم ٹھہرے ہوئے تھے۔ وہاں ہمارا دل گھبرانے لگا تو گومتی کے کنارے جا پہنچے۔ ہم دونوں گومتی کی لہروں کو کناروں سے سر پٹختے' سسکیاں لیتے سنتے رہے۔ آس پاس پھیلی ہوئی جھاڑیوں میں ہوا دھیرے دھیرے غم سے بوجھل بہہ رہی تھی۔ پورا ماحول سوگوار اور غمگین تھا۔ ہر طرف تاریکی پھیلی ہوئی تھی پھر ہمیں محسوس ہوا کہ ہماری آنکھوں کے سامنے تاریکی کا ایک حصہ متحرک ہوگیا۔ یہ دھبا حرکت کرتا ہوا قریب آگیا۔ ایک سیاہ ہیولا ہم سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑا تھا پھر اس دھبے سے آواز ابھری۔ اس نے ہم دونوں کو نام لے کر مخاطب کیا۔ وہ مجاہد اوّل کی آواز تھی جو اب کہہ رہا تھا "ہندوستان ایک عظیم اور بہادر بیٹی سے محروم ہوگیا ہے۔ یہ صرف تم لوگوں کا غم نہیں پورے ہندوستان کا غم ہے" مجاہد اوّل کی آواز دکھ سے بوجھل تھی۔

ہم دونوں اپنی جگہ ساکت کھڑے رہے۔ ہمارے پاس کہنے کو تھا ہی کیا مگر میں نے مجاہد اوّل کے ان الفاظ کو حقیقت کے بہت قریب جانا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ہندوستان ہوں' ہاں میں ہندوستان تھا۔ میں اور میرے ساتھی اپنے اپنے وجود میں مکمل ہندوستان تھے۔ مجاہد اوّل ٹھیک ہی کہہ رہا تھا' یہ سارے ہندوستان کا غم تھا۔

"میں تمہارے غم کو خوب سمجھتا ہوں" مجاہد اوّل کی آواز پھر بلند ہوئی "تم سب میرے بچے ہو۔ میں تمہارے ہر ساتھی کی موت پر خون کے آنسو رویا ہوں۔ میرا یہ دل ایک قبرستان ہے جہاں نہ معلوم تمہارے کتنے ساتھیوں کی لاشیں دفن ہیں مگر ہر غم نے' ہر تازہ گھاؤ نے میرے اندر بھڑکتی ہوئی آگ کو اور بھڑکایا ہے۔ یہ غم مجھے بے عمل نہیں بناسکے۔ میں صفدر (جوگیندر کا تنظیمی نام) اور موہن لال سے شرمندہ ہوں۔ نہ میں اسے یہاں بھیجتا نہ شاید اس کی گرفتاری عمل میں آتی۔"

مجاہد اوّل ایک چٹان تھا جس میں ایک بے حد نرم دل دھڑک رہا تھا۔ اس کے اعصاب آہنی تھے مگر دل گداز تھا۔ وہ ایک حریت پسند تنظیم کا سربراہ تھا' وہ سرفروشوں کی فوج کا بے جگر سوار تھا اسی لیے کبھی وہ جذبات کو اپنے مقصد پر غالب نہیں آنے دیتا تھا۔

"یہاں سے تم سیدھے ہر پرشاد کے گھر جاؤ گے صفدر!" مجاہد اوّل نے جوگیندر کو مخاطب کیا "تم اس کے گھر سے واقف ہو۔ اس کے مہمان خانے کا دروازہ تمہیں کھلا ملے گا۔ وہاں سوشیلا تمہاری منتظر ہے۔ وہ میرے ساتھ ہی یہاں پہنچی ہے۔ اچھا میں چلا۔ شاہین! تم امین آباد ہی میں ٹھہرو گے۔"

مجاہد اوّل چلا گیا اور پھر ہم دونوں بھی جدا جدا راستوں پر چل کھڑے ہوئے۔ ہر پرشاد لکھنؤ کی نمایاں سیاسی شخصیات میں سے ایک تھا۔

پھر اسی روز رات ہونے سے قبل مجھے ایک مقامی ساتھی نے پیغام دیا کہ میں بھی جوگیندر اور سوشیلا کے پاس پہنچ جاؤں' سو میں نے ایسا ہی کیا۔

رات کا آخری پہر تھا کہ مجاہد اوّل بھی وہاں پہنچ گیا۔ سیاہ چمکتی آنکھوں نے کمرے اور ماحول کا جائزہ لیا پھر اس نے کہا "میرے بچو! میں تمہارے دکھ سے واقف ہوں' اس لیے کہ اس غم کا داغ میرے دل پر بھی ہے مگر یاد رکھو' ہم ایک حقیقی جنگ میں مصروف ہیں۔ یہ جنگ کوئی ڈراما نہیں ہماری زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے اور تم جانتے ہو کہ جنگ میں بہت سے دوست کام آتے ہیں۔ فاطمہ کا غم اپنی جگہ مگر ہمیں اس مقصد کو عزیز رکھنا ہے جس کے لیے فاطمہ نے اپنی جان دے دی اور مقصد کو قربان نہیں کیا۔ اس کے لیے زندگی کا سودا کرنا مشکل نہیں تھا۔ اذیتیں جب اس کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگئیں تو اس نے اپنی جان دینے کا فیصلہ کیا اور ہندوستان کی حریت پسند خواتین میں اپنا نام درج کرالیا۔"

"ہمیں اپنا مقصد اسی طرح عزیز ہے جیسے فاطمہ کو تھا" جوگیندر بول اٹھا۔

"اب میں تمہیں اس مہم کے بارے میں بتاتا ہوں کہ جس کے لیے ہم کئی ماہ سے تیاریاں کر رہے ہیں۔ ہماری یہ مہم اسی سال سردیوں میں شروع ہوگی۔ تمہارے ساتھی اس مہم کے لیے تیاریوں میں مصروف ہیں۔ شاہین! جس علاقے میں تم نے تعمیراتی کام ہوتے دیکھا تھا وہاں انگریز مہلک کیمیائی اسلحہ کا کارخانہ قائم کر رہے ہیں۔" مجاہد اوّل نے چند لمحے توقف کیا پھر بولنے لگا "اس کارخانے کی تعمیر کے لیے دو مقا

اس لیے چنا گیا ہے کہ کیمیائی اسلحہ کی تیاری میں استعمال ہونے والا خام مواد وہاں دستیاب ہے۔ انگریز اس کی تعمیر جرمن اور ترک جنگی قیدیوں سے کرا رہے ہیں۔"

"مگر جناب' انھوں نے یہ فیکٹری برطانیہ ہی میں کسی جگہ قائم کیوں نہیں کی؟" میں نے سوال کیا۔

"اس کی پہلی وجہ تو یہ ہے کہ برطانیہ میں ایسا اسلحہ تیار کرنے کے لیے خام مال وافر مقدار میں نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جنگ کے سبب برطانیہ میں جاسوسوں کا جال پھیلا ہوا ہے۔ برطانیہ کے سیاست دانوں اور جنگی ماہرین کا خیال ہے کہ اگرچہ جنگ ختم ہو چکی ہے' جرمنی کی شکست ہوئی ہے لیکن جرمنی اس شکست کو ایک دائمی حقیقت کے طور پر تسلیم نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزوں نے یہ اسلحہ ساز کارخانہ ہندوستان کے ایک دور افتادہ علاقے میں لگایا ہے تاکہ اس وقت برطانیہ میں سرگرم عمل جرمن جاسوسوں کو اس کی سن گن نہ لگ سکے' دوسرے اس لیے بھی کہ مستقبل میں ہونے والی جنگ میں جرمن اس تک آسانی سے نہ پہنچ سکیں۔ ان کا اندازہ ہے آئندہ جنگ بیس بائیس سال بعد متوقع ہے" مجاہدِ اوّل نے تفصیل کے ساتھ میرے سوال کا جواب دیا۔

"مگر اس کے لیے موسم سرما کا انتخاب کیوں کیا گیا ہے۔ جب کہ وہ موسم اس مہم کو ز... شوار بنا دے گا؟" جوگیندر نے دریافت کیا۔

"اس لیے کہ اگلے دو تین ماہ میں یہ فیکٹری مکمل ہو جائے گی" مجاہدِ اوّل بتانے لگا "ہمارا منصوبہ یہ ہے کہ اس فیکٹری کو اس وقت تباہ کیا جائے جب یہ مکمل ہو کر اپنا کام شروع کر دے تاکہ انگریزوں کی یہ کوشش قطعی طور پر ناکام ہو جائے۔ اس کے علاوہ یہ فیصلہ کرنے کا ایک اور سبب بھی ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ کیمیائی اسلحہ کا یہ فارمولا ایک جرمن سائنس داں کے ذہن کی اختراع ہے۔ انگریزوں نے اس سائنس داں کو عین اس وقت اغوا کیا جب وہ اس فارمولے پر کامیاب تجربہ کر چکا تھا۔ اس کا معاون دراصل ایک انگریز سائنس داں تھا۔ اسی نے جرمن سائنس داں کے اغوا کا منصوبہ بنایا تھا۔ جرمن سائنس داں کو اغوا کرکے سیدھا ہندوستان پہنچایا گیا۔ اسے ہندوستان میں کہاں رکھا گیا ہے اس کا علم صرف وائسرائے کو ہے۔"

مجاہدِ اوّل جو کچھ بتا رہا تھا' اسے ہم بڑی ... اور اشتیاق سے سن رہے تھے۔

"کہا جاتا ہے کہ نینی تال کے علاقے ... والی اسلحہ ساز فیکٹری کا نقشہ اس سائنس داں ہی کی مدد سے تیار کیا گیا ہے" مجاہدِ اوّل بتا رہا تھا۔

"کیمیائی اسلحہ کی تیاری کا فارمولا اس کے ذہن میں ہے۔ لاکھ تشدد کے باوجود اس نے یہ فارمولا انگریزوں کو نہیں بتایا۔ ہاں وہ اس پر ضرور آمادہ ہو گیا ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے' اس فارمولے پر عمل درآمد کرتے ہوئے مطلوبہ مہلک بم تیار کرتا رہے گا۔ اس کا خیال ہے کہ اس طرح وہ اس ہتھیار کی ہلاکت آفرینی کو محدود کر سکے گا۔ یہ ہماری سب سے اہم مہم ہو گی" مجاہدِ اوّل نے پرزور و پرجوش آواز میں ہم سے کہا "اس فیکٹری کو مکمل طور پر تباہ کرنے کے لیے ضروری اسلحہ' اس مہم کے آغاز سے بہت پہلے اس علاقے میں تمہارے مستقر پہنچ جائے گا۔ نینی تال کے مضافات میں سیاحت سے متعلق ٹیپو نے اپنی جو رپورٹ پیش کی ہے' اس کے مطابق ہم نے اس علاقے میں' بعض غاروں کے اندر اپنے مورچے اور مستقر بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ اس وقت تک ٹیپو ان غاروں میں یہ گولہ بارود جمع کر چکا ہو گا۔ ان دنوں ٹیپو اسی کام میں مصروف ہے اور طارق بیگ بھی اس کے ساتھ ہے۔ طارق کی وجہ سے ٹیپو کو بڑی آسانی ہوئی ہے۔ وہ علاقہ طارق کا دیکھا بھالا ہے اور مقامی بولی سے بھی واقف ہے۔ وہ خوش ہے کہ اپنے دادا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انگریزوں کے خلاف مصروف جہاد ہے۔"

"میں ایک بات اور پوچھنا چاہتا ہوں جناب! اگر مناسب سمجھیں تو بتا دیں" میں بولا اور پھر مجاہدِ اوّل کی اجازت پا کر کہا "اس فیکٹری سے متعلق ہماری معلومات کا ذریعہ کیا وہی انگریز ولسن ہے جسے ہم نے راولپنڈی میں اغوا کیا؟"

"کسی حد تک!" مجاہدِ اوّل نے جواب دیا "وہ دبلا پتلا منحنی شخص بڑے مضبوط اعصاب کا مالک ثابت ہوا۔ وہ واقعی اپنے تنگ سینے کے چھوٹے سے پنجرے میں شیر کا دل رکھتا تھا۔ اس نے ہمیں جھوٹی سچی باتیں بتائی تھیں لیکن ان سے ہمیں بہرحال ایسے اشارے مل گئے جو ہمارے لیے بنیادی اہمیت کے حامل تھے۔ اس کے بعد تمھیں اور ٹیپو کو نینی تال کے علاقے کی سیاحت پر بھیجا گیا تھا پھر باقی معلومات ہم نے اپنے ذرائع سے حاصل کی تھیں۔ انگریزوں میں بھی غدار ہو سکتے ہیں۔ آج بھی ہندوستان میں موجود انگریز افسر' وارن ہیسٹنگز کی طرح دولت کی ہوس رکھتے ہیں۔ بہرحال ٹیپو نے اس علاقے میں اب تک کام کے بارے میں جو رپورٹ ... ہے' یہ اس کی نقل ہے" مجاہدِ اوّل نے ایک لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا "تم اس رپورٹ کا مطالعہ کرو۔ اس میں فیکٹری کا ایک نقشہ بھی ہے جو ٹیپو نے کسی طرح حاصل کیا ہے۔ تم اس رپورٹ اور نقشے کا بہ غور مطالعہ کرو اور سوچو کہ اس فیکٹری کی تباہی کے لیے کیا طریقہ اختیار کیا جائے! ایسا ایک منصوبہ ٹیپو بھی تیار کر رہا ہے۔ میں بھی اپنے طور پر سوچ رہا ہوں۔ ہم سردیوں میں نینی تال کے مضافات میں اپنی مہم کے مستقر پہنچ کر ان تینوں منصوبوں پر غور کریں گے اور یہ فیصلہ کریں گے کہ کون سا منصوبہ قابلِ عمل ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ اس فیکٹری کی تباہی کے لیے ہمارے پاس تین متبادل منصوبے ہوں جن میں موقع پر معمولی ردوبدل کی جا سکے۔"

"اس عرصے میں ہم کیا کریں گے؟" جوگیندر نے سوال کیا۔

"اب سے دو ماہ بعد تم دونوں شملے پہنچو گے اور وہاں کے پہاڑی علاقے میں زندگی گزارنے کی مشقیں کرو گے۔ سوشیلا تم سے پہلے روانہ ہو جائے گی" پھر مجاہدِ اوّل اٹھ کھڑا ہوا۔ چلنے سے پہلے اس نے سوشیلا کو مخاطب کیا "تم بہادر بھائی کی بہن اور بہادر باپ کی بیٹی ہو' مجھے خوشی ہے' اس مہم میں تم نے ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا۔"

○☆○

پھر وہ مہربان رات آ ہی گئی جو ہمارے لیے ماں کی آغوش کے مانند تھی۔ آج رات میرے سینے میں بھڑکتا ہوا انتقام کا الاؤ سرد ہونے والا تھا۔ میں اور جوگیندر اسی رات لکھنؤ چھوڑ دینے کا فیصلہ کر چکے تھے۔ آج ہی رات ہمیں کیتھی سے فاطمہ کا انتقام لینا تھا۔ ہریر شاد سے رخصت ہو کر ہم رات کی تاریکی میں باہر آ گئے۔

ہم اس وقت اسلحہ سے خاصے لیس تھے۔ ہمارے پاس چار پستول تھے' چاروں میں گولیاں بھری ہوئی تھیں۔ اسی کے ساتھ ہمارے پاس فالتو راؤنڈز بھی تھے۔ جوگیندر کے پاس ایک تھیلے میں چھے دستی بم تھے۔ ہم بٹلر ہاؤس کی طرف بڑھتے رہے۔ ابھی ہم ایک موڑ پر کھڑے ہی تھے کہ دو سپاہی ہمارے سامنے آ گئے۔ وہ ہمارے پاس سے گزر گئے۔ ہم دیوار سے چپک کر بے حس و حرکت ہو گئے تھے۔ آس پاس کہیں کوئی اور شخص نہیں تھا پھر ہم ان سپاہیوں کے پیچھے روانہ ہو گئے اور پھر انہیں پستول سے دھمکا کر ایک طرف لے چلے۔ تھوڑے ہی فاصلے پر ایک مسجد تھی جس کے پہلو میں کنواں بنا ہوا تھا۔ کنویں کے پیچھے املی کا گھنا پیڑ تھا۔

جان کس کو پیاری نہیں ہوتی! وہ خاموشی سے وہی کرتے رہے جو ہم ان سے کہہ رہے تھے۔ ہم نے ان کی وردیاں اتروالیں اور ہاتھ پیر باندھنے کے ساتھ منہ میں کپڑا ٹھونس دیا۔ تب ہم نے اپنے کپڑے اتار کر ان کی وردیاں پہن لیں۔ انھیں کنویں میں لٹکا کر ہم بٹلر ہاؤس کی طرف روانہ ہو گئے۔ اب فوری طور پر ہمیں کوئی خطرہ نہیں تھا۔ رات کی تاریکی میں ہمیں اپنی وردی سے سپاہی سمجھا جاتا۔

بٹلر ہاؤس کے جس حصے میں کیتھی مقیم تھی' اب ہمارے سامنے تھا۔ اس طرف حفاظتی انتظامات غیر معمولی ہی نظر آئے۔ گیٹ پر مسلح سپاہی موجود تھے۔ ہم ادھر سے گزرتے ہوئے مشرق کی سمت میدان کی طرف بڑھتے چلے گئے۔ کونے پر بنے ہوئے مچان پر ایک مسلح فوجی پہرا دے رہا تھا۔

میں نے گزرتے ہوئے اسے دیکھ کر ہاتھ ہلایا۔ اس نے نیچے دیکھ کر ہماری طرف ہاتھ ہلایا اور پھر اپنی جگہ مستعد کھڑا ہو گیا۔ اب ہم نسبتاً تاریکی میں تھے۔

"آج تو بہت زیادہ چوکسی ہے" میں نے جوگیندر سے دھیمی آواز میں کہا "گزشتہ مرتبہ جب ہم داخل ہوئے تھے تو ایسا نہیں تھا۔"

اس وقت ہم ایک درخت کے نیچے سے گزر رہے تھے کہ درخت پر سے ٹارچ کی روشنی چمکی گئی۔

"کون ہے!؟" میں نے سوال کیا' ساتھ ہی ٹارچ کی روشنی اوپر ڈالی۔ درخت میں بنے ہوئے مچان پر ایک سپاہی موجود تھا۔

"ٹھیک ہے" اوپر سے کہا گیا۔

"کوئی خاص بات؟" جوگیندر نے پوچھا۔

"ہر طرف سناٹا ہے" جواب ملا اور ہم آگے بڑھ گئے۔

ہم نے بٹلر ہاؤس کا پورا چکر لگا لیا۔ واقعی بہت سخت پہرا تھا' چڑیا پر نہیں مار سکتی تھی۔

"اب کیا کیا جائے؟" میں نے بے چین آواز میں جوگیندر سے کہا "میرے لیے یہ خیال سوہانِ روح ہے کہ فاطمہ کی قاتل اس دیوار کی دوسری طرف موجود ہے اور میں کچھ نہیں کر سکتا" میں واقعی سخت الجھن میں گرفتار تھا۔ گیٹ سے اندر پہنچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ جس درخت پر چڑھ کر کچھ روز پہلے ہم دونوں بٹلر ہاؤس میں داخل ہوئے' اس پر بھی آج پہرا تھا۔

"بس ایک ترکیب ہے" جوگیندر بولا۔ اس وقت ہم پھر اسی درخت کی طرف بڑھ رہے تھے جو مشرقی دیوار کے ساتھ تھا اور جس پر ہمارے اندازے کے مطابق ایک سپاہی موجود تھا۔ جوگیندر نے اچانک مجھ سے پوچھا "تمہارے پاس غلیل ہے؟"

"ہے اور اس کے اسپیشل کارتوس بھی موجود ہیں" میں نے جوگیندر کو بتایا۔

"لاؤ مجھے دو" جوگیندر نے کہا "درخت کے نیچے پہنچ کر تم اس پر ٹارچ کی روشنی ڈال کے بات کرنا۔ اس دوران میں میری کوشش یہی ہوگی کہ تاک کر ایسا نشانہ لگاؤں کہ وہ سپاہی بغیر آواز نکالے ڈھیر ہو جائے۔"

"اگر اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوا؟" میں نے ایک امکانی خطرے کی نشان دہی کی۔

"وہ تو جب تم اس سے بات کرو گے تو معلوم ہو جائے گا" جوگیندر نے جواب دیا "اس وقت یہی ایک ترکیب میری سمجھ میں آئی ہے اگر کوئی اور بھی ہوا تو کچھ اور سوچیں گے۔"

پھر میں چند قدم آگے نکل گیا۔ اب میں اس درخت کے نیچے تھا "سب کچھ ٹھیک ہے؟" میں نے روشنی اوپر ڈال کر پوچھا۔

"ہاں سب ٹھیک ہے" جواب دیا گیا "تمہارا دوسرا ساتھی کہاں ہے؟"

"وہ ذرا پیشاب کرنے بیٹھ گیا ہے" میں نے ہنستے ہوئے کہا "ڈر کے مارے سالے کا پیشاب ہی اترا چلا آرہا ہے۔"

اوپر سے پہلے ہنسی کی آواز ابھری تھی جس کا اختتام ہلکی سی کراہ پر ہوا۔ جوگیندر کا نشانہ واقعی سچا تھا۔ سپاہی آواز نکالے بغیر درخت پر سے نیچے آرہا تھا۔ بھد کی آواز کے ساتھ وہ زمین پر گر چکا تھا۔ اس کے بعد سپاہی کو اچھی طرح باندھ کر جھاڑیوں میں ڈالنا اور رسی کے سہارے مچان پر پہنچنا کوئی مشکل نہیں تھا۔ اس تمام کارروائی میں ہمیں دس منٹ لگے تھے مگر محسوس ایسا ہو رہا تھا جیسے ایک زمانہ بیت گیا ہو۔ اس مچان سے ہم ایک سیڑھی کے سہارے بٹلر ہاؤس میں اتر گئے۔

وسیع و عریض اور خوب صورت لان میں کراٹے کی باڑھ سے روشیں بنائی گئی تھیں۔ باڑھ کے ساتھ ساتھ قطعات کے اندرونی حصوں میں پھولوں کے تختے تھے۔ ہم دونوں پولیس والوں کے مخصوص انداز میں ان روشوں پر بڑھتے رہے۔ صرف ساٹھ ستر گز کے فاصلے پر بٹلر ہاؤس کا مہمان خانہ تھا جس میں کیتھی ٹھہری ہوئی تھی۔

ہم نے چاروں طرف سے گھوم کر گیسٹ ہاؤس کا جائزہ لیا۔ ہم اس عمارت سے دور ہی دور رہتے تاکہ کوئی شخص ہمیں قریب سے نہ دیکھ پائے۔ ہم دراصل یہ دیکھنا چاہتے تھے کہ کیتھی اس وقت گیسٹ ہاؤس کے کس حصے میں ہے۔ اب ہم چکر لگاتے ہوئے گیسٹ ہاؤس کے سامنے والے حصے کی طرف آنکلے تھے کہ کیتھی نظر آگئی۔ وہ ڈرائنگ روم میں چند افراد کے ساتھ بیٹھی ہوئی باتیں کر رہی تھی۔

کیتھی کو دیکھ کر میرے جسم میں جھرجھری سی تو آگئی۔ جوگیندر کو یقیناً میرے جذباتی ہیجان کا اندازہ تھا۔ اس نے اسی لیے میرا شانہ دبا کر مجھے ذرا دیر انتظار کرنے کا اشارہ کیا۔ ہم ٹہلتے ہوئے ادھر سے گزر کر پھر اسی جگہ آگئے جہاں سے بٹلر ہاؤس میں داخل ہوئے تھے۔

"واپسی کے بارے میں کچھ سوچا؟" جوگیندر نے پوچھا۔

"واپسی کے بارے میں؟" میں نے سوالیہ نظروں سے جوگیندر کی طرف دیکھا "کیا یہی راہ مناسب نہیں؟" میں نے اسی سیڑھی کی طرف اشارہ کیا جو درخت پر مچان تک جاتی تھی۔

"ہاں' یہ بھی ہے لیکن ہمیں یہاں سے بہت تیزی کے ساتھ نکلنا ہوگا" جوگیندر بولا۔

"اس احاطے سے نکلنے کے بعد دیکھا جائے گا" میں نے جوگیندر سے کہا۔ اس وقت مجھے جوگیندر کی احتیاط پسندی بالکل نہیں بھائی تھی۔

"دوسری طرف کاریں کھڑی ہیں" جوگیندر کہنے لگا "کیا خیال ہے اگر ہم یہاں سے کسی کار میں فرار ہو جائیں؟"

"یہ ہو سکتا ہے" میں بولا "لیکن دھماکا ہوتے ہی کیا ایک دم گیٹ بند نہیں کر دیا جائے گا؟"

"اوّل تو اس افراتفری میں کوئی شخص بھی فوری طور پر کسی فیصلے کے قابل نہیں ہوگا پھر بھی اگر ایسا ہوا تو ہماری یہ وردیاں کام آئیں گی" جوگیندر نے جواب دیا "میرا تو خیال ہے ہمیں یہی کرنا چاہیے۔"

اسی وقت اس پیڑ پر نیچے سے ٹارچ کی روشنی پھینکی گئی جس کے ذریعے ہم بٹلر ہاؤس کے احاطے میں داخل ہوئے تھے۔ اسی کے ساتھ ایک آواز بھی ابھری۔ "پریم پال! کہاں ہو تم؟"

آواز دینے والے نے شاید اس سپاہی کو آواز دی تھی جو اس مچان پر پہرا دے رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور ٹارچ کی روشنی مچان پر پڑی پھر اچانک سیٹیاں گونج اٹھیں۔ گویا ہمارے فرار کی یہ راہ مسدود ہو چکی تھی۔ میں نے جوگیندر کا بازو پکڑا اور ہم دونوں تیزی کے ساتھ وہاں سے ہٹ گئے۔ سیٹیوں کی آواز کے ساتھ ہی ہر طرف افراتفری مچ گئی۔ محافظ دوڑ کر اسی سمت آرہے تھے اور ہم گیسٹ ہاؤس کے مغربی پہلو میں پہنچ گئے تھے۔

"تم اپنا کام کرو!" جوگیندر نے کہا "میں کار اسٹارٹ کرتا ہوں۔"

میں نے اپنے تھیلے سے ایک دستی بم نکالا' اس کی سیفٹی پن کھینچی اور اسے گیسٹ ہاؤس کی ایک کھلی ہوئی کھڑکی سے پھینک دیا۔ زبردست دھماکا ہوا۔ میں اس دوران میں دوسرے دستی بم کی سیفٹی پن کھینچ چکا تھا۔ اسی وقت میری نظر ڈرائنگ روم کے سامنے والے برآمدے پر پڑی۔ کیتھی اور اس کے مہمان وہیں دہشت زدگی کے عالم میں موجود تھے۔ دوسرا بم میں نے برآمدے میں اچھال دیا۔ آخری بار لپک کر کار کی طرف بھاگتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا تھا اور میرے دل میں بھڑکتا ہوا الاؤ جیسے ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ دستی بم کیتھی کے سامنے گرا تھا اور پھر کیتھی کے جسم کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ پھر دھماکے سے برآمدے کی چھت نیچے آرہی تھی۔ کیتھی کے مہمانوں میں سے اگر کوئی بم سے زندہ بچ گیا ہوگا تو چھت گرنے سے بچنا محال تھا۔ مجھے کسی اور کی موت زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی۔ مجھے تو کیتھی کی موت سے دلچسپی تھی جسے میں نے موت کی نیند سلا دیا تھا۔ فاطمہ کو تو خیر قبر کی آغوش میسر آگئی تھی مگر کیتھی کے نصیب میں یہ بھی نہیں تھا۔ اس کا جسم ٹکڑوں ٹکڑوں میں تبدیل ہو کر گوشت کے لوتھڑوں کی صورت میں بکھر گیا تھا۔

جوگیندر دھماکوں کے شور اور لوگوں کی چیخ و پکار کے درمیان ایک کار اسٹارٹ کر چکا تھا۔ گیسٹ ہاؤس میں ایک قیامت آگئی تھی۔ دھماکوں سے تباہ ہونے والی عمارت سب کی توجہ کا مرکز تھی۔ کار تیزی سے گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہی خطرہ سامنے آچکا تھا جس کا تذکرہ میں نے جوگیندر سے کیا تھا۔ گیٹ پر دو فوجی موجود تھے۔ وہ دونوں گیٹ کے ایک ایک کواڑ کو دھکیل کر بند کر رہے تھے۔ جوگیندر نے کار کی رفتار بڑھا دی۔

"گیٹ کھولو۔ گیٹ کھولو!" جوگیندر زور سے چیخا "میجر نے ڈاکٹر بلانے کو کہا ہے۔ مس کیتھی زخمی ہیں۔"

دونوں فوجی متذبذب کھڑے تھے۔

"جلدی کرو گیٹ کھولو!"

"تم کون ہو؟" ایک فوجی نے پوچھا۔

اسی وقت دوسرے فوجی نے پہلو میں لگا ہوا پستول نکالنے کی کوشش کی تھی مگر اس سے پہلے میں اپنے پستول سے گولی چلا چکا تھا۔ جوگیندر نے دوسرے فوجی کو نشانہ بنایا تھا پھر میں نے کار سے اتر کر گیٹ کا جو ایک پٹ بند ہو چکا تھا' کھول دیا۔ جوگیندر نے کار کو گیٹ سے نکالا۔ میں لپک کر کار کے دروازے سے کار میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت عقب سے دوڑتے قدموں کی آواز آئی۔ وہ کئی افراد تھے۔

"ہالٹ!" ادھر سے کہا گیا پھر گولیاں سنسناتی ہوئی آئیں مگر اس وقت تک کار گیٹ سے مڑ کر ہوا ہو چکی تھی۔

O☆O

فیکٹری کی تباہی کے لیے منتخب کیے جانے والے تمام سرفروش مستقر میں جمع تھے۔ ہماری تعداد نو تھی' یعنی میں' مندر' نیچو' حیدر علی' سراج الدولہ' طارق' سوشیلا' بخت خاں اور اعجاز! بخت خاں اب صحت یاب ہو چکا تھا۔ اعجاز ہمارا ایک نیا ساتھی تھا۔ ہمارے علاوہ خالد اور مجاہد اوّل بھی موجود تھے۔

مجاہد اوّل اس وقت بھی حسب معمول اپنے مخصوص لباس میں تھا اور چہرہ سیاہ نقاب میں چھپا ہوا تھا۔ مجاہد اوّل نے تمام افراد پر ایک نظر ڈالتے ہوئے کہا "کیا پوری ٹیم موجود ہے" تھوڑی دیر خاموشی رہی پھر مجاہد اوّل نے گفتگو شروع کی "فیکٹری کی تباہی کے لیے تم لوگوں نے جو منصوبے پیش کیے تھے' میں نے ان سب کا جائزہ لے لیا ہے۔ اس جائزے کے بعد ہم نے آخری منصوبہ بنایا ہے جس میں تمام منصوبوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے۔ یہ تمام منصوبے اس لیے ناقص تھے کہ تم لوگوں کو نہ تو مکمل معلومات حاصل تھیں' نہ تازہ ترین حالات کا علم تھا۔ تازہ ترین حالات یہ ہیں کہ اس فیکٹری میں کام شروع ہو گیا ہے۔ جرمن سائنس داں ڈاکٹر شٹ یہیں موجود ہے۔ یہاں ترک اور جرمن جنگی قیدیوں کی تعداد سو کے قریب ہے۔ انگریز فوجیوں کی تعداد تیس سے چالیس کے درمیان رہتی ہے پھر سب سے اہم بات یہ ہے کہ نیچو اور طارق کی رسائی اس فیکٹری تک ہو گئی ہے۔ وہ کچن کے لیے تقریباً روزانہ ہی سامان لے کر فیکٹری جاتے ہیں۔ اس آمد و رفت کے نتیجے میں جرمن سائنس داں ڈاکٹر شٹ سے بھی ان کے تعلقات پیدا ہو گئے ہیں۔ ان ترک اور جرمن قیدیوں سے بھی ان کی جان پہچان ہو گئی ہے جو کچن میں کام کرتے ہیں۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ ڈاکٹر شٹ ہماری مدد کے لیے تیار ہو گیا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ جو خطرناک بم اب تک تیار ہو چکے ہیں' یہاں سے لے جانے سے پہلے ہی تباہ کر دیے جائیں۔"

یہ واقعی اہم باتیں تھیں اور ان سے ہم اپنے منصوبے کو زیادہ مؤثر بنا سکتے تھے۔

"ہم نے جو منصوبہ تیار کیا ہے' اس میں ان تمام باتوں سے فائدہ اٹھایا گیا ہے" مجاہد اوّل نے بتایا اور عمارت کی ایک دیوار پر چاک سے نقشہ بنا کر اپنے منصوبے کی تفصیلات بیان کرنا شروع کر دیں۔

یہ اس مربوط فیکٹری کی مکمل تباہی کا منصوبہ تھا جو دو حصّوں پر مشتمل تھا۔ چار افراد کی ایک پارٹی کو خالد کی قیادت میں جوشی مٹھو کی طرف سے کانوں اور سرنگ کے دہانے پر یلغار کرکے سرنگ کے راستے ہم سے آملنا تھا۔ دوسری پارٹی کو جس میں سات افراد شامل تھے اصل فیکٹری پر یلغار کرنا تھی۔ اس کی قیادت خود مجاہد اوّل نے اپنے ذمّے لی تھی۔ اس پارٹی کو دو حصّوں میں منقسم ہوکر اپنا کام کرنا تھا۔ ایک حصّے کا سربراہ میں تھا' دوسرے کا جوگیندر۔

"آج سے ٹھیک پندرہ دن بعد۔" مجاہد اوّل نے کہا "ہم یہ فیکٹری مکمل طور پر تباہ کرچکے ہوں گے۔"

باہر موسم کی پہلی برف باری کے آثار ہویدا تھے۔ ہوا بہت سرد اور تیز تھی۔ شام ہی کو ژالہ باری ہوئی تھی۔

پھر وہ پندرہ دن بھی گزر ہی گئے۔

تمام ماحول برف کی سفید چادر اوڑھے رات کی خاموشی میں جیسے دم سادھے ہوئے تھا۔ وہ چاند کی چودھویں رات تھی۔ میں اپنے ساتھیوں اور طارق کے ساتھ سفید لباس پہنے اس غار سے نکلا جو گلاب کوٹی کے محاذ پر ہماری آخری چوکی کا کام دے رہا تھا۔ اس مہم کے لیے ہمارے دستے نے سفید لباس پہن رکھے تھے تاکہ سفید پس منظر میں ہماری نقل و حرکت نہ دیکھی جاسکے۔ حد تو یہ ہے کہ اس دن مجاہد اوّل نے شاید پہلی مرتبہ اپنے مخصوص سیاہ لباس کے بجائے سفید لباس پہنا تھا۔ اس کے چہرے پر بھی سفید نقاب تھی۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ ابھی پانچ منٹ باقی تھے۔ پانچ منٹ بعد جوگیندر اپنی پارٹی کے ساتھ یقیناً نیچے پہاڑ کے دامن میں قیدیوں اور انگریز محافظوں کی بیرکوں کے آس پاس پہنچ جاتا پھر پوزیشن لیتے ہی اسے اپنے چند ساتھیوں سمیت انگریز محافظوں کی بیرک پر دستی بم پھینکنا تھے۔ اس ہنگامے اور افراتفری کے دوران میں ٹیپو کو رائفلوں کے بوجھ کے ساتھ خاردار تاروں کی باڑھ سے گزر کر جرمن اور ترک قیدیوں کی بیرکوں میں پہنچنے کے بعد انہیں رائفلیں اور کارتوس فراہم کرنا تھے پھر ان قیدیوں کو بھی ہمارا ساتھ دینا تھا۔ اس ہنگامے کے دوران میں ان تین محافظوں کا بھی خاص خیال رکھا جانا تھا جو احاطے کے باقی تین کونوں پر بنے ہوئے مچانوں پر متعین تھے کیوں کہ پہلے کونے پر متعین پہرے دار کو تو پہلے ہی حملے میں نشانہ بنایا جانا تھا۔ ٹھیک اسی وقت جوشی مٹھو کی کانوں کی سمت سے خالد اور اس کے ساتھیوں کو اپنی کارروائی شروع کرنا تھی۔

مجھے بھی ٹھیک اسی وقت طارق کے ساتھ حرکت میں آجانا تھا۔ پہلے دھماکے کے ساتھ ہی خام مال لے جانے والی لفٹ جیسی ٹرالی کو پہاڑ کی کوکھ میں زیرِ زمین بنی ہوئی فیکٹری سے اوپر آنا تھا۔ ڈاکٹر شمٹ نے یقین دلایا تھا کہ وہ اور اس کے چند ساتھی اس ٹرالی میں ایسی خرابی پیدا کردیں گے جس کی وجہ سے خام مال اوپر سے نیچے آنا بند ہوجائے گا اور خطرناک قسم کے بموں کی تیاری رک جائے گی۔ انگریز اتنے پاگل ہو رہے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کوئی تاخیر برداشت نہیں کریں گے۔ وجہ یہ ہے کہ انہیں ایک ہفتے بعد مقررہ تعداد میں یہ بم تیار کرکے رائل کمیت بھیجنا تھے۔ جہاں سے ان بموں کو کہیں اور بھیجا جانا تھا۔ کام رک جانے کی صورت میں بموں کی تیاری میں مصروف شفٹ کے قیدیوں کو بھی بیرکوں کے اندر بھیج دیا جاتا تھا۔ ڈاکٹر شمٹ کو چند ساتھیوں سمیت فیکٹری میں رہ کر ہی ٹرالی کی مرمت کرنا تھی۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ پہلے دھماکے کے بعد ہی وہ ٹرالی کو اوپر بھیج دے گا۔

پانچ منٹ بعد ہی تباہی کی یہ مشینری حرکت میں آگئی۔ فضا میں ایک سنسناہٹ ابھری یا پھر یہ سنسناہٹ صرف میرے کانوں میں ابھری تھی۔ میں زمین دوز فیکٹری کے اوپر ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں طارق کے ساتھ موجود تھا۔ ہماری نظریں سامنے اس مچان پر لگی ہوئی تھیں جس کے نیچے فیکٹری میں اترنے والی لفٹ جیسی ٹرالی کی حرکت کے لیے کنواں بنا ہوا تھا۔ اس ٹرالی سے ایک طرف پہاڑ میں موجود کان سے خام مال کھود کر نیچے پہنچایا جاتا تھا۔ کان کا دہانہ اس ٹرالی کے نظام سے پچاس ساٹھ گز کے فاصلے پر تھا۔ میں اور طارق کان کا پہلے ہی جائزہ لے چکے تھے' وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا۔

اب میں اور طارق نیچے پہاڑ کے دامن میں پہلے دھماکے کی آواز کے منتظر تھے پھر ہمارے کانوں نے وہ آواز سن ہی لی۔ پہلے دھماکے کی خوشگوار آواز کے بعد ہی پے درپے کئی دھماکے ہوئے مگر میرے کان مچان کے نیچے بنے ہوئے کنوئیں میں ٹرالی کے کھسکنے کی آواز پر لگے ہوئے تھے۔

ہماری توقع کے عین مطابق ٹرالی کے قریب بنے ہوئے مچان پر متعین محافظ چونک کر نیچے اترا تھا اور میری رائفل کی نکلی ہوئی گولی نے اسے لاش میں تبدیل کردیا تھا۔ میں اور طارق اگلے لمحے دوڑتے ہوئے مچان کے نیچے پہنچے۔ ٹرالی اوپر آچکی تھی اور ہمیں نیچے لے جانے کی منتظر تھی۔

پھر ہم تیزی سے خام مال لے جانے والی ٹرالی میں سوار ہوگئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم زمین دوز فیکٹری میں اتر رہے تھے۔ نیچے پہاڑ کے دامن میں ابھرنے والا شور اب ہمارے

کانوں تک نہیں پہنچ رہا تھا۔ کنویں سے گزر کر ٹرالی اس زمین دوز ہال میں پہنچ گئی جہاں فرش پر اسے ٹھہرنا تھا۔ میں نے نیچے دیکھا۔ ڈاکٹر شمٹ اور اس کے دو ساتھی' دو انگریز محافظوں سے الجھے ہوئے تھے۔ میں نے پستول نکالا اور ٹھیک اس وقت گولی چلادی جب ان میں سے ایک محافظ ڈاکٹر شمٹ کو دھکا دے کر رائفل سیدھی کرچکا تھا۔ انگریز محافظ گولی کھاکر الٹ گیا۔ اس کے ہاتھ سے رائفل گر گئی۔ دوسرا انگریز محافظ بھی اسی انجام سے دوچار ہوا تھا۔ اسی دوران میں ٹرالی فرش پر پہنچ کر رک چکی تھی۔ ہم دونوں اچھل کر ٹرالی سے نکلے۔ اسی وقت دھائیں کی ایک آواز ہوئی۔ ایک سیٹی سی میرے کان کے پاس سے گزر گئی پھر دوسرا دھماکا ہوا اور میرے الٹے بازو میں آگ اتر گئی۔ میں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ انگریز محافظ جو میری پہلی گولی سے زخمی ہوا تھا' سرنگ کی دیوار سے ٹکا بیٹھا تھا اور اس کی رائفل میری طرف اٹھی ہوئی تھی۔ اسے تیسری گولی چلانے کا موقع نہیں مل سکا۔ طارق کے پستول سے نکلی ہوئی گولی نے اسے دوسری دنیا کی سیر کرادی تھی۔

اس عرصے میں ڈاکٹر شمٹ کے دونوں ساتھی' انگریز محافظوں کی رائفلوں پر قبضہ کرچکے تھے۔ ان کے علاوہ ہم بھی پانچ رائفلیں اور کافی گولیاں ایک لمبے سے تھیلے میں لائے تھے۔ ڈاکٹر شمٹ نے ایک انگریز محافظ کی کمر سے ایک پٹی کھول کر میری گردن میں ڈال دی تھی اور میرا زخمی بازو اس پٹی کے حلقے میں ڈال دیا تھا۔

"تم میں سے ایک۔۔۔" میں نے ڈاکٹر شمٹ کے ایک ساتھی سے کہا "کانوں کی طرف آنے والے راستے کے دہانے پر جم جاؤ اگر اس طرف سے کوئی انگریز محافظ ادھر آئے تو بلادریغ اسے گولی ماردینا۔ ویسے اس کی امید نہیں۔"

پھر میں' ڈاکٹر شمٹ' اس کے ساتھی اور طارق کے ہمراہ سرنگ کے دہانے کی طرف بڑھ گیا۔ دہانہ پہاڑوں کے دامن میں اس طرف کھلتا تھا جہاں جوگیندر اور اس کے ساتھی مصروفِ جنگ تھے۔

دو دستی بموں سے سرنگ کے دہانے پر لگا ہوا آہنی جنگلا ٹوٹ گیا۔ ان دھماکوں کی آواز زیرِ زمین تعمیرات کی دیواروں میں دیر تک گونجتی رہی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم سرنگ کے دہانے پر تھے۔

جرمن اور ترک جنگی قیدی' جوگیندر کی پارٹی کے لائے ہوئے اسلحے سے جنگ کررہے تھے۔ انگریز محافظ اپنی بقا کی جنگ لڑرہے تھے اور ابھی بہرحال کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ فاتح کون ہوگا' مفتوح کون!

سرنگ کا گیٹ ٹوٹنے کے ساتھ ہی ترک اور جرمن قیدیوں کے ساتھ ہم نے اپنے ساتھیوں کے پُرجوش نعرے سُنے۔ ان کی طرف سے فائرنگ میں شدت آگئی۔ دوسری طرف سے انگریز محافظوں نے بھی فائرنگ تیز کردی۔ اس فائرنگ کے درمیان زخمی ہونے والوں اور مرنے والوں کی چیخیں بھی ابھر رہی تھیں۔

ہم پانچوں سرنگ کے ٹوٹے پھوٹے گیٹ سے ذرا فاصلے پر سرنگ کی دیوار سے چپکے کھڑے تھے پھر ڈاکٹر شمٹ کے اشارے پر اس کے دو ساتھی فرش پر رینگتے ہوئے گیٹ سے باہر پہنچے ہی تھے کہ پے درپے کئی گولیاں چلیں اور وہ دونوں سرنگ کے باہر ہی الٹ گئے۔

"ایک!" قیدیوں کی بیرک سے ایک آواز ابھری۔ ابھی یہ آواز ختم ہی ہوئی تھی کہ دستی بموں کے پے درپے تین دھماکے ہوئے۔ یہ دھماکے انگریز محافظوں کی بیرک میں ہوئے تھے۔ میں' طارق اور ڈاکٹر شمٹ فرش سے چپک کر کھسکتے ہوئے سرنگ سے باہر آئے اور لپک کر ایک بڑی سی چٹان کی آڑ میں ہوگئے۔

ترک اور جرمن قیدیوں کا ایک دستہ فائر کرتا ہوا۔ انگریز محافظوں کی بیرک کی سمت بڑھ رہا تھا۔ ان کے عقب سے بھی ترک فوجی بیرک سے مسلسل فائر کررہے تھے۔ انگریز محافظ جو دستی بموں کے دھماکوں سے پریشان ہوکر رہ گئے تھے پھر سنبھل چکے تھے اور انہوں نے یلغار کرنے والے قیدیوں پر فائرنگ شروع کردی تھی۔

"سیکنڈ کمپنی اٹیک!" قیدیوں کی بیرک سے پھر کاشن ابھرا۔ اس کے ساتھ ہی محافظوں کی بیرک پر دستی بموں کی بارش ہوگئی۔ قیدیوں کا ایک اور دستہ نعرے لگاتا ہوا انگریز محافظوں کی بیرک کی طرف بڑھا۔

اسی وقت انگریز محافظوں کی بیرک سے تین فائر ہوئے اور بیرک کی ٹوٹی ہوئی چھت سے آگے پیچھے تین روشن لکیریں آسمان کی بلندیوں میں پہنچ کر گم ہوگئیں۔ انگریز محافظوں نے شاید یہ آتشی فائر اپنے ساتھیوں کو خطرے کی اطلاع دینے اور مدد طلب کرنے کے لیے سگنل کے طور پر کیے تھے۔ اس کے سوا ان فائروں کا کوئی اور مقصد نہیں ہوسکتا تھا۔ آسمان کی بلندیوں پر پہنچنے والی یہ روشن لکیریں بہت تیز تھیں۔

لڑائی بہت زوروں پر تھی۔ میں نے دائیں طرف دیکھا۔ ڈاکٹر شمٹ اپنی جگہ نہیں تھا۔

"طارق!" میں نے کہا "ڈاکٹر شمٹ کہاں گیا؟"

محافظوں اور قیدیوں کی بیرکوں کے درمیان برف سے ڈھکے ہوئے میدان میں کئی افراد مردہ پڑے ہوئے تھے۔ کئی افراد فائرنگ کرتے ہوئے محافظوں کی بیرک کی طرف کھسک رہے تھے۔ اسی وقت پھر دستی بموں کے دھماکے ہوئے۔

دستی بموں کے دھماکے کے بعد دو اور دھماکے ہوئے۔ اس کے ساتھ ہی ڈاکٹر شمٹ کی تیز آواز ابھری۔ "انگریزوں کی بیرک سے دور رہو!۔۔۔ انگریزوں کی بیرک سے دور ہٹ جاؤ!۔۔۔ دور ہٹ جاؤ!"

ڈاکٹر شمٹ کی آواز جوگیندر نے بھی سن لی تھی اور یلغار کرنے والے بعض قیدیوں نے بھی! انھوں نے اسی لیے بلند آواز میں ڈاکٹر شمٹ کا پیغام دہرایا۔ ذرا دیر میں یہ پیغام ہر طرف گونج گیا۔ پیش قدمی کرنے والے قیدی پسپا ہونے لگے۔

انگریزوں کی طرف سے مزاحمت ختم ہوگئی۔ اس دوران میں کئی انگریز محافظوں نے بیرک سے نکلنے کی کوشش کی لیکن وہ سب گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ انگریز فوجیوں کی مزاحمت دم توڑ چکی تھی۔

شمٹ میرے پاس واپس پہنچ چکا تھا۔

نصف گھنٹے کے بعد ہم سب مل کر زخمیوں اور مرنے والوں کا شمار کر رہے تھے۔ ڈاکٹر شمٹ اور مجاہد اوّل سرنگ کے اندر باتوں میں مصروف تھے۔

اس یلغار میں تمام انگریز محافظ جن کی تعداد چالیس تھی، کام آگئے تھے۔ سینتیس ترک اور جرمن قیدی مارے گئے تھے، پندرہ شدید زخمی ہوئے تھے۔ ہمارے ساتھیوں میں سراج الدولہ شہید ہوا تھا۔ بہرحال ہماری کوشش کامیاب رہی تھی۔ فیکٹری پر اب ہمارا قبضہ تھا۔

ترک اور جرمن قیدی اب ایک منظم اور مسلح فوجی یونٹ کی صورت میں مستعد تھے۔ خود کار نظام کی طرح وہ جرمن کرنل شولز کی کمان میں اس طرح سرگرم تھے جیسے کوئی فوج قلعے میں محصور ہو کر ایک جنگی پلان کے مطابق اپنی سرگرمیوں میں مصروف ہو۔ اسی دوران میں تمام زخمیوں کی مرہم پٹی کی جا چکی تھی۔ میں بھی ان میں شامل تھا۔ اس کام میں سوشیلا بھی پیش پیش تھی۔

تھوڑی ہی دیر میں مجاہد اوّل اور ڈاکٹر شمٹ دو گہرے دوستوں کی طرح کمرے سے نکل آئے۔ ہم سب لوگوں کی نظریں ان کی طرف اٹھ گئیں۔

"دوستو!" ڈاکٹر شمٹ نے کہا "میں تمہارا تعارف ہندوستان کے ایک عظیم مجاہد سے کرا رہا ہوں۔" یہ کہہ کر اس نے مجاہد اوّل کا تعارف مختصر مگر مؤثر انداز میں کرایا۔ "مجاہد اوّل اور اس کے ساتھیوں کا مقصد اس ہولناک فیکٹری کو تباہ کرنا تھا۔ اسی مقصد کے تحت اس کے ساتھیوں نے ہم سے رابطہ قائم کیا تھا۔ میں نے وعدہ کیا ہے کہ اب اس فیکٹری کی مکمل تباہی کا کام ہم کریں گے۔ ہمیں یہ فیکٹری اس طرح تباہ کرنا ہے کہ انگریز اسے دوبارہ استعمال نہ کر سکیں۔ انگریز فوجیوں نے اپنی ہلاکت سے قبل خطرے کا سگنل دیا تھا۔ اس کے بعد ادھر فوجی کمک آنا لازمی ہے لیکن برف باری کی وجہ سے یہ کمک یہاں سات آٹھ گھنٹے سے قبل نہیں پہنچ سکتی۔ اسی مدت میں ہمیں اس تمام شیطانی نظام کو مکمل طور پر تباہ کرنا ہے۔ اس فیکٹری کی تباہی کے لیے مجاہد اوّل کے ساتھیوں نے آس پاس دو مقامات پر بارود، ڈائنامائٹ اور متعلقہ سامان ذخیرہ کر رکھا ہے۔ وہ مقامات تمہیں دکھا دیے جائیں گے۔ کرنل شولز اس پلان کے انچارج ہوں گے۔" یہ کہہ کر ڈاکٹر شمٹ خاموش ہوگیا۔

پھر مجاہد اوّل نے مختصر سی تقریر میں ترک اور جرمن قیدیوں کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ اس فیکٹری کی مکمل تباہی ہندوستان، ترکی اور جرمنی کے اتحاد کی علامت بن کر تاریخ کے صفحات میں درج ہوگی۔ مجاہد اوّل کی مختصر سی تقریر کے خاتمے پر فضا ترک جرمن اور ہندوستان کی دوستی زندہ باد کے نعروں سے گونج اٹھی۔

"ٹیپو! طارق!" مجاہد اوّل کی آواز گونجی "تم دونوں کرنل شولز کو وہ غار دکھاؤ گے جہاں ہم نے فیکٹری کی تباہی کے لیے دھماکا خیز سامان کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔"

یہ حکم سنتے ہی ٹیپو اور طارق، کرنل شولز کی طرف بڑھ گئے۔ کام شروع کرنے سے قبل جرمن قیدیوں نے سب لوگوں کو گرما گرم کافی پلوائی اور پھر وہاں ایک سرگرمی شروع ہوگئی۔ کرنل شولز اس دوران میں ایک میز پر بیٹھا تیزی سے کاغذوں پر اپنا پلان مرتب کر رہا تھا۔ اس کام میں تین ترک اور جرمن فوجی اس کی مدد کر رہے تھے۔

اس نے اپنے ساتھیوں کے تین گروپ بنائے تھے۔ دو گروپوں کو ٹیپو اور طارق کے ساتھ ان غاروں سے تباہی کا سامان فیکٹری میں منتقل کرنا تھا۔ ان میں سے ایک غار گلاب کوٹی کی طرف، دوسرا جوشی مٹھ کی سمت تھا۔ تیسرے گروپ کے سپرد فیکٹری میں تباہی کی تیاریاں مکمل کرنا تھا۔

میں، جوگیندر اور سوشیلا کے ساتھ ایک میز کے ساتھ پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھا تھا۔ ٹیپو اور طارق دو پارٹیوں کو لے جا چکے تھے پھر میں نے ڈاکٹر شمٹ کو کرنل شولز

کے ساتھ بیرک سے نکل کر فیکٹری کی طرف جاتے دیکھا۔ بیرک اب خالی ہو چکی تھی۔ صرف دو جرمن اور ترک قیدی بیرک کے باہر پہرے پر موجود تھے۔ مجاہد اوّل، ڈاکٹر شمٹ اور شولز کو بیرک کے برآمدے میں چھوڑ کر واپس آگیا۔

"کہو دوستو!" مجاہد اوّل نے کہا "کیسا رہا؟"

"بہت سنسنی خیز!" سوشیلا بولی۔

"سراج الدولہ۔۔۔" جوگیندر نے کہنا چاہا۔

"ہاں سراج الدولہ!" مجاہد اوّل دکھ بھرے لہجے میں بولا "ہمارے دلوں کے قبرستان میں اپنے ایک اور ساتھی کی قبر کا اضافہ ہوگیا ہے۔ ایک اور گمنام مجاہد آزادی کی راہ میں کام آگیا۔ ہمارے دل، ہمارے جسم غلامی سے بنجر ہو جانے والی اس سرزمین میں کھاد بن کر اس دیس کی سرزمین کا بانجھ پن ختم کریں گے اور اسے وہ زرخیزی عطا کریں گے جس سے آزادی کی کھیتیاں لہلہا اٹھیں گی۔"

"اب ہمارا کام کیا ہے؟" جوگیندر نے پوچھا۔

"ہمیں اب یہاں سے واپس چلنا ہے۔ چیل کوٹی اور گلاب کوٹی کے راستے رانی کھیت یا کاٹھ گودام پہنچنا اب خطرے سے خالی نہیں ہے" مجاہد اوّل نے جواب دیا "پھر ہم سب ایک ساتھ واپس بھی نہیں چل سکتے۔ ہمیں یہاں سے ٹکڑیوں میں واپس جانا ہوگا۔"

"خالد اور اس کے ساتھی؟" میں نے سوال کیا۔

"انہیں یہ ہدایت تھی کہ وہ اپنا کام مکمل کرنے کے بعد ہماری طرف سے پہلا رابطہ قائم ہوتے ہی اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کریں۔ وہ اس وقت جوشی مٹھ کی سمت اس غار میں موجود ہوں گے جہاں ہم نے دھماکا کرنے والی اشیا کا ذخیرہ کر رکھا ہے۔۔۔ میں نے طارق کو ہدایت کر دی ہے کہ وہ خالد کو وہاں سے نکل جانے کے لیے کہہ دے۔ طارق، شولز کی ایک پارٹی لے کر اسی طرف گیا ہے" مجاہد اوّل نے بتایا۔

"اور یہ جرمن اور ترک قیدی؟" یہ بھی میں نے ہی دریافت کیا۔

"یہ لوگ فیکٹری کو تباہ کرنے کے بعد تبت، سنکیانگ اور کاشغر کے راستے فرار ہو کر ترکی پہنچنے کی کوشش کریں گے" مجاہد اوّل بولا "صفدر! (جوگیندر کا تنظیمی نام) ٹیپو کے واپس آتے ہی تم، سوشیلا اور ٹیپو یہاں سے واپس ہو لو گے۔ تمہیں یہاں سے مسوری پہنچنا ہے جہاں سے تم دہرہ دون پہنچو گے۔ ٹیپو اس علاقے سے خوب واقف ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم صحیح سلامت مسوری پہنچو گے۔"

"مگر جناب، میں اس فیکٹری کو تباہ ہوتے دیکھنا چاہتا ہوں" جوگیندر نے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔

"فیکٹری کی تباہی چھ سات گھنٹے سے پہلے ممکن نہیں" مجاہد اوّل نے کہا "اس دوران میں ہمیں یہاں سے دور نکل جانا ہے۔ ہمیں معلوم نہیں ہے کہ امدادی سگنل ملنے پر انگریز کس پیمانے پر کارروائی کریں گے۔"

"مگر ہم اس فیکٹری کی تباہی کے بعد بھی تو نکلنے کی کوشش کر سکتے ہیں" سوشیلا بول اٹھی۔

"تم اگر ساتھ نہ ہوتیں تو شاید میں یہ بات مان لیتا" مجاہد اوّل کہنے لگا "میں اپنے بیٹوں کا غم برداشت کر سکتا ہوں۔ میں نے اپنے متعدد بیٹوں کے غم برداشت کیے ہیں لیکن فاطمہ کے بعد۔۔۔ اس کے بعد میں اپنی کسی اور بیٹی کا غم برداشت نہیں کر سکتا۔ نہیں میری بیٹی، نہیں! سوشیلا! تمہیں میری بات ماننا ہی پڑے گی۔" اس وقت مجاہد اوّل کا لہجہ اتنا غم ناک تھا کہ ہم بھی اداس ہوگئے تھے۔ فاطمہ کا ذکر ہی ایسا تھا۔

"اور آپ؟" جوگیندر نے مجاہد اوّل سے معلوم کیا۔

"میں اس فیکٹری کی تباہی تک یہیں رہوں گا پھر میں ترک اور جرمن قیدیوں کے ساتھ یہاں سے درہ کامٹ کی طرف جاؤں گا۔ انہیں درہ کامٹ پر چھوڑ کر میں واپس شملے پہنچوں گا۔ تمہارے جانے کے بعد طارق کے ساتھ شاہین لال پہاڑ کی طرف جائے گا۔ اس وقت کسی زخمی کو ہم اس علاقے سے لے جانے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔"

ہم سب خاموش ہوگئے۔ مجاہد اوّل نے جو کچھ کہا تھا، قطعی اور فیصلہ کن انداز میں کہا تھا۔ اس پروگرام میں کسی ردوبدل کی گنجائش نہیں تھی لیکن ہم تینوں مجاہد اوّل کے اس فیصلے سے مایوس ہوئے تھے کیوں کہ ہم تینوں ہی اس فیکٹری کو اپنی آنکھوں سے تباہ ہوتے دیکھنا چاہتے تھے۔

"ایک اہم بات اور سنو! یہ بات اس پارٹی میں صرف تم تینوں ہی کو بتائی جا رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ تم یہ بات کسی اور کو نہیں بتاؤ گے" مجاہد اوّل نے چند لمحے توقف کیا پھر بتانے لگا۔ "میں نہیں جانتا کہ میری واپسی کب تک ہوگی۔ مزید ہدایات کے لیے اگر تمہیں تنظیم کے سرکردہ لوگوں سے رابطے کی ضرورت محسوس ہو تو دہلی کے نیشنل ٹریڈرز کی معرفت خالد کو خط لکھ دینا۔ پورا پتا میں تمہیں ابھی بتاتا ہوں۔ یاد کر لو! یا اس سے مل لینا اگر تم دہلی میں ہو! نیشنل ٹریڈرز گنج میں ہے اور اس کا پوسٹ بکس نمبر چھ سو دس ہے۔ یہ ہماری تنظیم کا ہیڈ کوارٹر بھی ہے اور ہماری تنظیم کے لیے سرمایہ فراہم کرنے کا ذریعہ بھی!"

نصف گھنٹے کے بعد ٹیپو واپس آگیا تھا۔ تھوڑی دیر بعد

ان تینوں کو میں رخصت کر رہا تھا۔ ہم میں سے کسی کو پتا نہیں تھا کہ اب ہم کتنی مدت کے بعد ملیں گے اور ملیں گے بھی یا نہیں! ہم سب کی آنکھیں نم تھیں۔ ان تینوں نے سراج الدولہ کی قبر پر کھڑے ہو کر فاتحہ پڑھی اور چند منٹ کی خاموشی کے بعد روانگی اختیار کی۔ میں انھیں چھوڑنے کے لیے پہاڑی کے اوپر اس جگہ آیا جہاں مچان کے نیچے سامان لے جانے والی ٹرالی کا نظام موجود تھا اور جہاں سے میں طارق کے ساتھ فیکٹری میں اُترا تھا۔

"سنو!" میں نے جوگیندر کو مخاطب کیا "مجھے نہیں پتا کہ ہم اب کب ملیں گے اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہو تو معاف کردینا!" یہی الفاظ میں نے ٹیپو اور سوشیلا سے بھی کہے۔ جواب میں ٹیپو اور جوگیندر نے مجھے گلے سے لگالیا پھر ہم سبھی کی پلکیں بھیگ گئیں۔

میں چٹان پر بنے ہوئے مچان کے پاس کھڑا ہوا ان تینوں کو دور ہوتے دیکھتا رہا۔ جرمن اور ترک فوجی ٹرالی سے دھماکا کرنے والا سامان پہاڑی کی کوکھ میں اُتار رہے تھے۔ تھوڑے تھوڑے فاصلے کے بعد میرے تینوں ساتھی پلٹ کر دیکھتے اور ہاتھ ہلاتے۔ وہ پہاڑی کی بلندی پر چڑھتے چلے گئے۔ ڈھلتے چاند کی دھندلائی ہوئی روشنی میں جھلملاتے برف پر وہ سفید دھبوں کے مانند حرکت کر رہے تھے پھر فاصلوں نے انھیں نگل لیا۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہوگئے۔

"تم لوگ پھر ملوگے؟" مجاہدِ اوّل نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔

"میں وہاں کب تک رہوں گا؟"

"زخم مندمل ہونے تک" مجاہدِ اوّل نے جواب دیا "پھر جب تم ٹھیک ہوجاؤگے تو طارق کے ساتھ شیلانگ پہنچوگے۔"

"شیلانگ!" میں نے حیرت سے کہا "مگر وہ تو بہت دور پڑے گا۔"

"ہاں شیلانگ!" مجاہدِ اوّل بولا "تمھیں صحت یاب ہونے میں تین مہینے تو لگ ہی جائیں گے۔ اس دوران میں برف باری سے راستے بند ہوجائیں گے اور تم اسی علاقے میں پھنس جاؤگے۔ جب تم واپسی کے لیے تیار ہوگے تو شمالی ہند میں ہماری کارروائیاں عروج پر ہوں گی۔ اس وقت اس طرف سے آنا تمھارے لیے مناسب نہیں ہوگا۔"

"آپ سے میری ایک درخواست ہے" میں نے کہا۔

"میں جانتا ہوں" مجاہدِ اوّل بول اٹھا "تم اس فیکٹری کی تباہی کا منظر اپنی آنکھوں سے دیکھ سکوگے" مجاہدِ اوّل واقعی قیافہ شناس تھا۔

جوگیندر وغیرہ چلے گئے تو تقریباً نصف گھنٹے بعد طارق بھی واپس آگیا۔ اس وقت میں کرنل شولز کے پاس ہی کھڑا تھا۔ مجاہدِ اوّل، ڈاکٹر شمٹ سے باتیں کر رہا تھا۔ کرنل شولز نے طارق کے ساتھ واپس آنے والے سے جرمن زبان میں چند باتیں کیں اور ڈاکٹر شمٹ کی طرف بڑھ گیا۔ میں اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

"کہو، تمام سامان ضرورت کے مطابق ہے؟" مجاہدِ اوّل نے کرنل شولز سے پوچھا۔

"آپ لوگوں نے کمال کیا ہے۔ یہ تو اتنا سامان ہے کہ اس جیسی تین فیکٹریاں تباہ کی جاسکتی ہیں۔ ہم اس تمام سامان سے تو یہ فیکٹری سرمہ بنادیں گے۔"

صبح کا ملگجا اندھیرا پھیل چکا تھا۔ فیکٹری کی تباہی کا کام آخری مرحلے میں داخل ہوچکا تھا۔ ڈائنا مائٹ کی چھڑیں اور بارود کے تھیلوں کو مختلف جگہ باندھا جارہا تھا۔ تار پھیلائے جارہے تھے۔ ترک اور جرمنی فوج کے ماہر سپاہی یہ تمام کام نہایت انہماک اور استغراق سے کر رہے تھے۔

اندازے کے مطابق انگریز فوج کی کمک وہاں پہنچنے میں ابھی تقریباً ڈیڑھ گھنٹا باقی تھا کہ کرنل شولز نے کام ختم ہوجانے کی اطلاع دی۔

تمام لوگ تباہ ہونے والی فیکٹری اور سرنگ سے محفوظ فاصلے پر اس جگہ جمع ہوگئے جہاں وہ لیور تھا جس سے کئی تار آکر منسلک ہوئے تھے۔ یہ ایک بلند مقام تھا جہاں سے ہمیں نیچے وہ پہاڑی نظر آرہی تھی جس کے بطن میں وہ خطرناک فیکٹری موجود تھی۔

مجاہدِ اوّل، ڈاکٹر شمٹ اور ایک ترک میجر ناصر بے نے مل کر اس لیور کا ہینڈل ایک طرف کھینچا اور چند لمحوں بعد ہی اس علاقے میں جیسے زلزلہ آگیا۔ پے در پے اتنے ہول ناک دھماکے ہوئے کہ کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔ ان دھماکوں کی ہول ناک آواز وادی میں گونجتی رہی۔ مٹی، پتھر اور برف کا ملا جلا بادل بلند ہوا تھا پھر دیر تک دھویں اور مٹی کا مرغولہ فضا میں بلند رہا تھا۔

اس کے بعد کانوں کو دھماکوں کے ذریعے تباہ کردیا گیا۔

پھر ہم سب وہاں سے تیزی کے ساتھ فیکٹری کی سرنگ کے اس دہانے کی طرف بڑھے تھے جو جوشی مٹھ کی طرف تھا۔ اس طرف کرنل شولز کو صرف اب کانیں تباہ کرنا تھیں جس کا نظام پہلے ہی سے تیار ہوگیا تھا۔

"تم اب یہاں سے سیدھے جوشی مٹھ کی طرف روانہ ہوجاؤگے" مجاہدِ اوّل نے مجھے اور طارق کو ہدایت دی "اب ہمارے ساتھ تمھارا رہنا مناسب نہیں۔"

ہماری اور ان کی راہیں جدا ہوگئیں۔ طارق نے جوشی مٹھ جانے کے لیے طویل اور دشوار گزار راستہ اختیار کیا تھا۔ یہ ایسا راستہ تھا جس پر انگریز فوج کی کمک سے مڈبھیڑ ہونے کی توقع نہیں تھی۔

ہم چلتے رہے۔ اس وقت میرا زخمی ہاتھ بہت تکلیف دے رہا تھا۔ ابھی ہمیں چلتے ہوئے کوئی ڈیڑھ گھنٹا ہوا تھا کہ خاموش پہاڑوں میں دھماکوں کی آواز سنائی دی۔

"وہ کانیں بھی تباہ کردی گئیں" میں نے مسرت سے کہا۔

طارق نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جوشی مٹھ ابھی کافی دور تھا۔ اس کی نگاہیں پہاڑوں کے نشیب و فراز میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"جوشی مٹھ کتنی دور ہے؟" میں نے طارق سے پوچھا۔

"تین گھنٹے کا راستہ ہے" طارق نے بتایا "کیوں کیا ہاتھ میں تکلیف ہو رہی ہے؟"

"اس کی پروا نہ کرو" میں بولا "تم یہاں رُک کیوں گئے؟"

"آرام کرنا چاہو تو یہاں ایک غار ہے" طارق نے کہا۔ "میں سوچ رہا تھا کہ ہمیں یہیں آرام کرنا چاہیے یا آگے جاکر! بات یہ ہے کہ میں تمھیں نے کر رات کے وقت جوشی مٹھ پہنچنا چاہتا ہوں تاکہ لوگوں کو یہ پتا نہ چلے کہ کوئی زخمی جوشی مٹھ آیا ہے۔"

سورج کی تیز چمک برف پر منعکس ہو کر آنکھوں کو خیرہ کیے دے رہی تھی۔ برف باری کی وجہ سے ہمارا راستہ اور بھی دشوار گزار ہوگیا تھا۔ بعض جگہ تو طارق میرا ہاتھ پکڑ کر، مجھے سہارا دے کر آگے بڑھاتا۔ ایسے مواقع پر مجھے اپنا توازن برقرار رکھنے کے لیے اپنے زخمی ہاتھ کو بھی حرکت دینا پڑتی جس سے تکلیف اور بھی شدید ہوجاتی تھی۔

ڈھائی گھنٹے کے بجائے یہ سفر چار گھنٹے کا ثابت ہوا۔ اس وقت میں تھک کر چور ہوچکا تھا۔ وہ چھوٹا سا غار مجھے کسی محل سے بھی زیادہ آرام دہ محسوس ہوا تھا۔ ٹھنڈ سے میری ٹانگیں پنڈلیوں تک سن ہو کر رہ گئی تھیں، ناک اور آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔ غار کے نیم سرد ماحول میں آکر میں نے جیسے اطمینان کا سانس لیا۔

پتھر اور مٹی کے فرش پر اپنے تھیلے رکھ کر ہم بیٹھ گئے۔ طارق نے تھرماس سے گرم گرم کافی نکالی اور میری طرف بڑھادی۔

اس غار میں پناہ لیے ہمیں ابھی ایک ہی گھنٹا ہوا تھا کہ نیچے پہاڑی راستے پر ہم نے سرگرمی محسوس کی۔ میں اور طارق غار کے دہانے پر آگئے۔ نیچے انگریز فوج کا ایک دستہ تیزی سے ایک سمت بڑھتا جارہا تھا۔

"یہ لوگ کدھر جارہے ہیں؟" میں نے طارق سے دریافت کیا۔

"اسی فیکٹری کو خام مال فراہم کرنے والی کانوں کی طرف" طارق نے جواب دیا۔

"گویا دونوں طرف سے فیکٹری کی حفاظت کرنے آئے ہیں" میں تلخ لہجے میں بولا۔

○☆○

جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، میری پریشانی بڑھتی گئی۔ طارق کہہ کر گیا تھا کہ وہ پندرہ بیس منٹ میں واپس آجائے گا لیکن اب اسے گئے ہوئے تین گھنٹے ہوچکے تھے۔ مجھے یقین ہو چلا تھا کہ طارق کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے۔ میرے لیے اب ضروری ہوگیا تھا کہ میں خود بستی کی طرف جاؤں اور دیکھوں کہ کیا معاملہ ہے؟

اس وقت رات کے دس بجے تھے۔ بستی خاموشی میں ڈوبی ہوئی تھی۔ آسمان سیاہ بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا اور ہوا بہت تیز ہوگئی تھی۔ برف باری کا سلسلہ کسی وقت بھی شروع ہوسکتا تھا۔ میرے سامنے اس وقت دو ہی راستے تھے یا تو واپس اسی غار میں جاکر رات گزاروں جہاں دن میں ہم نے آرام کیا تھا یا پھر بستی میں جاکر طارق کا پتا چلاؤں کہ اس پر کیا بیتی؟ میں نے دوسرا راستہ اختیار کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔

بستی کی طرف روانگی سے پہلے میں نے مزید ایک گھنٹے انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں چاہتا تھا کہ جب بستی میں جاؤں تو کوئی بھی جاگتا ہوا نہ ہو اور نہ مجھے دیکھنے والا ہو۔ پتھروں کے درمیان کھڑے ہوئے میری حالت اور بھی خراب ہوگئی تھی۔ سردی کی وجہ سے میرا تمام جسم سن ہو کر رہ گیا تھا۔ میں نے اپنے پیروں کو جنبش دینا چاہی تو ایسا لگا جیسے رگوں میں خون منجمد ہو کے رہ گیا ہے۔ بڑی مشکل سے میں نے خود کو سنبھالا، دائیں ہاتھ کو شانے کے جوڑ سے پھرکی کی طرح گھمایا، تھرماس سے کافی نکال کر پی اور سوچنے لگا میرا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے؟

ٹھیک گیارہ بجے میں وہاں سے چلا۔ میرا رُخ سردار مکھن کے مکان کی طرف تھا۔ سردار مکھن سے میری ملاقات پہلی بار طارق نے ہی کرائی تھی۔ یہ اس وقت کی بات تھی

جب میں پہلی بار ٹیپو کے ساتھ اس علاقے کا جائزہ لینے آیا تھا۔ سردار کھمن کا مکان بستی کے ایک سرے پر تھا۔ یہ چھوٹا سا مکان دو منزلہ تھا۔ اس کا مہمان خانہ بالائی منزل پر تھا۔ مکان کیوں کہ پہاڑی کے دامن میں بنا ہوا تھا اس وجہ سے اس پر پڑی ہوئی ٹین کی ڈھلوان چھت پہاڑی کی طرف سے اتنی نیچے تھی کہ اس پر آدمی بغیر کسی مشکل کے چڑھ سکتا تھا۔ اسی سمت دیوار میں روشن دان بھی بنے ہوئے تھے۔ میں لمبا چکر کاٹ کر پہاڑی سے گزرتا ہوا اسی سمت آیا تھا۔

اس وقت میں نے اچانک بہت سے لوگوں کے بولنے کی آوازیں سنیں۔ میں لپک کر مکان کے کونے پر آیا اور جھانک کر دیکھا۔ نیچے تین چار آدمی باتیں کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک آواز سن کر میں تقریباً اچھل پڑا۔ یہ آواز میرے ڈیڈی ڈیسوزا کی تھی۔

"ڈیڈی یہاں کہاں سے آ گئے؟" میں منہ ہی منہ میں بڑبڑایا۔ انٹیلی جنس کے چیف' یعنی میرے ڈیڈی ڈیسوزا کی وہاں موجودگی میرے لیے حیران کن تھی۔

پھر لکڑی کے زینے پر چڑھنے کی آوازیں آئیں۔ مجھے یقین ہو گیا کہ طارق پھنس ہی گیا ہے۔

اچانک ہوا اور بھی تیز ہو گئی' ساتھ ہی برف باری بھی ہونے لگی۔

وہ آوازیں اب بالائی منزل پر آ گئی تھیں۔ میں اپنی جگہ سے ہٹ کر اب پہلے روشن دان کے قریب پہنچ گیا تھا۔ وہ لوگ اس کمرے سے گزر کر جس میں یہ روشن دان کھلتا تھا' پہلے دوسرے اور پھر تیسرے کمرے کی طرف بڑھے۔ میں تیسرے روشن دان کے پاس آ گیا۔ میں اس روشن دان میں سے جھانک کر نیچے نہیں دیکھ سکا تھا اور آوازیں سن کر مکان کے کونے کی طرف بڑھ گیا تھا۔

میں نے روشن دان سے جھانک کر دیکھا۔ طارق اندر کمرے میں ایک چارپائی پر بیٹھا تھا۔

"یہ ہے وہ؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"جی ہاں" ایک انگریز فوجی نے جواب دیا۔

"تمہیں یقین ہے؟" ڈیڈی نے پھر انگریز فوجی سے سوال کیا۔ ابھی تک انہوں نے طارق سے کچھ بھی نہیں پوچھا تھا۔ سوال تو وہ انگریز فوجی سے کر رہے تھے لیکن ان کی آنکھیں طارق کا جائزہ لینے میں مصروف تھیں۔

"جی ہاں سر! مجھے یقین ہے۔ میری ڈیوٹی بھی فیکٹری پر رہی تھی۔ انہی دنوں میں نے اسے وہاں سامان وغیرہ لاتے دیکھا تھا" فوجی نے جواب دیا۔

"کیا نام ہے تمہارا؟" ڈیڈی نے اس مرتبہ طارق سے سوال کیا۔

"طارق!"

"کہاں رہتے ہو؟"

"داپا میں۔"

"کیا کرتے ہو؟"

"مزدوری' قلی کا کام کرتا ہوں۔"

"تم فیکٹری میں سامان لے کر جاتے تھے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"جی ہاں" طارق بولا "صاحب لوگوں نے حکم دیا تھا۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے؟" ڈیڈی نے سردار کھمن کی طرف مڑ کر تصدیق چاہی۔

"مجھے نہیں پتا صاحب' یہ کس فیکٹری کا سامان لے جاتا تھا" سردار کھمن بولا "مجھے تو بس یہی معلوم تھا کہ یہ محنت مزدوری کرتا ہے۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم جناب کہ ادھر کوئی فیکٹری بھی تھی۔"

"تم نے سردار کھمن کو فیکٹری کے بارے میں بتایا کیوں نہیں تھا؟" اس مرتبہ ڈیڈی نے طارق سے سوال کیا۔

"صاحب لوگوں نے منع کر دیا تھا کہ کسی کو نہ بتاؤں ورنہ مجھے مار ڈالا جائے گا" طارق نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔

"فیکٹری کس نے تباہ کی ہے؟" ڈیڈی نے اچانک سوال کیا۔

"جی!" طارق نے حیرت کی انتہائی کامیاب اداکاری کی "فیکٹری تباہ۔۔۔"

ڈیڈی اس وقت طارق کو بہت غور سے دیکھ رہے تھے "ہاں بتاؤ' فیکٹری کس نے تباہ کی ہے؟" ڈیڈی نے اپنا سوال دہرایا۔

"جی مجھے پتا نہیں!۔۔۔ کیا فیکٹری تباہ ہو گئی؟ کب؟"

"اس وقت کہاں سے آ رہے ہو؟" ڈیڈی نے طارق کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے معلوم کیا۔

"ساپو بان سے" طارق نے جواب دیا "میں جوشی مٹھ جا رہا ہوں۔"

"ساپو بان کدھر ہے؟" ڈیڈی نے سردار کھمن کو مخاطب کیا۔

"شمال میں سرائے طوطا کی طرف" سردار کھمن نے بتایا۔

"کون کون سے دن تم فیکٹری میں سامان لے جاتے تھے؟" ڈیڈی پھر طارق سے پوچھ گچھ کرنے لگے۔

"جس دن صاحب لوگ کہتے تھے۔ میں کل سامان لے کر گیا تھا۔ اب انہوں نے ایک ہفتے بعد سامان لانے کو کہا تھا۔"

"کیا کیا سامان منگایا تھا انہوں نے؟"

طارق نے کوٹ کی ایک جیب سے ایک کاغذ نکال کر ڈیڈی کی طرف بڑھا دیا "یہ سامان ہے جی!"

ڈیڈی نے وہ فہرست پڑھ کر واپس کر دی "تم پہلی مرتبہ فیکٹری کس طرح پہنچے تھے؟"

طارق نے انہیں وہی تفصیل بتا دی جو وہ ہمیں سنا چکا تھا۔

"اس کا ایک اور بھائی بھی ہے" انگریز فوجی نے ڈیڈی کو بتایا۔

"تمہارا بھائی کہاں ہے؟" ڈیڈی نے پلٹ کر طارق سے دریافت کیا۔

سردار کھمن کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پیدا ہوئے وہ کچھ کہنا چاہتا تھا کہ طارق بول اٹھا "وہ رانی کھیت میں ہے۔"

"کل کس وقت تم فیکٹری گئے تھے؟" ڈیڈی نے پوچھا۔

"دوپہر کے وقت۔"

"کوئی خاص بات تو تم نے وہاں نہیں دیکھی تھی؟"

"نہیں جناب!" طارق بولا "مجھے کیوں پکڑا گیا ہے جناب؟ میں نے کیا کیا ہے؟"

ڈیڈی نے انگریز فوجی سے کہا "یہ تو ٹھیک ہی معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال ہم فی الحال اسے یہیں روکیں گے۔" پھر وہ پلٹ کر طارق سے مخاطب ہوئے "یہ کہتا ہے' تمہارے کچھ ساتھی بھی تھے' تمہارے ساتھ اسے یہ بات سرائے طوطا کی طرف سے آنے والوں نے بتائی تھی۔ تمہارے وہ ساتھی کہاں ہیں؟"

"جی!" طارق نے پھر حیرت کی اداکاری کی "میں تو اکیلا ہی آیا ہوں۔ راستے میں تو مجھے کوئی نہیں ملا۔ کن لوگوں نے بتایا تھا۔۔؟ انہیں شاید غلط فہمی ہوئی ہوگی۔"

"ہم دیکھیں گے اس غلط فہمی کو؟" ڈیڈی عجیب سے لہجے میں بولے "آج رات تم یہیں رہو گے۔"

"مگر جناب' مجھے پتا تو چلے کہ میرا قصور کیا ہے؟"

"سردار کھمن! اس کے لیے یہاں سونے کا انتظام کرو" ڈیڈی نے کہا "اور تم سنو! کل ہم تمہارے بھائی کو بھی رانی کھیت سے بلوائیں گے پھر دیکھیں گے تمہارا کیا کیا جائے!" یہ کہہ کر ڈیڈی نے سامنے باہر کی سمت کھلنے والی کھڑکی کا جائزہ

لیا۔ وہ کھڑکی لکڑی کے موٹے تختوں کی تھی "سردار کھمن! اس کھڑکی میں تالا ڈال کر چابی میرے حوالے کر دو" پھر ڈیڈی اس کمرے سے باہر چلے گئے۔ ان کے پیچھے باقی لوگ بھی کمرے سے نکل گئے۔

میں اب دوسرے روشن دان سے کمرے میں جھانک رہا تھا "اب میں سوؤں گا۔ تمام دن ہو گیا ہے بھاگ دوڑ کرتے ہوئے! ایک کپ گرم گرم کافی بنا لاؤ" ڈیڈی کی آواز آئی۔

اب مجھے انتظار کرنا تھا' سو انتظار کرتا رہا۔

پندرہ منٹ کے اندر اندر ڈیڈی کو کافی دے دی گئی اور پھر وہ بیچ والے کمرے میں موٹے اور نرم بستر پر سو گئے۔ ان کے برابر والے کمرے میں انگریز فوجی سو رہا تھا۔ طارق کے کمرے کی کھڑکی میں تالا لگا کر چابی ڈیڈی کے حوالے کر دی گئی تھی اور درمیان والے کمرے کا دروازہ ڈیڈی نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ طارق کے لیے بھی بستر فراہم کر دیا گیا تھا لیکن وہ سویا نہیں تھا۔ وہ مضطرب تھا اور مسلسل ٹہل رہا تھا۔ اسے یقیناً میرے بارے میں تشویش تھی پھر وہ اٹھ کر دیواروں میں کیلیں تلاش کرنے لگا۔ دو ایک کیلوں کو اس نے ہلا جلا کر بھی دیکھا مگر اسے مایوسی ہوئی۔

اس وقت رات کا ایک بج رہا تھا۔ ہوا اور بھی زنّاٹے سے چلنے لگی تھی۔ برف باری کچھ اور شدید ہو گئی تھی۔ میں نے باری باری دونوں کمروں کا جائزہ لیا۔ انگریز فوجی اور ڈیڈی سو گئے تھے۔ اس وقت میں نے روشن دان کو آہستہ سے دھکا دے کر کھولا اور منہ سے کوکل کی آواز نکالی۔

طارق نے چونک کر روشن دان کی طرف دیکھا اور میں نے روشن دان کے خلا سے ہاتھ نکال کر اسے اشارہ کیا۔ ہنگامی حالات کے لیے مخصوص کٹ بیگ سے میں نے رسی نکالی اور اس کے ایک سرے میں مضبوط موٹا تار باندھ کر اسے روشن دان سے نیچے لٹکا دیا۔

طارق نے رسی کو پکڑ کر دو مرتبہ جھٹکا دیا۔ اس اشارے کا مطلب یہی تھا کہ میں رسی چھوڑ دوں' سو میں نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد طارق نے موٹے تار کی مدد سے تالا کھولا اور کھڑکی کے پاس ہی لگی ہوئی کھونٹی سے رسی باندھ کر باہر لٹکا دی۔ چند لمحوں بعد وہ رسی کے سہارے کھڑکی کے راستے باہر پہنچ گیا تھا پھر وہ چکر کاٹ کر میرے پاس آ گیا۔ ہم بغیر کچھ کہے سنے تیزی سے چل دیے۔ ہم دونوں اس جگہ پہنچے جہاں طارق مجھے چھوڑ کر سردار کھمن سے ملنے گیا تھا۔ وہاں برف ہٹا کر ہم نے اپنے تھیلے نکالے اور دریا کے ٹھنڈے پانی میں اتر گئے پھر دریا پار کر لیا۔

برف باری کا طوفان اور شدید ہو گیا تھا۔
"اب ہم کہاں چلیں گے؟" میں نے چیخ کر طارق سے پوچھا۔
"تھوڑی دور پر ایک غار ہے" طارق نے جواب دیا۔
"مگر وہ ہمارے قدموں کے نشانات سے وہاں پہنچ جائیں گے" میں بولا۔
"اتنی شدید برف باری ہے، صبح تک یہ نشانات مٹ جائیں گے۔ ویسے اس وقت کچھ اور کیا بھی نہیں جا سکتا۔"

○☆○

برف باری کا طوفان اگلے دن بھی جاری رہا۔ جس غار میں ہم نے پناہ لے رکھی تھی، وہ چھوٹا بھی تھا اور تنگ بھی۔ کافی کب کی ختم ہو چکی تھی۔ سردی ہمارے جسم گلائے دے رہی تھی لیکن ہم اس غار سے نکلنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔

طارق کا خیال ٹھیک ہی نکلا۔ وہ لوگ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہم دریا پار کا راستہ اختیار کریں گے۔ اس موسم میں دریا پار کرنا واقعی ایک مشکل کام تھا۔ برف باری نے ہمارے لیے سامنے دیکھنا ناممکن بنا دیا تھا۔ تیز ہوا ہمارے قدم اکھاڑے ڈال رہی تھی لیکن ہم پہاڑی دریا کے درمیان ابھرے ہوئے پتھروں اور چٹانوں پر سے گزرتے ہوئے بس بڑھتے ہی چلے گئے تھے۔ دریا پار کرنے کا یہ قدرتی راستہ عام دنوں میں بھی بے حد خطرناک تھا۔ ذرا سا پاؤں پھسلتے ہی دس بارہ فٹ گہرائی میں جا گرنا پھر برف اور پانی کی تہ میں دھنس کر وہیں بے بسی سے ختم ہو جانا قوی امکانات میں سے تھا لیکن طارق کی مہارت اور جان بچانے کی لگن نے ہمیں یہ پل صراط پار کرا ہی دیا تھا۔

رات ہوتے ہی برف باری کا طویل اور خوف ناک سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔
"بس اب ہمیں یہاں سے نکل لینا ہے" طارق نے مجھ سے کہا۔
"اب ہم کدھر جائیں گے؟" میں نے دریافت کیا۔
"ہم سیدھا راستہ چھوڑ بیٹھے ہیں" طارق نے کہا "پہلے ہم سوپا بان، سرائے طوطا، جوما اور مالاری سے گزرتے ہوئے بمپا پہنچتے لیکن اب یہاں سے سیدھے بمپا جائیں گے۔ یہ راستہ اگرچہ بہت خطرناک ہے لیکن محفوظ ہے۔ اس موسم میں کوئی بھی یہ راستہ اختیار کرنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ ویسے میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ ایسا کروں بھی یا نہیں کیوں کہ تم زخمی بھی تو ہو!"

"میرے زخم کی پروا نہ کرو!" میں بولا "بس یہاں سے بہ حفاظت نکل چلو!" مجھے اس کی رائے سے اتفاق تھا۔ عام راستے اب ہمارے لیے زیادہ ہی خطرناک تھے۔ میں انٹیلی جنس کے چیف ڈیسوزا یعنی اپنے ڈیڈی کو اچھی طرح جانتا تھا، وہ اتنی آسانی سے ہمارا پیچھا نہیں چھوڑ سکتے تھے۔

ہم وہاں سے نکل گئے۔ میرا زخمی بازو اب بہت زیادہ تکلیف دے رہا تھا۔ زخم کی حالت بہت خراب ہو چکی تھی۔ فرسٹ ایڈ کا جو سامان ہمارے پاس تھا وہ اس قسم کے زخموں کے مندمل کرنے کے لیے ناکافی تھا مگر ہم کر بھی کیا سکتے تھے پھر سردی نے میرے پیروں کو تقریباً سن کر دیا تھا۔ پیروں کی انگلیاں سوج گئی تھیں جن کی وجہ سے، جوتے پہننا مشکل ہو گیا تھا۔ یہی حالت کانوں کی تھی جن کی لویں پھول کر لٹک گئی تھیں۔ طارق اگرچہ روزانہ برفانی ریچھ کی چربی سے میرے ہاتھ پاؤں اور چہرے کی مالش کرتا تھا لیکن سردی کچھ اتنی شدید تھی کہ وہ بھی کچھ اثر کرتی معلوم نہ ہوتی تھی۔
"اس کی مالش سے اگر کوئی فائدہ نہیں طارق تو اتنی دردسری مول کیوں لے رہے ہو؟" میں نے ایک روز کہا تھا۔
"اگر اس کی مالش نہ کر رہے ہوتے تو اب تک ہمارا گوشت شدید سردی سے گل چکا ہوتا" طارق نے بتایا اور میں کانپ کر رہ گیا۔

مالاری تک کے اس ہول ناک سفر نے مجھے نیم جاں کر دیا تھا۔ میرا تمام وجود ایک ٹھنڈا پھوڑا بن کر رہ گیا تھا۔ ساٹھ میل کا یہ سفر کتنا کٹھن اور دشوار گزار تھا اس کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن میں ہم کبھی پانچ میل سے زیادہ سفر نہ کر سکے اگر طارق میرے ساتھ نہ ہوتا تو شاید میں کبھی زندہ سلامت مالاری تک بھی نہ پہنچتا۔ وہ اس علاقے کا کیڑا تھا اسی لیے ہم نے ہر رات کسی نہ کسی غار میں گزاری لیکن صرف بسکٹ کھا کھا کر تو ہم اپنی توانائی بحال نہیں رکھ سکتے تھے۔

پندرہویں دن ہم مالاری سے چار میل کے فاصلے پر ایک غار کے سامنے کھڑے تھے اور طارق کے چہرے پر الجھن تھی۔ اس کی الجھن کا سبب میری سمجھ میں بھی آ گیا تھا۔ وہ برف پر بنے ہوئے پیروں کے نشانات دیکھ رہا تھا۔ لگتا تھا جیسے وہاں انسانوں کی آمد و رفت رہی ہو۔
"دیکھا جائے گا" میں نے کہا "مجھ میں اب مزید چلنے کی ہمت نہیں ہے" یہ کہہ کر میں غار میں داخل ہو گیا۔ میرے پیچھے پیچھے طارق بھی آ گیا۔
غار کے اندر پہنچ کر ہماری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

چھوٹے سے اس غار میں چوڑا سا نرم اور گرم بستر بچھا ہوا تھا اور موٹے موٹے کمبل رکھے تھے۔ ایک طرف بڑا سا تھرماس اور اس کے ساتھ ٹارچ رکھی تھی۔
ہم دونوں غار کے اندر اس سامان کو دیکھتے رہے۔ میرے قدموں میں سکت نہیں تھی۔ میں وہیں اپنے تھیلے پر بیٹھ گیا اور تھرماس اٹھا کر اس کا ڈھکنا کھولا۔ ڈھکنے کے اندر ایک کاغذ رکھا تھا۔ میں نے تھرماس کی بوتل سے کارک ہٹایا۔ اندر سے گرم گرم کافی کی مہک میرے نتھنوں سے ٹکرائی۔ طارق ایک مرتبہ پھر باہر جا چکا تھا۔
میں نے تھرماس سے کافی انڈیلنے کے لیے ڈھکنا سیدھا کیا تو میری توجہ پھر کاغذ پر گئی۔ میں نے کاغذ نکال لیا۔ اس کاغذ پر ایک تحریر بھی تھی۔

شاہین! طارق!
اطمینان سے کافی پیو اور آرام کرو، رات کسی وقت ملاقات ہوگی۔
مجاہد اوّل

"طارق!" میں چیخا "ادھر آؤ!"
وہ لپکتا ہوا واپس آیا۔ جب میں نے اسے تمام بات بتائی تو وہ حیران رہ گیا۔ ہم نے جلدی جلدی گرم گرم کافی کے دو دو مگ پیے پھر برفانی علاقے میں سفر کا لباس اتار کر بستر میں گھس گئے۔
"مجھے حیرت ہے، اس غار کا علم مجاہد اوّل کو کیسے ہوا؟" طارق بولا۔
"ہوا ہوگا یار!" میں نے کہا "آرام کرو!"
کئی دن کے بعد ہمیں اطمینان، سکون اور مناسب بستر ملا تھا پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ کافی دنوں بعد ہمیں تحفظ کا احساس بھی ہوا تھا۔ یہ احساس مجاہد اوّل کی تحریر نے دلایا تھا۔ ایسے صبر آزما حالات میں بھی وہ ہماری طرف سے غافل نہیں رہا تھا۔ یہ بڑی بات تھی پھر یہ کہ مسلسل تھکن نے ہمیں نڈھال کر رکھا تھا۔ اونی کمبلوں کی گرمی رفتہ رفتہ ہمارے جسموں میں بیٹھی ہوئی سردی کو ختم کر رہی تھی۔ ذرا دیر میں ہم گہری بے ہوشی کی نیند میں کھو گئے تھے۔
رات کا پتا نہیں کون سا پہر تھا کہ مجاہد اوّل نے ہمیں جگایا۔ غار کے ایک کونے میں ٹارچ روشن تھی۔ مجاہد اوّل ہمارے لیے کھانا لایا تھا جسے ہم دونوں نے سیر ہو کر کھایا۔ غنودگی کے اثر سے رفتہ رفتہ ہمارے ذہن صاف ہوتے چلے گئے۔
"میں تین دن سے یہاں روزانہ تمہارا انتظار کرتا رہا ہوں" مجاہد اوّل کی کھرکھراتی آواز ابھری۔
"آپ کو کیسے یقین تھا کہ ہم یہاں آئیں گے؟" طارق نے سوال کیا۔
"تمہارا یہ خیال درست نہیں کہ یہ غار تمہاری دریافت ہے" مجاہد اوّل نے کہا "بہرحال سنو! فیکٹری کی تباہی کے بعد ترک اور جرمن ساتھیوں کو روانہ کر کے میں گلاب کوٹی پہنچا تھا۔ میں نے اپنے ترک اور جرمن ساتھیوں سے بہت کہا کہ میں انہیں تبت کی سرحد تک پہنچا آؤں مگر انہوں نے میری بات نہ مانی۔ ان کی ضد تھی کہ میں واپس چلا جاؤں کیونکہ ہندوستان میں میری زیادہ ضرورت ہے۔"
"میرا خیال ہے کہ انگریز فوج ان کا تعاقب ضرور کرے گی" میں بولا۔
"یہ ان کی قسمت ہے" مجاہد اوّل نے طویل سانس لیا "لیکن ترک اور جرمن واقعی زندہ قومیں ہیں۔ انہوں نے تعاقب کے خطرے کو بھانپ لیا تھا اس لیے ان کے زخمیوں اور پانچ فوجیوں نے سوسائڈ (خودکشی) اسکواڈ بنا لیا ہے۔ یہ اسکواڈ جوشی مٹھ کی سمت کارخانے کی سرنگ کے دہانے سے قریب ایک تنگ درے میں مورچہ بند ہو کر بیٹھ گیا ہے۔ ان لوگوں کے پاس اتنا اسلحہ ہے کہ وہ دو تین سو فوجیوں کے دستے کو ایک ہفتے تک وہاں روک سکتے ہیں۔ اس ایک ہفتے میں ان کے ساتھی بہت دور نکل چکے ہوں گے۔ ایک ہفتے کے بعد یا تو وہ اس علاقے سے نکلنے کی کوشش کریں گے یا ناکامی کی صورت میں خود کو ختم کر ڈالیں گے۔ طارق! کافی نکالو!"
طارق نے تین مگوں میں تھرماس سے کافی انڈیلی۔
مجاہد اوّل نے کافی کے گھونٹ لیتے ہوئے پھر کہنا شروع کیا "بہرحال میں گلاب کوٹی میں تھا کہ مجھے اطلاع ملی کہ انٹیلی جنس کے ڈیسوزا نے جوشی مٹھ میں طارق کو پکڑ لیا تھا لیکن وہ رات کے وقت اپنے ساتھی کی مدد سے فرار ہو گیا۔ ڈیسوزا کا خیال تھا کہ تم دونوں یا تو مالاری کی طرف جا سکتے ہو یا پھر گلاب کوٹی کی طرف لہٰذا اس نے اپنے چند لوگوں کو گلاب کوٹی کی طرف روانہ کر دیا اور خود چند انگریز فوجیوں کے ساتھ مالاری کی طرف بڑھ گیا۔ یہ خبر سنتے ہی میں گلاب کوٹی سے جوشی مٹھ پہنچا۔ وہاں طارق کے ایک دوست کی حیثیت سے میں سردار مکھن سے ملا" سردار مکھن، طارق کے لیے بہت پریشان تھا۔ اسے یہ یقین دلانے میں کہ میں طارق کا دوست ہوں، بڑی مشکل پیش آئی تھی۔"
"تو پھر اس غار کا پتا سردار مکھن ہی نے آپ کو بتایا ہوگا" طارق بولا۔

"ہاں" مجاہد اوّل نے کہا "اسی نے مجھے بتایا کہ مالاری جانے کے لیے کون سا محفوظ راستہ استعمال کرسکتے ہو! وہ میرے ساتھ مالاری آیا ہوا ہے۔ اسی نے اندازاً بتایا تھا کہ تمہیں تین دن قبل یہاں پہنچ جانا چاہیے تھا۔"

"اب کیا حالات ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"ڈیسوزا یہاں سے آگے بڑھ گیا ہے" مجاہد اوّل نے بتایا "لیکن یہاں مالاری میں اس نے کچھ فوجی طلب کرلیے ہیں۔ اسے معلوم ہے کہ طارق دابا کار رہنے والا ہے لہٰذا وہ اس علاقے میں دابا تک تمہارا تعاقب کرنا چاہتا ہے۔"

"مگر دابا تو تبت میں ہے" میں نے کہا "وہاں ڈیسوزا کے کیا اختیارات ہوں گے؟"

"یہ تم کیسی احمقانہ باتیں کررہے ہو؟" مجاہد اوّل بولا "اصل اختیارات طاقت سے حاصل ہوتے ہیں' وہ اس کے پاس ہے" مجاہد اوّل نے کافی کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے مزید کہا "میں اب یہاں سے لوٹ جاؤں گا۔ ڈیسوزا درہ نیتے کی راہ سے دابا کی طرف گیا ہے کیوں کہ وہ راستہ مختصر ہے۔ تم ایسا کرو کہ درہ چار موٹے سے گزر کر لال پہاڑ پہنچو۔"

پھر مجاہد اوّل نے میرے زخم کی ڈریسنگ کی جو بہت ہی خراب ہوچکا تھا۔ شدید سردی کی وجہ سے زخم سے آس پاس کی کھال اور گوشت گلنے لگا تھا۔ ڈریسنگ کے دوران میں مجھے سخت تکلیف ہوئی تھی۔

"مجھے افسوس ہے کہ تمہارے زخم کے لیے میں مناسب دوائیں نہ لاسکا۔ ارے' تمہیں تو بخار بھی آرہا ہے!" مجاہد اوّل کی آواز میں تشویش تھی۔

"تھکن کی وجہ سے آگیا ہوگا" میں بولا۔

"بہرحال تم کل اور آرام کرو پھر تمہیں اپنے سفر پر روانہ ہونا ہی ہے" مجاہد اوّل نے گویا فیصلہ سنادیا۔

"میرا خیال ہے کہ مجھے سیدھا نینی تال ہی جانا چاہیے تھا" میں نے کہا۔

"نینی تال' رانی کھیت یا کاٹھ گودام کا صرف ایک راستہ اس برف باری میں کھلا ہے۔ اس طرف سے کسی زخمی آدمی کا جانا یا پھر طارق کا جانا' اب اور بھی خطرناک ہوگا۔ بہتر یہی ہے کہ تم طارق کے ساتھ تبت کی طرف نکل جاؤ اور جب مکمل طور پر صحت یاب ہوجاؤ تو واپس ہندوستان آجاؤ۔"

اس دن مجھے احساس ہوا تھا کہ مجاہد اوّل کو اپنے ایک ایک سرفروش کا کتنا خیال تھا۔ جیسے ہی اسے اطلاع ملی تھی کہ انٹیلی جنس کے چیف' یعنی میرے ڈیڈی ڈیسوزا میرے تعاقب میں ہیں' وہ فوراً حرکت میں آگیا تھا پھر اس نے نہ جانے کیا کیا خطرات مول لے کر اور ہم سے رابطہ قائم کرکے ہماری رہبری کی تھی' اسی کے ساتھ ان خطرات سے بھی آگاہ کیا تھا جو ہمارے استقبال کے لیے موجود تھے۔ اگلی رات ہم دونوں پھر اسی سرد جہنم میں سفر کے لیے تیار تھے۔

مجاہد اوّل نے ہمیں گرم جوشی سے رخصت کیا۔ اس وقت اس کا لہجہ بوجھل تھا "اچھا میرے بیٹو' خدا حافظ! اللہ تمہیں اپنی امان میں رکھے۔ چھے ماہ بعد میں تمہاری طرف سے پیغام کا انتظار شروع کردوں گا' پتا یاد ہے نا نیشنل ٹریڈرز کا؟"

"جی ہاں" میں نے جواب دیا۔

یہ سفر پہلے مرحلے سے بھی زیادہ کٹھن ثابت ہوا۔ بہ مشکل تمام اٹھارہ دن بعد ہم درہ چار موٹے سے گزر کر شلشال پہنچے تھے۔ لال پہاڑ ابھی بہت دور تھا مگر اب ہمارے لیے مزید سفر کرنا بہت دشوار تھا۔ وجہ یہ تھی کہ درہ چار موٹے میں ایک چٹان سے گزرتے ہوئے میں نیچے کھڈ میں گر گیا تھا اور پھر سخت جدوجہد کے بعد طارق مجھے وہاں سے نکال پایا تھا۔ اس عرصے میں میری دائیں ٹانگ برف میں مسلسل دبی رہنے کی وجہ سے بالکل سن ہوکر رہ گئی تھی۔ جب اس نے مجھے نکالا تو یہ پتا چلا کہ میرے لیے اب اس ٹانگ پر زور دے کر چلنا ناممکن ہوگیا ہے۔ اس کے بعد ہمارا یہ سفر اور بھی کٹھن ہوگیا تھا۔ یہ طارق ہی کی ہمت تھی کہ وہ مجھے اس علاقے سے لے کر شلشال آیا تھا۔ طارق کا کہنا تھا کہ یہاں اس کے ماموں کا ایک دوست بدھ خانقاہ میں بھکشو ہے۔ طارق نے اسی بدھ بھکشو سے مدد لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

یہ خانقاہ ہمارے لیے بہت اچھی پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ یہیں بھکشو نے ایک مقامی وید سے میرا علاج کرایا۔ وید نے اپنی سی تمام کوشش کی لیکن پھر مجبور ہوکر میری زندگی بچانے کے لیے میرا الٹا ہاتھ کاٹ دیا۔ وجہ یہ تھی کہ میرا گوشت مسلسل سردی کھاتے کھاتے گلتا جارہا تھا۔ خیریت یہ تھی کہ گوشت گلنے کا رخ نیچے کی طرف زیادہ تھا اگر اوپر کی طرف ہوتا تو میری زندگی کا چراغ گل ہوجاتا۔

میری دائیں ٹانگ میں نہ صرف موچ آئی تھی بلکہ برف میں پانچ گھنٹے دبے رہنے کی وجہ سے اس کا گوشت بھی گلنے لگا تھا۔ میرا پیر اپنی جگہ بٹھانا اس صورت میں ناممکن تھا کیوں کہ ذرا سے دباؤ سے گوشت میں انگلیاں دھنس سکتی تھیں اس لیے پہلے وید نے گوشت کو گلنے سے روکنے کا علاج کیا۔ جب وہ اس میں کامیاب ہوگیا تو پیر کی اتری ہوئی ہڈی کو اپنی جگہ بٹھانا ناممکن ہوچکا تھا کیوں کہ گوشت سڑنے کے بعد اس کا اندمال اس طرح ہوا تھا کہ پیر کو ٹخنے کے جوڑ پر گھمانا بھی محال ہوگیا تھا۔

مجھے مکمل طور پر صحت یاب ہونے میں سات ماہ لگے۔ اس دوران میں دو مرتبہ ڈیڈی ادھر سے گزرے بھی لیکن بھکشو کی وجہ سے انہیں میرا پتا نہ چل سکا۔ اس عرصے میں طارق بھی اپنے ماں باپ سے مل آیا تھا۔

پھر وہ دن آہی گیا جب میں اور طارق اس مہربان بھکشو سے رخصت ہورہے تھے۔

ہم نیپال سے ہوکر دارجلنگ پہنچے اور وہاں سے کلکتہ! کلکتے میں ہم نے مچھوا بازار کے علاقے میں ایک بڑا سا مکان کرائے پر لے لیا تھا۔ ہمارے پاس کافی رقم تھی جو ہمیں تبت کے سفر سے قبل دی گئی تھی۔ اپنے قیام کا انتظام کرنے کے بعد ہم نے مجاہد اوّل سے نیشنل ٹریڈرز دہلی کے پتے پر رابطہ قائم کیا اور اسے کلکتے میں اپنی آمد سے مطلع کردیا۔ ایک ہفتے بعد ہی میرے پاس جوگیندر پہنچ گیا اور ہم دونوں سگے بھائیوں کی طرح بہت دیر تک گلے مل کر روتے رہے۔

اس عرصے میں جوگیندر پر بھی ایک قیامت گزر چکی تھی جس کا علم مجھے کلکتہ پہنچتے ہی ہوگیا تھا۔ موہن لال' یعنی جوگیندر کے والد کو بھی گرفتار کرلیا گیا تھا۔ ان پر حراست کے دوران سخت تشدد کیا گیا تھا اور پھر انہیں بھی وہی راہ اپنانا پڑی تھی جو ان کی عظیم بیٹی فاطمہ نے اپنائی تھی۔ انہوں نے زہر کھاکر اپنی زندگی ختم کرلی تھی مگر زبان نہیں کھولی تھی۔

میری حالت دیکھ کر جوگیندر نے کہا تھا "شاہین! یہ سب کیا ہوگیا؟" وہ اب بھی مجھے میرے تنظیمی نام ہی سے مخاطب کرتا تھا۔ اب تک اسے میرا اصل نام معلوم نہیں ہوا تھا اور میں بھی اب یہ بھول جانا چاہتا تھا کہ میرا نام طارنوش تھا۔ اس نام سے میری زندگی کی بہت سی تلخ یادیں وابستہ تھیں جنہیں اب میں بھلا دینا چاہتا تھا۔ اب عالم جنات سے میرا رابطہ قطعی طور پر منقطع ہوچکا تھا۔ موروثی طور پر مجھے پراسرار قوتیں اپنے باپ ہاموس سے ملی تھیں' وہ قبیلہ جنات کے سردار ملیقا کے فیصلے کے مطابق سلب کرلی گئی تھیں۔ اسی فیصلے کے مطابق جنات پر یہ پابندی عائد کردی گئی تھی کہ مجھ سے کوئی رابطہ نہ رکھیں۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ یہ کیسا خود غرضانہ فیصلہ تھا! میں اپنے اجداد سے بچھڑ گیا تھا۔ کبھی مجھے خیال آتا کہ جو کچھ ہوا اچھا ہی ہوا۔ پہلے تو میں مکمل طور پر نہ جن تھا نہ انسان' اب انسان تو بن گیا تھا! کاش میری ماں ایک جن کے عشق میں مبتلا نہ ہوتی پھر یوں اسے دربہ در نہ

ہونا پڑتا! مگر اب یہ سب کچھ سوچنا لاحاصل تھا۔ مجھے پراسرار اسی بھی یاد آتی مگر جلد ہی اس کا خیال میں اپنے ذہن سے جھٹک دیتا۔ میرے خیال میں وہ بھی خود غرض ہی تھی۔ وہ میرے ذریعے اپنے بھائی' یعنی میرے باپ ہاموس کا انتقام لینا چاہتی تھی اور جب انتقام لے لیا تو مجھے بے سہارا چھوڑ گئی۔ مجھ پر گزشتہ دنوں کیا کیا نہیں بیت گئی تھی مگر اسی نے پلٹ کر میری خبر نہیں لی تھی۔ میں بھی اب اسے بھول جانا چاہتا تھا۔

جوگیندر اور میں دیر تک ایک دوسرے کو اپنی کتھا سناتے رہے۔ اس نے مجھے مجاہد اوّل کا ایک خط دیا جس میں میرے لیے ایک ہول ناک خبر تھی۔ اس عرصے میں طویل عرصے بیمار رہنے کے بعد میری ممی اس دنیا سے رخصت ہوچکی تھیں۔ مجاہد اوّل نے مجھ سے تعزیت کی تھی۔ وہ خط پڑھ کر میں نے پھاڑ دیا اور بہت حوصلے کے ساتھ خود پر قابو کیے رہا کہ کہیں جوگیندر کو میری حالت کا اندازہ نہ ہوجائے۔

اس کے بعد جوگیندر بولا "اور ہاں شاہین' ایک بات تو میں تمہیں بتانا بھول ہی گیا۔ میری سوشیلا کی منگنی ہوگئی ہے۔ خود مجاہد اوّل نے یہ منگنی کرائی ہے۔ انہوں نے سوشیلا کو اپنی بیٹی بنالیا ہے۔ وہ کہتے ہیں' اللہ نے مجھ سے فاطمہ لے کر مجھے سوشیلا جیسی بیٹی عطا کردی ہے۔"

مجاہد اوّل ٹھیک ہی کہتا تھا۔ اسے فاطمہ کی جگہ دوسری بیٹی مل گئی تھی مگر میری فاطمہ تو مجھ سے بچھڑ گئی تھی۔

پھر جوگیندر چلا گیا۔ مجاہد اوّل نے اسے اسی لیے بھیجا تھا کہ وہ میرے بارے میں مکمل رپورٹ دے کہ میری جسمانی حالت کیسی ہے؟ مجاہد اوّل کو یقین تھا کہ اس سفر میں میرا بازو ناکارہ ہوگیا ہوگا لیکن اسے یہ پتا نہیں تھا کہ اب میں ایک معذور آدمی تھا۔

کٹے ہوئے بازو اور ناقص پیر کی وجہ سے اب میں تنظیم کی چھاپا مار مہموں کے لیے ناکارہ ہوچکا تھا۔ میری افادیت اب صرف اتنی رہ گئی تھی کہ میں سال میں ایک آدھ بار برما کا چکر لگاؤں اور تنظیم کے لیے اسلحہ کی فراہمی کا انتظام کرتا رہوں۔ اس کے علاوہ میری ایک اور ذمے داری یہ بھی تھی کہ تنظیم جو نئے ارکان بھیجے انہیں اسلحہ کے استعمال کی تربیت دوں۔

میری بدقسمتی یہ تھی کہ میں عین اس وقت ناکارہ ہوکر رہ گیا تھا جب ہماری تنظیم جوان ہوچکی تھی۔ جب تنظیم کے اراکین بڑے بڑے معرکے سر کررہے تھے' وہ انگریزوں پر ضرب لگانے کے لیے ملک کے مختلف علاقوں میں مصروف عمل تھے' میں قطعی بے عمل پڑا تھا۔ میں ان کے کارناموں

کے واقعات سنتا اور دل ہی دل میں کڑھتا رہتا۔
میرے کڑھنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہندوستان کے سیاسی حالات ہم انقلابیوں کے خیال میں ہماری توقع کے برعکس مسلسل کروٹ لے رہے تھے۔ مسلمان اور ہندو رفتہ رفتہ ایک دوسرے سے دور ہو کر ایک دوسرے کے حریف اور دشمن بن گئے تھے۔ ان دونوں قوموں کو باہم دست و گریباں کرنے کی وہ سازش جس کا سراغ ہمیں کلکتے ہی میں ملا تھا' اب کامیاب ہو چکی تھی۔
بارہ برس کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا تھا۔ اب [illegible] تھا۔ اسی عرصے میں ذاتی طور پر مجھے دو مرتبہ نفسیاتی صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ پہلی افسوس ناک خبر مجھے چھے سال پہلے ملی تھی کہ میرے نانا جان نواب فرقان علی کا انتقال ہو گیا تھا۔ دوسری خبر ڈیڈی کے متعلق تھی۔ یہ خبر مجھے گزشتہ سال ملی تھی۔ میرے ڈیڈی تنظیم ہی کے ایک دیرینہ رکن اور میرے عزیز دوست بخت خاں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ تنظیم کے ساتھ دہلی میں ہونے والے ایک معرکے میں یہ اندوہ ناک واقعہ پیش آیا تھا۔ خود میرا یار بخت خاں بھی اس معرکے میں شدید زخمی ہوئے کے بعد کچھ ہی روز میں خالقِ حقیقی سے جا ملا تھا۔
سیاسی سطح پر بھی اس بارہ سال کے عرصے میں بہت کچھ ہو چکا تھا۔ سائمن کمیشن' چودہ نکات' نہرو رپورٹ! اس کے درمیان پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم فسادات' سب کچھ ہوتا رہا۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ ہندوؤں اور مسلمانوں نے مشترکہ طور پر کیا تھا لیکن چودہ نکات اور نہرو رپورٹ نے دونوں قوموں کو متحارب فریق بنا دیا تھا اور پورا ہندوستان ان کی باہمی آویزشوں کی آماج گاہ بن گیا تھا۔
پھر [illegible] کا دستور نافذ ہوا۔ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم ہوئیں۔ تب دنیا نے دیکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے بارے میں ہندوؤں کے عزائم کیا ہیں۔ پورے ہندوستان میں کانگریسی وزارتوں کے تحت ہندوؤں نے منظم طور پر مسلمانوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ سرکاری سطح پر انہوں نے مسلمانوں کی معاشرتی اور معاشی زندگی پر کاری ضربیں لگائیں۔ کانگریسی وزارتوں نے سب سے زیادہ مظالم سی پی برار اور بہار میں توڑے۔
اس پُرآشوب دور میں تنظیم کی سرگرمیاں انہی علاقوں میں زوروں پر رہیں۔ وہ فرقہ وارانہ فسادات کو ہوا دینے والوں کے خلاف کارروائیاں کرتے لیکن اس سے کوئی نتیجہ نہ نکلا۔
سی پی برار' بہار' یوپی وغیرہ میں کانگریس کی صوبائی حکومتوں کے زیرِ اثر مسلمانوں پر جہاں انسانیت سوز مظالم توڑے جا رہے تھے' وہیں ان کی تہذیبی' معاشرتی' مذہبی اور معاشی زندگی پر بھی حملے کیے جا رہے تھے۔ ان ہنگاموں سے متاثر ہو کر بنگال کے انتہا پسند ہندو بھی صوبے کی فضا کو مسموم بنانے کے درپے ہو چکے تھے۔ تنظیم نے فیصلہ کیا تھا کہ بنگال کو اس قسم کے ہنگاموں سے بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی جائے گی۔ اسی مقصد کے تحت تنظیم کے کئی سرفروش کلکتے پہنچ چکے تھے۔ میں کلکتے میں عارضی طور پر بچھوا بازار کے جس مکان میں مقیم تھا اسی کو ہنگامی ہیڈ کوارٹر میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔
کلکتے پہنچنے والے سرفروشوں میں جوگیندر اور سوشیلا بھی تھے۔ وہ دونوں میرے ساتھ ہی ٹھہرے تھے۔ ایک عرصے بعد میری ان سے ملاقات ہوئی تھی۔ اس مرتبہ مجھے جوگیندر کچھ بجھا بجھا سا لگا۔ یہ وہ جوگیندر نہیں تھا جسے میں جانتا تھا' مضطرب' بے چین' سیماب صفت' آتش زیرپا! جوگیندر کی جگہ اس بار ایک کھویا کھویا سا شخص میرے سامنے تھا۔ لگتا تھا کہ اس کے سینے میں دہکنے والا انقلابی الاؤ سرد پڑ چکا تھا۔ وہ ہر وقت کسی سوچ میں گم رہتا تھا۔ میں نے کئی مرتبہ اس سے پوچھا بھی مگر وہ مجھے ٹال گیا۔
ایک دن جب میں جوگیندر کے سر ہو گیا تو وہ مردہ سی آواز میں بولا "شاہین! لگتا ہے میرے سارے خواب بکھر گئے ہیں' تمام آدرش کھو گئے ہیں۔"
میں سمجھا کہ شاید وہ ہندوستان کی عام سیاسی فضا اور فرقہ وارانہ کشیدگی کے سبب پریشان ہے۔ میں نے اسی لیے اس سے کہا "یہ حالات تو ہمیشہ سے تھے میرے یار! ہم نے کبھی ان سیاسی لیڈروں سے بہتری کی توقع نہیں کی تھی۔"
اس نے جیسے میری بات سنی ہی نہیں اور کہنے لگا "میں زندگی کے اس نازک دوراہے پر آپہنچا ہوں شاہین کہ اب مجھے کوئی نہ کوئی فیصلہ کرنا ہی پڑے گا۔ میں ان دو راستوں میں کون سے راستے پر چلوں' یہ تو سوچنا ہی ہوگا۔ میں ابھی تک قطعی طور پر طے نہیں کر سکا کہ جو فیصلہ میں کرنا چاہتا ہوں' وہ حقیقت پسندانہ تجزیے پر مبنی ہے یا اس میں سراسر میری جذباتیت کو دخل ہے۔"
"مجھے بتاؤ" میں نے کہا "شاید کسی فیصلے تک پہنچنے میں تمہاری مدد میں کر سکوں۔"
"جب میں اپنے راستے کے بارے میں کسی یقینی نتیجے تک پہنچ جاؤں گا تو تمہیں بھی بتا دوں گا۔" اس نے کہا۔
دو دن بعد مجھے اس کی ذہنی کشیدگی کا علم ہوا۔
تنظیم کے کارکنوں کا اجلاس ختم ہو چکا تھا۔ تمام کارکن وہاں سے جا چکے تھے۔ اس اجلاس میں طے کیا گیا تھا کہ کلکتے کو ہندو مسلم فسادات کی آگ سے بچایا جائے' ہندو انتہا پسندوں کو ہر قیمت پر ان کے مذموم عزائم سے باز رکھا جائے۔ یہ واحد صوبہ تھا جو اب تک فرقہ وارانہ فسادات سے بچا ہوا تھا۔
اس دوران میں بھی جوگیندر کچھ بجھا بجھا سا رہا۔ اب تک وہ ہر اجلاس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا رہا تھا۔ وہ بحث کے ساتھ ساتھ تجاویز بھی پیش کرتا تھا لیکن اس روز وہ محض خاموش تماشائی بنا رہا۔
جب تمام کارکن وہاں سے چلے گئے تو مجاہدِ اول نے مجھے اور جوگیندر کو اپنے کمرے میں بلایا۔ اس مکان کا یہ کمرا صرف مجاہدِ اول کے لیے مخصوص تھا۔ اس کمرے کو مجاہدِ اول نے ایسے چن لیا تھا کہ اس کا ایک دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ مجاہدِ اول کسی وقت اس کمرے میں آتا تھا اور کب وہاں سے چلا جاتا تھا' کسی کو کچھ پتا نہ چلتا تھا۔ اندر کھلنے والا دروازہ ہمیشہ بند رہتا تھا۔ ہمیں ہدایت تھی کہ تین مرتبہ دستک دے کر کمرے میں داخل ہوں۔
"آج تم بہت خاموش ہو" مجاہدِ اول نے جوگیندر کو مخاطب کیا "اس کی کوئی خاص وجہ ہے کیا؟"
"جی ہاں" جوگیندر نے جواب دیا "میں خود آپ سے بات کرنا چاہتا تھا۔"
"کہو کیا بات ہے؟" یہ کہتے ہوئے مجاہدِ اول نے اپنی جیب سے ایک کاغذ نکال کر اس کی تہ کھولی اور کاغذ پر لکھی ہوئی تحریر پڑھی پھر اسے دوبارہ تہ کر کے میز پر رکھ دیا۔ اب وہ اس کاغذ کو انگلیوں سے تھپتھپا رہا تھا۔
"میں بہت شرمندہ ہوں جناب!" جوگیندر بولا "بہرحال میں تنظیم کو چھوڑنے کا فیصلہ کر چکا ہوں۔"
جوگیندر کا یہ جملہ میرے لیے دھماکے سے کم نہیں تھا۔ مجھے اپنی سماعت پر یقین نہ آیا کہ میں نے جو کچھ سنا ہے' وہ حقیقت ہے۔
"ہوں!" مجاہدِ اول نے گہرا سانس لیا۔ میز پر رکھے ہوئے کاغذ پر اس کی انگلیاں اور تیزی سے پڑنے لگیں "اس بات پر ہم بعد میں غور کریں گے کہ تم تنظیم کو چھوڑ سکتے ہو یا نہیں' پہلے وجہ بتاؤ کہ تم نے یہ فیصلہ کیوں کیا ہے؟"
تو یہ بات تھی جس پر جوگیندر سوچ رہا تھا' جس نے اسے

ذہنی طور پر پراگندہ کر رکھا تھا۔ میں نے سوچا۔
"تنظیم سے علیحدگی کا فیصلہ میں نے بہت غور و خوض کے بعد کیا ہے حالانکہ میرے والد' میری بہن اسی تنظیم پر قربان ہو چکے ہیں۔ اس تنظیم کو میرے خاندان نے اپنے خون سے تقویت دی ہے۔"
"جذبات پر اپنے فیصلے کی عمارت نہ اٹھاؤ!" مجاہدِ اول نے کہا "سیٹھ موہن لال مجھے اپنے بھائی کی طرح عزیز تھا۔ نادرہ مجھے اپنی بیٹی سے زیادہ عزیز تھی۔ ان لوگوں کے بارے میں تو جذبات مجھے بھی ہیں اور شاید اس لیے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس وقت تم خون کے رشتوں کو زیادہ اہمیت دے رہے ہو۔ خون کے اس رشتے کی اہمیت کے لحاظ سے تم جان لو کہ نادرہ مجھے اپنی بیٹی سے بھی زیادہ عزیز تھی۔ تم شاید اس بات کو نہیں سمجھ سکتے۔ یہ بات صرف سیٹھ موہن لال جانتا تھا۔ تم وہ اسباب بتاؤ جن کی بنا پر تم نے تنظیم سے علیحدگی کا فیصلہ کیا ہے۔"
"بات یہ ہے جناب!" جوگیندر نے کہا "اس کا مجھے بہت افسوس لگا تھا' میں ایک خاص نظریے کے ساتھ تنظیم میں شامل ہوا تھا مگر اب مجھے احساس ہو رہا ہے کہ تنظیم کا نظریہ میرے نظریات سے متصادم ہے۔"
میرے سر پر جیسے پے در پے کوڑے پھٹ گئے' میرا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ یہ اچانک جوگیندر ہم سے اتنی دور کیسے چلا گیا ہے؟ میں نے سوچا تھا۔
"اب تم نے بات کی ہے کام کی!" مجاہدِ اول سرد لہجے میں بولا "کچھ یاد ہے' تم اس تنظیم سے کن ایام میں وابستہ ہوئے تھے اور یہ کن ایام میں جب تمہیں اٹھارہ برس لگے یہ معلوم کرنے میں کہ تنظیم تمہارے نظریات سے متصادم ہے؟"
"اس کا احساس مجھے گزشتہ چند مہینوں میں ہوا ہے" جوگیندر نے کہا "میں اس خیال سے تنظیم میں شامل ہوا تھا کہ تنظیم قومی بنیادوں پر ہندوستان کی آزادی کے لیے جدوجہد کرے گی۔ یہ فرقہ وارانہ خطوط پر کام نہیں کرے گی مگر تجربے سے پتا چلا کہ میرا اندازہ غلط تھا۔"
"تم بہت عجیب بات کہہ رہے ہو!" مجاہدِ اول کی آواز میں تلخی گھل گئی۔
"میں بڑے دکھ سے یہ حقیقت بیان کر رہا ہوں" جوگیندر بولا۔
"تم نے یہ غلط اندازہ کیسے لگایا؟" مجاہدِ اول نے سوال کیا۔

"پچھلے دنوں سی پی برار' بہار اور یوپی میں تنظیم کی سرگرمیوں کی بنا پر! ہر جگہ تنظیم مسلمانوں کی خاطر حرکت میں آئی ہے' اس نے مسلمانوں کی حمایت کی ہے اور انگریزوں کے خلاف اپنی عظیم جدوجہد کو فراموش کردیا ہے۔"

"تم نے تنظیم کے ان مقاصد کو نہیں سمجھا جو پچھلے دنوں تنظیم کی بنیاد رہے ہیں۔ تمہارا یہ کہنا غلط ہے کہ تنظیم کو مسلمانوں کی حمایت میں استعمال کیا گیا ہے۔ ہماری کارروائیوں کا اصل مقصد فرقہ وارانہ فسادات کو روکنا تھا بالکل اسی طرح جیسے رحمان چارلس سے ملنے والی اطلاعات کے بعد تنظیم نے ہندو مسلم اتحاد کو برقرار رکھنے کی کوششیں کی تھیں' اسی طرح تنظیم کی یہ مہمیں بھی تھیں۔"

"مگر ہر جگہ نتیجہ کیا نکلا؟ تنظیم کے اراکین کو مسلمانوں ہی کی مدد کرنا پڑی یا ان کی حمایت میں تنظیم کو میدان میں اترنا پڑا۔ آج تک کہیں بھی تنظیم ہندوؤں کی حمایت میں سرگرم عمل نظر نہیں آئی۔"

"مجھے افسوس ہے کہ تم جیسا منطقی ذہن رکھنے والا اور حقیقت پسند انسان بھی جذباتیت کا شکار ہوکر منطقی استدلال اور حقیقت پسندی سے منحرف ہوگیا ہے" مجاہد اوّل کے لہجے سے دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔ اسی کے ساتھ اس کے لہجے میں سختی اور غصّہ بھی تھا۔

جوگیندر خاموش رہا۔

پھر میں نے دکھ پر غصّے کو غالب آتے دیکھا۔ مجاہد اوّل کہہ رہا تھا "مجھے بتاؤ' تنظیم نے جہاں کہیں بھی مسلمانوں کے حق میں کارروائی کی ہے' کیا وہاں مسلمان مظلوم نہیں تھے؟ مجھے بتاؤ کہ اب تک جتنے بھی فرقہ وارانہ فسادات ہوئے ہیں' کیا ان میں پہل ہندوؤں نے نہیں کی؟ وہاں تمام تر شرارت ہندوؤں نے نہیں کی؟ تم مجھے ایک بھی ایسا علاقہ بتاؤ جہاں مسلمانوں نے فساد کی آگ بھڑکائی ہو! مجھے افسوس ہے کہ تم نے تنظیم کے بارے میں اس نہج پر سوچا" مجاہد اوّل کے لہجے میں تاسف تھا "ویسے اس کے علاوہ بھی اور بھی باتیں تم نے محسوس کی ہیں؟"

"جی ہاں" جوگیندر بولا "تنظیم میں اب صرف واحد شخص میں ہوں جو مسلمان نہیں ہے کیوں کہ سوشیلا تنظیم کی باقاعدہ رکن نہیں ہے۔"

"لاحول ولا قوۃ!" مجاہد اوّل نے کہا "بات یہ ہے کہ انسان جب حقائق کی طرف سے منہ موڑ لیتا ہے تو وہ اسی انداز میں سوچتا ہے۔ کبھی تم نے یہ سوچا کہ اگر یہ تنظیم صرف مسلمانوں کی ہے تو تم اس میں کیسے شامل ہوگئے؟ اور

کیا تم بھول گئے کہ اس تنظیم میں تم خود کس طرح شامل ہوئے؟ ویسے ایک بات میں تمہیں بتادوں کہ تنظیم کے چار بڑوں میں سے دو ہندو بھی ہیں جنہیں تم تنظیم کے بنیادی ارکان کہہ سکتے ہو۔"

جوگیندر خاموش ہوگیا لیکن اس کے چہرے سے عیاں تھا کہ وہ اپنے فیصلے پر قائم ہے۔

"میرا خیال ہے کہ تم تنظیم چھوڑنے کا فیصلہ حتمی طور پر کرچکے ہو" مجاہد اوّل نے چند لمحے خاموش رہ کر جوگیندر کے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا "ویسے مجھے بتاؤ کہ اب تمہاری راہ کیا ہوگی؟"

"جدوجہد کی راہ میری زندگی ہے" جوگیندر نے جواب دیا "میں کیمونسٹ پارٹی کے تحت کام کروں گا۔"

"شاید تم زیر زمین چھاپا مار تنظیموں کا ایک بنیادی اصول بھول گئے" مجاہد اوّل کہنے لگا "ان میں داخل ہونے کا راستہ تو ہوتا ہے' باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں ہوتا' سوائے موت کے!" مجاہد اوّل کا لہجہ سرد اور فیصلہ کن تھا۔ میں کانپ اٹھا "آج رات تم مزید غور کرلو' صبح تم میرے ساتھ ناشتا کروگے۔ میں نے جو باتیں تمہیں بتائی ہیں' ان پر ٹھنڈے دل سے غور کرلو۔"

"صبح بھی میرا فیصلہ یہی ہوگا" جوگیندر بولا "میں نے فیصلہ جذباتی انداز میں اور اچانک نہیں کیا ہے۔"

"بہرحال صبح ناشتا تم میرے ہی ساتھ کروگے۔ اس تنظیم کے رکن کی حیثیت سے تمہارے لیے یہ میرا آخری حکم ہے" مجاہد اوّل نے کہا اور وہ پرچہ جو اس کی انگلیوں کے نیچے دبا ہوا تھا' اٹھالیا "تمہارے اس ذہنی خلجان کا تنظیم کو علم تھا۔ یہ دیکھو' تنظیم کے چار بڑوں میں سے ایک کی تمہارے بارے میں رپورٹ! اس میں لکھا ہے کہ جوگیندر جس کا تنظیمی نام صفدر ہے' تنظیم کے بارے میں شبہات کا شکار ہوگیا ہے۔ وہ اس تنظیم کو حریت پسند چھاپا مار تنظیم کے بجائے فرقہ وارانہ اور جنگجو جماعت سمجھنے لگا ہے۔ اس کی طرف سے ہوشیار اور چوکنا رہنے کی ضرورت ہے۔ بہتر ہوگا کہ اسے راستے سے ہٹادیا جائے ورنہ وہ تنظیم کے لیے خطرہ ثابت ہوسکتا ہے۔ کرم چند" یہ کہہ کر مجاہد اوّل نے وہ پرچا جوگیندر کو تھمادیا۔

جوگیندر نے وہ پرچا پڑھا اور مجاہد اوّل کو واپس دے دیا۔

"تمہیں خود بھی معلوم ہے کہ چھاپا مار تنظیموں کا یہی اصول ہوتا ہے کہ برگشتہ ہونے والے رکن کو ختم کردیا جائے

لیکن میں نے ایسا کرنے سے انکار کردیا ہے کیوں کہ یہ میرا ایمان ہے' تم تنظیم سے الگ ہوکر بھی تنظیم کو نقصان نہیں پہنچاؤ گے۔ کم از کم میری تربیت اتنی ناقص نہیں ہو سکتی۔"

جوگیندر کچھ دیر خاموش رہ کر کمزور لہجے میں بولا "میں پھر شرمندگی کا اظہار کرتا ہوں مگر مجبور ہوں۔"

"میں تمہاری مجبوری جانتا ہوں" مجاہد اوّل نے کہا "پھر بھی تم سے یہ ضرور کہوں گا کہ تمہیں یہ مایوسی ہر تنظیم سے ہوگی اگر تمہارا انداز فکر اسی طرح غیر منطقی جذباتی اور غیر حقیقت پسندانہ رہا۔ اچھا اب تم لوگ جا سکتے ہو۔"

ہم دونوں اٹھ کھڑے ہوئے۔

"سنو!" مجاہد اوّل نے جوگیندر کو مخاطب کیا "تم چاہو تو اسی وقت رخصت ہو' صبح ناشتے پر ملاقات کی ضرورت بھی نہیں۔ بادہ جو کہیں تم یہ سمجھو' میں صبح تک تمہیں اس لیے روک رہا ہوں کہ کرم چند کے مشورے پر عمل کیا جا سکے۔ ایسا نہیں ہے جوگیندر بیٹا!" پہلی بار مجاہد اوّل نے اس کا تنظیمی نام تبدیل لیا تھا۔ اس کا مطلب میں نے یہی لیا کہ جوگیندر کو اب تنظیم سے الگ کیا جا چکا ہے۔ مجاہد اوّل اب کہہ رہا تھا "ایک باپ کبھی ایک اچھے اور فرماں بردار بیٹے سے ایسا سلوک نہیں کر سکتا تھا۔ وہ تو ایسی اولاد کی حفاظت کرتا ہے جوگیندر! تم مجھے شاہین سے زیادہ عزیز ہو' مجھے اپنے بیٹے سے زیادہ عزیز ہو! مجھے دکھ ہے کہ تم جو ایک اچھے اشتراکی انسان بننا چاہتے تھے' محض ایک اشتراکی ہندو بن کر رہ گئے ہو۔ میں جانتا ہوں' ایسا کس لیے ہوا ہے' کس نے تمہاری وسیع النظری کو تنگ دلی سے تبدیل کردیا ہے!"

"یہ میرا اپنا فیصلہ ہے جناب!" جوگیندر نے کہا "مجھے کسی نے سکھایا پڑھایا نہیں ہے۔"

"شاید تم بھی صحیح کہہ رہے ہو مگر نادانستگی میں غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ تمہارا المیہ یہ ہے کہ تمہیں یہ بھی معلوم نہیں کہ تم غلط بیانی سے کام لے رہے ہو۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد حقیقت تم پر ظاہر ہوجائے گی۔ اچھا الوداع!"

اس کمرے سے نکل کر میں نے محسوس کیا کہ دنیا بدل چکی ہے۔ میں دنیا میں تنہا رہ گیا ہوں۔ جوگیندر مجھ سے دور چلا گیا ہے۔ ہم دونوں خاموشی سے اپنے کمرے میں آگئے جہاں طارق موجود تھا۔

"سوشیلا بی بی چلی گئی ہیں" طارق نے جوگیندر کو بتایا "وہ بال گنج میں اپنی کسی سہیلی کے پاس گئی ہیں۔ وہ کہہ رہی تھیں

کہ آپ پتا جانتے ہیں وہیں پہنچ جائیں' انہیں دیر ہوجائے گی۔"

"کب گئی تھی سوشیلا؟" جوگیندر نے پوچھا۔

"ابھی دس پندرہ منٹ پہلے ہی گئی ہیں" طارق نے جواب دیا۔

"اچھا شاہین' میں چلتا ہوں" جوگیندر نے کمزور لہجے میں کہا۔

"واپس نہیں آؤ گے؟"

"آؤں گا' سوشیلا کو لے کر" جوگیندر بولا "شاید نہ آتا لیکن یہ بھی نہیں چاہتا کہ مجاہد اوّل کو یہ خیال ہو' میں نے ان کی نیت پر شبہ کیا ہے اور اس ڈر سے چلا گیا ہوں کہ کہیں مجھے صبح تک ٹھکانے نہ لگادیا جائے! صبح میں' مجاہد اوّل کے ساتھ ناشتا کروں گا۔ تنظیم کے رکن کی حیثیت سے ان کے اس آخری حکم کی تکمیل میرا فرض ہے۔"

پھر جوگیندر چلا گیا اور تنہائی کا بکراں سناٹا میرے گرد اگرد پھیل گیا۔ دیر تک میں پلنگ پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا اور سوچتا رہا کہ آخر وہ کون ہے جس نے جوگیندر کے خیالات کو اس قدر تبدیل کردیا ہے؟ رات کو دو بجے تک میں جوگیندر اور سوشیلا کی واپسی کا انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آسکے۔ وہ اب نہیں آئیں گے۔ میں نے سوچا تھا بھلا اب وہ واپس آکر کیا کریں گے؟ وہ رفاقت جو ختم ہوچکی تھی' اب بحال نہیں ہوسکتی تھی۔ یہی سب کچھ سوچتے سوچتے میں سوگیا لیکن یہ نیند سکون و اطمینان کی نیند نہیں تھی۔

رات اپنے پچھلے پہر میں داخل ہوچکی تھی کہ مجاہد اوّل نے اچانک مجھے اور طارق کو جھنجوڑ کر جگایا۔

"پولیس آگئی ہے اور مکان کی ناکابندی کررہی ہے" مجاہد اوّل نے بتایا۔

ہم دونوں اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ مجاہد اوّل کے ہاتھ میں اسلحہ کا ایک تھیلا اور ہاتھ میں پستول تھا۔ ہم نے بھی اسلحے کے وہ تھیلے اٹھالیے جو ہمیشہ ہمارے بستروں کے ساتھ تیار رکھے رہتے تھے۔ اب پستول ہمارے ہاتھوں میں بھی تھے۔

"دستی بم نکال لو!" مجاہد اوّل نے کہا "طارق! تم میرے ساتھ رہوگے۔ شاہین! تم میرے کمرے میں جاؤ۔ تم وہاں ہمارے آنے تک ٹھہروگے۔"

"مگر آپ؟" میں بولا۔

"تم جاؤ!" مجاہد اوّل نے سخت لہجے میں حکم دیا "دھر کا دروازہ کھلا رکھنا' دوسری طرف سے کسی کو اندر نہ آنے دینا!

طارق تم میرے ساتھ آؤ۔

میں وہاں سے اس کے کمرے میں آگیا جہاں مجاہد اوّل کا قیام تھا۔ اندر کا دروازہ میں نے پورا کھول دیا اور پچھلے دروازے کی طرف متوجہ ہوگیا جو گلی میں کھلتا تھا۔ اس دروازے کے باہر محتاط آہٹیں سُنائی دے رہی تھیں۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا۔ ایک دستی بم میں نے اپنے نٹنے ہاتھ کی بغل میں دبا رکھا تھا۔ میں کمرے میں ایسی جگہ کھڑا تھا جہاں سے مجاہد اوّل اور طارق کی کارروائیاں دیکھ سکتا تھا۔

ان دونوں نے جلدی سے وہ کمرا کھولا تھا جس میں ہنگامی ضرورت کے لیے تھوڑا بہت اسلحہ اور بارود رکھا تھا۔ طارق اور مجاہد اوّل نے اس کمرے میں بارود کے تھیلے اور دستی بم بیرونی دروازے کے آگے ڈھیر کردیے تھے۔ دروازے کے دونوں طرف دو کمرے بنے ہوئے تھے جن کے اوپر بھی کمرے بنے تھے۔ اس طرف کا دروازہ صحن سے پھوٹنے والی گلی میں تھا۔ مجاہد اوّل اور طارق نے دھماکا کرنے والے مادے کا ڈھیر اسی گلی میں لگایا تھا۔ یہ ڈھیر دروازے تک گیا تھا پھر وہ دونوں تیزی سے میری طرف آئے تھے۔ انہوں نے ایک رائفل بھی اٹھا رکھی تھی۔

"ہم اس کمرے کی چھت پر جارہے ہیں" مجاہد اوّل نے مجھے بتایا "ہم چھت سے فائرنگ کرکے گلی صاف کریں گے پھر جب تم ٹرک رکنے کی آواز سن لو تو دروازہ کھول کر ٹرک میں داخل ہوجانا۔"

"اور آپ؟"

"ہم چھت سے ٹرک میں کود جائیں گے" مجاہد اوّل نے جواب دیا "تم ایسا کرنا کہ جیسے ہی ہم اوپر سے فائرنگ شروع کریں' بارود اور دستی بم کے اس ڈھیر پر پے درپے فائر کرتے جانا تاکہ سب کچھ ایک ہی دھماکے سے اڑ جائے" یہ کہہ کر مجاہد اوّل' طارق کو لے کر ایک سیڑھی کے سہارے چھت پر چلا گیا۔

میں اس وقت حیران تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ آخر وہ ٹرک کہاں سے آئے گا؟ کون اسے چلا رہا ہوگا؟ کیا مجاہد اوّل کو پولیس کے اس چھاپے کا پہلے سے علم تھا؟ کیا اسے سن گن مل گئی تھی؟ اگر سن گن مل گئی تھی تو پہلے ہی سے کیوں نہ اس مکان کو خالی کردیا گیا؟ اس وقت میں اس سے زیادہ کچھ نہ سوچ سکا۔

میں نے سیڑھی چڑھتے ہوئے مجاہد اوّل کی آواز سُنی "ٹیپو! ہم آرہے ہیں گولی نہ چلا دینا!"

یہ میرے لیے ایک اور حیرت انگیز انکشاف تھا۔ گویا ٹیپو بھی یہاں موجود تھا اور چھت پر تھا۔

اچانک پے درپے تین فائر ہوئے پھر فائر ہوتے ہی چلے گئے۔ میں بھی پستول سے فائر کرچکا تھا۔ بارود کے ذخیرے میں زوردار دھماکے ہوئے تھے' دروازہ ٹوٹا تھا پھر دونوں طرف کے کمروں کی دیواریں بیٹھ گئی تھیں۔ اس کے ساتھ بالائی کمرے بھی نیچے آرہے تھے۔ باہر ایک شوروغوغا مچ چکا تھا پھر مجھے دو اور دھماکوں کی آوازیں سُنائی دیں۔ ان کے بعد ایسے ہی دو دھماکے اور ہوئے۔ یہ دھماکے دستی بموں کے تھے اور باہر کی سمت ہوئے تھے۔ باہر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ پولیس کی سیٹیاں بج رہی تھیں۔ دروازے پر اب بھی دھماکے ہورہے تھے۔ پولیس کے سپاہی شور مچا رہے تھے پھر مزید چند دھماکے ہوئے۔ آوازوں سے میں نے اندازہ لگایا تھا کہ مجاہد اوّل' طارق اور ٹیپو نے باہر کھڑے ہوئے پولیس کے ٹرکوں کو دستی بموں سے نشانا بنایا تھا۔ میں لپک کر باہر کھلنے والے دروازے کے پاس پہنچ گیا تھا۔ میں نے گلی میں ایک ٹرک کے داخل ہونے کی آواز سُنی تھی۔

میں نے تیزی کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھولا' باہر آیا اور لپک کر ٹرک میں بیٹھ گیا۔ اسی وقت اوپر سے دھم دھم کرکے مجاہد اوّل' طارق اور ٹیپو ٹرک میں کودے تھے پھر مجاہد اوّل ہمیں بیٹھنے کی ہدایت دے کر ٹرک سے اتر کے آگے گیا تھا۔ مجاہد اوّل' ڈرائیور کے ساتھ بیٹھ گیا تو ٹرک تیزی سے روانہ ہوا۔

یہ گلی کیا' ایک تنگ سڑک تھی۔ ابھی ہمارا ٹرک گلی کے موڑ پر بھی نہ پہنچا تھا کہ گلی کے دوسرے سرے سے پولیس کے چند سپاہی گلی میں داخل ہوگئے۔ انہوں نے ٹرک پر اندھا دھند فائرنگ شروع کردی۔ ٹرک کے پہلو میں جو تختے تھے' ہم ان کا سہارا لے کر گھٹنوں کے بل بیٹھے جوابی فائرنگ کررہے تھے اور ٹرک اپنی رفتار سے دوڑ رہا تھا۔ اسی وقت گلی میں پہلو کے ایک دروازے کی آڑ سے بھی ایک شخص نے فائرنگ شروع کردی۔ اچانک ہمارا ٹرک لہرایا پھر بڑی مشکل سے پہلو کی دیواروں سے ٹکراتے ٹکراتے بچا اور ایک جگہ رک گیا۔

پولیس کے سپاہی عقب سے ٹرک کی طرف آرہے تھے۔ ٹرک رکا ہوا تھا۔ پولیس نے یقیناً بہت بڑی تعداد میں چھاپا مارا تھا۔

پھر مجاہد اوّل کی آواز اُبھری "شاہین! حیدر علی ہلاک ہوگیا ہے اور میں زخمی ہوں۔ تم عقب کا خیال رکھو' میں ٹرک اسٹارٹ کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

طارق اور ٹیپو نے عقب سے آنے والے سپاہیوں پر بے تحاشا فائرنگ شروع کردی تھی۔ اس دوران میں انہوں نے دو دستی بم بھی سپاہیوں پر مارے تھے۔ ٹرک اب بھی بے حرکت تھا۔

پھر میں نے اسی شخص کو چیختے ہوئے سُنا جو ایک دروازے سے سپاہیوں پر فائرنگ کررہا تھا "ٹرک کیوں روک رہے ہے؟ ٹرک نکال کرلے جاؤ!"

یہ آواز میرے لیے مسرت انگیز حیرت کا باعث ہوئی۔ یہ آواز میرے دوست جوگیندر کی تھی۔

"جوگیندر!" میں نے چیخ کر کہا "ٹرک کا ڈرائیور ہلاک ہوگیا ہے۔"

پھر میں نے جوگیندر کو تیزی سے ٹرک کی طرف دوڑتے دیکھا۔ اسی وقت دو پولیس والوں نے آڑ سے نکل کر جوگیندر پر گولیاں چلائیں۔ میں نے بھی پستول سے سپاہیوں پر فائر کیے۔ گولیاں جوگیندر کے دائیں بائیں نکل گئیں۔ آخرکار وہ ٹرک میں داخل ہو ہی گیا۔

"شاہین! تم عقب کا خیال رکھنا!" جوگیندر کی آواز آئی "میں ٹرک اسٹارٹ کررہا ہوں۔"

میں ڈرائیونگ کیبن کے پیچھے کھڑا ہوگیا۔ اب سامنے کی گلی مجھے دور تک نظر آرہی تھی۔ میں نے ایسا اس لیے کیا تھا کہ جوگیندر کو کور کرسکوں۔ عقب سے ہونے والے حملے کو تو طارق اور ٹیپو سنبھال سکتے تھے مگر سامنے سے آنے والی کوئی گولی حیدر علی کی طرح جوگیندر کا بھی کام تمام کرسکتی تھی جب کہ مجاہد اوّل بھی زخمی ہوچکا تھا۔ کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ جوگیندر کی مدد کرنے کے قابل تھا بھی یا نہیں!

"طارق! ٹیپو! دو دستی بم پیچھے پھینک کر آگے آجاؤ!" میں نے چیخ کر کہا۔

وہ دونوں میری ہدایات پر عمل کرتے ہی میرے قریب آگئے۔ جوگیندر ٹرک اسٹارٹ کرچکا تھا۔ اب مجھے پیچھے سے زیادہ آگے کی فکر تھی۔ اس کے باوجود میں پیچھے کی طرف سے غافل نہیں تھا۔ پولیس والے آڑ لیتے ہوئے تیزی سے آگے بڑھتے آرہے تھے۔ میں نے اندازہ لگایا تھا کہ ٹرک جب گلی کے نکڑ تک پہنچے گا تو پولیس والے خاصے قریب آچکے ہوں گے۔

"جیسے ہی ٹرک گلی کے نکڑ پر پہنچنے والا ہو' تم دونوں ایک ایک دستی بم دائیں بائیں پھینکنا!" میں نے ٹیپو اور طارق کو ہدایت دی پھر چیخ کر جوگیندر سے بولا "ٹرک پوری رفتار سے چلاؤ جوگیندر!"

جوگیندر میرے کہنے کے ساتھ ہی اس پر عمل کرچکا تھا۔ ٹرک ابھی گلی کے موڑ سے چھ سات فٹ دور تھا کہ ٹیپو اور طارق نے دائیں بائیں ایک ایک دستی بم اچھال دیا۔ ٹھیک اس وقت دو دھماکے ہوئے جب ٹرک گلی سے نکل کر مڑ رہا تھا۔ دھماکوں کی شدت سے ٹرک ایک طرف ذرا سا لہرایا تھا اور پھر سڑک پر مڑ کر تیزی سے بڑھنے لگا تھا۔ ذرا سی دیر میں ہم اس تمام ہنگامے کے مرکز سے خاصی دور پہنچ چکے تھے۔

مجھے معلوم نہیں تھا کہ اب ہم کہاں جارہے تھے! ٹرک مختلف موڑ کاٹتا ہوا ایک انجانی منزل کی سمت بڑھتا جارہا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ جوگیندر اسی طرف جارہا ہوگا جدھر جانے کی ہدایت اسے مجاہد اوّل نے دی ہوگی پھر مجھے حیدر علی کی ہلاکت اور مجاہد اوّل کے زخمی ہونے کا خیال آیا۔ معلوم نہیں مجاہد اوّل کے زخم کی نوعیت کیا ہے؟ میں سوچ رہا تھا۔

پھر ٹرک ایک مضافاتی علاقے میں داخل ہوگیا۔ یہاں چاروں طرف کھیت اور ہموار میدان تھے۔ راستہ بھی کچا تھا۔ تھوڑی دیر بعد ٹرک ایک بڑے سے احاطے میں جاکر ٹھہر گیا۔ چاروں طرف نارنج اور اناس کے درخت لگے ہوئے تھے۔ ٹرک رکتے ہی خالد اور چند سرفروشوں نے ٹرک کو گھیر لیا تھا۔

"تمام سرفروشوں کو خبر کردو کہ وہ تنظیم کے عارضی ہیڈکوارٹر کا رخ نہ کریں" مجاہد اوّل نے خالد کو ہدایت کی "اس ٹرک کو بھی ٹھکانے لگادو اور ٹرک میں حیدر علی کی لاش ہے' اسے یہیں احاطے میں دفن کردو۔"

"آپ بھی تو زخمی ہیں' پہلے ــــ"

"میری فکر نہ کرو! زخم ٹھیک ہوجائیں گے۔ پہلے اس خطرے کو دور رکھنے کے انتظامات کرو جو بہت قریب آچکا ہے" مجاہد اوّل نے کہا "یہ تینوں میرے زخم کی ڈریسنگ کردیں گے۔"

ہم تینوں مجاہد اوّل کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

"وہ سوشیلا کہاں ہے؟" اچانک مجاہد اوّل نے پوچھا۔

"اپنی ایک سہیلی کے گھر ہے وہ" جوگیندر نے جواب دیا۔

مجاہد اوّل کے دائیں بازو اور دائیں رخسار پر ہی زخم آئے تھے۔ اس نے ہمیں رخسار کے زخم کی پروا نہ کرنے کی ہدایت کی۔ اس کی پروا نہ کرو' گولی بس جھلستی ہوئی رگڑ کھا کر گزر گئی تھی تم بازو کے زخم کی ڈریسنگ کردو! گولی گوشت پھاڑ کر نکل گئی ہے۔ خیریت ہے کہ ہڈی بچ گئی۔"

ہم نے زخم کی ڈریسنگ کے لیے مجاہد اوّل کا بازو کھولا تو

زخم سے اوپر کئی نام بازو پر گدے ہوئے دیکھے۔ کئی نام ہمارے جانے پہچانے تھے۔

"اب ناموں میں حیدر علی کے نام کا اضافہ بھی ہوجائے گا" مجاہد اوّل نے طویل سانس لے کر کہا۔

فرسٹ ایڈ کے سامان سے ہم نے ڈریسنگ بھی کی اور وہ نام بھی پڑھتے رہے۔

"فاطمہ کا نام تلاش کر رہے ہو؟" مجاہد اوّل مجھ سے بولا "بس وہ ۔۔۔ وہ ایک نام میرے سینے پر نقش ہے۔" زخم کی ڈریسنگ ہوگئی تو مجاہد اوّل نے کہا "تم لوگ اب جاؤ' چہرے کے زخم کی ڈریسنگ میں خود کرلوں گا۔"

میں نے دیکھا' خون سے سیاہ نقاب تر ہورہی تھی۔ سیاہ نقاب کے پھٹے ہوئے حصّے سے سرخ سرخ گوشت جھلک رہا تھا۔

ہم باہر آگئے۔ خالد نے بتایا کہ ایک شخص موٹر سائیکل پر تمام سرفروشوں کو مطلع کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے' ایک سرفروش اس ٹرک کو دریائے ہگلی میں گرانے لے گیا ہے۔ ناریل کے ایک درخت کے نیچے ہم نے حیدر علی کے لیے قبر کھودی اور اپنے اس عزیز ساتھی کو قبر میں اتار دیا۔ اس وقت میرا دل بُری طرح دھڑک رہا تھا۔ کاش اس کی جگہ میں مرجاتا۔ میں نے سوچا تھا' اس طرح تنظیم ایک صحیح وسالم عملی سرفروش سے تو محروم نہ ہوتی مگر کتنی خواہشیں' کتنی تمنائیں ایسی ہوتی ہیں جو تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہیں اگر سب خواہشیں پوری ہوتی چلی جائیں تو مشیت ایزدی کا قائل کون رہے!

اس کام سے فارغ ہوئے تو صبح صادق طلوع ہوچکی تھی۔ خالد ہمیں ایک کمرے میں چھوڑ کر جہاں ہمیں سونا تھا' مجاہد اوّل کے پاس چلا گیا تھا۔

"ارے ہاں ٹیپو! یہ تم چھت پر کہاں سے آٹپکے تھے؟" میں نے موقع ملا تو پوچھا "اور حیدر علی ٹرک لے کر وہاں کیسے وقت پر آپہنچا؟"

"جب سے مجاہد اوّل اس مستقر پر آکر مقیم ہوئے تھے' میرا ٹھکانا وہی چھت تھی" ٹیپو نے بتایا "مجاہد اوّل نے یہ انتظام پیش بندی کے طور پر کیا تھا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہم لوگوں کو کسی بھی وقت بے خبر اور مطمئن نہیں ہونا چاہیے۔ میری اور حیدر علی کی ڈیوٹی چوبیس گھنٹے کی تھی۔ میں رات کو جاگتا تھا' دن میں سوتا تھا اور حیدر علی جو وہاں سے تھوڑی ہی دور ایک ٹرک کے ساتھ موجود ہوتا تھا' دن کو نگرانی کرتا تھا اور رات کو سوتا تھا۔ ہنگامی حالات میں مجھے اور حیدر علی کو یہ حکم تھا کہ کسی بھی صورت ٹرک لے کر ہمیں اس مکان کے دروازے تک پہنچنا تھا۔ ظاہر ہے کہ دھماکے ہوتے ہی حیدر علی نے صورت حال کا اندازہ کرلیا تھا۔"

ناشتے پر مجاہد اوّل بھی ہمارے ساتھ تھا لیکن اس وقت وہ کچھ کھا پی نہیں رہا تھا۔ اس نے جوگیندر کو مخاطب کیا "جوگیندر! مجھے خوشی ہے کہ اس وقت تم ہمارے ساتھ ناشتے پر موجود ہو" چہرے کے زخم کی وجہ سے وہ ٹھہر ٹھہر کر بات کر رہا تھا۔

"آپ کا حکم تھا جناب!" جوگیندر بولا۔

ناشتے کے بعد جوگیندر رخصت ہوگیا لیکن اب میرے دل سے ایک بوجھ ہٹ گیا تھا۔ رات کے تجربے کے بعد میں ایک مسرت سی محسوس کر رہا تھا۔ جوگیندر اب بھی میرا دوست تھا' ہماری منزلیں اب بھی ایک ہی تھیں۔

جوگیندر چلا گیا تو خالد نے بتایا "مجاہد اوّل کے چہرے کا زخم خاصا گہرا ہے' جبڑے کی ہڈی صاف نظر آرہی ہے' کافی گوشت اڑ گیا ہے۔۔۔ بس خیریت ہی ہوگئی۔ میں نے ڈاکٹر کو بلایا ہے' ٹانکے لگ جائیں گے تو زخم جلد بھر جائے گا۔"

اسی رات مجھے ہدایت کی گئی کہ میں کلکتے سے ڈھاکا چلا جاؤں۔

○☆○

دوسری جنگِ عظیم چھڑے دو ایک مہینے ہی ہوئے تھے' جرمن تباہ کن یلغار کرتا ہوا یورپ میں بڑھتا جارہا تھا۔ مجھے مجاہد اوّل کا پیغام ملا کہ میں' طارق کے ساتھ فوراً برما جاکر تنظیم کے لیے مسلسل اور مستقل اسلحہ کی فراہمی کا انتظام کروں۔ یہ ہدایت بھی تھی کہ اب میں مستقلاً برما ہی میں ڈیرے ڈال دوں اور اسلحہ کو ہندوستان لانے کا کام طارق کے سپرد کردیا جائے۔ طارق اب تنظیم کا رکن بن چکا تھا۔ تنظیم نے فیصلہ کیا تھا کہ اس وقت جب کہ انگریز کی تمام تر توجہ اور طاقت جنگ پر لگی ہوئی ہے' تنظیم کو پورے ہندوستان میں اپنی چھاپا مار سرگرمیوں میں اضافہ کردینا چاہیے۔

میں حکم کی تعمیل میں برما چلا گیا اور اپنا کام انجام دینے لگا۔ یہیں ۱۹۴۱ء کے اواخر میں میری ملاقات کریم غنی سے ہوئی۔ وہ ایک سچا مسلمان' پکا محبِ وطن اور پُرجوش انقلابی تھا۔ میں برما ہی میں مقیم تھا کہ ۱۹۴۲ء کے اوائل میں جاپان مشرقِ بعید میں داخل ہوگیا۔ پرل ہاربر پر حملے سے لے کر برما پر چڑھتے سورج کا پھریرا لہرانے تک صرف چند ماہ کا عرصہ تھا۔ سنگاپور' ملایا اور برما میں لاکھوں فرنگی فوجیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ انگریز فوجیں برما سے بڑی افراتفری میں بھاگیں۔ میں

ان دنوں منڈالے میں تھا۔ ایک دن کریم غنی میرے پاس آیا۔ برما کے حریت پسند رہنما کی حیثیت سے اس کی شخصیت جانی پہچانی تھی۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گیا۔ اسی نے مجھے سبھاش چندر بوس' کیپٹن شاہنواز' لیفٹیننٹ ڈھلوں اور کیپٹن عبدالرشید سے ملوایا۔ یہ لوگ برما اور ملایا میں ہندوستانی فوجیوں کی مدد سے آزاد ہند فوج قائم کر رہے تھے اور اس کے لیے جاپانی جنرل سے بات ہوچکی تھی۔

اس دن برما میں قائم کیے جانے والے آزاد ہند ریڈیو سے آزاد ہند فوج اور حکومت کے قیام کا اعلان ہوا۔ اس حکومت میں کریم غنی کو وزیر دفاع بنایا گیا۔ کریم غنی نے ایک خاص ارادے سے مجھے لیڈروں سے ملوایا تھا۔ اس نے چھوٹتے ہی کہا "لو بھئی یہ ہیں ہمارے وزیر اطلاعات و نشریات!"

میں حیران ہی تو رہ گیا تھا اور پھر اس اعزاز سے نرمی کے ساتھ انکار کردیا تھا۔ اس سلسلے میں وطن پرست تنظیم میری سب سے بڑی مجبوری تھی۔ مجاہد اوّل کی اجازت کے بغیر میں کوئی عہدہ قبول نہیں کرسکتا تھا۔ یہی مجبوری میں نے اصرار کرنے پر ظاہر بھی کردی۔ اس کے ساتھ میں نے کہا "میری تمام ہمدردیاں اور خدمات آپ کے لیے وقف ہیں۔ میں آزاد ہند فوج کے ایک ادنیٰ اعزازی کارکن کی حیثیت سے ہر خدمت بجالاؤں گا۔"

اس دن میری تمام سرگرمیاں آزاد ہند ریڈیو کے پروگراموں کے لیے وقف ہوگئیں۔ آج بھی اگر آزاد ہند فوج کے کچھ لوگ زندہ ہیں تو انہیں اپنا ایک تنگا اور لنگڑا ساتھی ضرور یاد ہوگا جس کی آواز و الفاظ نے اس وقت ایک آگ لگادی تھی' ایک اودھم مچادیا تھا۔

جنگ کیوں کہ اب ہندوستان کی سرحدوں تک آپہنچی تھی اس لیے اپنی تنظیم سے میرا رابطہ بالکل منقطع ہوگیا تھا۔ تنظیم کے لیے سامانِ حرب کی فراہمی کا سلسلہ بھی معطل ہوگیا تھا۔

پھر ۱۹۴۵ء کا وہ منحوس دن آگیا جب جاپان پر ایٹم بم گرایا گیا۔ جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔ برما میں جاپانی فوج اسیر ہوئی اور انگریز فوج پھر قابض ٹھہری۔ آزاد ہند فوج کے اراکین پکڑ لیے گئے۔ میں بہ مشکل تمام کریم غنی کے ساتھ فرار ہوکر سیرابوم کی اس بستی میں پہنچا جو کہ کھنٹن کی بستی تھی۔ وہاں قیام کے دوران میں ہمیں کچھ پتا نہ تھا کہ دنیا میں کیا ہورہا ہے کیا نہیں! انگریز فوجیں پورے برما میں ان ہندوستانی فوجیوں کو تلاش کرتی پھر رہی تھیں جنھوں نے جاپان کے تعاون سے

آزاد ہند فوج بنائی تھی۔

ہم ڈیڑھ سال تک سرابوم میں چھپے رہے۔ اس عرصے میں میں نے بہت احتیاط کے ساتھ برما کی ایک تجارتی فرم کے لیٹر ہیڈ پر مجاہد اوّل کو نیشنل ٹریڈرز دہلی کی معرفت خط لکھا جس میں صرف اپنی خیریت کی اطلاع دی اور تازہ ہدایات طلب کیں پھر میں جواب کا انتظار کرنے لگا۔ اڑتی ہوئی خبریں مل رہی تھیں کہ برطانیہ' ہندوستان کو آزادی دینے پر آمادہ ہو گیا ہے۔ بے چین و مضطرب کریم غنی سے صبر نہ ہو سکا اور وہ برما کی پُرشور سیاست میں حصہ لینے نکل گیا پھر میری اس سے ملاقات تقریباً بیس سال قبل کراچی میں ہوئی تھی۔ اسے برما کی حکومت نے جلاوطن کر دیا تھا۔ یہ انقلابی شخص بعد میں برما کی اسمبلی کا رکن بنا' ڈاکٹر یوبا کا سیکریٹری رہا پھر برما کے مسلمانوں کے لیے مؤثر آواز اٹھانے کی پاداش میں جلاوطن ہو کر سنگاپور پہنچا۔ وہاں ایک مسئلے پر انگریز حکام نے اسے گرفتار کرا لیا۔ جیل میں اسے زہریلے ٹیکے لگائے گئے جس سے وہ تپ دق اور فالج کا مریض بن گیا۔ مرتا کھپتا کسی نہ کسی طرح وہ پاکستان آیا اور کراچی کے جناح اسپتال میں گمنامی کی موت مر گیا۔ آخر دم تک وہ ایک مجاہدانہ شان سے مسلمانانِ عالم کی خدمت کرتا رہا' نام و نمود اور صلے کی تمنا کیے بغیر! وہ موتمر العالم اسلامی کے ہفت روزہ مسلم ورلڈ کو مرتب کرتا رہا۔ جب وہ مرا تو اس کے قریب کوئی نہ تھا' سوائے موتمر کے ایک بوڑھے ملازم کے! مرنے سے پہلے اس کی صرف ایک خواہش تھی' وہ بھی پوری نہ ہو سکی کہ وہ کسی طرح برما جا کر اپنے بچوں سے مل لے۔ کراچی میں میری اس سے چند ملاقاتیں ہوئی تھیں۔ آخری مرتبہ جب میں اس سے ملنے گیا تو پتا چلا' وہ اسپتال میں ہے' اسپتال گیا تو پتا چلا وہ مر گیا ہے۔ وہ ایسا ہی سیماب صفت آدمی تھا۔ اس کے ساتھ چلنے والے ہانپ جاتے تھے' وہ ہمیشہ ان سے آگے رہتا تھا۔

اپریل ۱۹۴۷ء کے اوائل میں مجھے اپنے خط کا جواب ملا۔ مجھے فوراً کلکتہ پہنچ کر جوگیندر سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی اور یہ نوید بھی دی گئی تھی کہ ہندوستان آزاد ہونے والا ہے اور مسلمانوں کے مطالبے پر پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا ہے۔ یہ جواب مجھے خالد کی طرف سے ملا تھا۔ تنظیم میں اس کی حیثیت میرے ہم پلہ ہی تھی۔ وہ بھی مجاہد اول کا نائب تھا مگر مجھ سے عمر میں بڑا' زیادہ تجربہ کار اور زیادہ سینیئر تھا۔ اسی شخص نے کراچی میں میرا امتحان لیا تھا۔ اسے میں بھول نہیں سکتا تھا۔

حسن کا باپ مجھے سرحد تک چھوڑنے آیا تھا۔ آگ' اور

خون کے سمندر سے گزرتا ہوا اس کلکتے میں پہنچا جہاں ان دنوں انسانی لہو ارزاں تھا۔ آسام کی سرحدوں سے کلکتے تک میں نے ہر طرف ابلیس کو رقص کرتے دیکھا' ان انسانوں کو دیکھا جن کی آزادی کے لیے ہم جدوجہد کر رہے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے کے دشمن' ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ انہیں اپنی وحشت میں نہ پھول جیسے بچوں پر پیار آتا تھا' نہ نازک سی کومل سی عورتوں اور دوشیزاؤں پر رحم آتا تھا' نہ بوڑھوں اور معذوروں پر وہ ترس کھاتے تھے۔ انسان اپنی تمام حسین خصوصیات کھو بیٹھا تھا۔ اب وہ ایک وحشی اور خون خوار' سفاک اور بے رحم درندہ تھا۔ کاش کوئی ایسی بھی تنظیم ہو جو انسان کو اس کے وحشی روپ سے نجات دلانے کے لیے قائم ہو۔ کاش کوئی ایسی تنظیم قائم ہو کہ انسان کو درجہ انسانیت پر فائز کر سکے۔ میں یہی سوچتا اور خون کے آنسو روتا ہوا سفر کرتا رہا۔

میں عین اس دن کلکتے پہنچا جس دن تقسیم ہند کے منصوبے کا اعلان ہوا تھا۔ جوگیندر میرا منتظر تھا۔ اس نے بڑی گرم جوشی سے میرا استقبال کیا۔ تقسیم ہند کے منصوبے کی خبر ہم دونوں نے ریڈیو پر سنی تھی اور ایک دوسرے سے گلے مل کر چپ روئے تھے اور مبارک باد بھی دی تھی۔ یہ یک وقت یہ خوشی اور غم کا موقع تھا۔ خوشی اس بات کی کہ برصغیر کو انگریزوں کی لوٹ کھسوٹ سے نجات مل گئی تھی' غم اس بات کا ایک ملک تقسیم ہو گیا تھا۔ یہ ایک بہت بڑی خبر تھی' بہت بڑی خوش خبری تھی' ایک ایسی منزل تھی جس تک پہنچنے کے لیے ہندوستان نے دو صدیوں کا سفر کیا تھا اور منزل پر پہنچنے والے آپس میں دست و گریباں تھے۔

"آزادی مل رہی ہے شاہین!" جوگیندر نے کہا "مگر یار یہ کیسی آزادی ہے کہ جی اندر ہی اندر رو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں شاہین' ہندوستان ہندوؤں کی اپنی تنگ دلی سے تقسیم ہوا ہے۔ وہ ہندوستان کی مکمل حکمرانی چاہتے ہیں۔ وہ اختیارات میں مسلمانوں کو حصہ نہیں دینا چاہتے۔ وہ ہندوستان کو انسانوں کا نہیں صرف ہندوؤں کا وطن بنانا چاہتے ہیں۔"

"آدمی جب مذہب کے نام پر انسان دشمنی کو اپنا مسلک بنا لے تو ایسے ہی تقسیم الیے جنم لیتے ہیں" میں نے کہا تھا۔

"مجاہد اول کا کہنا قطعی درست تھا۔ میں قدم قدم پر مایوس ہوا ہوں۔ تنظیم سے علیحدگی کے بعد میں نے یہی محسوس کیا کہ یہاں کوئی بھی انسانوں کے بارے میں انسانی بنیاد پر اور انسانی سطح پر سوچنے کے لیے تیار نہیں۔"

اچانک ہی مجھے سوشیلا کا خیال آ گیا تھا اور جوگیندر سے پوچھا تھا "یہ میری بھابی سوشیلا کہاں ہیں؟"

"وہ یہاں ہیں' میرے دل میں!" جوگیندر نے اپنے دل پر ہاتھ رکھا' پھر سر پر انگلی رکھتے ہوئے بولا "اور یہاں میرے ذہن میں!"

"کیا مطلب؟" میں نے سہم کر پوچھا "کیا کہہ رہے ہو؟"

"تمہیں وہ رات یاد ہو گی جب مچھوا بازار میں تنظیم کے عارضی ہیڈ کوارٹرز پر چھاپا پڑا تھا؟" جوگیندر نے کہا "وہ چھاپا سوشیلا کی مخبری پر پڑا تھا۔ اس رات جب میں تمہارے ساتھ مجاہد اول کے کمرے میں گیا تو سوشیلا دروازے سے کان لگا کر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ میں اس روز کی ملاقات میں مجاہد اول سے تنظیم چھوڑنے کے متعلق بات کروں گا۔ دوران گفتگو میں جب اس نے مجاہد اول کا یہ جملہ سنا کہ صبح میں ناشتا انہی کے ساتھ کروں اور یہ کہ تنظیم سے نکلنے کا موت کا سوا کوئی راستہ نہیں ہوتا تو وہ گھبرا گئی۔ اس نے سمجھا کہ مجاہد اول نے صبح تک مجھے ٹھکانے لگانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ وہ یہ سن کر فوراً ہی وہاں سے چلی گئی اور کسی نہ کسی طرح اس نے پولیس کو ہمارے بارے میں اطلاع دے دی۔ پولیس کے لیے وطن پرست تنظیم کا نام کافی تھا۔ وہ اسی لیے بڑی تعداد میں آئی تھی۔ اسے شدید مقابلے کا پہلے ہی سے احساس تھا۔ میں سوشیلا کی سہیلی کے گھر یا لی گنج پہنچا تو وہ وہاں نہیں تھی۔ وہ اپنی سہیلی کے ساتھ چلی گئی تھی اور مجھ سے وہیں انتظار کرنے کے لیے کہہ گئی تھی" جوگیندر دھیمے غم انگیز لہجے میں کہتا رہا پھر وہ اچانک جیسے کہیں گم ہو گیا۔ خود ہی وہ تھوڑی دیر بعد چونک کر کہنے لگا "سوشیلا رات گئے واپس آئی تو مجھے دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اسے توقع نہیں تھی کہ مچھوا بازار سے مجھے زندہ نکلنے دیا جائے گا۔ اس نے اپنی سہیلی سے مل کر ایسا انتظام کیا تھا کہ میں نہ پکڑا جاؤں۔ اس کی سہیلی کے والد اس علاقے کے ڈی ایس پی تھے پھر باتوں ہی باتوں میں اس کی سہیلی نے مجھے بتایا کہ سوشیلا کیا قدم اٹھا چکی ہے! جب مجھے یہ پتا چلا تھا تو میں اندھا دھند وہاں سے مچھوا بازار پہنچا تھا' عین اسی وقت جب کہ پولیس چھاپا مار چکی تھی۔ اسے بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے۔"

"پھر کیا ہوا؟"

"پھر وہی ہوا جو مجھے کرنا چاہیے تھا۔"

"کیا کیا تھا تم نے؟" میں نے تمام اندیشوں کے ساتھ پوچھا۔

"سوشیلا تنظیم کی مخبری کرنے والوں کے انجام سے

اپنے خالو جان خان بہادر ثناء اللہ خاں کے خیال سے کچھ کوفت محسوس ہوئی۔ ان سے میری آخری ملاقات 'نئی دہلی میں مسز سروجنی نائیڈو کے بنگلے پر ہوئی تھی۔

"تم کیا سوچنے لگے شاہین؟" جوگیندر نے مجھے ٹوکا۔

"علی گڑھ چلتے ہیں' وہاں میری سگی خالہ رہتی ہیں" میں نے جواب دیا۔

ہم اسی وقت ریلوے اسٹیشن روانہ ہو گئے۔ وہاں ہماری ملاقات اسٹیشن سے باہر آنے والے ایک آشنا شخص سے ہوئی۔ یہ لکھنؤ کی ایک سیاسی شخصیت ہریرشاد تھا۔ جوگیندر اور میں لکھنؤ میں اسی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ یہ اس وقت کی بات تھی جب فاطمہ کی گرفتاری کے بعد میں اور جوگیندر لکھنؤ گئے تھے۔ ہریرشاد نے ہمیں اور ہم نے انہیں پہچان لیا۔

"آپ یہاں دہلی میں؟" میں بولا "وہ بھی ان حالات میں؟"

"دراصل میں گیا تو علی گڑھ تھا' اپنے عزیز دوست خان بہادر ثناء اللہ خاں سے ملنے! علی گڑھ میں ایسی خبر ملی کہ مجھے مجبوراً دہلی آنا پڑا۔"

ہریرشاد سے اپنے خالو جان کا ذکر سن کر میں چونک اٹھا اور میں نے اسے مزید کریدا۔

"وہاں خان بہادر کی کوٹھی میں تالا پڑا ہے۔ وہاں کوئی نہیں ملا ہوا یہ کہ خان بہادر علی گڑھ میں نہیں تھے۔ ان کے پیچھے علی گڑھ میں فساد ہو گیا پھر جو بھگی مچی تو بھابی صاحب میاں عطا اللہ اور صاحب زادی شگفتہ کو لے کر دوسرے عزیزوں کے ساتھ لاہور کے لیے روانہ ہو گئیں۔ خان بہادر علی گڑھ واپس پہنچے تو انہیں یہ علم ہوا پھر وہ بھی لاہور کے لیے ٹرین میں سوار ہو گئے۔ ان کے ساتھ دو ایک عزیز اور تھے" ہریرشاد بتا رہا تھا "انہی عزیزوں میں سے ایک کی زبانی معلوم ہوا کہ دہلی سے قبل اس ٹرین پر بلوائیوں نے حملہ کر دیا جس میں کئی افراد ہلاک اور زخمی ہو گئے۔ زخمی ہونے والوں میں خان بہادر بھی شامل ہیں۔"

ہریرشاد سے کچھ مزید کہے سنے بغیر ہم الٹے قدموں لوٹ لیے۔ علی گڑھ جانا اب لاحاصل ہی تھا۔ میرے خالو لاکھ خان بہادر سہی' تھے تو میرے سگے خالو ہی اور اس وقت مشکل میں تھے کیوں کہ خالہ جان اور بچے ان سے بچھڑ گئے تھے پھر یہ کہ وہ نہ معلوم کتنے زخمی تھے! انہیں میری مدد کی ضرورت ہو سکتی

حقیقت میرے چیخنے سے بدل سکتی تو میں آج تک مسلسل چیختا ہی رہتا "تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا جوگیندر! سوشیلا نے جو کچھ کیا تھا' صرف تمہارے لیے کیا تھا۔"

"مجاہد اوّل نے کہا تھا۔" جوگیندر گلوگیر لہجے میں بولا "تنظیم میں داخل ہونے والے اپنی انفرادی حیثیت کھو بیٹھتے ہیں۔ وہ ایک بڑی مشین کے کل پرزے بن جاتے ہیں جو اس مشین کو متحرک رکھتے ہیں۔ پرزہ خراب ہو جاتا ہے تو اسے بدلنا ہی پڑتا ہے' سو میں نے ایسا ہی کیا۔ میری وجہ سے تنظیم سے سوشیلا بھی ایک حد تک وابستہ تھی۔ تنظیم کی باقاعدہ رکن نہ ہونے کے باوجود وہ کئی مہموں میں حصہ لے چکی تھی۔ میں نے تنظیم کا رکن بننے کے بعد جتنا عرصہ گزارا تھا' اس کا یہی تقاضا تھا کہ تنظیم سے غداری کرنے والا' اسے نقصان پہنچانے والا کوئی بھی ہو' اسے ختم کر دیا جائے۔"

"اور آج تک تم اس کی یاد دل میں بسائے بیٹھے ہو!" میں نے کہا اور ریڈیو پر رکھی ہوئی سوشیلا کی تصویر کو دیکھنے لگا۔ میری آنکھیں نم ہو گئیں۔

"اس دل پر میرا اختیار نہیں ہے" جوگیندر نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

جوگیندر نے بتایا کہ ملک بھر میں فرقہ وارانہ خونی فسادات کے بعد تنظیم کے کارکنوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے عزیزوں کے پاس چلے جائیں۔ اسے خالد نے اطلاع دی تھی کہ میں اس کے پاس پہنچنے والا ہوں لہٰذا وہ کلکتے میں میرا انتظار کرے۔ جوگیندر آخر میں بولا "اس دنیا میں اب تمہارے سوا میرا کوئی ایسا نہیں شاہین جسے میں صحیح معنوں میں اپنا عزیز کہہ سکوں اس لیے میں تمہارا انتظار کر رہا تھا۔"

کلکتے سے میں نے اپنے تمام ہی عزیزوں اور دوستوں کو تار دیے تھے مگر پورا ہفتہ گزر جانے کے بعد بھی کہیں سے کوئی جواب نہیں ملا تھا۔ ڈاک' تار اور مواصلات کا نظام درہم برہم تھا۔ میں نے پھر دہلی چلنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ جوگیندر میرے ساتھ تھا۔

آگ' خون' آہوں' کراہوں' شور شغب' غیظ و غضب اور تباہی و بربادی کے نظارے دیکھتے ہوئے ہم ایک ہفتے کے بعد بہ مشکل تمام دہلی پہنچے' اجاڑ اور ویران دہلی میں! محبت اور اخوت کی وہ فضا جو دہلی کو دہلی بناتی تھی' اب اس کی جگہ خوف و دہشت نے لے لی تھی۔ میں قرول باغ گیا۔ جہاں میں

پلا بڑھا تھا' اس گھر میں تالا پڑا ہوا تھا پھر میں اپنی ننھیال گیا تو حویلی ویران پڑی تھی۔ معلوم ہوا کہ میری ننھیال والے لاہور چلے گئے ہیں کیوں کہ اب دہلی میں مسلمانوں کا رہنا محال ہو گیا ہے۔ ایک پڑوسی نے لاہور کا وہ پتا بھی بتایا جہاں ماموں وغیرہ گئے تھے۔ بڑے ماموں احتیاطاً پتا لکھوا گئے تھے۔

"کیا دہلی کے سوا کہیں اور تمہارا کوئی قریب عزیز نہیں؟" جوگیندر جو میرے ساتھ تھا' اس نے پوچھا۔

اس پر مجھے اپنی خالہ جان کا خیال آیا جو مجھے اپنی اولاد کی طرح چاہتی تھیں پھر مجھے بھائی عطا اللہ خاں یاد آئے البتہ

جلد ہی ان کا سراغ مل گیا۔ اسپتال سے وہ دو دن بعد ہی جامع مسجد میں منتقل ہو گئے تھے جہاں دہلی کے ہزاروں بے گھر مسلمانوں نے پناہ لے رکھی تھی۔

دہلی ان دنوں فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔ انسان نے انسانیت کو ننگا کر دیا تھا' اس کی حرمت و عزت کو پامال کر دیا تھا۔ میں اور جوگیندر وحشت و بربریت کے اس طوفان سے گزر کر جامع مسجد پہنچ گئے تھے۔ اس دوران میں ہمیں اپنا کچھ ہوش نہیں تھا۔ جوگیندر کے جسم پر ایسا لباس تھا کہ اسے کوئی ہندو کی حیثیت سے نہیں پہچان سکتا تھا جامع مسجد میں ہم نے خان بہادر کو بہت تلاش کیا مگر وہ نہ ملنے تھے نہ ملے۔ اس دوران میں البتہ ان کے ایک عزیز سے ضرور ملاقات ہو گئی۔ اس نے بتایا کہ خان بہادر تین دن قبل جامع مسجد سے چلے گئے تھے کیوں کہ یہاں یہ خبر پہنچی تھی کہ جس گاڑی سے خالہ جان وغیرہ لاہور روانہ ہوئی تھیں' وہ امرتسر میں کاٹ دی گئی تھی۔ وہ شخص بتا رہا تھا "خان بہادر صاحب! اپنے بچوں کے لیے بہت پریشان تھے۔ ہم نے انہیں بہت روکا کہ وہ زخمی ہیں' ان کے زخم خطرناک ہیں' ابھی انہیں یہاں سے نہیں جانا چاہیے مگر وہ نہ مانے۔ وہ یہی کہتے تھے کہ میں نہیں رک سکتا۔ میرے سب بیٹے بچھڑ گئے ہیں۔ میں اپنی شگفتہ کو تلاش کروں گا' کہیں وہ بھی مجھ سے نہ چھن جائے۔"

یہ سن کر میری آنکھوں میں شوخ و شریر شگفتہ کا حسین سراپا گھوم گیا۔ میری خالہ جان اس سے میری شادی کرنا چاہتی تھیں۔ معلوم نہیں وہ کس حال میں ہوگی؟ خالہ جان کیسی ہوں گی؟ بھائی عطاءاللہ بھی خیریت سے ہوں گے یا نہیں؟ یہ سب کچھ سوچ کر میرے دل کو دھکا سا لگا اور خالو جان کی بے بسی پر بھی ترس آیا کہ وہ سب سے بچھڑ گئے تھے۔

وہ شخص مزید بتا رہا تھا "خان بہادر کے سر میں شدید زخم آئے ہیں جس کی وجہ سے ان کا ذہنی توازن بھی کچھ خراب ہو گیا ہے۔ کبھی تو وہ ہوش مندوں کی طرح باتیں کرتے ہیں' کبھی پاگل پن کا دورہ پڑتا ہے اور نہ معلوم کیا کیا باتیں کرنے لگتے ہیں۔"

وقت نے کیا کیا کروٹیں لی تھیں! وہ خان بہادر جنہیں اپنے بیٹے اور بیٹی سے زیادہ اپنی خان بہادری عزیز تھی' لاٹ بہادر کے راج کا خاتمہ ہوتے ہی پھر اپنوں کی طرف لوٹ رہے تھے۔ آج پھر انہیں اپنا بیٹا اور بیٹی یاد آ رہے تھے۔ وہ خان بہادر جو اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے' اپنی بیٹی کی تلاش میں آج ایک عام آدمی کی طرح محض ایک باپ بن کر خاک چھانتے پھر رہے تھے۔

دہلی کے فسادات اتنے شدید تھے کہ ہم بس جامع مسجد میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ ایک ماہ وہاں محصور رہنے کے بعد میں نے اور جوگیندر نے وہاں سے ہر قیمت پر نکلنے کا فیصلہ کر ہی لیا۔ میں اس عرصے میں جوگیندر کو سب کچھ بتا چکا تھا کیوں کہ اب اس رازداری کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ اب جوگیندر کی سمجھ میں یہ معما آگیا تھا کہ اس کی بہن فاطمہ کے ہونٹوں پر مرتے دم "میرے دیوتا طارنوش" کیوں تھا۔

ہم کس طرح دہلی سے نکلے اور کس طرح مختلف سواریاں بدلتے ہوئے اٹاری پہنچے یہ ایک الگ دل خراش داستان ہے۔ آخری سفر ہم نے ایک بیل گاڑی میں کیا۔ کئی جگہ ہماری بیل گاڑی کو آگے بڑھنے کے لیے لاشوں پر سے گزرنا پڑا تھا۔ اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ سفر کتنا ہول ناک رہا ہو گا اور انسان نے انسان پر کتنے مظالم کیے ہوں گے!

کیسا عجیب اتفاق تھا کہ میں نے اپنی انقلابی زندگی کا پہلا سفر تقریباً ربع صدی قبل بیل گاڑی میں کیا تھا اور اپنی انقلابی زندگی کا اختتامی سفر بھی بیل گاڑی ہی میں کیا۔

کتنا عجیب سفر تھا' چلے تو دوپہر تھی' منزل پر پہنچے تو شام ہو چکی تھی' سورج غروب ہو رہا تھا۔

اس طوفانی سفر کا آغاز ہم نے "جان دینا خلافت پہ دے دو" کی پرسوز لے کے سائے میں کیا اور یہ سفر "لے کے رہیں گے پاکستان' بٹ کے رہے گا ہندوستان" کی رزمیہ دھن کی تعبیر کے موقع پر اختتام کو پہنچا تھا۔ ہم پچیس برس پہلے اپنے بدترین سامراجی دشمن اور نو آبادیاتی آقا پر ضرب کاری کا عزم جواں لے کر نکلے تھے اور منزل پر پہنچے تو آزادی کے زخموں سے چور تھے۔ ہم نے جوانی کی دوپہر میں کوچ کیا تھا اور بڑھاپے کی دہلیز پر پہنچے تو منزل آئی تھی۔

ربع صدی کا یہ سفر ہم مڑ کر دیکھتے تو کل ہی کی بات لگتی تھی۔

اٹاری پنجاب کا وہ علاقہ تھا جو تقسیم ہند کے منصوبے کے مطابق پاکستان میں شامل ہونے والا تھا مگر بعد میں ایسا نہیں ہوا بہرحال اس وقت لاہور' امرتسر ریلوے لائن پر یہ گویا پہلا پاکستانی ریلوے اسٹیشن تھا۔ یہ چھوٹا سا قصبہ ہندوستان کی طرف سے لٹ پٹ کر آنے والے مہاجروں کے لیے پاکستان میں مہینوں تک پہلا پڑاؤ بنا رہا۔

یہ چودہ اگست کا دن تھا' مجھے اچھی طرح یاد ہے۔

اسٹیشن کے آس پاس میدان میں آزادی کے خون ریز سیلاب میں تنکوں کی طرح بہہ کر آنے والے شکستہ حال

خودرو جھاڑیوں کے بجائے انسان نکل پڑے ہیں۔

ہم نے اپنی بیل گاڑی اسٹیشن کے پاس ہی دیوار کے ساتھ روک دی۔ راستے میں ہم نے ایک مختصر سے خاندان کو جو میاں بیوی اور دو بچوں پر مشتمل تھا' اپنی گاڑی میں بٹھالیا تھا۔ اسے ہم بیل گاڑی کے پاس ہی چھوڑ کر خانماں برباددوں کی اس عارضی بستی کا چکر لگانے کے لیے نکل پڑے۔ وہ سب شکستہ حال تھے' خاک بہ سر تھے' زخم زخم تھے' اپنے اندر بھی اور باہر بھی! انہوں نے آزادی کی بڑی بھاری قیمت ادا کی تھی۔ ان سے مطالبہ پاکستان کی بڑی بھاری قیمت لی گئی تھی۔ جان' مال' عزت' آبرو' سبھی کچھ ان سے چھین لیا گیا تھا پھر بھی وہ خوش تھے کہ سب کچھ لٹا کر پاک سرزمین پر پہنچ گئے تھے۔ ان میں بے حد جوش و خروش تھا کیوں کہ اس رات قیام پاکستان کا باضابطہ اعلان ہونے والا تھا "پاکستان زندہ باد" کے نعرے لگ رہے تھے۔

"ان کا جرم کیا ہے طارنوش؟" جوگیندر مجھ سے مخاطب ہوا "صرف یہی ناکہ انہوں نے بھی اپنی آزادی طلب کی تھی لیکن ان لوگوں نے جو صدیوں سے ان کے ساتھ تھے' جو خود آزادی کا مطالبہ کر رہے تھے' ان لوگوں سے وہی سلوک کیا جو انگریز دو سو برس سے ہندوستان کے عوام کے ساتھ کرتا آرہا تھا۔ مجھے بتاؤ طارنوش' لوگ اصولوں کو اتنا توڑتے موڑتے کیوں ہیں؟ مجھے بتاؤ کہ وہ جو غالب ہوتے ہیں' طاقت ور ہوتے ہیں' اتنے تنگ دل کیوں ہو جاتے ہیں؟"

میں جوگیندر کی بات کا کیا جواب دیتا' خاموش رہا۔

رات گیارہ بجے ہی سے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر بڑا ہجوم تھا۔ اسٹیشن ماسٹر اپنا ریڈیو نکال لایا تھا اور سب لوگ قیام پاکستان کا اعلان سننے کے لیے بے چین تھے۔

میں اور جوگیندر بھی اسی بھیڑ میں شامل تھے۔ ہمارے ساتھ ہی ایک خستہ حال اور نحیف بوڑھا کھڑا تھا۔ اس کے سر پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ وہ بار بار ہمارے درمیان سے ہو کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پھر وہ اعلان ہوا۔

لوگوں میں بے پایاں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ کچھ من چلوں نے خوشی کے اس موقعے کو شایانِ شان طریقے پر منانے کے لیے پٹاخوں کا انتظام کیا تھا۔

پھر لوگوں نے رقص شروع کیا اور اس دوران میں ہجوم جو پیچھے ہٹا تو ہم دور تک اس کے ریلے میں بہ گئے۔ اسی درمیان ایک انسانی چیخ ابھری' پھر وہ چیخ کئی چیخوں میں بدل گئی۔

میں اور جوگیندر تیزی سے ادھر لپکے۔ یہ وہی بوڑھا تھا جو ہجوم کے مسرت سے بے قابو ہو جانے کی وجہ سے لڑکھڑا کر گرا تھا اور لوگوں کے قدموں میں روندا گیا تھا۔

لوگوں کو ہٹاتے ہوئے ہم اس کے پاس پہنچے۔ اس کے سر پر پٹیوں سے خون بہنے لگا تھا۔ ہم اسے اٹھا کر پلیٹ فارم کے ایک کونے پر لے آئے۔

بوڑھا نیم بے ہوش تھا۔ اس کے سر اور سینے سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کی بغل میں ایک گٹھری دبی ہوئی تھی۔ ہم نے وہ گٹھری لینا چاہی تو اس نے ہمیں جھڑک دیا "نہیں' یہ نہیں لو!"

یہ آواز میرے لیے ایک مانوس آواز تھی۔ یہ آواز میرے خالو جان خان بہادر ثناء اللہ خاں کی آواز تھی جنہیں میں ان کے بڑھاپے اور چہرے پر بڑھی ہوئی داڑھی کی وجہ سے نہیں پہچان سکا تھا۔ میں کوئی بیس سال بعد انہیں دیکھ رہا تھا۔

"خالو جان!" میں نے کہا "میں ہوں طارنوش۔"

"طارنوش!" خان بہادر ثناء اللہ خاں بولے "طارنوش میرے بیٹے! تو کہاں تھا؟۔۔۔ شگفتہ' میری شگفتہ! میرا عطا اللہ!" یہ کہہ کر وہ بے ہوش ہو گئے۔

"کیا یہ تمہارے خالو جان ہیں؟" جوگیندر نے کہا "جن کے لیے ہم علی گڑھ جا رہے تھے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا۔

تھوڑی ہی دیر میں خالو جان پھر کراہ اٹھے "طارنوش! میں نے معلوم کیا تھا۔ ابھی اس اسٹیشن سے یونین جیک اتار کر سبز ہلالی پرچم لہرایا جائے گا۔ میں وہ منظر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

مجھے ان کی زبان سے یہ بات سن کر حیرت تو ہوئی مگر کچھ بولا نہیں۔ ہم انہیں اٹھا کر ایسی جگہ لے آئے جہاں سے اٹاری اسٹیشن کی چھت پر لہراتا ہوا یونین جیک نظر آرہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی آہستہ آہستہ یونین جیک نیچے کھسکتا چلا آیا۔ میں نے غور سے خالو جان کے چہرے کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں چمک عود کر آئی تھی۔ ان پر سخت نقاہت طاری تھی لیکن شاید وہ اپنی تمام قوت مجتمع کر کے خود کو ہوش و حواس میں رکھنے کی کوشش کر رہے تھے پھر یونین جیک کی جگہ سبز ہلالی پرچم بلند ہوا اور لہرانے لگا۔

"پاکستان!" ایک صدا گونجی۔ "زندہ باد!" جواب آیا۔

زندہ باد کے اس پُرزور جواب میں میرے خالو جان کی

یک آواز بھی شامل تھی۔

ہماری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں! مہاجروں کے اس عارضی کیمپ میں ایک بھی ڈاکٹر موجود نہیں تھا۔ ہم خالو جان کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے تھے' سوائے یہ کہ ہم ان کے پاس بیٹھے رہیں۔ عجیب بے بسی تھی!

رات کے پچھلے پہر خالو جان کو تھوڑی دیر کے لیے ہوش آیا اور وہ مجھ سے بولے "طارق ش بیٹا! تمہارا بھائی عطااللہ خاں ابھی لاہور نہیں پہنچا۔ ایک عزیز نے مجھے بتایا تھا کہ وہ ابھی ہندوستان میں ہے۔ تمہاری خالہ جان اور شگفتہ بھی ابھی وہیں ہیں۔"

"میں انہیں تلاش کراؤں گا' ہندوستان میں۔ وہ سب آپ کے پاس پہنچ جائیں گے" جوگیندر بول اٹھا۔

"یہ میرا دوست جوگیندر ہے' خالو جان!" میں نے آہستہ سے کہا۔

"میں جانتا ہوں' سیٹھ موہن لال کا بیٹا جوگیندر! موہن لال ہمارے ہی قصبے جلالی کا تو تھا' علی گڑھ کا قصبہ جلالی! وہ بھی میرا بڑا گہرا اور عظیم دوست تھا۔" خان بہادر ثناء اللہ خاں نے اٹک اٹک کر کہا "تم دونوں یوں ہی میرے پاس بیٹھے رہو۔ میں تمہیں جی بھر کے دیکھنا چاہتا ہوں۔"

وہ دیر تک ہمیں دیکھتے رہے۔ ہمارے ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھے پھر ہمارے ہاتھوں پر ان کی گرفت مضبوط ہوئی۔

"خدا حافظ!" ان کے منہ سے نکلا اور وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئے۔

صبح ان کی تدفین کی تیاریاں ہو رہی تھیں' ہم پر ایک اور انکشاف ہوا۔

خان بہادر ثناء اللہ خاں کے دائیں بازو پر ہماری تنظیم کے بہت سے اراکین کے نام گدے ہوئے تھے۔ جوگیندر نے بازو کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا' ان ناموں کے نیچے زخم کا ایک سیاہ نشان تھا۔

میں نے تیزی سے ان کی قمیص ہٹا کر ان کا سینہ دیکھا۔ ان کے سینے پر فاطمہ کا نام گدا ہوا تھا۔

اس وقت مجھے محسوس ہوا کہ میں واقعی یتیم ہو گیا ہوں۔

پھر میں اور جوگیندر پہلی مرتبہ خان بہادر کی موت پر پھوٹ پھوٹ کر روئے تھے اس لیے کہ وہ ہمارا مجاہد اوّل بھی تھا۔

اگلے روز شام ڈھلے میں' جوگیندر کو رخصت کر رہا تھا جو واپس ہندوستان جا رہا تھا۔

اختتام